عُلماء

میدانِ سیاست میں

جناب حکیم محمود احمد ظفر



بیت العلوم

۲۰- نابھہ روڈ، پرانی انارکلی لاہور۔ فون: ۷۳۵۲۴۸۳

عُلماء
میدانِ سیاست میں

جناب حکیم محمود احمد ظفر

بیتُ العلوم
۲۰- نابھہ روڈ، پُرانی انارکلی لاہور۔ فون: ۷۳۵۲۴۸۳

کتاب علماء میدان سیاست میں
مولف جناب حکیم محمود احمد ظفر
باہتمام محمد ناظم اشرف
ناشر بیت العلوم ۔۲۰ نابھہ روڈ، چوک پرانی انارکلی، لاہور
فون: ۷۳۵۲۴۸۳

﴿ملنے کے پتے﴾

بیت العلوم = ۲۰ نابھہ روڈ، پرانی انارکلی، لاہور
ادارہ اسلامیات = ۱۹۰ انارکلی، لاہور
ادارہ اسلامیات = موہن روڈ چوک اردو بازار، کراچی
دارالاشاعت = اردو بازار کراچی نمبرا
بیت القرآن = اردو بازار کراچی نمبرا
بیت الکتب = گلشن اقبال، کراچی
ادارۃ المعارف = ڈاک خانہ دارالعلوم کورنگی کراچی نمبر۱۴
مکتبہ دارالعلوم = جامعہ دارالعلوم کورنگی کراچی نمبر۱۴
مکتبۂ قرآن = بنوری ٹاؤن، کراچی
مکتبہ سید احمد شہید = الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

انتساب

یہ کتاب والد محترم الحاج مرزا محمد حسین صاحب رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ کی خواہش پر حیطۂ تحریر میں لائی گئی کیونکہ اسلامی نظام کی خاطر انہوں نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا تھا، لیکن افسوس کہ وہ 60 سال کے عرصہ میں بھی اس ملک میں اسلامی نظام کی بہار نہ دیکھ سکے۔ آخر کار 6 مئی 2006ء کو اپنی زندگی کی پوری سومنزلیں طے کر کے یہ کہتے ہوئے اس عدم ہستی نما سے ہستی عدم نما کو انتقال فرما گئے

دوستو! دیکھا تماشا یاں کا سب
تم رہو خوش، ہم تو اپنے گھر چلے

یہ کتاب میں ان کے نام معنون کرنے کی جرأت کرتا ہوں

اللھم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه و ادخله الجنة الفردوس

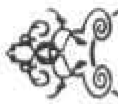
بحرمة النبی الکریم علیه الصلوٰة والتسلیم،

یارب العالمین! یاأکرام الأکرمین

(حکیم) محمود احمد ظفر۔ سیالکوٹ

فہرست

علماء میدانِ سیاست میں




☆ ☆ ☆

پیش آہنگ

اسلام اور سیاست کا چولی دامن کا ساتھ ہے لیکن یہ بھی نہیں کہ مکمل دین ہی سیاست ہے۔ سیاست اسلام کا ایک جزو ہے۔ بعض حضرات نے اسلام میں سیاست کو داخل کرتے کرتے پورے دین ہی کو سیاسی بنا دیا اور سیاست کو دین میں مرکزی مقام دے دیا، اور ان کو پورے دین میں اپنے مخصوص ذہن کی وجہ سے دین کو سیاسی طور پر غالب کرنا ان کی زندگی کا مقصد ہو گیا جس کے نتیجہ میں دین کے تمام اجزاء سیاست کے تابع ہو گئے۔ ان حضرات کے نزدیک محض تکوینی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کو خالق اور مدبر کائنات اور مالک ارض وسماء مان لینا کافی نہیں بلکہ سیاسی حیثیت سے اسی کو بادشاہ، حاکم اور قانون ساز ماننا بھی ضروری ہے۔ ان کے نزدیک مومن کی زندگی کا مشن یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کا قانون تکوینی تمام کائنات میں نافذ ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قانون شرعی بھی عالم انسانی میں نافذ ہو۔ مومن کی تمام مساعی کا ہدف مقصود یہ ہو کہ وہ خدا کے بندوں کو خدا کے سوا ہر ایک کی بندگی سے نکالے اور صرف خدا کا بندہ بنائے۔

دین کی اس سیاسی تعبیر نے لوگوں کے ذہنوں میں اپنے فطری نتیجے کے طور پر منزل مقصد کا سیاسی تصور پیدا کیا اور امت کو ایک ایسا نصب العین دیا جس میں سیاست اور حکومت کو بنیادی حیثیت حاصل ہو۔ چنانچہ اس کے نتیجہ میں پیغمبر ایک لیڈر، دین ایک تحریک اور ایک اسٹیٹ بن گئی۔ اور اس تحریک کے تمام کارکن جماعت اسلامی کے فرد بن گئے۔ عبادت یعنی نماز، روزہ اور حج اور زکوٰۃ وغیرہ حکومت الٰہیہ قائم کرنے کے لیے ایک تربیتی کورس بن گیا۔ نماز باجماعت خدا کے قانون کو پھیلانے اور جاری کرنے کے

لیے انفرادی کوشش کرنے کے بجائے ایک اجتماعی جدوجہد کا نام ہو جاتی ہے۔ تقویٰ اور احسان کا معنی پھر خدا کا خوف جو انسان کو اس کی ناراضی سے بچنے پر آمادہ کرتا ہے اور احسان کا اساسی تصور خدا کی محبت نہیں رہتا جو انسان کو اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ابھارتی ہے بلکہ ان دونوں الفاظ کا مفہوم بدل کر بدل سیاسی ہو جاتا۔ چنانچہ دین کی شہادت دینے اور اتمام حجت کرنے کا کام اس سیاسی تعبیر کے ڈھانچے میں ایک ایسی چیز بن گیا جس کا تعلق براہِ راست نظام حکومت کے قیام سے ہے۔ حکومت کے بغیر اس کی پوری ادائیگی ممکن ہی نہیں۔ یہاں تک کہ معراج کے واقعہ کو بھی سیاسی غلاف میں لپٹے ہوئے الفاظ میں یوں بیان کیا گیا:

> ''یہ کرۂ زمین جس پر ہم آپ رہتے ہیں، خدا کی عظیم الشان سلطنت کا ایک چھوٹا سا صوبہ ہے۔ اس صوبہ میں خدا کی طرف سے جو پیغمبر بھیجے گئے ہیں، ان کی حیثیت کچھ اس طرح کی سمجھ لیجئے جیسے خدا کی حکومتیں اپنے ماتحت ملکوں میں گورنر یا وائسرائے بھیجا کرتی ہیں۔ ایک لحاظ سے دونوں میں بڑا بھاری فرق ہے۔
>
> ''آپ ﷺ کو اپنے مشن کی تبلیغ کرتے ہوئے قریباً بارہ سال گزر چکے تھے۔ اور آپ کی تحریک ایک مرحلے سے گزر کر دوسرے مرحلے میں قدم رکھنے کو تھی۔ دوسرے مرحلے سے میری مراد یہ ہے کہ اب وقت آ گیا تھا کہ آپ مکہ کی ناموافق سرزمین کو چھوڑ کر مدینے کی طرف منتقل ہو جائیں جہاں آپ کی کامیابی کے لیے زمین تیار تھی۔ اور اسلام کی تحریک ایک اسٹیٹ میں تبدیل ہونے کو تھی، اس لیے اس اہم موقع پر ایک نیا پروانۂ تقرر اور نئی ہدایات دینے کے لیے بادشاہِ کائنات نے آپ ﷺ کو اپنے حضور میں طلب فرمایا۔ اسی پیشی وحضوری کا نام معراج ہے۔
>
> ''چودہ اصول جو معراج میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیئے گئے ان کی حیثیت صرف اخلاقی تعلیمات ہی کی نہ تھی، دراصل یہ اسلام

کا مینی فیسٹو (Manifesto) تھا، اور وہ پروگرام تھا جس پر آپ ﷺ کو آنے والے زمانے میں سوسائٹی کی تعمیر کرنی تھی۔ یہ ہدایات اس وقت دی گئیں جب آپ کی تحریک عنقریب تبلیغ کے مرحلے سے گزر کر حکومت اور سیاسی اقتدار کے مرحلے میں قدم رکھنے والی تھی، لہٰذا اس دور کے شروع ہونے سے پہلے بتا دیا گیا کہ خدا کا پیغمبر کن اصولوں پر تمدن کا نظام قائم کرے گا۔ اسی لیے معراج میں یہ چودہ نکات مقرر کرنے کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے تمام پیروانِ اسلام کے لیے پانچ وقت کی نماز فرض کی تا کہ جو لوگ اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اٹھیں، ان میں اخلاقی انضباط پیدا ہو اور وہ خدا سے غافل نہ ہونے پائیں۔''

جب دین کی سیاسی تعبیر میں پیغمبر لیڈر اور دین تحریک بن گیا، تو تمام دین کا مفہوم ہی تبدیل ہو کر رہ گیا، کیونکہ پیغمبر اور لیڈر یا ریفارمر میں مندرجہ ذیل فرق بیان کیے گئے ہیں:

(1) ایک ریفارمر اور لیڈر کی پرورش اور تربیت عام انسانوں کی طرح ہوتی ہے، ان ہی کی طرح وہ تعلیم و تربیت حاصل کرتا ہے۔ ان ہی کی طرح اس کی زندگی میں اتار چڑھاؤ آتے ہیں، پھر وہ اپنی سعی و محنت اور متواتر جدوجہد اور اس کے ساتھ اپنی فطری صلاحیت اور دل سوزی کی بنا پر قوم یا ملک میں کوئی سیاسی، اجتماعی، اقتصادی، معاشرتی اور تعلیمی انقلاب برپا کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی فراست طبعی، خلوص و دیانت اور ایثار و نیک نیتی کی بنا پر قوم کی نگاہ میں محبوب ہو جاتا ہے اور قوم اس کو اپنا ریفارمر اور لیڈر تسلیم کر لیتی ہے، لیکن انبیاء کی حالت ایسی نہیں ہوتی۔ اول تو ان کی تعلیم و تربیت ہی صفت اجتباء اور اصطفاء کے تحت ہوتی ہے کیونکہ آگے چل کر ان کو ایک بہت بڑی ذمہ داری کو اٹھانا ہوتا ہے جو کہ لیڈر کی ذمہ داری سے بہت بھاری ہوتی ہے۔ پھر ان کے ہر قول و فعل کی قدرت خود نگرانی کرتی ہے حتیٰ کہ ان کی غذا، قوت شنوائی، قوت بینائی سب کو صفت عصمت کے تحت معصوم رکھا جاتا ہے۔ پھر وہ لیڈروں کی طرح قوم کے کہنے پر

نبی نہیں بنتے بلکہ وہ ایک مناسب عمر پر جو کہ اکثر چالیس برس ہوتی ہے خود اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ رب العزت کی طرف سے نبی اور رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔ ہمیں نبی ماننے پر تمہاری دنیوی اور اخروی زندگی کی بہتری اور اصلاح کا دارومدار ہے۔ ہم اس بات پر مامور ہیں کہ تم سے اپنی نبوت و رسالت کا اقرار کروائیں، اور تم اس بات پر مامور ہو کہ ہمیں نبی مانو، ہمارے احکام پر عمل کرو اور دنیا اور آخرت کے عذاب سے بچ جاؤ۔ غرضیکہ نبی اور رسول نہ از خود بنتے ہیں اور نہ قوم ان کو نبی اور رسول بناتی ہے بلکہ حق تعالیٰ براہِ راست ان کو رسول بناتا ہے۔

(2) لیڈر اپنی تحریکوں اور پارٹیوں کو وقتی مصلحتوں اور سیاسی حکمت عملیوں کے تحت چلاتے ہیں۔ وہ اپنی ذہانت اور صواب دید سے تحریک کے مختلف گوشوں میں ہوا کا رخ دیکھ کر ردوبدل کرتے رہتے ہیں۔ نہ ان کے لیے بعض حدود و قیود کی پابندیاں ہوتی ہیں اور نہ ہی پیروی کے لیے ان کے سامنے کوئی اسوہ ہوتا ہے۔ وہ خود ہی کوزہ اور خود ہی کوزہ گر ہوتے ہیں۔ اگر عوام کو بھڑکانے کے لیے ضرورت محسوس کریں گے تو اپنی الیکشنی سرگرمیوں کو بھی بدر و حنین کے غزوہ سے تعبیر کریں گے اور اس جہاد سے الگ رہنے والوں کو مرتد اور مردود ٹھہرائیں گے۔ اور ہوا کا رخ خلاف دیکھیں گے تو یہ بدر و حنین کے مجاہدین اس طرح بلوں میں جا گھسیں گے جس طرح بلی کو دیکھ کر چوہے بلوں میں جا گھستے ہیں۔ اگر موسم سازگار پائیں گے تو گلے پھاڑ پھاڑ کر اعلان کریں گے کہ وقت آ گیا ہے کہ کرسیوں والے اپنے اقتدار کی کرسیاں ان کے لیے خالی کر دیں، لیکن اگر شومیٔ قسمت سے اثنائے تقریر ہی میں موسم بدلتا نظر آئے تو زورِ تقریر کے جھاگ خشک ہونے سے پہلے ہی اپنے مجاہدین کو ہدایات دیں گے کہ اپنی وردیاں پھینک دو، اپنی تلواریں توڑ دو، اپنے بورڈ اتار دو، اپنے اعلانوں کو گھس گھس کر مٹا دو، اپنے نعروں اور ناموں پر سیاہیاں پھیر دو اور اپنے گھروں کے دروازے بند کر لو۔

لیکن اس کے برعکس انبیاء علیہم السلام کے لیے خود حق تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود و قیود ہوتے ہیں۔ وہ حق تعالیٰ کی وحی کی روشنی میں چلتے ہیں۔ ان کی جدوجہد کو یہ افتاد کبھی نہیں پیش آتی کہ وہ اٹھیں تو آندھی کی طرح اور بیٹھ جائیں بلبلے کی طرح۔ وہ طوفانوں

کے زور کے ساتھ بھی چلیں گے تو اس میں بھی نسیم صبح کی خوش ادائی اور بادِ بہاری کی عطر بیزی اور مشک افشانی ہوگی۔ بجلیاں آئیں گی لیکن وہ بھی ان کو اپنے راستہ سے نہیں روک سکیں گی۔ وہ زمانے کی ہوا کا رخ دیکھ کر نہیں چلیں گے بلکہ زمانے کو اپنے مطابق چلانے کی کوشش کریں گے، اور اس کوشش میں وہ اکثر کامیاب ہوتے ہیں۔

(3) لیڈروں کا مقصد کامیابی ہوتا ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے اگر برے سے برا طریقہ بھی ان کو اختیار کرنا پڑے تو وہ اس سے بھی نہیں چوکتے، لیکن انبیاء کا مقصد کامیابی نہیں ہوتا بلکہ اللہ کی رضا ان کا مقصد ہوتا ہے خواہ ساری زندگی کے وعظ و نصیحت کے بعد ایک متنفس بھی ان پر ایمان نہ لائے، لیکن لوگوں کو ایمان کے راستہ پر لانے کے لیے وہ کبھی بھی ایسا طریقہ اختیار نہیں کرتے جو حق تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے کے خلاف ہو یا جسے حق تعالیٰ شانہ ناپسند فرماتے ہوں۔ نہ ہی انہوں نے کبھی اس بات کی پروا کی ہے کہ دین کی تبلیغ حالات و مصالح کے مطابق ہے یا نہیں، اور لوگ اس کو رد کریں گے یا قبول کریں گے۔ اگر مصلحت کے پرستاروں کی طرف سے کبھی یہ اصرار کیا گیا کہ فلاں بات میں اگر یہ ترمیم و اصلاح کر دی جائے تو وہ پورے دین کو بخوشی قبول کر لیں گے، تو انہوں نے صاف کہہ دیا کہ ہم اپنی جانب سے اس میں کسی ردّ و بدل کے مجاز نہیں ہیں۔ جس کا جی چاہے اس کو قبول کرے جس کا جی نہ چاہے اس کو ردّ کر دے، بلکہ اس دین کو جوان پر اتارا گیا ہے، بغیر کسی کمی بیشی، بغیر کسی دخل و تصرف اور بغیر کسی ردّ و بدل کے پوری وضاحت و صراحت کے ساتھ خلق خدا کو پہنچا دیتے ہیں، اور اس طرح پہنچاتے ہیں کہ نہ اس کے مزاج میں کوئی تغیر پیدا ہونے دیتے ہیں اور نہ ہی اس کے مواد اور ترتیب میں کوئی تبدیلی ہونے دیتے ہیں۔ وہ اللہ کے دین کے امین ہوتے ہیں نہ کہ موجد اور مصنف۔ اس وجہ سے ہر طرح کے حالات میں وہ اپنی ذمہ داری صرف یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے پیغام کو لوگوں تک پہنچائیں۔

(4) پھر وہ لیڈروں کی طرح صرف گفتار ہی کے غازی نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنے اصولوں، اپنے دعاوی اور اپنے نظریات کے عملی مظہر ہوتے ہیں۔ ان کے دل و زبان، قول و عمل اور خلوت و جلوت میں مطابقت ہوتی ہے۔ ان کی ایک ایک ادا اسی دین کی

شہادت دیتی ہے جس کے وہ داعی بن کر آتے ہیں۔ ان کی زندگی کی کتاب اور ان کی دعوت کی کتاب میں ذرہ برابر فرق نہیں ہوتا۔ وہ جس شی کو دوسروں سے روکتے ہیں اس سے پوری شدت کے ساتھ خود پرہیز کرتے ہیں بلکہ اس کی پرچھائیں بھی اپنے پر نہیں پڑنے دیتے۔ جس چیز کا دوسروں کو حکم دیتے ہیں اس پر خود پوری قوت اور عزیمت کے ساتھ عمل کرتے ہیں بلکہ جس چیز کی وہ دعوت دیتے ہیں۔ اگر دوسروں سے اس پر پاؤ سیر عمل کا مطالبہ کرتے ہیں تو خود اس پر سیر بھر عمل کرتے ہیں۔

(5) لیڈر صرف اپنے اعتماد پر چلتے اور چلاتے ہیں۔ اس وجہ سے اگرچہ وہ اپنی ذہانت کی دوربین سے بیس (20) سال کی مسافت تک مستقبل کے پردوں میں جھانک کر دیکھ لیتے ہیں، لیکن حق تعالیٰ کی وحی کی روشنی سے محروم ہونے کی وجہ سے جب وہ ٹھوکر کھاتے ہیں تو بسا اوقات اپنی ناک کے نیچے کے پتھر سے ٹھوکر کھا جاتے ہیں، اور جب گرتے ہیں تو ان کو سنبھلنا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ انبیاء علیہم السلام کا معاملہ اس سے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ اول تو وہ اپنی ذہانت وفراست کی دوربین سے مستقبل کے پردوں میں جھانک کر دیکھنے پر کلی اعتماد نہیں کرتے بلکہ حق تعالیٰ کی وحی کی روشنی میں چلتے ہیں، لیکن اگر کبھی اپنی کسی اجتہادی لغزش کے سبب گرتے بھی ہیں تو اپنے رب کے دروازے پر ہی گرتے ہیں اور "ربنا ظلمنا انفسنا" کی دعائیں مانگتے ہیں، اور ان کا رب ان کو اٹھاتا اور سنبھالتا ہے۔ (دین میں حکمت عملی کا مقام)

جب دین کی سیاسی تعبیر کی جائے تو پھر دین کا ہر جزو سیاسی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ زندگی اور کائنات کے تصور پر اسی طرح سیاسی رنگ چھا جاتا ہے جیسے کارل مارکس کی تشریح میں تمام چیزوں پر معاشی رنگ چھایا ہوا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نصب العین نے سیاسی نوعیت اختیار کر لی، نبی لیڈر بن گیا، ان کی بعثت میں سیاسی مقاصد کارفرما نظر آنے لگتے ہیں، دین تحریک اور سیاسی ڈھانچہ میں ڈھل جاتا ہے، امت مسلمہ اپنی اعلیٰ ترین حیثیت میں ایک قسم کی سیاسی پارٹی ہو کر رہ جاتی ہے۔ عبادات بھی سیاست کا ضمیمہ قرار پاتی ہیں، تقویٰ اور احسان سیاسی قالب میں ڈھل جاتے ہیں اور شہادت حق سیاسی شہادت کی شکل اختیار کر لیتی ہے، معراج ایک سیاسی سفر بن جاتا ہے، غرض سارا دین

ایسے اجزاء کا مجموعہ بن جاتا ہے جس کی معنویت سیاست کے حوالے کے بغیر سمجھی نہ جا سکے۔ پھر معاملہ یہاں تک بڑھ جاتا ہے کہ قرآن کی بنیادی اصطلاحوں میں بھی تغیر و تبدل کرنا پڑتا ہے، اور یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ان اصطلاحوں کو امت کئی صدیوں سے سمجھ ہی نہیں سکی، اور اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ایک تو امت میں یہاں تک کہ عربوں میں بھی عربیت کے ذوق کی کمی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلام کی سوسائٹی میں جو لوگ پیدا ہوئے ان کے لیے ان اصطلاحوں کے وہ معنی باقی نہ رہے تھے جو نزول قرآن کے وقت غیر مسلم سوسائٹی میں رائج تھے۔ انہیں دونوں وجوہ سے دور اخیر کی کتب لغت وتفسیر میں اکثر قرآنی الفاظ کی تشریح اصل معنی لغوی کے بجائے ان معانی سے کی جانے لگی جو بعد کے مسلمان سمجھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کا اصطلاحوں کے مفہوم پر پردہ پڑ جانے کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ اس کی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہو گئی اور اسلام قبول کرنے کے باوجود لوگوں کے عقائد و اعمال میں جو نقائص نظر آ رہے ہیں ان کا ایک بڑا سبب یہی ہے۔

اسلام میں قرون اولیٰ سے لے کر موجودہ صدی تک کسی عالم نے دین کی اس طرح کی سیاسی تعبیر نہیں کی جواب بعض لوگ کرتے ہیں۔ اسلام میں سیاست ضرور ہے لیکن اسلام کی ہر بات میں سیاست نہیں ہے۔ بلکہ سیاست کا لفظ ہی اسلام نے دنیا کو دیا اور سیاست انبیاء علیہم السلام کا کام تھا۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

﴿کانت بنو اسرائیل تسوسهم الانبیاء، کلّما هلک نبی خلفه نبی، وانّه لانبی بعدی، وسیکون خلفاء فیکثرون، قالوا: ماتأمرنا،قال: فوابیعة الاول فالاول﴾

(بخاری: جلد ا ص ۴۹۰، مسلم: جلد ۲ ص ۱۲۶، مسند احمد: جلد ۲ ص ۲۹۷)

یعنی بنی اسرائیل کی سیاست اس کے نبی کیا کرتے تھے۔ جب کسی نبی کی وفات ہو جاتی تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہو جاتا، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں، البتہ خلفاء ہوں گے اور بہت ہوں گے۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا: ''آپ ان کے بارہ میں کیا حکم فرماتے

ہیں؟'' ارشاد فرمایا: ''یکے بعد دیگرے ہر بیعت پر وفا کرو۔''

اس حدیث سے پتہ چلا کہ سیاست انبیائے کرام علیہم السلام کا کام ہے۔ آج کل ہم نے سیاست کو خیر باد کہہ کر اس کو چوروں اور ڈاکوؤں کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ یہ سنت انبیاء کے خلاف ہے۔ انہوں چالاکی اور چابک دستی سے اہل سیاست اور اہل دین کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر کے سیاست کو دین سے الگ کر دیا ہے اور اب یہ سیاست چنگیزی بن کر رہ گئی ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ سیاست ہے کیا؟ سیاست کے لفظی معنی دیکھ بھال یا نگرانی کے ہیں۔ لفظ ''سائیس'' اسی لفظ سیاست سے ماخوذ ہے جس کے معنی نگران اور دیکھ بھال کرنے والے کے ہیں۔ لیکن سیاست کے اصطلاحی معنی ملکی دیکھ بھال اور ملکی نظام کے لیے تدابیر وغیرہ پر غور وخوض کرنے اور اس کے لیے قوانین وضع کرنے کے ہیں۔ حکمت و فلسفہ میں تہذیب اخلاق، تدبیر منزل کی طرح سیاست مدن بھی حکمت عملیہ کی ایک قسم کا نام ہے جس میں بہت سے انسانوں کی بود وباش اور ان کی ضروریات زندگی اور مصالح اور کسی ایک شہر یا ملک کی دیکھ بھال اور اس کے نظام سے بحث کی گئی ہو۔ اسی تدابیر ملک داری اور سیاست مدنیہ کو عرف عام میں سیاست کہتے ہیں۔ اس سیاست کے دو حصے ہیں ایک سیاست کا عملی حصہ اور اس کے احکام شرعیہ ہیں۔ سیاست کا یہ حصہ حدیث و فقہ اور قرآن و سیر میں مذکور ہے۔ سیاست کے اس حصہ سے ہر عالم کا واقف اور آشنا ہونا ضروری ہے اور اس حصہ کو علماء نے درس و تدریس اور تعلیم و تعلم سے آج تک باقی رکھا ہے۔ دوسرا حصہ سیاست عملی کہلاتا ہے یعنی ملک داری کا نظام اور اس کے قائم رکھنے کی تجرباتی تدابیر جو ہر زمانہ میں حالات و واقعات وغیرہ کے تغیر و تبدیل سے بدلتی رہتی ہیں۔

تجربہ کا دار ومدار واقفیت اور حالات و واقعات آنے پر ہے، اس میں تجربہ کے لحاظ سے علماء کے درجات میں اختلاف ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ کسی عالم کو ایسے حالات اور واقعات سے دلچسپی اور واسطہ ہونے، نہ ہونے یا کم ہونے کی وجہ سے اس کا تجربہ کم ہو اور دوسرے کو حالات و واقعات سے زیادہ وابستگی اور دلچسپی ہونے سے زیادہ تجربہ ہو۔ تجربہ کی یہ کمی بیشی حالات و واقعات کی واقفیت کی کمی بیشی پر مبنی ہوتی ہے۔ اور یہ بھی

ضروری نہیں کہ ہر عالم کو حالات وواقعات سے آشنائی اور ان کا تجربہ ہو، لیکن چونکہ دنیا کی کوئی تجویز وتدبیر اور کسی شخص کا کوئی عمل اور اس کی رائے ایسی نہیں ہوسکتی جو شریعت کی حدود سے باہر اور مذہب کی گرفت سے آزاد ہو اور جس کا حکم شرعی جائز یا ناجائز ہونا شریعت اسلامی سے معلوم نہ کیا جاسکتا ہو، اس لیے ایک عالم کے لیے ہر تجویز وتدبیر اور ہر عمل سے متعلق شرعی حکم کا علم رکھنا اور اس سے آشنائی حاصل کرنا از حد ضروری ہے، اور شریعت کی ان تدابیر اور تجاویز پر عمل کرنے والوں کے لیے بھی ضروری قرار دیا گیا کہ وہ شریعت کے جاننے والوں یعنی علماء کی طرف رجوع کریں، لہٰذا امور مملکت کے بارے میں ہر تدبیر اور تجویز پر عمل کرنے سے قبل یہ معلوم کرنا ضروری قرار دیا گیا کہ یہ معلوم کیا جائے کہ شریعت اسلامی میں اس کا کیا حکم ہے اور اس پر حکم کرنا جائز ہے یا ہیں؟ اس کی مثال ایسے ہے کہ ایک ہے علم طب کا جاننا، لیکن علم طب کو کتابوں سے جاننے کے باوجود جب کوئی شخص کسی تجربہ کار طبیب کے پاس جاکر اس کے مطب میں کام نہیں کرے گا اور ان طبی تدابیر پر عمل نہیں کرے گا جن کا علم اس نے کتابوں سے حاصل کیا ہے، اس وقت تک فن طب کا عالم ہونے کے باوجود وہ تجربہ کار طبیب نہیں کہلاسکتا، لیکن ان طبی تدابیر کے متعلق جواز اور عدم جواز شرعی کی تحقیق کرنا عالم شریعت کا فرض منصبی ہے اور ایک طبیب کے ذمہ لازم ہے کہ وہ ان تدابیر پر غور کرنے سے قبل ان کے جواز اور عدم جواز کو کسی ماہر شریعت سے معلوم کرے۔

نظام حکومت کو قائم رکھنے والی اور سیاسی تدابیر میں تجربہ کاروں کی جماعت کا ایک کام تو یہ ہے کہ وہ اپنی سیاسی بصیرت اور تجربات کے پیش نظر ایسی تدابیر وتجاویز پر غور وفکر کرتی رہے جو اس نظام کے لیے مفید ہوں۔ اور دوسرا کام اس کا یہ ہے کہ غور وفکر کے بعد جو تجاویز اس کو قابل عمل اور مفید معلوم ہوں، ان کے بارے میں علمائے شریعت سے شرعی احکام معلوم کرکے اس کے مطابق عمل پیرا ہوں۔

عام حالات میں تو علماء کا اصل کام ملکی سیاسیات کی ان تدابیر اور تجاویز کے شرعی احکام اور ان کے جواز اور عدم جواز کی تحقیق کرکے ان کے بارے میں یہ بتانا ہے کہ فلاں تدبیر اور تجویز شریعت کی رو سے جائز اور قابل عمل ہے اور فلاں شرعاً ناجائز اور ناقابل عمل

ہے۔ معلوم ہوا کہ ان دونوں جماعتوں کا دائرہ عمل الگ الگ اور فرائض بھی جدا جدا ہیں۔ ایک جماعت کا کام جائز تدابیر کو بروئے کار لانا اور ملک میں ان کو عملی طور پر نافذ کرنا ہے اور دوسری جماعت علماء کا اصل کام ان تدابیر کے بارے میں شرعی احکام بتلانا ہے۔ لیکن اگر کسی وقت کوئی جماعت اہل سیاست کی ایسی موجود نہ ہو جو علماء سے احکام شرعیہ معلوم کر کے عمل کیا کرے، اور جو سیاسی جماعت موجود ہو وہ ملکی نظام کی تدابیر پر عمل پیرا ہونے میں حدود شریعت سے تجاوز کر جاتی ہو تو پھر ایسے وقت میں علماء کرام کے ذمہ یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ یا تو ایک ایسی جماعت بنائیں جو احکام شریعت کے علم میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ عملی طور پر بھی سیاسیات اور امور مملکت کی تدابیر کا تجربہ رکھتی ہو، اور وہ جماعت علمی اور عملی طور پر سیاست کی جامع ہو، یا پھر موجود جماعت میں سے کسی جماعت کو اس پر آمادہ کریں کہ وہ علمائے شریعت سے احکام دریافت کر کے ان کی ہدایت پر عمل کرنے کی پابندی کرے، اور ظاہر ہے کہ ایسی جامع جماعت کا انتظام کرنے کی شرط یہ ہے کہ اس پر قدرت واستطاعت حاصل ہو، کیونکہ انسان احکام شرعیہ اور ادائے فرض کا اپنی استطاعت وقدرت کے موافق ہی مکلّف ہوتا ہے۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ علماء کا اصل وظیفہ اور فرض منصبی احکام شرعیہ کی تحقیق و تنقیح کرنا ہے نہ کہ مسند حکومت پر بیٹھ کر ملکی انتظام و انصرام کرنا، اس لیے علماء کی جو جماعت احکام شرعیہ کی تحقیق و تنقیح میں مصروف و مشغول ہوگی، اور اس وجہ سے وہ ان امور سیاسیہ میں مشغول نہیں ہے تو وہ جماعت علماء اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں مصروف ہے کیونکہ از روئے شریعت نہ تو وہ کسی کوتاہی عمل کی مرتکب ہو رہی ہے اور نہ ہی وہ عملی طور پر کسی نقص میں مبتلا ہے۔ اور جو جماعت ملکی سیاست میں عملی طور پر حصہ لینے والی جماعت علماء اور اس کی ملکی اور سیاسی خدمات کو دوسری جماعت سے جو عملی سیاست میں حصہ نہیں لے رہی، کامل تر سمجھا جاتا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔ کیونکہ علمائے شریعت کا کام حکومت کرنا نہیں بلکہ ان کا اصل کام دین کے عقائد و اعمال اور اخلاق و معاملات وغیرہ کی حفاظت و تبلیغ کا فریضہ انجام دینا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ لادینی سیاست کے اثرات سے شعبۂ سیاست کو محفوظ رکھنے کی کوشش

کرنا بھی ہے۔ اگر کسی وقت اس جماعت کو ملکی اقتدار حاصل ہو جائے یا نظم مملکت میں اثر ورسوخ حاصل ہو جائے تو اس کو بھی دین کے شعبہ عقائد اور اعمال اور اخلاق کی تبلیغ و اشاعت کا ذریعہ بنائیں، اور اس اقتدار کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ازالہ کا وسیلہ تصور کریں کیونکہ دین کا شعبہ سیاست اپنی ذات میں خود مطلوب و مقصود نہیں ہے بلکہ دین کے دوسرے شعبوں عقائد وعبادات اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قائم کرنے کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے مطلوب ہے۔

اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ کے اوراق سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ علمائے کرام نے ہر زمانہ میں ملکی سیاست میں کسی نہ کسی صورت میں حصہ لیا اور اسلام کے دوسرے شعبوں کی طرح سیاست کے اس شعبہ میں بھی لوگوں کر رہبری اور رہنمائی کی، لادینی سیاست کے غلط رجحانات اور گندی سیاست کی غلاظتوں سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کوششیں علمائے اسلام کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ چنانچہ امام ابو حنیفہؒ، امام احمد بن حنبلؒ، علامہ ابن تیمیہؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ وغیرہ علماء نے اپنے اپنے زمانہ میں جس طرح اپنے علم و فضل سے امت کی راہ نمائی فرمائی اسی طرح ان حضرات نے امور سیاسیہ اور ملکی نظام حکومت میں بھی مسلمانوں کی رہبری کی، لیکن ہر زمانہ میں ان کی راہ نمائی اور رہبری کا طریقہ مختلف رہا جیسا کہ آئندہ صفحات میں بتایا گیا ہے۔

بعض اکابر علماء اسلام نے کاروبار حکومت اور سیاست میں عملی طور پر کوئی حصہ نہیں لیا اور نہ ہی دین کی سیاسی تعبیر کی بلکہ صاحب اقتدار امراء اور سلاطین اور وہ لوگ جن کے ہاتھ میں زمام اختیار تھی، ان کی اصلاح کی اور مختلف معاملات میں ان کی علمی رہنمائی فرمائی اور اس طریقہ سے ملک کی سیاست کا رخ لا دینی سیاست سے دینی سیاست کی طرف موڑ دیا۔ جیسے کہ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ نے صرف مکتوبات سے اکبر کے ملحدانہ اور بے دین خیالات سے ملک کی فضاء کو صاف کر دیا۔ اسی طرح حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اپنے پیر و مرشد

حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی زیرِ کمان 1857ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا، لیکن اس جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد تمام زندگی علم وعمل کی شمع روشن کیے رکھی اور جب تک زندہ رہے قرآن وسنت کی روشنی پھیلانے اور اپنی تحریر وتقریر سے ظاہری اور باطنی افاضہ کے مختلف طریقوں سے دنیائے اسلام کو منور کیے رکھا، لیکن دونوں حضرات کا کسی سیاسی تحریک میں شرکت کرنا ثابت نہیں ہے حالانکہ 1885ء میں ملکی حقوق طلبی کے لیے کانگرس کے نام سے ملک میں ایک سیاسی جماعت قائم ہو چکی تھی، حضرت گنگوہیؒ نے اس میں عملی شرکت تو نہیں فرمائی البتہ اس وقت کے حالات کے تقاضا کے تحت اس میں شرکت کا فتویٰ صادر فرما کر لوگوں کی علمی رہنمائی فرمائی۔

ان دونوں حضرات کے بعد انہیں کے تربیت یافتہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمود الحسن قدس سرہ نے بھی اپنی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ دینی تعلیم وتربیت اور ارشاد وہدایت میں صرف کیا اور مسلمانوں کو اپنے ظاہری اور باطنی فیوض وبرکات سے بہرہ ور فرمایا، لیکن پھر ایک وقت آیا کہ انہوں نے سیاسیات حاضرہ میں عملی طور پر موقع اور وقت کی مناسبت سے اپنے اجتہاد اور دینی بصیرت کے تحت بھرپور حصہ لیا اور دین کے اس شعبہ کو بھی اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں سے منور فرمایا، اور اتنے اخلاص اور دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اس شعبہ میں حصہ لیا جس کی نظیر کم ہی ملتی ہے۔ قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں اور جلاء وطنی کے سمندر سے بھی گزرے، لیکن ایسے گزرے کہ سمندر بھی پایاب ہو گیا۔ اور دنیا نے دیکھا اور سیاسی زعماء انگشت بدندان رہ گئے کہ ایک گوشہ نشین عالم اور زاہد شب زندہ دار نے راحت وآرام، درس وتدریس، تعلیم وتربیت، تزکیۂ نفس، تفسیر وافتاء اور تصنیف وتالیف کی مقدس زندگی کو خیرباد کہہ کر پہلے تو سفر حجاز کیا اور پھر پانچ سال تک جلاء وطنی اور قید وبند صعوبتیں اس طریقہ سے برداشت کیں کہ انگریزی استبداد کو ہلا کر رکھ دیا۔ اور اس ساری سیاسی زندگی میں حدود شریعت کو بھی قائم رکھا۔ تحریک ترک موالات کے زمانہ میں جب بڑے بڑے لیڈر جذبات کی رو میں بہہ کر اپنے عمل میں حدود شریعت سے تجاوز کر رہے تھے، اس وقت بھی حضرت شیخ الہندؒ شریعت کے کسی حکم میں کسی حالت میں بھی کسی طرح کی نرمی اور مداہنت کے لیے تیار نہ

تھے جیسا کہ کتاب میں بتایا گیا ہے۔ آپ کے نزدیک ''احکام خدا کی امانت'' ہیں لہٰذا ان میں کسی قسم کی خیانت نہیں ہونی چاہیے۔

مختصر یہ کہ اس دور میں بھی علماء نے ہر دور کی طرح سیاست میں حصہ لیا۔ اور تحریک پاکستان میں بھی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ اور آپ کے متوسلین نے جن میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ، مولانا احتشام الحق تھانویؒ اور دوسرے حضرات قائداعظم کی اس یقین دہانی پر کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہوگی' اس میں کتاب وسنت کا قانون نافذ ہوگا، اپنی علمی اور تصنیفی زندگی کو چھوڑ کر میدان سیاست میں آئے۔ مسلم لیگ کی بھرپور مدد کی۔ پورے ہندوستان میں مسلم لیگ کی کامیابی کے لیے دورے کیے، سلہٹ اور سرحد کے ریفرنڈم میں مسلم لیگ کو کامیاب کرایا، لیکن پاکستان بننے کے بعد مسلم لیگ کے وڈیرے ان تمام وعدوں سے مکر گئے جو انہوں نے ان علماء اور ہندوستان کے مسلمانوں سے کیے تھے، اور یہ سب علماء اپنی پوری زندگی اسلامی نظام کے نفاذ کی جدوجہد میں صرف کر کے اس دنیا سے چلے گئے، لیکن وہ پاکستان میں اسلامی نظام کی بہار سے لطف اندوز نہ ہو سکے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

اس کتاب میں علمائے اسلام کی سیاسی جدوجہد کی ایک طویل داستان کو قلم بند کیا گیا ہے اور یہ سارا مواد انہی کتابوں سے لیا گیا ہے جو تاریخ سیاست کے ماہرین نے لکھی ہیں۔ اب یہ قارئین کا کام ہے کہ وہ یہ فیصلہ کریں کہ علماء اپنی سیاسی کاوشوں میں کہاں تک کامیاب ہوئے۔

محتاج دعا: (حکیم) محمود احمد ظفر۔ سیالکوٹ

29 رمضان المبارک 1426ھ

3 نومبر 2005ء

فون نمبر: 0300-6106968



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علماء اور سیاست

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے انتقال کے بعد دین کے مختلف شعبے مختلف لوگوں میں تقسیم ہو گئے۔ خلفائے راشدین کے عہد میں صحابہ کرامؓ کی ایک مجلس شوریٰ تھی جس میں ہر اہم کام کا مشورہ ہوتا تھا، لیکن خلفائے راشدین کے بعد جب نظام خلافت میں ملوکیت نے دراڑیں ڈالنا شروع کر دیں اور امور سیاست چلانے والے خلفاء نے اپنی مرضی سے امور خلافت کو چلانا شروع کیا تو علمائے وقت نے انہیں ہر معاملہ میں اپنی مرضی کرنے کی اجازت نہیں دی بلکہ ہر ایسی بات پر انہیں روکتے اور ٹوکتے رہے جہاں ذرا بھی کتاب وسنت کی مخالفت ہوتی نظر آتی۔ وہ راہ حق کے مجاہد سپاہ کی تیغ بازی کے مقابلہ میں نگاہ کی تیغ بازی سے کام لیتے رہے۔ یہ علماء اسی معاشرہ میں پرورش پاتے اور بچپن سے عہد شعور تک انہی خیالات واعتقادات اور رسوم ورواج کو دیکھتے اور سنتے رہے جن کی فضا ان کے چاروں طرف محیط تھی۔ کانوں میں انہی کی صدا آتی، ان کی آنکھیں اسی ضلالت وفساد کو دیکھتیں، لیکن چشم آفتاب نے بارہا دیکھا کہ جونہی انہوں نے ایوان اقتدار سے کوئی کام کتاب وسنت کے خلاف ہوتے دیکھا تو وہ شاہراہ عام سے الگ ہو کر اقتدار کے ایوانوں میں اپنے کلمۂ حق سے ایک زلزلہ سا پیدا کر دیتے۔ فیضان ہدایت الٰہی کی ایک مخفی قوت کا سرچشمہ ان کے سینے کے اندر ابلنے لگتا اور وہ باوجود تمام ملک اور زمانے کو اپنا مخالف دیکھنے کے تن تنہا اٹھ کھڑا ہوتے کہ رسم ورواج، معتقدات عام، دولت وثروت اور حکومت وسطنت کے مقابلہ میں حق کی تائید ونصرت کے لیے جہاد کریں۔ چنانچہ ان کی آواز گو ان کے حلق سے نکلتی لیکن چونکہ وہ حق وصداقت کی آواز ہوتی، اس لیے ان کی نہیں بلکہ صوت الٰہی کی صدائے لازوال ہوتی اور

وہ راہ حق کے مجاہد ہوتے۔ وہ اگرچہ دیکھنے میں بظاہر بے مایہ وسامان اور حقیر و عاجز انسان نظر آتے لیکن ان کا دل قوت الٰہی اور جبروت ربانی کا مسکن ہوتا پھر جب وہ بولتے تو ان کی آواز میں صدائے حق کی گرج ہوتی اور جب نظر اٹھاتے تو ان کی نگاہوں سے نور الٰہی کے شعلے نکلتے۔ وہ خدا کا ہاتھ اور پھر اس کی فوج ہوتے۔ وہ بے نوا فقیر بڑے بڑے بادشاہوں کے تخت وتاج کو الٹ دیتے اور دنیا کی بڑی بڑی قوتوں کے تسلط سے نکال کر لاکھوں دلوں کو اپنے آگے سر بسجود کرا لیتے۔

امام ابوحنیفہؒ درس وتدریس کے دوران میں علانیہ حکومت کے ظالمانہ اقدامات کی مخالفت کرتے اور نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ آپ خلیفہ وقت منصور عباسی کے بعض فوجی افسروں کو محمد نفس زکیہ کے خلاف لڑنے سے روک دیا تھا۔ چنانچہ روایات میں مذکور ہے کہ منصور عباسی کا ایک سپہ سالار حسن بن قحطبہ ایک دفعہ امام ابوحنیفہؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر کہنے لگا: ''میرا جو کام ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں، کیا اس سے توبہ ممکن ہے؟''
امام صاحبؒ نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ کو معلوم ہو جائے کہ تم اپنے کیے پر نادم اور شرمسار ہو، اور اگر تمہیں اپنی جان کو ہلاک کرنے یا کسی مسلمان کو قتل کرنے میں اختیار دیا جائے تو تم اپنی جان کو ہلاک کرنا گوارا کرلو لیکن کسی مسلمان کا قتل تمہیں پسند نہ ہو، اور اگر اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کرلو کہ آئندہ یہ کام نہیں کروں گا تو ان شرطوں کا پورا کرنا ہی تمہاری توبہ ہے۔''

حسن بن قحطبہ نے کہا مجھے منظور ہے۔ میں اپنے اللہ سے اس بات کا عہد کرتا ہوں کہ میں کسی مسلمان کو کبھی قتل نہیں کروں گا۔'' اسی اثناء میں ابراہیم بن عبداللہ حسنی علوی کے خروج کا واقعہ پیش آیا۔ منصور نے حسن کو ابراہیم سے لڑنے کا حکم دیا۔ حسن نے امام سے یہ واقعہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ تمہاری توبہ کا وقت آچکا ہے۔ اگر تم نے اپنے عہد کو پورا کیا تو تم تائب ٹھہرو گے۔ ورنہ پہلے اور پچھلے سب گناہوں میں ماخوذ ہو گے۔ اس نے توبہ کی کوشش کی اور جان ہتھیلی پر رکھ کر وہ منصور کے دربار میں آکر کہنے لگا: ''میں تو اس طرف کا رخ بھی نہیں کروں گا۔ اگر تمہارے احکام کی تعمیل اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا سبب ہے تو میں یہ سعادت بہت حاصل کر چکا، اور اگر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے تو مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ میں پہلے ہی بہت سیاہ کار ہوں۔'' صاحبان اقتدار کو اپنی

مخالفت کسی صورت بھی پسند نہیں ہوتی، اس لیے منصور اس کو کیسے پسند کر سکتا تھا۔ اس نے وقتی طور پر تو خاموشی اختیار کی لیکن پھر بھی الفاظ میں ناراضگی کا اظہار ضرور کیا۔ حسن کے بھائی حمید بن قحطبہ نے منصور کی ناراضگی کو دیکھ کر کہا ایک سال سے میرے اس بھائی کے ہوش و حواس بجا نہیں ہیں، میں اس مہم پر جانے کے لیے تیار ہوں، میں اس سے زیادہ آپ کی فضل و عنایت کا استحقاق رکھتا ہوں۔ چنانچہ وہ ابراہیم کی سرکوبی کے لیے چلا گیا۔

اس روایت سے اور اس جیسی دوسری کئی روایات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ علویوں کے بالمقابل خلیفۂ وقت کے اعمال و افعال پر کھلم کھلا تنقید کرتے تھے۔ منصور ان دنوں کوفہ میں اقامت گزین تھا۔ امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرز عمل اس کی متجسس نگاہوں سے کس طرح اوجھل رہ سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے آپ کی وفاداری کو آزمانا چاہا جس کا مناسب وقت بھی آ گیا۔ بغداد ان دنوں زیر تعمیر تھا۔ منصور نے آپ کو قاضی بنانا چاہا مگر آپ راضی نہ ہوئے۔

منصور چاہتا تھا کہ آپ کوئی نہ کوئی منصب ضرور قبول کریں تا کہ آپ کی نیت کھل کر سامنے آ جائے۔ امام ابوحنیفہؒ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ منصور آپ کو قابو میں لانا چاہتا ہے لیکن آپ کو منصور کی آرزو کی تکمیل پسند نہ تھی، چنانچہ جیسا کہ طبری کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے بغداد کی تعمیر کے لیے اینٹیں شمار کرانے کا کام قبول کر لیا۔ چنانچہ طبری کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ

> ”منصور نے آپ کو قاضی بنانا چاہا لیکن آپ نے اس کو قبول نہ کیا۔ اس نے حلف اٹھا لیا کہ وہ امام کو ضرور مجبور کر کے رہے گا۔ ادھر انہوں نے بھی کسی منصب کو قبول نہ کرنے کی قسم کھا لی۔ منصور نے آپ کو بغداد کی تعمیر و اصلاح، اینٹیں بنوانے اور مزدور مقرر کرنے کے کام پر لگا یا۔ آپ نے یہ خدمت قبول فرمالی۔“

ابن کثیرؒ نے ابن جریر کے حوالے ہی سے لکھا ہے کہ منصور نے امام ابوحنیفہؒ کو قضاء و حقوق کا عہدہ تفویض کرنا چاہا۔ آپ نہ مانے۔ منصور نے قسم کھائی کہ وہ یہ کام کر کے رہے گا۔ امام ابوحنیفہ کو پتہ چلا تو انہوں نے ایک چھڑی منگوا کر اینٹیں شمار کرنا شروع

کر دیا تا کہ منصور کی قسم پوری ہو جائے۔" (البدایہ والنہایہ: جلد ۱۰ص ۹۷)

اس طرح امام ابوحنیفہؒ نے منصور کے سب منصوبے خاک میں ملا دیئے۔ غالباً یہ وہی زمانہ تھا جب منصور نے علوی سرداروں کو ابوالعباس سفاح کی عطا کردہ جاگیروں سے محروم کر کے انہیں قید و بند میں ڈال دیا تھا۔

امام ابوحنیفہؒ اپنی نرم پالیسی سے منصور کی تند و تیز نگاہوں سے بچ نکلنے میں کچھ وقت تک تو کامیاب ہو گئے اور وہ بھی اس طریقہ سے کہ ان کے دین و دل میں کوئی فرق بھی نہ آنے پایا۔ گو منصور بھی قدرے اغماض ہی سے کام لے رہا تھا مگر امام صاحبؒ پر اس کی خردہ گیری وقتاً فوقتاً جاری رہتی تھی لیکن وہ سزا دینے میں عجلت سے کام نہ لیتا۔

خطیب نے تاریخ بغداد میں ایک روایت نقل کی ہے کہ "امام ابوحنیفہؒ ابراہیمؒ کی بغاوت کے زمانہ میں علانیہ منصور کی مخالفت کرتے تھے یہاں تک کہ مجھے کہنا پڑا کہ آپ ہمیں پابند سلاسل بنا کر چھوڑیں گے۔ اسی اثناء میں عیسیٰ بن موسیٰ کو منصور کا خط ملا کہ ابوحنیفہؒ کو بغداد بھیج دیں۔ چنانچہ اس نے حکم کی تعمیل کر دی۔ آپ بغداد پہنچ کر صرف پندرہ روز زندہ رہے۔" (تاریخ بغداد: جلد ۱۳ص ۳۳۰)

اس علانیہ تنقید اور منصب حکومت کو قبول نہ کرنے اور دوسری کئی ایک وجوہات جو کہ ذاتی نہیں بلکہ سیاسی تھیں، منصور امام ابوحنیفہؒ سے بغض و عناد رکھنے لگا۔ منصور ایسے واقعات کی ٹوہ میں لگا رہتا جس سے یہ ثابت ہو کہ امام صاحبؒ منصور کی مخالفت کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں منصور کے بعض حاشیہ نشین بھی اسے بھڑکاتے رہتے اور آپ کے اقوال اور فتاویٰ سے نفرت دلاتے رہتے تھے، لیکن آپ کسی کی رضا اور عدم رضا، خوشی اور ناخوشی سے قطع نظر اپنے اقوال و فتاویٰ کو جاری رکھتے تھے۔ ادھر منصور کے بدباطن خواص اور امراء امام صاحبؒ کے خلاف اشتعال انگیزی اور تنفر کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ رکھتے تھے۔

خطیب بغدادی ہی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ منصور نے امام ابوحنیفہؒ کو بلا بھیجا۔ منصور کا حاجب ربیع امام صاحبؒ کا جانی دشمن تھا بولا: "امیر المومنین! ابوحنیفہؒ آپ کے دادا کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ عبداللہ بن عباسؓ فرمایا کرتے تھے کہ اگر حلف اٹھانے کے ایک دو دن بعد انشاء اللہ کہہ لے تو روا ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں

کہ استثناء (یعنی انشاء اللہ) قسم سے متصل ہونا چاہیے۔

امام ابو حنیفہؒ نے یہ سن کر فرمایا: ''امیر المومنین! ربیع کا خیال ہے کہ آپ کی فوج کے لوگ آپ کے حلقۂ بیعت میں داخل نہیں۔'' خلیفہ بولا: ''وہ کیسے؟'' حضرت امام صاحبؒ نے فرمایا: ''وہ یوں کہ آپ کے روبرو حلف اٹھا کر عقد بیعت کر لیں گے اور گھر جا کر ان شاء اللہ کہہ دیں گے، اور اس طرح ان کی قسم باطل ہو جائے گی۔''

منصور یہ سن کر ہنس پڑا اور ربیع سے مخاطب ہو کر بولا: ''ابو حنیفہؒ سے تعرض نہ کیجئے۔'' جب خلیفہ چل دیا تو ربیع نے امام صاحبؒ سے کہا کہ آپ تو میرا خون بہانا چاہتے تھے۔'' آپ نے فرمایا: ''نہیں، یہ کوشش تو آپ نے کی تھی۔ میں نے تو دونوں کی گلوخلاصی کرادی۔'' (تاریخ بغداد: جلد ۱۳ص ۳۶۵)

اس طرح ابو العباس طوسی بھی امام ابو حنیفہؒ کے سخت خلاف تھا اور یہ مخالفت صرف ایوان اقتدار میں تقرب حاصل کرنے کی غرض سے تھی۔ چنانچہ ایک روز امام ابو حنیفہؒ منصور کے یہاں آئے۔ لوگوں کا ازدحام تھا۔ طوسی کہنے لگا: ''آج میں ابو حنیفہؒ کو قتل کر کے چھوڑوں گا۔'' وہ امام صاحبؒ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: ''یہ بتائیے بالفرض امیر المومنین ہم میں سے کسی کو حکم دیں کہ وہ کسی شخص کو قتل کر دے حالانکہ اسے معلوم نہیں کہ یہ حکم کیسا ہے، کیا وہ خلیفہ کے حکم کی تعمیل کر دے؟'' امام صاحبؒ نے فرمایا: ''اچھا یہ بتائیے کہ خلیفہ حق کا حکم دیتے ہیں یا باطل کا؟'' کہنے لگا: ''حق کا۔'' آپ نے فرمایا: ''حق جہاں بھی ہو اس پر عمل کیجئے، زیادہ کرید کی کیا ضرورت؟''

امام ابو حنیفہؒ نے اپنے ایک ہم نشین کو فرمایا: ''اس نے مجھے پابند سلاسل بنانے کا ارادہ کیا تھا مگر خود اس میں پھنس گیا۔'' (تاریخ بغداد: جلد ۱۳ص ۳۶۶)

امام ابو حنیفہؒ نہ صرف خلیفۂ وقت منصور پر تنقید کرتے بلکہ اس کے قاضیوں کے غلط فیصلوں کو بھی اپنی کھلم کھلا تنقید کا نشانہ بناتے کیونکہ آپ یہ سمجھتے تھے کہ قاضیوں کے غلط فیصلے عوام پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اکثر و بیشتر قاضی کا غلط اور ظالمانہ فیصلہ جو کسی شرعی دلیل پر مبنی نہ ہو، عوام الناس کے لیے غلط فتویٰ سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ آپ ایسی تنقید میں حق بجانب تھے کیونکہ قاضی کی غلطی سے جان و مال ضائع ہو جاتے ہیں، حقوق و

حرمات کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی اور ظلم وستم کی پشت پناہی ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ ایک پاگل عورت نے ایک شخص کو زانی والدین کا بیٹا کہا۔ قاضی ابن ابی لیلیٰ نے اس کو مسجد میں کھڑا کر کے دو مرتبہ حد لگائی۔ ایک حد والد کو تہمت زنا لگانے کی اور دوسری حد والدہ کو متہم کرنے کی۔

امام ابو حنیفہؒ کو پتہ چلا تو فرمایا کہ قاضی ابن ابی لیلیٰ نے اس فیصلہ میں چھ غلطیاں کی ہیں۔

1- قاضی صاحب نے مسجد میں حد لگائی جب کہ مسجد میں حد لگانا منع ہے۔

2- اس عورت کو کھڑا کر کے حد لگائی جب کہ عورت کو بٹھا کر حد لگائی جاتی ہے۔

3- والد اور والدہ کی علیحدہ علیحدہ حد لگائی جب کہ اگر کوئی شخص ایک جماعت پر بہتان لگائے تو صرف ایک حد کا مستوجب ہوگا۔

4- بوقت واحد دو حدیں لگائیں حالانکہ یہ درست نہیں ہے۔

5- مجنون عورت پر حد لگائی جب کہ شرعاً اس پر حد نہیں لگانا چاہیے تھی۔

6- والدین دعویٰ دار ہیں۔ ان کی عدم موجودگی میں حد نہیں لگائی جا سکتی۔

ابن ابی لیلیٰ کو جب امام صاحبؒ کی ان باتوں کا پتہ چلا تو گورنر سے شکایت کر کے آپ کو فتویٰ دینے سے روک دیا گیا۔ چنانچہ چند روز آپ فتویٰ نہ دے سکے۔ اس اثناء میں ولی عہد کا قاصد آیا اور چند مسائل پیش کر کے فتویٰ حاصل کیا۔ آپ نے فتویٰ دینے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ مجھے فتویٰ دینے کی اجازت نہیں۔ قاصد نے امیر سے یہ ماجرا بیان کیا۔ امیر نے کہا کہ میں نے اجازت دی۔ چنانچہ آپ نے فتویٰ لکھ دیا۔

(المناقب لابن البزازی: جلد ۱ص ۱۶۶، تاریخ بغداد: جلد ۱۳ص ۳۵۶)

منصور جانتا تھا کہ امام ابو حنیفہؒ مجھے غلط سمجھتے ہیں اور علویوں کی طرف مائل ہیں اور اپنے حلقۂ درس میں تلامذہ کے سامنے اس بات کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں، لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ امام صاحبؒ کے خیالات ان کے حلقۂ درس تک محدود تھے۔ پھر نہ تو آپ دینی اعتبار سے متہم تھے کہ وہ آپ کی کج روی سے فائدہ اٹھاتا، نہ آپ کے ظاہری اعمال پر کسی قسم کی گرفت کا امکان تھا کیونکہ آپ ایک قابل اعتماد، متقی اور سنجیدہ عالم دین

تھے جن کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کی دور دور تک دھوم تھی اور آپ کا ایک وسیع حلقہ تھا جس میں آپ کو نہایت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں نہ آپ نے کبھی تلوار پکڑی نہ باغیوں کا ساتھ دیا، لیکن منصور آپ سے سخت بیزار تھا مگر بظاہر اسے کوئی حیلہ نہ سوجھتا تھا۔ آخر آپ کو منصب قضا پیش کرنے کا خیال آیا تاکہ بصورت انکار وہ من مانی کاروائی کر سکے گا۔

چنانچہ منصور نے آپ کو بلا کر قضا کا منصب پیش کیا تو آپ نے قبول نہ کیا۔ پھر اس نے کہا کہ چلئے یہی کیجئے کہ قاضی مشکل مسائل کے حل میں آپ کی طرف رجوع کر سکیں۔ آپ نے اسے بھی تسلیم نہ کیا۔ چنانچہ اس نے آپ کو زدوکوب اور قید و بند کی سختیوں میں ڈالا اور ایک روایت کے مطابق صرف قید کر دیا۔ علامہ موفق نے مناقب میں لکھا ہے کہ

> ''امام ابوحنیفہؒ جب بغداد آئے تو بارگاہ خلافت سے خنداں و شاداں نکلے، فرمانے لگے: ''مجھے منصور نے منصب قضاء کے لیے بلایا تھا۔ میں نے بتا دیا کہ میں اس کام کے لیے موزوں نہیں۔ یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ مدعی کا کام شہادت پیش کرنا ہے اور مدعیٰ علیہ بصورت انکار حلف اٹھائے، مگر عہدۂ قضاء کے لیے بڑے دل گردے کا آدمی ہونا چاہیے۔ قاضی ایسا جری آدمی ہونا چاہیے جو آپ، آپ کی اولاد اور سپہ سالاروں کے خلاف فیصلے دے سکے، اور مجھ میں یہ ہمت نہیں۔ میری تو یہ حالت ہے کہ آپ مجھے بلاتے ہیں تو میں آپ سے رخصت ہو کر ہی آرام کا سانس لیتا ہوں۔
>
> ''منصور نے کہا کہ ''آپ میرے تحائف کیوں نہیں قبول کرتے؟'' فرمایا: ''میں نے آپ کے ذاتی مال سے دیا ہوا کوئی ہدیہ کبھی واپس نہیں کیا بلکہ ایسا تحفہ قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ مجھے بیت المال سے عطیے بھیجتے ہیں اور بیت المال میں مجھے کوئی حق حاصل نہیں۔ نہ میں فوجی مجاہد ہوں کہ اپنا حصہ وصول کروں، نہ ان کی اولاد ہوں کہ بچوں کا حصہ حاصل کروں، نہ تنگ

دست ہوں کہ فقراء کی طرح صدقہ وصول کروں۔

"بولا اچھا جایئے لیکن بوقت ضرورت قاضی اگر آپ کی طرف رجوع کریں تو ان کی مشکلات دور فرمایئے۔"

(المناقب، موفق مکی: جلد ۱ص ۲۱۵)

ابن البزازی نے لکھا ہے کہ "ابو جعفر منصور نے امام ابو حنیفہؒ کو منصب قضاء پیش کرنے اور قاضی القضاۃ بنانے کے لیے قید کر دیا۔ انکار کرنے پر ایک سو دس کوڑے لگوائے اور اس شرط پر قید خانے سے رہا کیا کہ آپ گھر سے باہر نہ نکلیں۔ نیز مطالبہ کیا کہ جو مسائل وہ بھیجے ان میں فتویٰ دے دیا کریں۔ وہ مسائل بھیجتا لیکن آپ اس کا جواب نہ دیتے تھے۔ منصور نے پھر قید کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ آپ دوبارہ محبوس ہوئے اور اس نے آپ پر بے حد سختی کی۔" (المناقب لابن البزازی: جلد۲ص ۱۹)

خطیب بغدادیؒ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ ربیع بن یونس کا بیان ہے کہ میں نے ابو جعفر منصور کو منصب قضا کے بارے میں امام ابو حنیفہؒ سے جھگڑتے ہوئے دیکھا۔ امام کہہ رہے تھے: "اللہ سے ڈر اور اپنی امانت صرف اسی شخص کے حوالہ کر جو خدا سے ڈرتا ہو۔ میں تو آپ کی رضامندی کی صورت میں بھی آپ سے خائف اور ہراساں ہوں چہ جائیکہ حالت غضب میں۔ اگر آپ مجھے دو باتوں میں سے ایک کا اختیار دیں کہ دریائے فرات میں ڈوب مرو یا قضاء کے عہدہ کو قبول کرو تو میں ڈوب مرنے کو ترجیح دوں گا۔ نیز آپ کے امراء اور خواص کو اکرام و احترام کی بڑی ضرورت ہے اور میں یہ صلاحیت نہیں رکھتا۔ منصور نے کہا: "آپ غلط کہتے ہیں۔ آپ میں یہ صلاحیت موجود ہے۔" امامؒ نے فرمایا: "آپ نے خود ہی فیصلہ کر دیا۔ آپ ایک جھوٹے شخص کو قضاء کی امانت کیوں سپرد کرنا چاہتے ہیں۔" (تاریخ بغداد: جلد۱۳ص ۳۲۸)

داؤد بن راشد واسطی کا بیان ہے کہ جب منصب قضاء کو قبول کرنے کے لیے امام صاحبؒ کو جسمانی اذیت دی جا رہی تھی تو میں وہاں موجود تھا۔ ہر روز قید خانہ سے باہر نکال کر آپ کو دس کوڑے مارے جاتے تھے۔ اس طرح آپ کو کل ایک سو دس کوڑے مارے گئے۔ آپ سے کہا جاتا تھا: "قاضی بننا قبول کیجئے۔" آپ فرماتے:

''میں اس کے لائق نہیں۔'' جب مسلسل کوڑے مارے جانے لگے تو آپ نے چپکے چپکے کہنا شروع کیا: ''اے اللہ! اپنی قدرت کاملہ سے ان کی شر مجھ سے دور فرما دے۔'' جب نہ مانے تو آپ کو زہر کھلا کر مار دیا گیا۔'' ایک اور روایت میں ہے کہ جب آپ ایک عرصہ تک قید و بند کے مصائب سے دوچار رہے تو خلیفہ کے بعض خاص امراء نے آپ کی سفارش کی۔ تب آپ کو قید خانہ سے رہا کر دیا گیا لیکن فتویٰ دینے، لوگوں کی ملاقات کرنے اور گھر سے باہر جانے کی ممانعت کر دی۔ وفات تک آپ کی یہی حالت رہی۔''

(المناقب لابن البزازی: جلد۲ ص ۱۹، مناقب للمکی: جلد۲ ص ۱۷۳)

آخر کار سنہ 150ھ میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کی وفات ایک صدیق و شہید کی موت تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس باضمیر مرد مجاہد اور صاحب عقل و خرد بہادر نے مر کر ہی راحت پائی۔ جیتے جی ہزاروں مصائب سے دوچار ہوئے۔ مخالفین نے ایذا رسانی گوارا کی۔ بہتان طرازی اور افترا پردازی کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا جہالت پیشہ لوگوں کے طعنے سنے، امراء و خلفاء کی اذیتیں سہیں لیکن حوصلہ نہ ہارا۔ انتقال کے وقت وصیت فرمائی کہ انہیں غیر مغصوب اور حلال و طیب زمین میں دفن کیا جائے اور کسی ایسی زمین میں ہرگز ہرگز دفن نہ کیا جائے جس کے غصب کرنے سے امیر متہم ہے۔ روایات میں ہے کہ جب منصور کو اس کا علم ہوا تو بولا: ''مجھے ابو حنیفہؒ سے کون چھڑائے گا، وہ زندہ ہوں یا مردہ۔'' اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ علم و فضل اور دین و اخلاق کی بھی ایک روحانی عظمت ہے جس کی تاثیر جاہ و سلطنت سے کسی طرح کم نہیں۔ نگاہ کی تیغ بازی سپاہ کی تیغ بازی سے زیادہ سخت ہوتی ہے، اسی لیے فقیہ عراق اور امام اعظمؒ کے جنازہ پر پورا بغداد اُمنڈ آیا، یہاں تک کہ منصور نے بھی آپ کی قبر پر نماز جنازہ پڑھی۔ نہ معلوم یہ آپ کے اخلاق و تقویٰ کے جلال و جمال کا اعتراف تھا یا فقط نمائش۔

منصور عباسی سے پہلے کے خلفاء کی سیاست اور علماء:

خلافت اموی اگرچہ اس میں لاکھ خرابیاں سہی لیکن وہ خالص عربی حکومت تھی۔ (تاریخ التمدن الاسلامی: جلد۲ ص ۱۸) اس میں بھی خلفاء اور فقہاء کا آپس میں

کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اس زمانہ میں فقہائے سبعہ کا دور دورہ تھا، اور لکھا ہے:

﴿غفل بنو امیه المدینة و فقهاء الاعمر بن عبدالعزیز فانه عاد الیٰ مشورتهم﴾ (تاریخ التمدن الاسلامی: جلد۲ص ۱۹۶)

''سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کو چھوڑ کر بنو امیہ کے خلفاء کا فقہاء سبعہ مدینہ سے کوئی رابطہ نہیں رہا۔''

اموری حکومت میں جو علمی اور اجتماعی روح پائی جاتی تھی وہ اہل علم اور فقہائے سبعہ کی مرہون منت تھی۔ حکومت کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ علماء صحابہ کرامؓ کے علمی ورثہ سے مالا مال تھے، لیکن اس زمانہ میں سیاسی اسباب کی بنا پر کچھ سیاسی پارٹیاں پیدا ہو گئی تھیں، ایسے ہی سیاسی انتشار اور نئی نئی قوموں کے اسلام میں داخل ہونے اور اس زمانہ میں یونانی اور ہندی کتابوں کے تراجم سے بعض دینی فرقے پیدا ہو گئے جن کی وجہ سے اسلامی معاشرہ میں نئے نئے فرقے پیدا ہو گئے۔ حضرات فقہاء سبعہ ان فرقوں کے پیدا کیے ہوئے مسائل سے نظر ہٹا کر شریعت کی سادہ اور اعلیٰ تعلیم کی حفاظت اور اشاعت میں لگے ہوئے تھے لیکن پھر بھی ان کو کبھی کبھی ان کے خلاف زبان کھولنی پڑتی تھی۔

بنو امیہ کے مادی اقتدار اور اس کے قدرتی اسباب کے باوجود اس عہد تک دین کا وقار اور اس کا اخلاقی اثر مسلمانوں کی زندگیوں میں قائم تھا۔ یہ دینی وقار اور اخلاقی اثر علماء کی وجہ سے تھا جو دینی اور علمی حیثیت سے بلند مقام کے حامل تھے اور اپنی للّٰہیت اور اخلاص، پاکیزہ نفسی اور علم و تفقہ میں مشہور تھے۔ حکومت سے باہر ان کا اچھا خاصا اثر تھا۔ اس اثر اور قلبی احترام کی وجہ سے مسلمان بہت سی خرابیوں اور گمراہیوں سے محفوظ تھے اور مادیت کے سیلاب میں بہ جانے سے رکے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کو ان علماء سے جو قلبی تعلق تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک دن ہشام بن عبدالملک بیت اللہ میں آیا۔ تو اچانک سالم بن عبداللہ بن عمرؓ سے ملاقات ہو گئی۔ ہشام نے کہا: ''سالم! مجھ سے کچھ مانگئے؟'' فرمایا: ''مجھے اللہ کے گھر میں غیر اللہ سے کچھ مانگتے ہوئے شرم آتی ہے۔'' سالمؒ باہر آئے تو ہشام نے پھر کہا: ''اب تو آپ اللہ کے گھر سے باہر ہیں، اب کچھ اپنی ضرورت بتایئے؟'' فرمایا: ''کون سی ضرورت؟ ضرورت دنیوی یا

اخروی؟" ہشام نے کہا: "دنیوی۔" فرمایا: "دنیا تو میں کبھی دنیا کے مالک سے نہیں مانگتا تو اس سے کیسے مانگوں جو دنیا کا مالک ہی نہیں ہے۔" (البدایہ والنہایہ: جلد ۱۰ ص ۲۳۵)

اس زمانہ کے علماء اسلام کی صحیح زندگی کا نمونہ تھے۔ انہوں نے اپنی خودداری حکومت سے بے تعلقی، بے باکی، علمی انہماک اور بے غرض خدمت دین سے اپنی اخلاقی برتری کا نقش قائم کر دیا تھا۔

اس زمانہ کے ایک بہت بڑے عالم اور فقہائے سبعہ کے ایک فرد جلیل سعید بن المسیبؒ کے بارے میں امام ذہبیؒ نے جہاں ان کی علمی صفات اور خدمات کا تذکرہ کیا ہے وہاں یہ بھی لکھا: "قوّالاً بالحق" یعنی حق گوئی اور بے باکی میں ایک مقام رکھتے تھے۔ چنانچہ جب سرکاری طور پر کہا گیا کہ ولید اور سلیمان کے حق میں ولی عہد عبدالملک کی حیثیت سے بیعت کرو تو آپ نے بلا خوف لومۃ لائم برملا کہہ دیا کہ جب تک لیل و نہار کی گردش قائم ہے میں دو شخصیتوں کی بیعت نہیں کر سکتا۔ اس انکار پر ان سے کہا گیا کہ "اس دروازے سے اندر آؤ اور دوسرے دروازے سے باہر چلے جانا یعنی تم ذاتی طور پر بے شک بیعت نہ کرو مگر لوگوں کو اپنے اس کردار کا پتہ نہ دو۔" فرمایا: "بخدا! میرے پیچھے لوگوں میں سے کوئی نہیں ہے۔ اس پر سعید بن المسیبؒ کو سو درے لگائے گئے اور ٹاٹ پہنا دی گئی۔" (حلیۃ الاولیاء: جلد ۱ ص ۷۰)

ابن سعد نے لکھا ہے کہ صرف اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ بازاروں میں اسی ہیئت کے ساتھ جلوس نکالا گیا، اور بالآخر ان کو قید خانہ میں بند کر دیا گیا۔

(طبقات ابن سعد: جلد ۵ ص ۱۲۶)

پھر جیل میں کیا گذری۔ مؤرخین نے کہا ہے کہ آپ کو قید خانہ میں عبرتناک اور دہشت ناک سزائیں دی گئیں، لیکن سعید دین کی زندگی میں کوہ استقامت تھے۔ ان کے پائے استقلال میں کسی مرحلے پر بھی جنبش نہیں آئی۔ جیل کی سزاؤں کا اندازہ عبداللہ بن یزید کے اس بیان سے ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"میں قید خانہ میں سعید کے پاس گیا۔ بکری ذبح کی جاتی۔ پھر اس کی کھال آپ کی پشت پر ڈال دی جاتی، پھر تازہ قمچیوں سے ان کو سزا

دی جاتی۔ سعیدؒ اپنی کلائیوں کو دیکھتے تو فرماتے: "اللھم انصرنی من ھشام"۔ (طبقات ابن سعد: جلد۵ ص ۱۲۶)

ابن سعدؒ نے ہی لکھا ہے کہ اس کے بعد ہشام کے پاس عبدالملک کا خط آیا جس میں ہشام کو ڈانٹ ڈپٹ کی گئی تھی۔ چنانچہ ہشام نے سعید بن المسیبؒ کو رہا کر دیا۔ پھر رہائی کے بعد امتحان و ابتلاء کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اگر چہ وہ دور جسمانی اذیت کا نہ تھا کیونکہ ہشام کو معلوم تھا کہ اگر زیادہ سختی کی گئی تو رائے عامہ خلاف ہو جائے گی اور اس سے سعید بن المسیبؒ کو فائدہ ہو گا۔ اب جو سزا دی وہ معاشرتی مقاطعہ تھا یعنی لوگوں کا سعیدؒ سے ملنا جلنا قانوناً بند کر دیا گیا۔ (حلیۃ الاولیاء: جلد۲ ص ۱۷۲)

چشم آفتاب نے دیکھا کہ ارباب اقتدار نے سعید بن المسیب کی استقامت کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ اب امتحان و ابتلاء کی تصویر بدل دی گئی۔ چنانچہ اب مال کا ابتلاء تھا اور یہ امتحان سب امتحانوں سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ عبدالملک بن مروان حج کے لیے مدینہ منورہ آیا اور مسجد نبوی کے دروازہ پر ٹھہر گیا مسجد کے اندر آدمی روانہ کیا کہ جا کر سعیدؒ کو بلا لاؤ، مگر صرف آنے کی دعوت دینا اور کوئی حرکت نہ کرنا۔ ایلچی نے پیغام دیا کہ امیر مسجد کے دروازے پر کھڑے آپ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے جواب میں فرمایا: "نہ امیر المؤمنین کو میری ضرورت اور نہ مجھے امیر المؤمنین کی ضرورت ہے اگر کوئی ضرورت ہے تو وہ پایۂ تکمیل تک ہرگز نہ پہنچے گی۔ ایلچی نے واپس آ کر جواب سنا دیا۔ امیر المؤمنین نے ایلچی کو دوبارہ بھیجا لیکن سعیدؒ نے وہی جواب دیا جو پہلے دیا تھا۔ ایلچی نے کہا کہ اگر مجھے ہدایات نہ ہوتیں تو میں تمہارا سر لے جاتا، امیر المؤمنین تم کو بلا رہے ہیں اور تم ایسا ترش جواب دیتے ہو۔ فرمایا: "اگر ان کا ارادہ خیر کا ہے تو اس سے تم ہی فائدہ اٹھاؤ اور اگر اس کے علاوہ کوئی اور ارادہ ہے تو میں ایک انچ بھی چلنے کو تیار نہیں ہوں۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے کر لے۔ ایلچی نے وہ ساری بات عبدالملک کے گوش گزار کر دی۔ عبدالملک نے جواب سن کر کہا: "ابو محمد! تجھ پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے، سختی ہی سختی ہے، نرمی کا نام و نشان نہیں۔" (طبقات ابن سعد: جلد۵ ص ۱۲۹)

اب عبدالملک نے سعیدؒ کے لیے ایک نیا جال تیار کیا کہ شاید وہ اس میں پھنس

جائیں۔ چال یہ تھا کہ سعید بن المسیبؒ کی صاحبزادی کا رشتہ اپنے بیٹے ولید کے لیے مانگا۔ ولید ولی عہد مملکت ہو چکا تھا اور لوگوں نے اس کے حق میں بیعت بھی کر لی ہوئی تھی، لیکن سعید بن المسیبؒ عبدالملک کے اس جال میں بھی گرفتار نہ ہوئے، اور ابونعیم نے لکھا ہے کہ

﴿فابیٰ سعید ان یزوجه﴾ (حلیۃ الاولیاء: جلد۲ ص ۱۹۸)

''یعنی سعیدؒ نے اپنی بچی کا ولید سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔''

امام مالکؒ اور ابوجعفر منصور:

امام مالکؒ نے مدینہ میں نفس زکیہ کی نصرت کا فتویٰ دیا۔ انہوں نے نفس زکیہ کی بیعت کا فتویٰ بھی صادر فرمایا۔ جب ان سے کہا گیا کہ ہماری گردن پر تو ابھی تک منصور کی بیعت سوار ہے تو آپ نے فرمایا: ''تمہیں بیعت کرنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ مجبور آدمی کی بیعت معتبر نہیں۔'' (البدایہ والنہایہ: جلد۱۰ ص ۸۴) فرمایا: حدیث ہے کہ اگر کسی سے جبراً طلاق دلائی جائے تو وہ واقع نہیں ہوتی۔

جعفر نے مدینہ پہنچ کر نئے سرے سے لوگوں سے بیعت لی۔ امام مالکؒ کو کہلا بھیجا کہ آئندہ طلاق جبری (مکرہ) کے عدم اعتبار کا فتویٰ نہ دیں کہ لوگوں کو جبری بیعت کی بے اعتباری اور عدم صحت کے لیے سند ہاتھ آ جائے، لیکن امام مالکؒ بدستور معاملۂ جبری کی عدم صحت کا فتویٰ دیتے رہے۔ سلیمان نے غضبناک ہو کر حکم دیا کہ ان کو ستر (70) کوڑے مارے جائیں۔ امام دارالہجرت کو گنہگاروں کی طرح دربار میں لایا گیا۔ کپڑے اتارے گئے اور شانۂ امامت پر دست تطاول نے ستر کوڑے پورے کیے۔ تمام پیٹھ خون آلود ہوگئی۔ دونوں ہاتھ مونڈھوں سے اتر گئے۔ اس پر بھی تسلی نہ ہوئی تو حکم دیا کہ اونٹ پر بٹھا کر شہر میں ان کی تشہیر کی جائے۔ امام مالکؒ بایں حال زار بازاروں اور گلیوں سے گزر رہے تھے اور زبان صداقت نشان بآواز بلند کہہ رہی تھی:

''جو مجھ کو جانتا ہے وہ جانتا ہے اور جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں مالک بن انس ہوں۔ فتویٰ دیتا ہوں کہ جبری طلاق درست نہیں۔''

(کتاب الامامہ والسیاسۃ: جلد۲ ص ۲۸۲، ابن خلدون: جلد۳ ص ۱۹۰، طبقات ابن سعد ترجمہ امام مالکؒ)

اس کے بعد اسی طرح خون آلود کپڑوں کے ساتھ مسجد نبوی میں تشریف لائے۔ پشت مبارک سے خون صاف کیا اور دو رکعت نماز پڑھی اور لوگوں سے فرمایا کہ سعید بن المسیبؒ کو جب کوڑے مارے گئے تھے تو انہوں نے بھی مسجد میں آ کر نماز پڑھی تھی۔ (تزئین الممالک ص ۱۲) یہ تعزیر گو تحقیر کے لیے تھی لیکن اس نے امام کی عزت اور وقار کو بلند کر دیا۔ یہ واقعہ سنہ 147ھ کا ہے۔

ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ جعفر گورنر مدینہ کی یہ حرکت منصور کو پسند نہ آئی۔ اس نے اس کو فوری طور پر معزول کر کے بذلت تمام گدھے پر سوار کر کے بغداد طلب کیا اور امام مالکؒ کو معذرت کا خط لکھا۔ امام مالکؒ کو لکھا کہ میں اس شخص سے انتقام لے رہا ہوں جس نے آپ کو اس طرح ذلیل کیا ہے لیکن امام نے فرمایا: "اس انتقام کی حاجت نہیں، امیر المؤمنین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کی خاطر میں اس کو معاف کرتا ہوں۔"

(کتاب الامامۃ والسیاسۃ: جلد۲ ص ۲۹۰)

امام احمد بن حنبلؒ اور ملکی سیاست:

امام احمد بن حنبلؒ اپنے زمانہ کی ایک نہایت عظیم الشان شخصیت تھے۔ ان کے استاذ امام شافعیؒ کا قول ابن ابی یعلیٰؒ نے طبقات الحنابلہ میں نقل کیا ہے کہ

"امام احمدؒ آٹھ باتوں میں امام تھے۔ (1) امام فی الحدیث (2) امام فی الفقہ، (3) امام فی اللغۃ (4) امام فی القرآن (5) امام فی الفقر (6) امام فی الزہد (7) امام فی الورع اور (8) امام فی السنہ۔"

اتنی خصوصیات اور خصائل کے باوجود جب بھی حکومت وقت نے ان کی کوئی بات اپنے نظریات اور مفاد کے خلاف دیکھی اور سنی تو فوراً قانون حرکت میں آ گیا۔ ارباب اقتدار کے نزدیک حق و باطل کا معیار ان کی اپنی ذات ہوتی ہے۔ جس بات سے ان کی ذات کو فائدہ اور خوشی ہو وہ حق اور درست ہوتی ہے اور جس بات سے ایوان اقتدار میں کوئی جنبش پیدا ہو وہ باطل اور غلط ہوتی ہے۔ لیکن ایک مرد مومن کا سرمایۂ حیات یہی ہے کہ وہ دنیا میں نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی کو جہاں کہیں دیکھے اپنے تئیں

اس کا ذمہ دار سمجھ کر اسے روکتا ہے۔ وہ ایذاء و تکلیف اور رنج و محن سے نہیں ڈرتا۔ دنیا میں اولاد آدم کو سب سے بڑی تکلیف جو دی جا سکتی ہے وہ موت ہے۔ اس کے بعد انسانی جبر وتعدی کا تمام اسلحہ بیکار ہو جاتا ہے۔ پس اگر کوئی شخص خود ہی تلخیٔ حیات کے اس آخری جرعہ کو پینے کے لیے تیار ہو جائے تو پھر دنیا میں کوئی شی اس کے لیے ناممکن نہیں۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے جو ایک انسان سے ممکن ہے۔ غموم و ہموم کا نزول جس طرح ہمت سوز اور یاس انگیز ہوتا ہے اسی طرح کبھی کبھی عزم وشجاعت کے مردہ دلوں کو زندہ بھی کر دیتا ہے۔ اور مبارک ہے وہ شخص جو نزول مصائب پر مایوسی اور عطالت کی جگہ عزم و ہمت سے کام لیتا ہے۔

یہ دنیا ایک میدان کارزار ہے اور جس شی کو عمل کہا جاتا ہے یہ دراصل ایک حریفانہ کشمکش اور مقابلہ ہے۔ پس طرح جنگ میں رہنے والے سپاہیوں کو فتح وشکست سے چارہ نہیں۔ وہ کبھی زخمی کرتے ہیں اور کبھی خود زخمی ہوتے ہیں۔ اسی طرح دنیا میں جو لوگ بستے ہیں انہیں کامیابی و ناکامی اور فیروز مندی و نامرادی سے چارہ نہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہمیشہ ہماری ہی تلوار اور دشمن کی گردن ہو؟ کیوں نہ ہم اپنے سر اور سینے میں زخم کے نشان پائیں۔

امام احمد بن حنبلؒ نے بھی ہر موقع پر کلمۂ حق بلند کیا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ سے وہ کبھی نہ چوکے۔ ایذاء وابتلاء میں ڈالے گئے لیکن ہر موقع پر وہ کامیاب و کامران رہے۔ امام صاحبؒ کے دور ابتلاء کا اصل سبب مامون الرشید کی وہ دعوت تھی جو اس نے وقت کے فقہاء اور محدثین کو اپنے قول خلق قرآن کی تائید وحمایت کے سلسلہ میں دی تھی۔ چنانچہ ان لوگوں کی زبانوں پر یہ بات جاری ہوگئی کہ قرآن حکیم مخلوق اور حادث ہے۔ جن لوگوں نے اعتزال کا یہ مسلک اپنا لیا انہیں وزارت کے منصب عطا ہوئے، عزت واقتدار کی کرسی ملی اور وہ اقتدار کی بارگاہ کے مقرب بنا دیئے گئے اور عطاء ونوال کی بارش ان پر ہونے لگی۔

امام احمدؒ نے مامون کی رائے سے اتفاق نہیں کیا نہ انہوں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اس جرم کی پاداش میں وہ نشانۂ جور واذیت بنائے گئے۔ اس شقاوت وسفا کی

کا آغاز مامون کے عہد میں ہوا۔ پھر معتصم باللہ اور واثق باللہ کے عہد میں مامون کی وصیت کے مطابق اور اس کی پیروی کے سلسلہ میں درجۂ اتم کو پہنچا۔

سب سے پہلے جس شخص نے یہ کہا کہ ''قرآن مخلوق ہے۔'' وہ جعد بن درہم تھا جو عہد اموی کا ایک فرد تھا۔ اسے عیدالاضحیٰ کے دن خالد بن عبداللہ القسری نے اسی جرم میں قتل کر ڈالا۔ وہ خالد کے سامنے اس حالت میں کہ اس کی مشکیں کسی ہوئی تھیں، لایا گیا۔ نماز کا وقت آ چکا تھا۔ خالد نے نماز سے فراغت کے بعد ایک خطبہ دیا اور اس خطبہ کے آخر میں کہا:

> ''جاؤ اپنی قربانی کے جانور ذبح کرو۔ میں نے ارادہ کیا ہے کہ جعد بن درہم کو ذبح کروں، اس لیے کہ یہ کہتا ہے کہ سیدنا موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے خدا سے باتیں نہیں کیں۔ نہ خدا نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اپنا دوست بنایا۔ خدا اس بات سے بہت بلند ہے جو یہ کم بخت کہتا ہے۔'' پھر خالد منبر سے اترا اور جعد کو قتل کر دیا۔ (سرح العیون: ص ۱۵۶)

جہم بن صفوان بھی اسی طرح کی باتیں کیا کرتا تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کی نفی کیا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے جہم کہتا تھا کہ قرآن قدیم نہیں بلکہ مخلوق ہے۔ پھر معتزلہ کا دور شروع ہوا۔ انہوں نے پہلے تو صفات باری تعالیٰ کا انکار کیا۔ پھر یہاں تک مبالغہ کیا کہ خدا کے کلام کرنے کے منکر ہو گئے، اور قرآن حکیم کی اس آیت ''کلّم اللہ موسیٰ تکلیماً'' کی یہ تاویل کی کہ اللہ تعالیٰ نے کلام کی صفت پیدا کی ہے اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے تکلم کی صفت کی صاف نفی کر دی۔ معتزلہ کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح اور تمام چیزیں پیدا کیں اسی طرح اس نے صفت کلام بھی پیدا کی ہے۔ اسی بنا پر ان کا یہ دعویٰ تھا کہ قرآن مخلوق ہے۔

بشر بن غیاث المریسی کا بھی یہی مسلک تھا۔ بشر کے استاذ قاضی ابو یوسفؒ نے اسے اس عقیدہ سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانا آخر آپ نے اسے اپنی مجلس سے اٹھا دیا۔

ہارون الرشید کے عہد خلافت میں معتزلہ کی تحریک شروع ہوئی لیکن ہارون کے زمانہ میں یہ تحریک کوئی زیادہ پروان نہ چڑھ سکی، بلکہ جب بشر المریسی کی کاروائیاں ہارون تک پہنچیں تو ایک روز ہارون نے کہا:

"اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے موقع فراہم کیا تو میں بشر کو قتل کر کے چھوڑوں۔"

مگر بشر اس کے عہد خلافت میں چھپا پھرتا رہا۔

ہارون کے انتقال کے بعد مامون الرشید خلیفہ ہوا تو معتزلہ اس پر چھا گئے اور اس کے مصاحبوں اور حاشیہ نشینوں میں یہی لوگ نمایاں تھے۔ چنانچہ انہوں نے اب عقیدۂ خلق قرآن کا مامون سے اعلان کرا دیا تاکہ ہمارے اس عقیدہ کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہو جائے۔ چنانچہ ۲۱۲ھ میں مامون نے اس کا اعلان کر دیا، لیکن اس نے فکر و عقیدہ کے بارے میں لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا۔

218ھ میں مامون کا انتقال ہو گیا۔ انتقال سے پہلے اس نے طے کیا کہ اپنی حکومت کی قوت اور قہر مانیت سے کام لے کر لوگوں کو عقیدۂ خلق قرآن قبول کرنے پر مجبور کرے۔ اس کام کی ابتداء ان لوگوں سے ہوئی جو حکومت کے مناصب پر فائز تھے۔ چنانچہ قاضی اور دوسرے اعلیٰ عہدیداران حکومت جو اس عقیدہ سے اختلاف رکھتے تھے ان کے لیے مامون نے کوئی تعزیر و عقوبت تجویز نہیں کی تھی سوائے اس کے کہ انہیں حکومت کے عہدوں سے ہٹا دیا جائے یا اگر وہ گواہ کی حیثیت سے عدالت میں حاضر ہوں تو ان کی شہادت قبول نہ کی جائے۔ بعد میں ایک نیا حکم جاری کیا کہا کہ:

"جو شخص اس کا اقرار نہ کرے کہ قرآن مخلوق ہے تو ایسے تمام لوگوں کو گرفتار کر کے امیر المومنین کے لشکر میں بھیج دیا جائے۔ پھر بھی اگر وہ اپنے مسلک سے رجوع نہ کریں اور تائب نہ ہوں تو سب کی گردن تلوار سے اڑا دی جائے۔ انشاء اللہ ولا قوۃ الا باللہ

مامون کے طرزِ عمل میں درجہ بدرجہ یہ تبدیلی آئی کہ اب نوبت قتل تک پہنچ گئی۔ مامون کے نائب اسحاق بن ابراہیم نے مامون کے

اس حکم کو عملی جامہ پہنانے میں امکانی سرعت سے کام لیا۔ اس نے محدثین، فقہاء اور مفتیوں کو دربار میں طلب کیا۔ انہی میں امام احمد بن حنبلؒ بھی تھے۔ اسحاق نے ان لوگوں کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے وہ بات نہ مانی جس کا حکومت کی طرف سے مطالبہ کیا جا رہا ہے اور بغیر کسی تردد اور تامل کے مامون کے فرمان پر سر تسلیم خم نہ کر دیا۔ تو ان کو لرزہ خیز سزا اور ہلاکت آفرین اذیت سے دوچار ہونا پڑے گا۔ چنانچہ اس دھمکی سے مرعوب و متاثر ہو کر قریباً سب نے وہی کچھ کہہ دیا جو ان سے چاہا جا رہا تھا، لیکن چار آدمی ایسے تھے جن کے قلوب کو اللہ تعالیٰ نے مضبوط کر دیا۔ انہوں نے باقی کو فانی پر ترجیح دی اور انہوں نے نہایت جرأت، استقلال اور اصرار کے ساتھ اپنے موقف کو پیش کیا۔ وہ چار نفوس قدسیہ حسب ذیل تھے:

(1) امام احمد بن حنبلؒ (2) امام محمد بن نوحؒ

(3) القواریری (4) بجادہ

ان لوگوں کو اسحاق کے حکم سے رسیوں میں جکڑ لیا گیا اور بیڑیوں سے کس دیا گیا۔ انہوں نے رات اسی حالت میں گذاری۔ جب صبح ہوئی تو سختیوں اور شدائد کی تاب نہ لا کر بجادہ نے سجدۂ سہو کر لیا یعنی اسحاق کی بات مان لی۔ چنانچہ اسے رہا کر دیا گیا۔ باقی اصحاب ثلاثہ بدستور آفات و مصائب میں مبتلا رہے۔ دوسرے روز پھر یہی بات دہرائی گئی۔ اس مرتبہ القواریری کی ہمت نے جواب دے دیا۔ اب باقی صرف دو آدمی رہ گئے۔ ان دونوں کو بیڑیوں میں جکڑ کر طرطوس بھیج دیا گیا تا کہ مامون کی خدمت میں پیش کیے جائیں۔ محمد بن نوح تو راستہ ہی میں شہید ہو گئے۔ **تغمدہ اللہ برحمتہ.**

امام احمد بن حنبلؒ ابھی راستہ ہی میں تھے کہ مامون کا انتقال ہو گیا۔ اس نے اس دنیا سے جانے سے قبل اپنے بھائی معتصم باللہ کو یہ وصیت کی کہ قرآن کے بارے میں وہ اس مسلک پر قائم رہے۔ اس وصیت کا اثر یہ ہوا کہ مامون کے مرنے کے بعد دور ابتلاء و مصائب ختم نہیں ہوا بلکہ اس میں اضافہ ہو گیا اور وہ محدثین و فقہاء جواب تک اس

مسلک کو اپنانے میں توقف کر رہے تھے، ان پر بلاؤں اور مصائب کا نزول شروع ہو گیا۔ اس گروہ کے سربراہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ تھے جو امام شافعیؒ کے شاگرد اور امام بخاریؒ کے استاذ تھے۔ مامون نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا وہ اچھا نہیں کیا تھا۔ علماء کی اہانت و ذلت، ان کا پابجولاں ہو کر سجن و زنداں کے مصائب میں گرفتار ہونا، فولاد و آہن کی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑا جانا، ان میں جو ضعیف جسم کے تھے وہ ان کڑیوں کی تاب نہ لا سکے اور راہِ حق و صداقت میں مرتبۂ شہادت پر فائز ہو کر عروس مرسے ہم کنار ہوئے، لیکن ایک حضرت امام احمد بن حنبلؒ باقی رہ گئے، اس لیے کہ ان کے جسم میں قوت تھی، ان کے نفس میں عزیمت تھی، ان کے قلب میں ایمان تھا، صبر و برداشت کی تاب و تواں تھی۔ پھر اسی پر بس نہیں بلکہ مامون نے اپنے جانشین کو ایذا رسانی جاری رکھنے کی وصیت بھی کر دی۔

مامون کا انتقال ہو گیا اس حالت میں کہ امام احمدؒ اس کی طرف آہنی بیڑیوں میں جکڑے اور ہتھکڑیاں پہنے کشاں کشاں آ رہے تھے۔ مامون کی موت نے بھی ابتلاء اور آزمائش کے اس دور کو ختم نہیں کیا بلکہ بعد کا دور پہلے دور سے زیادہ سفاکانہ اور لرزہ خیز تھا۔ اس کی وجہ مامون کی معتصم کو وصیت تھی۔

معتصم کا حال یہ تھا کہ وہ علم سے کورا اور تلوار کا دھنی کا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے خلق قرآن کا معاملہ احمد بن داؤد معتزلی کے سپرد کر دیا کہ وہ مامون کی وصیت نافذ کرنے کے سلسلہ میں جو چاہے کرے۔ مامون کی موت کے بعد امام احمدؒ معتصم کے دربار میں حاضر کیے گئے۔ چنانچہ پہلے تو انہیں دھمکی اور تخویف سے رام کرنے کی کوشش کی گئی کہ یہ عقیدہ قبول کر لیں، لیکن جب وہ ترغیب و ترہیب سے متاثر نہ ہوئے تو ہر دھمکی نے عملی جامہ پہن لیا۔ چنانچہ ان پر کوڑے پڑنے لگے۔ ایک کے بعد ایک، یہاں تک کہ کوڑوں کی ضرب کی تاب نہ لا کر وہ بے ہوش ہو جاتے۔ پھر انہیں تلوار سے کوچا جاتا کہ ہوش میں آ جائیں لیکن وہ بے حس و حرکت پڑے رہتے۔ تشدد و تعذیب اور قید و بند کا یہ سلسلہ کم و بیش ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔ جب یہ لوگ امام احمدؒ سے مایوس ہو گئے تو اب ان کے دل میں شفقت کا جذبہ پیدا ہوا، چنانچہ انہیں رہا کر دیا گیا، اور انہیں

ان کے گھر میں ایسی حالت میں پہنچایا کہ وہ زخموں سے لہولہان تھے اور متواتر مار پیٹ اور جیل کی سختیوں کی وجہ سے ان کا بدن چور ہو رہا تھا۔ گھر میں کچھ عرصہ اقامت گزیں ہوئے۔ جب جسم کے زخم مندمل ہوئے اور اس قابل ہوئے کہ مسجد میں جانے لگیں تو وہ مسجد میں مسند درس پر بیٹھ گئے یہاں تک کہ معتصم کا انتقال ہو گیا۔

معتصم کے بعد واثق باللہ مسند آرائے خلافت ہوا۔ اب پھر امتحان کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اب احمد بن داؤد معتزلی اور واثق اور معتصم کی وفات کے بعد جسمانی ایذا رسانی کا اعادہ نہیں کیا بلکہ قصر خلافت سے یہ حکم صادر ہوا:

"تمہارے پاس کسی کو آنے اور تم سے کسی کو ملنے جلنے کی اجازت نہیں ہے، اور نہ تم اس شہر میں اقامت اختیار کرو جہاں ہمارا قیام ہو۔"

واثق کے انتقال کے بعد امام احمدؒ کے امتحان و آزمائش اور ایذاء و تکالیف کا سلسلہ جو قریباً پانچ سال تک جاری رہا، ختم ہو گیا۔ اس کے بعد وہ پہلے سے زیادہ عزت و مکرمت کے ساتھ درس و تدریس کی مسند پر رونق افروز ہوئے۔ ان کی پیرانہ سالی، تقویٰ، زہد، قناعت اور مصائب کی برداشت نے ان کا مرتبہ اور زیادہ بلند کر دیا۔

اس امتحان و ابتلاء میں امام احمدؒ اکیلے نہیں تھے بلکہ اور بھی کئی فقہاء اور محدثین اس ظلم و تشدد کی آماجگاہ تھے، اگرچہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ احمدؒ کو ان سب پر سبقت کا فخر حاصل ہے۔

دمیری نے اپنی کتاب حیاۃ الحیوان جلد ۱ ص ۸۲ پر ایک روایت نقل کی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ واثق نے اپنی زندگی کے آخری دور میں عقیدۂ خلق قرآن سے اختلاف رائے رکھنے والوں پر سختی اور تشدد کا سلسلہ بند کر دیا تھا۔

ابن تیمیہؒ میدان سیاست میں:

گذشتہ صفحات میں قرون اولیٰ کے علماء اور فقہاء نے ملکی سیاست میں حصہ لے کر ایوانِ اقتدار کو اپنے اعمال اور سیاسی کارروائیوں سے جس طرح متاثر کیا اس کی یہ ایک اجمالی داستان تھی۔ تاریخ اسلام کے صفحات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ ہر دور

حکومت میں علماء کا ایک سیاسی عمل دخل رہا۔ 1216ء میں جب چنگیز خان اپنے ساٹھ ہزار وحشی انسانوں کو لے کر نکلا اور وہ اپنے اسلحہ کے ساتھ مسلمان آبادیوں پر ٹوٹ پڑے اور تمام تمدنی اور تہذیبی آثار کو برباد اور تہ و بالا کر ڈالا۔ عراق، ایران اور ترکستان ان کے قدموں کے نیچے زیروزبر ہو گئے اور انہوں نے بغداد کی عظیم مسلم خلافت کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا، اس وقت مسلمان علماء و فقہاء اسلامی حکومت کے استحکام کے لیے ایک اہم سیاسی رول ادا کر رہے تھے۔ حالانکہ وہ وقت اتنا نازک تھا کہ ایک مغربی مؤرخ کے نزدیک یہ واقعہ اتنا ہولناک بلکہ خوفناک تھا کہ اس کے قلم سے یہ الفاظ نکلے:

"آسمان نے زمین پر گر کر تمام چیزوں کو مٹا دیا۔"

(Harold Lamp, Chenghiz Khan, P206)

بعض مؤرخین نے اس واقعہ کو اس طرح تشبیہ دی ہے کہ جس طرح کسی پہاڑ سے برف کا ایک بھاری تودہ اچانک آ گرتا ہے اسی طرح چنگیز خان اور اس کے پوتے ہلاکو خان کے لشکر اسلامی تہذیب و تمدن کے مرکزوں پر آن ٹوٹے اور اپنے پیچھے ویران صحرا اور بھیانک کھنڈر چھوڑ گئے حالانکہ ان کی آمد سے پہلے یہاں شان دار شہروں کے محلات کھڑے تھے اور ان کے گردونواح میں خوشنما باغات اور سرسبز کھیت لہلہاتے تھے۔ جب ہرات کے شہر سے مغلوں کے لشکر نے کوچ کیا تو چالیس تباہ حال آدمی اپنی پناہ گاہوں سے نکلے اور دہشت زدہ نظروں سے اس برباد ویرانے کو دیکھنے لگے جو چند روز قبل ان کا خوبصورت شہر تھا۔ صرف یہی چالیس آدمی تھے جو ایک لاکھ کی آبادی میں سے بچے تھے۔ امام بخاریؒ کے مسکن بخارا کا بھی یہی حال تھا۔ یہی حال سمرقند، بلخ اور وسطیٰ ایشیا کے دوسرے شہروں کا ہوا جن سے اسلامی تہذیب و تمدن کی شان و شوکت وابستہ تھی اور جو اولیائے کرام کا مسکن اور علم و فضل کا مخزن تھا۔ یہی مصیبت بغداد پر نازل ہوئی جو صدیوں تک دولت عباسیہ کا پایۂ تخت رہ چکا تھا۔

سفاکی اور غارت گری کے ان واقعات کے تصور ہی سے اگر کوئی مسلمان مؤرخ کانپ اٹھا ہو تو یہ بات کوئی بے جا نہیں۔ مؤرخ ابن اثیر نے جہاں اسلامی ملکوں پر تاتاریوں کے حملوں کا حال لکھا ہے وہاں وہ بیان کرتا ہے:

''میں کئی برس تک اس حادثے کے ذکر سے پہلو تہی کرتا رہا کہ اس کا ذکر کروں یا نہ کروں کیونکہ میں اسے ایک حادثہ عظیم سمجھتا تھا اور اس کے ذکر سے کراہت محسوس کرتا تھا۔ چنانچہ اسی تردد کی حالت میں کبھی ایک قدم آگے بڑھاتا اور کبھی ایک قدم پیچھے ہٹاتا تھا، کیونکہ ایسا کون شخص ہوگا جس کے لیے اسلام اور مسلمانوں کی خبر مرگ کا لکھنا اور اس کا بیان کرنا آسان ہو۔ کاش کہ میری ماں مجھ کو نہ جنتی اور میں اس سے پہلے ہی مر جاتا اور دنیا مجھ کو بالکل فراموش کر دیتی۔ جب کہ میں اس بارے میں پس و پیش کر رہا تھا میرے چند دوستوں نے مجھے اس سانحہ کے قلم بند کرنے پر مجبور کیا۔ پھر میں نے بھی خیال کیا کہ اس حادثے کا ذکر چھوڑ دینے میں کچھ فائدہ نہیں ہے۔ اس کے ضمن میں مجھے ایک بڑے حادثے اور ایک مصیبت کا حال لکھنا ہے جس کی نظیر لانے سے لیل و نہار قاصر ہیں۔ یہ مصیبت تمام لوگوں پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً نازل ہوئی۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ جب سے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا ہے اس وقت سے آج تک اہل دنیا ایسی سخت مصیبت میں کبھی گرفتار نہیں ہوئے، تو وہ بالکل حق بجانب ہوگا، کیونکہ تاریخی کتابوں میں کوئی ایسا حادثہ مذکور نہیں جو دہشت انگیزی اور سفاکی میں اس کے لگ بھگ ہو۔ اس قسم کا سب سے بڑا حادثہ جو تاریخ میں مذکور ہے یہ ہے کہ بخت نصر نے بنی اسرائیل کا قتل عام کیا تھا۔ اور بیت المقدس کو برباد کیا تھا، مگر بیت المقدس کو ان شہروں سے کیا نسبت جن کو ملعونوں نے تباہ و برباد کیا اور جن میں سے ہر شہر بیت المقدس سے کئی گنا بڑا تھا۔ اسی طرح بنی اسرائیل کا ان لوگوں کے مقابلہ میں کیا شمار ہے جن کو تاتاریوں نے قتل کیا۔ یہ تعداد میں بنی اسرائیل سے کہیں زیادہ تھے۔ شاید

اہل علم دنیا کے خاتمے تک ایسا عظیم حادثہ نہیں دیکھیں گے۔ ان وحشیوں نے کسی پر رحم نہیں کھایا۔ انہوں نے عورتوں، مردوں اور بچوں کو قتل کیا۔ عورتوں کے پیٹ چاک کر دیئے اور پیٹ کے بچوں کو مار ڈالا۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون، ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم** ۔ یہ حادثہ عالم گیر اور عالم آشوب تھا۔ ایک طوفان کی طرح اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔'' (کامل لابن اثیر: جلد۱۲ص۲۳۴)

تاتاری جب دارالخلافت بغداد میں داخل ہوئے تو اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ علامہ ابن کثیرؒ بغداد کی تباہی اور تاتاری وحشیوں کی غارت گری اور خون آشامی کا ذکر کرتے ہوئے اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:

''بغداد میں چالیس روز تک قتل و غارت کا بازار گرم رہا۔ چالیس روز کے بعد یہ باغوں کا شہر جو دنیا کا رونق ترین شہر تھا، ایسا ویران اور برباد ہوا کہ شہر میں خال خال لوگ نظر آتے تھے۔ بازاروں اور راستوں پر لاشوں کے ڈھیر اس طرح لگے ہوئے تھے کہ دیکھنے والوں کو ٹیلے نظر آتے تھے۔ ان کی لاشوں پر بارشیں ہوئیں تو صورتیں مسخ ہوگئیں اور سارے شہر میں تعفن اور گندگی پھیل گئی جس سے شہر کی ہوا خراب ہوگئی اور سخت وبا پھیلی جس کا اثر ملک شام تک پہنچا۔ اس کی متعفن ہوا اور وبا سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق بکثرت مری۔ وبا اور فنا کا دور دورہ تھا۔'' (البدایہ والنہایہ: جلد۱۳ص۲۶۷)

یہ وقت اسلام اور مسلمانوں کے لیے بڑا مشکل تھا۔ فوجیں تتر بتر اور ہلاکت کے منہ میں چلی گئی تھیں۔ چنانچہ اس صورت حال کے بارے میں امریکی یہودی مؤرخ ہٹی نے لکھا ہے:

''مشرق میں وحشی منگولوں کے تیراندازوں کی یلغار اور مغرب میں زرہ پوش صلیبی سرداروں کے درمیان تیرھویں صدی عیسوی کے

ابتدائی حصہ میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا، مگر اس صدی کے آخری حصہ میں صورت حال کچھ مختلف ہو چکی تھی۔ آخری صلیبی اس وقت سمندر میں دھکیلا جا چکا تھا۔ گیارہ تا تاری خانوں میں سے ساتویں خان نے (جن میں سے اکثر کے ہاں عیسائی بیویاں تھیں اور وہ عیسائیت کی طرف مائل تھے)۔ بالآخر اسلام کو سرکاری مذہب کے طور پر تسلیم کرلیا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مذہب نے وہاں اسلامی تہذیب کی بے رحمانہ تباہی کے بعد نصف صدی سے بھی کم مدت میں اس کا پوتا غازان مسلمان ہو کر اسلامی تہذیب کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت اور قوت خرچ کر رہا تھا۔" (ہسٹری آف عربز، ہٹی: ص ۴۸۸)

ایسے موقع پر علماء اور فقہاء نے وہ کام کیا جو صاحبان اقتدار نہ کر سکے بلکہ وہ تو میدان جنگ میں بالکل بازی ہار چکے تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں پروفیسر آرنلڈ نے لکھا ہے:

"بعد کے سالوں میں اگرچہ یہ عظیم سلطنت پارہ پارہ ہو گئی اور اسلام کی سیاسی قوت کم ہو گئی مگر اس کی روحانی فتوحات بغیر وقفہ کے برابر جاری رہیں۔ جب 1258ء میں بغداد کو تباہ کیا گیا اور عباسی خلافت کی شان و شوکت کو خاک و خون میں غرق کر دیا گیا، اس وقت اسلام جزیرہ سماٹرا میں اپنی جگہ بنا چکا تھا اور جزائر ملایا میں اپنا فاتحانہ سفر شروع کر رہا تھا۔ اپنے سیاسی زوال کے زمانہ میں اسلام نے اپنی بعض انتہائی نمایاں روحانی فتوحات حاصل کیں۔ دو بڑے مواقع پر کافر قبائل نے اپنے پاؤں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیرووں کی گردن پر رکھ دیئے تھے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں سلجوقی ترکوں نے تیرھویں صدی عیسوی میں مغلوں (تاتاریوں) نے، مگر ہر بار فاتح نے مفتوح کے مذہب کو قبول کر لیا۔"

(پریچنگ آف اسلام: ص ۲۲۱)

ان حالات میں جہاں صوفیائے کرام نے اپنی روحانی طاقت کو استعمال کیا وہاں علماء نے اپنی علمی اور سیاسی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ علامہ تقی الدین ابن تیمیہؒ نے مصر و شام کے مسلمانوں کو اکٹھا کر کے یہ نعرہ دیا کہ

الحرب انفی للحرب یعنی جنگ کا علاج جنگ ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ اپنی انتہائی فوجی قوت کے باوجود اسے ختم نہ کر سکے، لیکن شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی سیاست کا لوہا تاتاری فرمانروا نے بھی مان لیا۔ 699ھ کا نیا سال جب شروع ہوا تو متواتر اطلاعات ملیں کہ ایران اور عراق کے تاتاری فرمان روا قازان کی نیت شام پر حملہ کرنے کی ہے اور اس کی فوجوں کا رخ دمشق کی جانب ہے۔ تاتاریوں کے حملہ کے جو تلخ تجربات اسلامی ممالک کو تھے ان کی بنا پر پورے ملک شام میں اس اطلاع کی ایک دہشت اور ہیبت پھیل گئی۔ لوگ حلب و حماۃ سے دارالسلطنت دمشق کا رخ کرنے لگے یہاں تک کہ حماۃ سے دمشق تک گھوڑے کا کرایہ دو سو درہم ہو گیا۔ چند دنوں کے بعد لوگوں نے سنا کہ سلطان مصر الملک الناصر محمد بن قلاوؤن افواج شاہی کے ساتھ تاتاریوں کے مقابلہ کے لیے آ رہے ہیں۔ اس خبر نے لوگوں میں کچھ اطمینان پیدا کر دیا۔ 8 ربیع الاول 699ھ کو مصری افواج دمشق میں داخل ہوئیں۔ اہل شہر نے سخت بارش اور کیچڑ کے باوجود بڑی گرم جوشی سے سلطان اور اس کی افواج کا استقبال کیا۔ شہر کو آراستہ کیا گیا اور مسلمانوں کی فتح و نصرت کے لیے دعائیں مانگی گئیں۔ 17 ربیع الاول 996ھ کو سلطان تاتاریوں کے مقابلہ کے لیے نکلا۔ بڑے بڑے علماء اور اعیان شہر ہم رکاب تھے۔ باقاعدہ فوج، رضا کاروں اور انگروٹوں کی بھی ایک بہت بڑی تعداد ساتھ تھی۔ مساجد میں قنوت نازلہ اور دعاؤں کا خاص اہتمام کیا گیا۔ دمشق کے باہر 27 ربیع الاول 996ھ کو قازان اور سلطان مصر کی فوجوں کے درمیان معرکہ ہوا۔ مسلمان میدان میں جم کر لڑے اور پوری بہادری سے مقابلہ کیا لیکن قسمت نے ساتھ نہ دیا اور شکست سے دو چار ہوئے۔ سلطانی افواج تو مصر چلی گئیں اور اہل دمشق نے دمشق میں پناہ لی۔ اس شکست سے دمشق میں بدحواسی پھیل گئی۔ بڑے بڑے اعیان سلطنت اور سربرآوردہ حضرات شہر چھوڑ کر مصر کا رخ کرنے لگے۔ صرف منتظم قلعہ ابھی مقیم تھا۔ مختصر یہ کہ کوئی

ذمہ دار شخص شہر میں موجود نہ تھا۔ گرانی اپنی انتہاء کو چھو رہی تھی۔ قیدی جیل توڑ کر باہر نکل آئے تھے اور انہوں نے شہر میں قتل و غارت کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ باغات جو اہل دمشق کی آمدنی کا ایک بہت بڑا ذریعہ تھے، ان کے دروازے توڑ ڈالے گئے۔ ادھر دمشق میں یہ افراتفری اور طوفان بدتمیزی تھا، ادھر قازان تاتاری کی آمد کا شور تھا جس نے لوگوں کو حواس باختہ کر دیا ہوا تھا۔ ان حالات کے پیش نظر اعیان شہر اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے مشورہ کیا اور یہ قرار پایا کہ شیخ الاسلام چند علماء اور رفقاء کی معیت میں قازان سے ملاقات کریں اور اہل دمشق کے لیے پروانۂ امن حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ 3 ربیع الثانی 699ھ کو مقام نبک میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور تاتاریوں کے فرماں روا قازان کی باہمی ملاقات ہوئی۔ شیخ کمال الدین ابن الانجا جو اس وقت امام ابن تیمیہؒ کے ساتھ تھے، اس ملاقات کا حال ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''میں شیخ الاسلامؒ کے ساتھ اس ملاقات میں موجود تھا۔ وہ سلطان قازان کو عدل و انصاف کی آیات اور احادیث سناتے تھے۔ ان کی آواز بلند ہوتی جاتی تھی اور وہ برابر سلطان کے قریب ہوتے جاتے تھے یہاں تک کہ قریب تھا کہ ان کے گھٹنے اس کے گھٹنے سے مل جائیں۔ سلطان کو اس سے کچھ ناگواری نہیں ہوئی۔ وہ نہایت توجہ سے کان لگائے ان کی باتیں سن رہا تھا اور ہمہ تن متوجہ تھا۔ اس پر شیخ الاسلامؒ کا رعب ایسا طاری تھا اور وہ ان سے ایسا متاثر تھا کہ اس نے لوگوں سے پوچھا یہ عالم کون ہیں؟ میں نے ابھی تک ایسا شخص نہیں دیکھا اور نہ ہی اس شخص سے زیادہ کوئی دلیر اور مضبوط اعصاب والا شخص آج تک دیکھنے میں آیا۔ اور ان کے علمی، سیاسی اور عملی کمالات و محاسن کا تذکرہ کیا۔ ابن تیمیہؒ نے قازان سے کہا کہ تمہارا دعویٰ ہے کہ تم مسلمان ہو اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے ساتھ قاضی، امام، شیخ اور مؤذنین بھی رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود تم نے ہم مسلمانوں پر حملہ کیا حالانکہ تمہارے

باپ دادا کافر ہونے کے باوجود ایسے اعمال سے پرہیز کرتے تھے۔انہوں نے اپنے ہر عہد کی پابندی کی اور تم نے ہر عہد کو توڑا اور جو کچھ کہا تھا اس کو پورا نہیں کیا اور بندگان خدا پر ظلم کیا۔''

(الکواکب الدریہ فی مناقب الامام، المجتہد شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ للشیخ مرعی بن یوسف:ص ۲۵)

شیخ کمال الدین فرماتے ہیں کہ ایسی تلخ، درشت اور سخت گفتگو کرنے کے باوجود شیخ الاسلام نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ واپس آئے۔ تاتاریوں کے پاس جو مسلمان قیدی تھے ان کی بڑی تعداد آپ کے حسن سفارش سے چھوڑ دی گئی۔ شیخ الاسلامؒ فرمایا کرتے تھے: ''غیر اللہ سے تو وہ ڈرے گا جس کے دل میں کوئی بیماری ہے۔''

(الکواکب الدریہ:ص ۲۵)

اہل دمشق کو اگرچہ تاتاری سلطان کی طرف سے پروانہ امن مل گیا تھا اور شہر میں اس کا اعلان بھی کر دیا گیا تھا، لیکن دمشق کے اطراف میں تاتاریوں کی غارت گری جاری تھی، وجہ اس کی یہ تھی کہ اگرچہ قازان مسلمان ہو چکا تھا اور اس کا اسلامی نام محمود تھا۔ یہ چنگیز خان کا پڑپوتا تھا۔ 694ھ میں اس نے امیر توزون کی دعوت پر اسلام قبول کر لیا تھا لیکن 5 سال کے مختصر عرصہ میں اس کی سیرت و اخلاق کی یکسر تبدیلی اور اسلامی تعلیم و تربیت کی زیادہ توقع نہیں کی جا سکتی۔ باوجود مسلمان ہو جانے کے تاتاریوں کی دہشت گردی، غارت گری، خون آشامی اور سفاکی میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوا تھا۔

دمشق کی شہر پناہ سے سے باہر ایک اودھم سا مچا ہوا تھا۔ شہر میں ضروریات زندگی کی قیمتیں آسمان کو چھو رہی تھیں۔ ادھر تاتاریوں کا یہ مطالبہ تھا کہ حکومت سابقہ کے جتنے گھوڑے، ہتھیار اور نقد لوگوں کے پاس چھپا ہوا ہے، وہ سب تاتاریوں کے حوالے کر دیا جائے۔ تاتاریوں نے ایک نومسلم تاتاری سیف الدین کو اپنی طرف سے حاکم شہر مقرر کیا اور اس نے اہل شہر پر سختی شروع کی۔ شہر پر تاتاریوں کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا، صرف قلعہ، قلعہ دار جواش نے ان کے حوالے نہیں کیا تھا بلکہ صاف انکار کر دیا تھا۔ حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ اس کے محرک شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ تھے۔ انہوں نے قلعہ دار کو قلعہ

حوالے کرنے سے روکا تھا اور قلعہ دار نے آخر وقت تک ان کے اس حکم پر عمل کیا۔

(البدایہ والنہایہ: جلد۱۴ اص ۱۷)

اب تاتاریوں نے شہر میں قتل و غارت شروع کر دی۔ شریف خاندان اور علماء کے گھرانوں کے لڑکے اور لڑکیاں غلام اور باندیاں بنالی گئیں۔ کتب خانے لوٹ لیے گئے۔ ان حالات میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے قازان کو دوبارہ ملنا چاہا لیکن اس کے حواریوں نے انہیں نہ ملنے دیا۔ اب یہ خبر مشہور ہوگئی کہ جو تاتاری شہر سے باہر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں، وہ اب شہر میں داخل ہوا چاہتے ہیں۔ اس خبر نے شہر میں ایک کھلبلی سی مچادی اور لوگوں کے رہے سہے ہوش وحواس جاتے رہے۔ تاتاریوں نے قلعہ کا قبضہ لینے کے لیے منجنیقیں نصب کر دیں اور دوسری تمام تیاریاں بھی مکمل کر لیں۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

> ''راستوں اور سڑکوں پر سناٹا تھا۔ اکا دکا کوئی شخص نظر آتا تھا۔ جامع مسجد میں نمازیوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی۔ جمعہ کی نماز میں ''جامع اموی'' میں بڑی مشکل سے ایک صف پوری ہوتی تھی اور کچھ آدمی پیچھے ہوتے۔ جو شخص کسی ضرورت سے نکلتا بھی تو وہ تاتاریوں کا بھیس بدل کر نکلتا اور پھر فوراً واپس آجاتا۔ پھر بھی یہ کھٹکا لگا رہتا کہ شاید واپس آنا نصیب نہ ہو۔'' (البدایہ والنہایہ: جلد۱۴ اص ۹)

29 جمادی الاولیٰ 699ھ کو قازان خودتو عراق کی طرف چلا گیا لیکن وہ اپنا نائب اور ایک بہت بڑی فوج پیچھے چھوڑ گیا۔ اس فوج نے اردگرد کی بستیوں میں لوٹ مار مچا رکھی تھی۔ اب علامہ ابن تیمیہؒ سے نہ رہا گیا۔ وہ 8 رجب المرجب کو یولائی کی لشکرگاہ میں جا کر اس سے ملے اور قیدیوں کی رہائی اور دوسرے کئی امور پر اس سے بات چیت کی۔ 9 رجب کو اطلاع ملی کہ سلطان محمد بن قلاوؤن اور مصری افواج دمشق کے استخلاص کے لیے مصر سے روانہ ہوگئی ہیں۔ اب قلعہ دار جواش نے اعلان کروایا کہ اہل شہر شہر پناہ اور دروازوں کی حفاظت کریں۔ لوگوں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ ابن تیمیہؒ کا ان دنوں معمول تھا کہ رات بھر شہر پناہ کا گشت کرتے تھے اور لوگوں کو جہاد

اور رباط فی سبیل اللہ کی آیات اور احادیث سنا کر صبر وقتال کی ترغیب دیتے تھے۔

(البدایہ والنہایہ: جلد۱۴ص۱۱)

ربیع الثانی 700ھ میں پھر تاتاریوں کی آمد کی خبر گرم ہوئی۔ اب ابن تیمیہؒ نے نائب الشام سے ملاقات کی۔ نائب الشام اور اعیان حکومت نے آپ سے استدعا کی کہ آپ خود مصر جائیں اور سلطان محمد بن قلاوؤن کو شام کی حفاظت اور تاتاریوں سے مقابلہ کرنے پر آمادہ کریں۔ چنانچہ وہ ڈاک کی سواری سے مصر روانہ ہوئے اور وہاں جا کر ابن قلاوؤن کو اپنی ایمان افروز اور یقین آفرین باتوں سے غیرت دلائی اور شام کی حفاظت کے لیے آمادہ کیا۔ چنانچہ سلطان آپ کے کہنے پر دمشق کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے ساتھ مصری افواج تھیں۔ علامہ ابن تیمیہؒ نے واپس آ کر دمشق کے لوگوں کو خوش خبری سنائی اور انہیں جہاد کی ترغیب دی۔ آخر 2 رمضان المبارک 700ھ کو شقحب کے میدان میں مصری اور تاتاری فوجوں میں گھمسان کا رن پڑا۔ سلطان محمد بن قلاوؤن نے بڑی ثابت قدمی دکھائی۔ اس نے اپنے گھوڑے کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں کہ بھاگنے نہ پائے۔ بڑے بڑے ترکی امراء کام آئے اور بالآخر ایک گھمسان کی جنگ کے بعد تاتاریوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بکثرت تاتاری قتل ہوئے۔ 4 رمضان المبارک 700ھ کو شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فتح مند دمشق میں داخل ہوئے۔ لوگوں نے ان کا شاندار استقبال کیا اور ان کو مبارکباد کے ساتھ دعائیں بھی دیں۔ 5 رمضان المبارک کو سلطان اور اعیان سلطنت مظفر ومنصور شہر دمشق میں داخل ہوئے۔



برصغیر پاک و ہند میں الحاد کے گہرے بادل

سیاسی معاملات اور حکومت کے افعال پر تنقید و تحسین کرنا صرف عراق و حجاز کے علماء کا ہی کام نہ تھا بلکہ جب اسلام کی حکومتیں سرزمین پاک و ہند میں قائم ہوئیں تو علماء نے یہاں بھی حکومت وقت کے ہر غلط کام کو روکنے کی کوشش کی۔ اس زمانہ کے امراء حکومت اور بادشاہانِ وقت بھی علماء، فقہاء اور درویشوں سے اپنا تعلق قائم رکھتے تھے بلکہ اس تعلق کو اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے تھے۔ اس زمانہ کے درویش بہت کم کارکنان اقتدار کے دروازوں پر جاتے تھے۔ بلکہ امراء کی خواہش ہوتی تھی کہ یہ اللہ والے ان کے پاس آئیں لیکن جن لوگوں کے دلوں میں اللہ کی محبت موجزن تھی وہ غیر اللہ کے دروازوں پر کیسے جاسکتے تھے۔ پھر انہیں یہ بھی یاد تھا کہ "**بئس الفقیر علی باب الامیر**" یعنی جو فقیر امراء کے دروازوں پر جائے وہ بہت برا ہے۔ چنانچہ سیر الاولیاء میں ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے پاس اجمیر کے اطراف و نواح میں ایک گاؤں بطور جاگیر حاصل تھا۔ مقامی حکام نے تقاضا کیا کہ اس جاگیر کے لیے باقاعدہ شاہی فرمان حاصل کیا جائے، اور شیخ کے صاحبزدوں نے انہیں مجبور کیا کہ وہ دہلی جا کر بادشاہ سے فرمان لائیں۔ چنانچہ شیخ کو اس وجہ سے اجمیر سے دہلی جانا پڑا۔ دہلی میں وہ شیخ قطب الدین بختیارؒ کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ شیخ قطب الدینؒ نے آپ سے کہا کہ آپ کو بادشاہ کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ فرمان میں لے آتا ہوں۔ چنانچہ شیخ قطب الدین بختیار سلطان شمس الدین ایلتمش کے ہاں تشریف لے گئے۔ بادشاہ انہیں دربار میں دیکھ کر حیران رہ گیا کیونکہ اس سے قبل وہ سلطان کے پاس کبھی نہ گئے تھے۔ ایک مرتبہ بادشاہ

نے خود انہیں ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ سلطان نے اسی وقت جاگیر کا فرمان جاری کر دیا اور اشرفیوں کے توڑوں کے ساتھ انہیں وہ فرمان دیا۔ شیخ قطب الدین وہ فرمان لے کر حضرت خواجہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خواجہ معین الدینؒ نے جب شیخ قطب الدین کی شہرت اور ان کے بارہ میں لوگوں کا اعتقاد دیکھا تو انہیں نصیحت فرمائی کہ ''عزلت میں پوشیدہ رہنا بہتر ہے۔'' (سیر الاولیاء: ص ۹۰)

یہ اللہ والے لوگ صاحبان اقتدار کو ذرا کم ہی ملتے تھے اور ان لوگوں کے ہدیے وغیرہ بھی کم ہی قبول کرتے تھے۔ ایک موقع پر سلطان شمس الدین ایلتمش نے خواجہ قطب الدین بختیارؒ کو جاگیر وغیرہ کی پیشکش کی لیکن آپ نے ان کی اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ سلطان شمس الدین برابر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ اہل شہر کا ان کی طرف کچھ ایسا رجوع تھا کہ لوگ جوق در جوق آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر رشد وہدایت کے موتی چنتے۔ خواجہ معین الدین اجمیریؒ جب دہلی تشریف لائے تو شیخ الاسلام نجم الدین صغریؒ نے حضرت خواجہ اجمیریؒ سے شکایت کی۔ حضرت خواجہؒ نے قطب الدین بختیارؒ سے فرمایا:

> ''بابا بختیار اتنی جلدی ایسے مشہور ہو گئے کہ بندگان خدا کو تم سے شکایت پیدا ہونے لگی۔ یہاں سے اٹھو اور اجمیر آؤ۔ وہاں قیام اختیار کرو۔ میں تمہارے سامنے (خادمانہ) کھڑا رہوں گا۔''
>
> (سیر الاولیاء: ص ۵۴)

یہ دراصل ایک لطیف طریقہ ہے جس سے ایک شیخ نے اپنے مرید کو تنبیہ فرمائی اور یہ بھی بتا دیا کہ یہاں کے اہل فضل وکمال تمہاری قدر و منزلت اور مقام و مرتبہ سے آشنا ہیں۔ خواجہ قطب الدین نے اپنے شیخ کی بات کو سن کر جو جواب دیا وہ بھی نہایت اعلیٰ اور درست تھا۔ عرض کی:

> ''مخدوما! میں تو آپ کے سامنے کھڑے ہونے کا بھی اہل نہیں، بیٹھنے کی کیا مجال ہے۔''

شیخ کا حکم تھا کہ اجمیر چلو اور مرید باصفا چلنے کے لیے فوراً تیار ہو گیا۔ لکھا ہے:

''خواجہ قطب الدین اپنے شیخ خواجہ اجمیریؒ کے ساتھ اجمیر روانہ ہوئے۔ جب دہلی والوں کو شیخ کے اجمیر جانے کا پتہ چلا تو شہر میں ایک شور برپا ہو گیا۔ اہل شہر مع سلطان شمس الدین ایلتمش کے شہر سے نکل کر آپ کے پیچھے ہو لیے۔ جہاں خواجہ قطب الدین کا پاؤں پڑتا تھا لوگ خاک پا کو تبرک سمجھ کر اٹھا لیتے تھے (وہر جا شیخ قطب الدین قدم می گذاشت خلائق خاک آں زمین بہ تبرک برمی داشت) لوگ بڑے بے قرار اور آہ وزاری میں مصروف تھے۔''

(سیر الاولیاء: ص ۵۴)

خواجہ معین الدین نے جب ہجوم کو آتے دیکھا جس میں سلطان شمس الدین ایلتمش بھی پیادہ پا آ رہا تھا تو مرید کو اجمیر لے جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور فرمایا:

''بابا بختیار! تم یہیں رہو، اس لیے کہ خدا کی اتنی مخلوق تمہارے باہر جانے سے تباہ حال اور مضطرب ہے۔ میں اس بات کو جائز نہیں سمجھتا کہ اتنے دل دکھائے اور رلائے جائیں۔ جاؤ، ہم نے اس شہر کو تمہاری پناہ میں چھوڑا۔'' (بروایں شہر را در پناہ تو گذاشتیم)

(سیر الاولیاء: ص ۵۵)

بادشاہوں سے راہ و رسم نہ رکھنے کا ایک سبب یہ حدیث بھی تھی کہ

﴿العلماء امناء الدین اذالم یخالطوا الامراء، واذا خالطوھم، فھم لصوص الدین﴾

''علماء دین کے امین ہیں جب تک وہ امراء اور صاحبان اقتدار سے نہ ملیں یعنی ان کا قرب حاصل نہ کریں۔ اور جب وہ ان کا قرب حاصل کر لیں تو پھر یہ دین کے چور ہیں۔''

لیکن جب ان حضرات نے دین میں رخنہ اندازی دیکھی تو پھر آگے بڑھ کر صاحبان اقتدار کو ٹوکا اور روکا جن کی مثالیں گذشتہ صفحات میں پیش کی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی حفاظت انہی لوگوں سے کروائی۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے لیے جنہوں

نے دین سے بدعات اور ایوان اقتدار کے محدثات کے جھاڑ جھنکار کو صاف کیا، حدیث میں تجدید کا لفظ آیا ہے۔ چنانچہ ابوداؤد وغیرہ میں حدیث ہے کہ

﴿ان اللہ عزوجل یبعث لھذہ الامة علیٰ رأس کل مائة سنة من یجدد لھا دینھا﴾ (ابوداؤد ورواہ الحاکم: جلد۴ص۵۲۲)

''اللہ تعالیٰ اس امت کے لیے ہر سو سال کے سرے پر ایسے بندے پیدا کرے گا جو اس کے لیے اس کے دین کو نیا اور تازہ کرتے رہیں گے۔''

ملا علی القاریؒ نے مرقات میں طبرانی کی معجم اوسط کا بھی حوالہ دیا ہے۔ اور سند اور رجال کے بارے میں لکھا ہے۔

سندہ صحیح و رجالہ کلھم ثقات۔ (مرقات: جلد۱ص۲۸۴)

ان کے علاوہ اور بھی کئی کتابوں میں اس حدیث کی تخریج کا ذکر ہے۔ ملاحظہ ہو کنز العمال: جلد۶ ص ۲۳۸، مجموعۃ الفتاویٰ، مولانا عبدالحی: جلد۲ص ۱۵۱)

اس حدیث میں ''رأس'' کو قید اتفاقی ہے اور اس کا مطلب ''کل قرن'' ہوگا اس بنا پر حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہر قرن اور ہر دور میں اس امت مسلمہ میں ایسے افراد پیدا کرتا رہے گا جو اس امت کے لیے دین کی تجدید کرتے رہیں گے۔ یعنی ماحول اور زمانہ کی آلائشوں اور آمیزشوں سے اس کو صاف کرتے رہیں گے اور اس کی رگوں میں تازہ خون دوڑاتے رہیں گے۔ چنانچہ مشہور غیر مقلد عالم نواب صدیق حسن خانؒ نے اس حدیث کی تشریح میں لکھا ہے:

"رأس مائة" سے مراد خاص صدی کا آغاز نہیں ہے بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر صدی میں مجدد کھڑے کرے گا، خواہ ابتداء میں، خواہ درمیان میں خواہ آخر میں، اور رأس کی قید صرف اتفاقی ہے، اور غرض حدیث کی صرف یہ ہے کہ کوئی صدی کسی مجدد کے وجود سے خالی نہ ہوگی اور ہر صدی کے اوائل، اواسط اور اواخر میں مجدد دین کا ہونا اس احتمال کے درست اور صحیح ہونے کی تائید کرتا ہے۔'' (حج الکرامہ: ص۱۳۴)

اکبری فتنہ اور اس کے برگ و بار:

دسویں صدی ہجری میں سرزمین پاک و ہند میں ایک بہت بڑا فتنہ رونما ہوا جس نے ذہنوں میں انتشار عقائد میں عظیم تزلزل، دین کی صحیح تعلیم اور کتاب و سنت کے علم سے نہ صرف غفلت و جہالت بلکہ وحشت و نفرت پیدا کر دی۔ اہل یونان کے علوم کو عقل کی آخری منزل قرار دیا جانے لگا، اور اسی کو حکمت، علوم دانش مندی اور انسانی علوم کا نقطۂ کمال کہا جانے لگا۔ علوم نبوت، صحف آسمانی، وحی و تنزیل اور نصوص قرآنی کی تضحیک وتحقیر کی جانے لگی اور ان پر ایمان لانے کو جہل، دقیانوسیت، کورانہ تقلید اور عقل دشمنی قرار دیا جانے لگا۔ پھر اس کے ساتھ اس وقت کی حکومت اور سیاسی نظاموں سے بیزاری بھی بغاوت و اشتعال کی حد تک پہنچ گئی۔ دسویں صدی کے نصف آخر میں عالم اسلام کے مختلف حصوں میں خاص طور پر اس کے سب سے بے چین، طباع اور تخلیقی و اختراعی صلاحیت رکھنے والے خطہ ایران میں جس کو بہت سی مماثلتوں کی وجہ سے مشرق کا یونان کہنا صحیح ہوگا، اس خیال کے عکس نظر آتے ہیں۔

ظہور اسلام کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ایک ہزار سال پورے ہو رہے تھے اور دوسرا ہزار شروع ہو رہا تھا۔ ہر صدی کے سرے پر مجدد کا ظاہر ہونا حدیث سے ثابت ہوتا ہے اور اسلام کی تاریخ بھی اس کا ثبوت فراہم کرتی ہے، اس لیے بعض ذہین لوگ مجدد سے زیادہ دین جدید کے مؤسس و بانی اور عالم کے نئے دور کے فاتح کے ظہور کے خواب دیکھنے لگے تھے، اور ان میں سے منچلے لوگوں نے اپنا نام اس منصب کے امیدواروں میں لکھانے کی کوشش بھی شروع کر دی، اور بقول مولانا ابوالحسن علی ندویؒ ایران میں صفوی حکومت کے قیام کے بعد جس نے شیعیت کو حکومت کی طاقت اور قوت سے سارے ایران کا مذہب بنا دیا تھا۔ اور اگرچہ اس سلطنت کے بانیوں کے مورث اعلیٰ شیخ صفی الدین مسلکاً و ذوقاً صوفی تھے، لیکن شیعیت کو چونکہ تصوف سے بیر ہے، اس لیے ان کے دور اقتدار میں اس ایران میں جس نے امام غزالی طوسیؒ، شیخ فریدالدین عطار نیشاپوری، مولانا جلال الدین رومی (جو اصلاً بلخ واقع ایران کے رہنے والے تھے حال واقع

افغانستان) اور مولانا عبدالرحمٰن جامی جیسے عارف و محقق پیدا کیے تھے اور جس سے بغداد، دہلی اور اجمیر کو حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی، خواجہ بزرگ شیخ معین الدین چشتیؒ اور شہید حق خواجہ قطب الدین کعکیؒ میسر آئے تھے، تصوف کا چراغ بالکل گل ہو گیا۔ دوسری طرف کتاب و سنت کا وہ علم اور فن حدیث جس کا ایران بڑا مرکز رہ چکا تھا اور جس نے تاریخ اسلام کو مسلم بن الحجاج القشیری نیشاپوریؒ، ابو عیسیٰ ترمذیؒ، ابو داؤد سجستانیؒ اور ابن ماجہ قزوینی اور حافظ عبدالرحمٰن نسائیؒ جیسے امام حدیث اور مصنفین صحاح عطا کیے، وہ اب کتاب و سنت اور علوم حدیث سے بالکل بیگانہ اور تہی دامن تھا۔ اب اس کے علم کا تمام ہدف اور اس کے امتیاز و تفوق کا میدان یونانی علوم و حکمت (فلسفہ و منطق) تھے۔ اس انقلاب نے جس کو نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ اور ان کی سنت و احادیث سے اس مردم خیز اسلامی ملک کا رشتہ پہلے ہی کاٹ دیا تھا، ملک کے ذہین اور طباع طبقہ کا رابطہ نبوت محمدی، عقیدۂ ختم نبوت اور دین اسلام کے خلود و بقا کے عقیدہ سے اگر منقطع نہیں کیا تو کمزور ضرور کر دیا، اور اگر اہل بیت کرامؓ سے شیعیت کی بنیاد پر عقیدت و نسب نہ ہوتی تو اس ملک کا مجوسیت، ماقبل اسلام کی تہذیب اور شاہ نامہ فردوسی کے رستم و اسفند یار کے دور کی طرف واپس چلے جانے کا خطرہ تھا۔''

اس دسویں صدی میں اگرچہ عالم اسلام کی سیاسی، دینی، روحانی اور علمی حالت کوئی خاص خراب نہ تھی لیکن یہ بھی نہیں کہ زندگی کے دریا میں جو ہزاروں میل کی مسافت میں بہہ رہا تھا، جس میں شریعت اور دین کی نشر و اشاعت، اس کی تعلیم و تربیت اور اخلاق و روحانیت کی ترقی کی کشتی پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ چلائی جا سکتی تھی اور اس کو کسی بھنور اور تلاطم کا کوئی اندیشہ نہ تھا، لیکن معاملہ ایسا نہ تھا بلکہ ہندوستان کے اسلام کے دینی اور ثقافتی مرکز حجاز مقدس سے دور ہونے، اسلام کے یہاں ایران کا اور ترکستان کا چکر کاٹ کر پہنچنے، عربی زبان کے رائج نہ ہونے، علم حدیث کی عدم اشاعت جس سے دین کی صحیح روح، سنت و بدعت کا فرق اور صحیح دینی احتساب کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے' حج اور طلب علم کے لیے بیرونی ملکوں کے سفر کی دشواریوں اور مسلمانوں کا غیر مسلموں کی اکثریت میں گھرے رہنے نے (جو اپنے مذہب میں نہایت سخت اور راسخ الاعتقاد، غیر

اسلامی رسم ورواج کی سختی سے پابند اور حد درجہ توہم پرست تھی) ہندوستان کے مسلمانوں کی تشتت وانتشار پسند دعوتوں اور طالع آزما مذہبی پیشہ وروں کی آسان چراگاہ بنادیا تھا۔ اس سلسلہ کی کڑی تشیع کی وہ غالی اور جارحانہ شکل تھی جو ایرانیوں کے اثر سے جنوبی ہند کے بعض مقامات اور کشمیر میں پیدا ہوئی۔ تاریخ فرشتہ وغیرہ میں ہے کہ دسویں صدی کے وسط میں احمد نگر کے والی سلطنت سلطان برہان نظام شاہ نے شیخ طاہر بن رضی اسماعیلی قزوینی کے اثر سے جو ایران سے شاہ اسماعیل صفوی کے ظلم وستم کے خوف سے بھاگ کر احمد نگر آئے تھے، تشیع قبول کر لیا اور اس میں بڑا مبالغہ کیا یہاں تک کہ مسجدوں، خانقاہوں، بازاروں اور سڑکوں پر خلفائے ثلاثہ (سیدنا ابوبکرؓ، سیدنا عمرؓ اور سیدنا عثمانؓ) پر علی الاعلان تبرا کرنے کا حکم دیا۔ اس خدمت کے انجام دینے والوں کے لیے بڑے بڑے مشاہرے مقرر کیے۔ اہل سنت میں سے بہت سے لوگوں کو قتل اور گرفتار کیا۔ دوسری طرف میر شمس الدین عراقی کی کوششوں سے کشمیر میں تشیع پھیلا۔ انہوں نے اپنے اس مذہب کی اشاعت میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ کہتے ہیں کہ 34 ہزار ہندو شیعہ ہو گئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ایک جدید مذہب بھی ایجاد کیا جس کا نام نوربخشی تھا۔ اس مذہب کے مسائل نہ تو اہل سنت کے مطابق تھے اور نہ ہی فرقہ امامیہ کے مسائل کے مطابق تھے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کشمیر میں اس نوربخشی فرقہ کا عقیدہ یہ تھا کہ سید محمد نور بخش مہدی موعود ہے۔

شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر 950ھ میں فوجی امداد اور سلطنت ایران کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ہمایوں ایران گیا۔ اس وقت ایران میں اسماعیل صفوی جیسے متعصب اور ظالم بادشاہ کا بیٹا طہماسپ تخت نشین تھا۔ طہماسپ نے ہمایوں سے مذہب تشیع قبول کرنے کی شرط لگائی کہ فوجی مدد اس صورت میں کی جائے گی جب ہمایوں شیعہ مذہب قبول کرے گا۔ ہمایوں نے کہا کہ ایک پرچہ پر تمام معتقدات لکھ دیئے جائیں۔ بادشاہ نے بطریق نقل اس کو پڑھ دیا۔ (منتخب التواریخ: جلد ا ص ۴۴۵) بادشاہ کے تبدیلی مذہب کی اگرچہ کوئی مستند شہادت نہیں ہے لیکن اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ایران کے قیام کے دوران میں شاہ ایران کی فیاضانہ میزبانی اور مسافرنوازی کے لیے وہ

نرم گوشہ ضرور پیدا ہو گیا ہو گا جو اس کے راسخ الاعتقاد تیموری آباء واجداد کے دل میں (جو راسخ الاعتقاد سنی حنفی تھے) پایا نہیں جاتا تھا۔ ہمایوں کی مدد کے لیے ایران سے امراء قزل باش آئے تھے اور پھر اس کے ساتھ شیعہ علماء اور مجتہدین کا برصغیر پاک و ہند میں ایک تانتا لگ گیا۔ ہمایوں بذات خود نیک دل، شائستہ اور مہذب انسان تھا۔ ہر وقت باوضو رہتا تھا اور اللہ رسول ﷺ کا نام بغیر طہارت کے نہیں لیتا تھا۔ اس کے امرائے خاص اور ارکان سلطنت میں ایک اہم مقام کا حامل بیرم خان تھا۔ یہ اگرچہ بڑی خوبیوں اور کمالات کا سردار تھا۔ جمعہ اور جماعت کا پابند، مشائخ کا قدردان لیکن شیعہ تھا۔ اس کا ایک مشہور شعر ہے

شہے کہ بگذرد از نہ سپہر افسر او
اگر غلام علی نیست خاک برسر او

میر شریف آملی علوم حکمت میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ وہ اکبر کے عہد میں ہندوستان آیا۔ اکبر نے اس کی بڑی پذیرائی کی۔ وہ ملحدانہ خیالات رکھتا تھا۔ تصوف کو فلسفہ سے مخلوط کیا، اور وہ عینیت کا قائل تھا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی تحریکیں ملک میں جاری تھیں جو سخت انتشار انگیز، دین کے لیے خطرناک اور باعث تخریب تھیں جیسے ذکری فرقہ، دوسرا فرقۂ روشنائیہ اور تیسری تحریک مہدویت جس کو مؤرخین اس عہد کی زلزلہ انگیز تحریک کہتے ہیں۔ اس کا بانی سید محمد جونپوری تھا۔ ان تحریکوں کے پیدا ہونے کے کئی اسباب و محرکات تھے جن کا بیان کرنا یہاں ضروری معلوم نہیں ہوتا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اس کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے:

> ''مسلمانوں کی عام سماجی اور اخلاقی حالت تیزی کے ساتھ زوال پذیر ہو رہی تھی۔ افسانہ شاہاں اور تاریخ داؤدی میں جن قصوں کو عجائب روزگار بنا کر پیش کیا گیا ہے، وہ اخلاقی پستی اور اخلاق کی زبوں حالی کے آئینہ دار ہیں۔ فقیروں کی عیاشانہ زندگی، طالب علموں کی بے راہ روی، تعویذ گنڈوں میں بے جا اعتقاد، جنوں اور دیوؤں کے قصے، چراغ سلیمان کی داستانیں، کسی مضبوط معاشرہ یا

محکم اخلاقی نظام میں اس طرح عام نہیں ہو سکتی تھیں۔ حقیقت میں مہدوی تحریک اس ذہنی انحطاط اور مذہبی جمود کو دور کرانے کی ایک کوشش تھی۔" (سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات: ص ۴۵۱)

اکبری حکومت کے دو دور:

تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ اکبر جب تخت نشین ہوا تو وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر اسے پختہ یقین تھا۔ بدعقیدگی اور خلاف جمہور عقائد پر وہ سخت سزا دیتا تھا۔ علماء اور صلحاء کی صحبت میں وقت گزارتا تھا، اور اولیاء اللہ کے مزارات پر بھی عقیدت کے پھول نچھاور کرتا تھا۔ ملا عبدالقادر بدایونی اور اس زمانہ کے دوسرے تمام مورخین نے ان چیزوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ملا عبدالقادر نے اپنی کتاب منتخب التواریخ میں لکھا ہے کہ

1- شہزادہ سلیم کی ولادت کے شکرانہ میں اکبر نے اجمیر کا پا پیادہ سفر کیا اور واپسی پر دلی میں اولیائے دہلی کے مزارات کی زیارت کی۔
2- پاک پٹن جا کر حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر کے مزارات کی زیارت کی۔
3- اوائل شعبان میں اجمیر کا سفر کیا اور سات کوس سے پیادہ پا مزار پر حاضری دی۔
4- عبادت خانہ میں ہر جمعہ کی رات سادات ومشائخ اور علماء وامراء کی طلبی ہوتی۔ بادشاہ وہاں خود بیٹھ کر مسائل کی تحقیق کرتا۔
5- جب خان زمان نے اکبر کے خلاف بغاوت کی تو اس کے مقابلہ پر نکلنے سے پہلے اکبر دہلی کے تمام اولیائے کرام کے مزارات پر دعا کی غرض سے حاضر ہوا اس سے اس کی اولیاء اللہ سے محبت کا اظہار ہوتا ہے۔
6- شیخ سلیم چشتی کے ساتھ اکبر کو خاص عقیدت تھی۔ ان کا مزار بڑے اہتمام سے تعمیر کرایا اور اس عقیدت ومحبت کی بنا پر جہانگیر کا جو کہا جاتا ہے کہ ان کی دعا سے پیدا ہوا، سلیم نام رکھا۔ بادشاہ نے سلیم کی ولادت سے قبل رانی جودھا بائی کو شیخ کے گھر بھیج دیا تھا تا کہ ان کی توجہ اور دعا رانی کے شامل حال رہے۔

7- اسی طرح شہزادہ مراد کی ولادت بھی شیخ ہی کے گھر میں ہوئی تھی۔
8- شہزادہ سلیم کی رسم تسمیہ خوانی اس زمانے مشہور محدث میر کلاں ہرویؒ سے کروائی۔
9- جب شہزادہ سلیم لکھنے پڑھنے کے قابل ہوا تو اسے حکم دیا کہ شیخ عبدالنبی کے گھر جا کر ان سے حدیث کی تعلیم حاصل کرے۔ اکبر کو شیخ عبدالنبی (نبیرہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی) سے اتنی عقیدت و محبت تھی کہ اکثر ان کے گھر جا کر ان کے درس میں شرکت کرتا، بلکہ ایک دو مرتبہ ان کی جوتیاں بھی سیدھی کیں۔ اکبر نے ان کے لیے شاہی کارخانہ میں خصوصی دوشالہ تیار کروایا اور ملا عبدالقادر کے ہاتھ ان کی خدمت میں بھیجا اور کہا کہ یہ آپ ہی کے لیے شاہی کارخانہ میں تیار ہوا ہے۔
10- اس عہد کے مشہور شطاری بزرگ شیخ محمد غوث گوالیاری کے گذارہ کے لیے ایک کروڑ سالانہ کی آمدنی کی جاگیر مخصوص کردی، اوران کے انتقال کے بعد وہ ان کے صاحبزادے شیخ ضیاء اللہ کے ساتھ بھی نیازمندانہ طریقہ پر پیش آتا۔

مشہور مورخ میر عبدالرزاق خافی خان کی مشہور کتاب مآثر الامراء میں اکبر کی دنیداری کی شہادت میں یہ لکھا ہے کہ

> ''اگرچہ بادشاہ احکام شرعیہ کے اجراء، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں بڑی کوشش کرتا تھا۔ خود اذان دیتا تھا اور امامت کراتا حتیٰ کہ ثواب کی نیت سے مسجد میں اذان بھی دیتا تھا۔''
>
> (مآثر الامراء: جلد۲ ص ۵۶۱)

ان ساری عبادتوں کو دیکھ کر اگر اکبر کی دینداری کا تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کی دینداری سطحی اور عامیانہ دینداری تھی جس کی بنیاد کتاب وسنت کے صحیح فہم سے آشنائی اور براہِ راست علم پر نہ تھی، اور وہ بجائے علمائے راسخین کی صحبت و تربیت کے رہین منت ہونے کے مذاق زمانہ اور ناواقف امراء اور اہل حکومت کی تقلید و نقالی اور ضعیف الاعتقادی پر مبنی تھی۔ اس دینداری کا رکن اعظم مزارات پر حاضری دینا، کوسوں

پیادہ پا چل کر وہاں جانا اور وہاں کے سجادہ نشینوں اور مجاوروں کے ساتھ جو اکثر بے علم، جاہل، اسلاف کے کمالات سے عاری اور صحیح روحانیت سے خالی ہوتے تھے، اپنی نیاز مندی کا اظہار کرنا، درباری سرکاری علماء و مشائخ کی توقیر و تعظیم، مجالس سماع میں شرکت وغیرہ تھی۔ ان سب باتوں کے باوجود وہ خود علم سے یک قلم کورا اور ناخواندۂ محض تھا۔ اس کا بچپن اور عنفوان شباب ناہموار اور غیر معمولی حالات میں گذرا۔ چچاؤں کی بے مروتی اور بے مہری کا اس نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا۔ اپنے باپ کی شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست اور سفر ایران، پھر ایران میں مسافرانہ قیام، ان سب حالات نے اس کی فطرت اور طبیعت میں بدگمانی اور اچھے اچھے آدمیوں کے خلوص اور وفاداری کے بارے شک وریب کا نظریہ اس کی طبیعت کا ایک جزو لاینفک ہو گیا تھا۔

ناخواندہ اور غیر تعلیم یافتہ ہونا ہی اس کی شخصیت کا ایک بہت بڑا نقص تھا، لہٰذا اس کے لیے بہتر تھا کہ وہ مذہبی امور میں دخل نہ دیتا، خاص طور پر کلامی مسائل، مذاہب و ادیان کے تقابل اور ماوراء الطبیعاتی حقائق کی تحقیق کے میدان میں ہرگز قدم نہ رکھتا، لیکن اکبر نے بے چین اور متجسس دماغ پایا تھا۔ وہ اپنی مسلسل فتوحات اور کامیابیوں کی وجہ سے کسی قدر خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا اور وہ سمجھنے لگا تھا کہ جس طرح وہ ملکی مسائل کو حل کرتا اور سیاسی گتھیوں کو سلجھاتا ہے، اسی طرح وہ مذہب اور عقائد کی پرخار وادیوں میں بھی کامیاب ترکتازیاں کر سکتا ہے، حالانکہ یہ بات اس کے لیے نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن تھی۔ دوسری طرف بعض شاطر ارکانِ سلطنت اور درباریوں نے کچھ تو اپنا ذہنی تفوق ظاہر کرنے کے لیے اور کچھ بادشاہ کی تفریح طبع کے لیے مختلف مذاہب و ادیان اور فرقوں کے علماء کے دنگل قائم کیے اور اس بات کو مذہبی تحقیق اور علمی مباحثہ کا نام دیا، حالانکہ کوئی شخص اس قسم کے علمی مباحثہ کے لیے گہرا اور وسیع علم اور دقیقہ رس دماغ نہیں رکھتا، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ توفیق الٰہی اس کا ساتھ نہیں دیتی تو وہ اکثر و بیشتر تشکیک و ارتیاب اور لا ادریت کی عمیق اور گہری خندق میں گر جاتا ہے۔ چنانچہ اکبر کے بیٹے جہانگیر نے اپنے باپ کی بابت تزک جہانگیری میں لکھا ہے کہ ''میرا باپ اکثر ہر دین و مذہب کے دانشوروں سے ملاقات کرتا تھا خصوصاً ہندوستانی فاضلوں اور پنڈتوں سے، اور ناخواندہ

اور امی ہونے کے باوجود کثرت مجالست کی وجہ سے علماء اور فضلاء کے ساتھ گفتگو میں کسی کو اس کے امی اور ناخواندہ ہونے کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ نظم ونثر کی باریکیوں اور دقائق کو وہ اس طرح سمجھتا تھا کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں تھا۔'' (ص ۱۵)

پھر اس نے اسی بات پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ اہل دربار کی طرف سے توریت، انجیل اور زبور کے ترجمے اور ان کے مطالب کو بادشاہ تک پہنچانے کا اہتمام کیا گیا۔ ان کتابوں کے ترجموں کے ساتھ عقیدۂ تثلیث اور عیسائی عقائد کو دلائل سے ثابت کرنے کے لیے عیسائی پادریوں کی ایک کھیپ بھی دربار اکبری میں درآمد کی گئی۔

(منتخب التواریخ: جلد۲ص ۲۶۰)

ملا عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے کہ

''اہل بدعت اور ہوا پرست لوگ اپنی غلط آراء اور باطل شبہات کی وجہ سے کمین گاہوں سے نکل آئے اور باطل کو حق کی صورت میں اور خطا کو صواب کی صورت میں پیش کرنے لگے، اور بادشاہ کو جو جوہر ذاتی رکھتا تھا اور طالب حق مگر محض امی اور ناخواندہ اور کافروں سے مانوس تھا، شک وارتیاب میں مبتلا کر دیا اور اس کی حیرت میں اضافہ کر دیا اور مقصد فوت ہو گیا اور شریعت کا بندھ ٹوٹ گیا اور پانچ چھ سال کے بعد اسلام کا کوئی اثر نہ رہ گیا اور معاملہ بالکل الٹ گیا۔'' (منتخب التواریخ: جلد۲ص ۲۵۵)

ارکان دین اور اسلامی عقائد کے بارے میں تمسخر اور ٹھٹھے کے ساتھ طرح طرح کے شکوک وشبہات پیدا کیے جانے لگے اور تفسیر وتاریخ کو جن میں ناخدا ترس اور غیر راسخ العلم لوگوں کو ذہنی انتشار اور فکری ناہمواری پیدا کرنے کی بڑی گنجائش ہے، غیر سنجیدہ طریقے سے دربار شاہی میں پڑھے جانے لگے۔ دیپ چندہ مسخرہ راجہ منجولہ کہتا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک گائے محترم اور معظم نہ ہوتی تو قرآن حکیم کی پہلی سورت میں کیوں اس کا ذکر ہوتا۔ تاریخ کو غیر سنجیدہ انداز میں پڑھنے کی صورت میں صحابہ کرامؓ کے بارے میں لوگوں کا اعتقاد خراب کیا جانے لگا اور نماز روزہ اور تمام نبوی تعلیمات کو

تقلیدیات کا نام دیا جانے لگا۔ دین کی بنیاد بجائے نقل کے عقل پر رکھی جانے لگی۔ فرنگیوں کی آمد ورفت دربار میں اکثر ہوگئی۔ چنانچہ ان کے بعض معتقدات بھی قبول کر لیے گئے۔

ایک طرف یہ معاملہ تھا دوسری طرف علماء اور ارکان سلطنت کا ایک خاص گروہ تھا۔ اہل بدعت اور ہوا پرست لوگوں کے اس حملہ کے باوجود اکبر کی اسلام کی صراط مستقیم پر قائم رکھنے اور اس کے مزاج کو بے اعتدالی اور انحراف کی شاہراہ سے ہٹانے میں علمائے دربار اور ارکان سلطنت بھی ایک اہم اور بنیادی کردار ادا کر سکتے تھے، لیکن افسوس کہ ان دونوں جماعتوں میں سے جو عنصر ملا وہ نہ صرف یہ کہ صحیح معیار پر پورا نہیں اترتا تھا بلکہ وہ اس سلسلہ میں خدمت کے بجائے بدخدمتی اور اکبر کو دین سے قریب کرنے کے بجائے اس کو دین سے دور، متوحش اور متنفر کرنے اور ان مخالف اسلام دعوتوں اور تحریکوں سے دور رکھنے یا ان کے استیصال پر آمادہ کرنے کے بجائے ان کو ان دعوتوں اور تحریکوں کا علمبردار بنانے کی خدمت انجام دینے لگا۔ اور جو حضرات حکمت دین اور تفقہ کا جوہر رکھتے، ان کی نگاہ جزئیات سے زیادہ کلیات پر اور وسائل سے زیادہ مقاصد پر ہوتی۔ اخلاق عالیہ سے متصف، بے غرض، جاہ طلبی اور حب دنیا کے جذبہ سے امکانی حد تک دور اور وہ اس عظیم نوخیز اسلامی سلطنت کی اہمیت و نزاکت کو خوب سمجھتے ہوئے جو ایک غیر مسلم اکثریت سے گھری ہوئی تھی تو ان کو جس تیموری سلطنت کی خدمت اور راہ نمائی کا زریں اور تاریخی موقع ملا تھا، اور وہ اس وقت ترکی کی عثمانی سلطنت کے بعد ہر لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی مسلم ریاست تھی، اس لیے اس کی حفاظت، اس کا دین اسلام سے رشتہ قائم رکھنے اور اس کے سربراہ کو ان نازک حالات میں اس شیشہ و آہن اور پنبہ و آتش کو اکٹھا رکھنے میں مدد دینے کو وقت کی سب سے بڑی عبادت سمجھتے اور دین و ملک کی سب سے بڑی خدمت تصور کرتے، لیکن افسوس کہ اس قسم کے علمائے دین اور ارکان سلطنت میسر نہ آئے، اور اگر میسر آجاتے تو اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ یہ سلطنت مشرق میں حمایت اسلام اور خدمت دین کا وہی کردار ادا کرتی جو مغرب میں آل عثمان کی حکومت نے کیا۔

علمائے دربار:

جہاں تک علمائے دین کا تعلق ہے جن پر اکبر نے آغاز حکومت میں سب سے زیادہ اعتماد اور اعتبار کیا، ان کے بارے میں ملا عبدالقادر بدایونی جو خود ارکانِ دربار میں سے ہے، لکھتا ہے:

''عبادت خانہ میں ہر جمعہ کی رات کو علماء و امراء اور سادات و مشائخ کی طلبی ہوتی تھی۔ آگے پیچھے بیٹھنے میں نفسانیت کا اظہار ہوتا۔ ہر ایک دوسرے سے آگے اور ممتاز جگہ پر بیٹھنے کے لیے تگ و دو کرتا۔ بادشاہ نے اس مشکل کا حل اس طرح کیا کہ حکم دیا کہ امراء مشرق کی جانب اور سادات مغرب کی جانب، اور مشائخ شمال میں بیٹھیں۔ اور بادشاہ خود ہر ایک حلقہ میں آتا اور مسائل کی تحقیق کرتا۔'' (منتخب التواریخ: جلد ا ص ۲۰۲)

اس زمانہ میں دربار میں دو اہم رکن تھے۔ ان میں ایک ملا عبداللہ سلطان پوری تھے جن کا عہدہ مخدوم الملک تھا، اور دوسرے صدر الصدور مولانا عبدالنبی تھے جو اس وقت ہندوستان کے سب سے بڑے عالم اور فن حدیث کے ماہر سمجھے جاتے تھے حالانکہ دراصل وہ اتنے بڑے عالم نہ تھے۔ (پھر معلوم نہیں کس نے ان کو اس عہدہ پر فائز کر دیا تھا) یہ دونوں حضرات ایک دوسرے کے حریف اور رقیب تھے۔ مخدوم الملک شیخ عبدالنبی کو الزام دیتے جب کہ شیخ عبدالنبی مخدوم الملک کی تجہیل و تکفیر کرتے۔ جب ان دونوں کا حال یہ تھا تو ان کے حامی اور طرف دار تو ان سے بھی دو قدم آگے تھے۔ ان دونوں حضرات کے وقائع زندگی کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں حضرات علم و حکمت دینی اور تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس کے لحاظ سے اس نازک زمانہ اور دربار اکبری کے اس اہم پیچیدہ ماحول میں دین کی صحیح نمائندگی کے لیے موزوں نہ تھے۔ یہ دونوں عام تہذیب اور موقع شناسی سے یک قلم عاری تھے۔ مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری کے بارے میں تواریخ میں ہے کہ انہوں نے محض اس لیے کہ انہیں حج نہ کرنا پڑے فریضۂ حج کے اسقاط کا فتویٰ دیا تھا۔ زکوٰۃ کے معاملہ میں

بھی حیلہ شرعی سے کام لیتے تھے اور اس کی فرضیت سے بچ جاتے تھے یعنی حولانِ حول (ایک سال گزر جانے) سے پہلے وہ رقم جس پر زکوٰۃ فرض ہو رہی تھی، اہلیہ یا کسی دوسرے عزیز کو دے دیتے۔ وہ لینے کے بعد وہ رقم انہیں قریباً ایک ماہ کے بعد واپس کر دیتا۔ اس طرح وہ اس سال زکوٰۃ سے بچ جاتے کیونکہ زکوٰۃ کے لیے حولان حول شرط ہے۔ آئندہ سال بھی یہی عمل کرتے۔ اس طریقہ سے انہوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں اتنی دولت اکٹھی کر لی تھی کہ سونے سے بھرے ہوئے صندوق ان کے آبائی قبرستان سے برآمد ہوئے جنہیں مردوں کے بہانہ سے انہوں نے دفن کیا ہوا تھا۔

دوسرا عالم دین جس کو اکبری دربار میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی، وہ صدر الصدور مولانا عبدالنبی تھا۔ اس کا علمی پایہ کچھ اتنا بلند نہیں تھا جتنا جاہ و جلال اور اختیار و اقتدار اس کو حاصل تھا۔ دربار اکبری میں اس کی ایک خاص اہمیت حاصل تھی اور اس کا ایک خاص مقام تھا۔ اچھے اچھے ارکان دولت اور ارباب سلطنت کا چراغ اس کے سامنے نہیں جلتا تھا۔ بڑے بڑے علماء اور مشائخ شرف باریابی حاصل کرنے کے لیے گھنٹوں اس کے دروازے پر کھڑے رہتے۔ کئی مرتبہ خود بادشاہ اکبر نے اپنے ہاتھوں سے اس کو جوتے پہنائے، لیکن اتنا مرتبہ اور مقام حاصل ہونے کے باوجود ملا عبدالنبی میں علماء کے وہ اعلیٰ اخلاق مفقود تھے اور عام تہذیب اور موقع شناسی سے بھی وہ عاری تھا بلکہ وہ اپنے عہدہ اور اثر و رسوخ کا غلط استعمال کرنے اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں مہارت تامہ رکھتا تھا، اور اس پر مستزاد یہ کہ مخدوم الملک اور ملا عبدالنبی کی آپس میں ہر وقت سر پھٹول رہتی تھی۔ ملا عبدالقادر کا بیان ہے کہ ان علماء کو جو اکبر کے عہد کی زینت تھے، وہ غزالی اور رازی سے بہتر سمجھتا تھا لیکن جب ان کی یہ نحیف اور بچگانہ حرکتیں دیکھیں تو علمائے سلف کو بھی ان پر قیاس کر کے سرے سے ان علماء ہی کا منکر ہو گیا بلکہ ان کو بھی ان جیسا سمجھنے لگے۔

ملا مبارک ناگوری اور اس کے فرزندان:

دربار اکبری میں پہلے ہی کافی اہل علم و فضل موجود تھے جو اکبر کو دین کی صراط

مستقیم سے ہٹا کر اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے اور اس کی ناخواندگی اور جہالت سے فائدہ اٹھا کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے اور اپنے معتقدات اور نظریات کی اشاعت و تبلیغ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اکبر کے قدموں کو متزلزل بھی کر دیا تھا۔ اسی اثناء میں ایران سے تین بھائی حکیم فتح اللہ گیلانی، حکیم ہمایوں اور نورالدین قراری وارد ہوئے اور دربار میں اونچی اور اہم جگہ پالی۔ کچھ عرصہ کے بعد ملا یزدی ولایت سے آئے اور صحابہ کرامؓ کے بارے میں بے باکانہ زبانِ طعن کھولی اور حکیم ابوالفتح نے حقائق دینی وغیرہ کا برملا انکار کیا۔ اس عرصہ میں کچھ اور لوگ بھی آئے جنہوں نے اکبر کے ذہن میں تشتت و انتشار اور دین کے بارے میں بغاوت کی تخم ریزی کی۔ کچھ بذلہ سنج اور لطیفہ گو ہندو بھی دربار میں داخل ہوئے اور بہت جلد اکبر کے مزاج میں دخیل ہو گئے۔ ان میں ایک راجہ بیربر تھا جس کا اصل نام برہم داس تھا۔ چنانچہ ان سب لوگوں نے مل کر بادشاہ کے مزاج کو دین کے معاملہ میں غیر سنجیدہ بنا دیا۔ اس پر طرفہ یہ کہ ملا مبارک ناگوری کی آمدورفت دربار اکبری میں شروع ہو گئی اور جلد ہی اس کے دونوں بیٹوں فیضی اور ابوالفضل کو بادشاہ کے مزاج میں ایسا دخل اور دربار میں ایسا اعزاز حاصل ہوا جو اس سے قبل کسی اور کو نہ تھا۔ یہ تینوں باپ بیٹے نہایت ذکی، اعلیٰ علمی استعداد اور تبحر رکھنے والے، علوم عقلیہ و ادبیہ پر حاوی، عربی اور فارسی کے شاعر اور انشاء پرداز، غرضیکہ ہر قسم کے علوم وفنون کے لحاظ سے لائق فاضل اور دانشور تھے۔ اگر ان تینوں میں دین میں استقامت اور رسوخ فی الدین، خدا ترسی، آخرت کوشی، زہد و ورع اور اخلاص وللّٰہیت ہوتی تو وہ اس عہد کی ایسی دینی خدمت انجام دے سکتے تھے جس کی نظیر ملنی مشکل ہوتی، لیکن ان کی تصنیفات اور ان کی کاروائیوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان تینوں کی طبیعت میں بے چینی اور دماغ میں شورش تھی۔ وہ اسلاف کے پورے فقہی ذخیرے سے بے اعتقاد ہو گئے۔ شیراز کے مشہور فاضل معقولات ابوالفضل گازرونی کے حلقہ میں شریک ہو کر ان پر تفسلف کا غلبہ ہوا۔ مکائد شیطان اور امراض نفس میں بری طرح مبتلا تھے۔ شیطانی کوچوں سے گزرنے کے بعد ان کے اندر ایک تلون اور انتشار پیدا ہو گیا۔ چنانچہ حضرت باقی باللہ کے صاحبزادے خواجہ کلاں جن کی تربیت شیخ مبارک کی بیٹی کے گھر میں

ہوئی تھی، ان کے بارے میں لکھتے ہیں: ''ہر زمانے کا وہ مروجہ مذہب و مشرب اپنا لیتے تھے جس سے امراء اور ملوک بھی رغبت رکھتے تھے۔'' اور سر ویلزلی ہینگ لکھتا ہے کہ

''شیخ مبارک مختلف ادروار میں سنّی، شیعہ، صوفی اور مہدوی کے علاوہ خدا جانے کیا کیا رہ چکا تھا۔'' (کیمبرج ہسٹری آف انڈیا: جلد۴ ص ۱۸)

اس زمانہ کے علماء نے اور خاص طور پر مخدوم الملک اور ملا عبدالنبی جو دربار اکبری پر حاوی تھے، ان کو وہ مقام نہیں دیا تھا جس کے وہ اپنے علم و فضل، ذہانت و فطانت اور قابلیت وفضیلت کی بنا پر اہل تھے اور ان کے بعض معتقدات و خیالات اور تلون مزاجی کی بناء پر دینی حلقوں میں ان کی سخت مخالفت کی جاتی تھی۔ ان باتوں کا زخم ان کے دل پر بہت گہرا تھا۔ علماء کی اس مخالفت کی وجہ سے اس پورے گھرانے میں احساس کمتری پیدا ہو گیا جو مختلف شکلوں میں احساس برتری کی شکل میں ظاہر ہوتا۔ اب انہوں نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ نہایت ذہین اور دانشور ہیں اور ان کے علم و ذہانت کے سامنے کسی کا چراغ نہیں جل سکتا، اس کوشش میں انہوں نے اسلام اور پورے دینی نظام کو داؤ پر لگا دیا۔ اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ یہ تینوں ہر علم وفن میں یگانۂ روزگار تھے لیکن انہوں نے اسلام، شعائر اسلام اور علوم اسلامیہ کو جو نقصان پہنچایا اس کی تلافی وہ بعد میں نہ کر سکے اگرچہ ان کو بعد میں اپنی اس غلطی کا احساس بھی ہو گیا تھا۔ چنانچہ ابوالفضل ایک خط میں خانخاناں کو اپنے بارے میں لکھتا ہے:

''اس دردناک کہانی کا ایک معمولی المیہ یہ ہے کہ راقم سطور مشاغل لایعنی کے جہنم میں پھنس کر بندۂ خدا کے مرتبہ سے گر کر بندۂ فطرت ہو گیا اور اس کے قریب پہنچ گیا کہ خدا کی بندگی کے بجائے بندۂ درہم و دینار کہا جانے لگے............

وہ اس تحریر میں اپنا یہ غم ظاہر کر رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ دنیا میں گزرے ہوئے ان 43 برسوں کی احمقانہ دوڑ دھوپ اور جدوجہد اور خصوصاً اس بارہ سالہ کش مکش سے جو ابنائے زمانہ کی صحبت میں رہی، مجھ میں نہ طاقت صبر ہے اور نہ قوت گریز و پرہیز۔ میں اس

بات کو قید تحریر میں لا کر اس کا اعلانیہ اظہار کر رہا ہوں۔"

(انشائے ابوالفضل دفتر: ۲ص ۱۰۲)

اکبر کی طبیعت کی اس تبدیلی کہ اس نے دین کے راستہ کو چھوڑ کر بے دینی کے راستہ کو اختیار کیا، اس پر اس کی راجپوت اور ہندو رانیوں کا اثر بھی تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کے استحکام کیلیے راجپوت راجاؤں کے ساتھ رشتے ناطے کیے اور ان کا اعلیٰ ترین مراتب پر تقرر کیا۔ چنانچہ ان کا پورا اعتماد حاصل کرنے کے لیے اور ان کی نگاہ میں اپنے کو محبوب اور عزیز بنانے کے لیے اس نے بہت سے وہ کام کیے جو اس کو ایک مسلمان کی حیثیت سے نہ کرنے چاہیے تھے، مثلاً ذبیحہ گاؤ کی ممانعت، داڑھی منڈوانا، بھدرا کروانا، قشقہ لگوانا، ہندو رانیوں کے ساتھ مل کر ان کی تمام ہندووانہ رسموں کو منانا اور ان میں حصہ لینا۔ اکبر کی ایک بیوی راجہ بہاری مل کی بیٹی اور راجہ بھگوان داس کی بہن تھی۔ دوسری جودھا بائی جودھ پوری کی رانی وغیرہ۔ ان ہندو رانیوں اور ان کے عزیز رشتہ داروں کا اکبر کی عملی اور فکری زندگی پر خاصا اثر تھا اور دین کے دیوان میں سب سے پہلا تنزل اسی تعلق کی وجہ سے واقع ہوا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ 1579ء میں متھرا کے قاضی عبدالرحیم نے ایک مسجد بنانے کے لیے عمارتی مسالہ منگوایا۔ ایک مقامی مالدار برہمن نے اس پر قبضہ کر لیا اور اس مسالے کو ایک مندر کی تعمیر میں صرف کر دیا۔ جب قاضی صاحب اور اس کے ساتھیوں نے اسے روکنا چاہا تو اس نے بانی اسلام جناب رسول اللہ صلی علیہ علیہ وسلم کو سب وشتم کیا اور اہل اسلام کی اہانت کی۔ قاضی یہ شکایت لے کر شیخ عبدالنبی صدر الصدور کے پاس گیا۔ شیخ نے برہمن کو بلا بھیجا۔ وہ نہ آیا۔ چنانچہ دربار سے ابوالفضل اور بیربر کو بھیجا گیا۔ وہ جا کر برہمن کو لے آئے اور اس وقوعہ کی نسبت ابوالفضل نے تصدیق کی۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اسے سزا کیا دی جائے؟ شیخ نے بادشاہ سے استصواب کیا لیکن بادشاہ ٹال مٹول کرتا رہا۔ صریحاً کچھ نہ کہتا، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا رہا کہ سیاسیات شرعیہ آپ سے متعلق ہیں۔ مجھ سے کیا پوچھتے ہیں؟ اس کشمکش میں معاملہ نے طول کھینچا۔ برہمن دیر تک قید خانے میں رہا اور بادشاہ کی راجپوت بیویاں اس کی رہائی

کے لیے کوشاں ہوئیں۔ شیخ نے بادشاہ سے پھر پوچھا اور حد سے زیادہ اصرار کیا۔ بادشاہ نے کہا: ''میں اس بارے میں اپنا خیال بتا چکا ہوں، اب تم جانو اور یہ ملزم۔'' چنانچہ شیخ نے برہمن کو قتل کروادیا۔ اس پر محل کے اندر رانیوں نے اور باہر مصاحبوں نے کہنا شروع کیا کہ ان علماء کو حضور نے اتنا سر پر چڑھا رکھا ہے کہ اب وہ آپ کی خوشی کا بھی کوئی خیال نہیں کرتے اور اپنا جاہ و جلال دکھانے کے لیے لوگوں کو بے حکم قتل کر دیتے ہیں۔ بادشاہ چونکہ ناخواندہ تھا اس لیے اس واقعہ سے بگڑا۔ اتفاق سے ان دنوں شیخ مبارک ناگوری کسی تقریب سے حضور میں آیا۔ اکبر نے اس کے سامنے وہ ساری دقتیں بیان کیں جو علماء کے اختیارات کی وجہ سے پیش آئی تھیں۔ شیخ مبارک نے کہا کہ بادشاہ خود امام وقت اور مجتہد روزگار ہے، اس نے بادشاہ کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اجتہاد کا دعویٰ کرے اور علماء سے محضر طلب کرے۔ چنانچہ آیتوں اور روایتوں کی اسناد سے ایک محضر تیار کیا گیا جو اکبر اور اس کی مملکت کے رخ کے پھیرنے میں سنگ میل ثابت ہوا اور جو ذہنی اور تہذیبی ارتداد کے پورے قصر کا قصر دروازہ کہا جا سکتا ہے۔ اس محضر کا پورا متن منتخب التواریخ جلد۲ ص ۲۷۱-۲۷۲ میں منقول ہے۔ جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

> ''ان امور کے درج کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ کے عدل و انصاف اور سرپرستی کی بدولت ہندوستان آج امن و امان کا گہوارہ بنا ہوا ہے اور اس کی وجہ سے عوام اور خواص دونوں اور خصوصاً ان صاحب علم و فضل علماء کا یہاں ان دنوں اجتماع ہو گیا ہے جو نجات کی راہوں کے راہ نما ہیں اور ''اوتوا العلم درجات'' قرآنی آیت کے مصداق ہیں۔ یہ لوگ عرب و عجم سے اس ملک میں تشریف لائے اور پھر اسی کو اپنا وطن بنا لیا۔ اب جمہور علماء جو ہر قسم کے علوم میں کامل دستگاہ رکھتے ہیں اور عقلی اور نقلی علوم وفنون کے ماہر ہیں اور انتہائی امانت و دیانت اور راست بازی کے ساتھ موصوف ہیں، قرآن کی آیت اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم (یعنی اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول

کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبانِ امر ہیں) اور صحیح احادیث جیسے یہ کہ خدا کے نزدیک قیامت کے روز سب سے زیادہ محبوب وہ امیر ہو گا جو عادل ہے، جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔ ان دلائل کے سوا دوسرے عقلی و نقلی دلائل کی بنیاد پر یہ قرار دیتے ہیں اور فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سلطان کا مرتبہ مجتہد کے مرتبہ سے زیادہ ہے۔ اور بادشاہ جلال الدین محمد اکبر غازی چونکہ سب سے زیادہ عدل والے، عقل والے اور علم والے ہیں، اس وجہ سے ایسے دینی مسائل میں جن میں مجتہدین باہم اختلاف رکھتے ہیں، اگر بادشاہ اپنے ذہن ثاقب اور صائب رائے کی روشنی میں بنی آدم کی معاشی سہولتوں اور دنیوی انتظام کی آسانیوں کے پیش نظر کسی ایک پہلو کو ترجیح دے کر اسی کو مسلک قرار دیں تو ایسی صورت میں بادشاہ کا یہ فیصلہ اتفاقی سمجھا جائے گا اور عام مخلوق اور رعایا کے لیے اس کی پابندی لازمی ہو گی۔ اسی طرح اگر کوئی ایسی بات جو نصوص قطعی کے مخالف نہ ہو اور دنیا والوں کو اس سے فائدہ ہوتا ہو، بادشاہ اگر اس کے بارے میں کوئی حکم صادر فرمائیں تو اس کا ماننا اور اس پر عمل کرنا ہر شخص کے لیے ضروری اور لازمی ہو گا اور اس کی مخالفت دینی اور دنیوی بردباری اور اخروی مواخذہ کی مستوجب ہو گی۔“

یہ محضر نامہ رجب 987ھ میں تیار کیا گیا اور اس کا پوری مملکت میں نفاذ ہوا۔ اس کی رو سے بادشاہ کو امام مجتہد اور واجب الاطاعت اور خلیفہ اللہ فی الارض قرار دیا گیا۔ یہ دین اسلام سے انحراف واعراض کا نقطۂ آغاز تھا۔

اب اس کے ساتھ ہی مخدوم الملک اور صدر الصدور کا زوال شروع ہو گیا۔ کیونکہ اب بادشاہ کے امام، مجتہد اور واجب الاطاعت ہونے کی وجہ سے نہ ان عہدوں کی ضرورت

رہی اور نہ ہی عہدے رکھنے والوں کی۔ چنانچہ اب ان دونوں حضرات کی توہین کی گئی اور ان دونوں سے کچھ ایسی داروگیر کی گئی کہ یہ دونوں یکے بعد دیگرے راہی ملک عدم ہو گئے۔

اکبر کو جب امام عادل اور مجتہد بنا دیا گیا تو اسے خطبہ پڑھنے کا خیال آیا۔ فیضی نے فارسی اشعار میں خطبہ تیار کیا، لیکن اکبر خطبہ پڑھتے وقت تھرانے لگا اور صرف دو شعر پڑھ کر منبر سے نیچے اتر گیا۔ پھر اس کے بعد وہی کچھ ہوا جو ہمیشہ اس کے بعد ہوا ہے۔ تھوڑے دنوں کے بعد علانیہ ائمہ و مجتہدین کی توہین و تحقیر ہونے لگی اور ابو الفضل کی جرأت اس حد تک پہنچ گئی کہ

> ''اگر کسی بحث و مباحثہ کے درمیان ائمہ مجتہدین کی بات پیش کی جاتی تو ابو الفضل اس کے جواب میں کہتا: فلاں حلوائی اور فلاں کفش دوز اور فلاں چمڑے والے کے قول سے مجھ پر حجت قائم کرتے ہو۔ ابو الفضل کو تمام علماء کا یہ انکار بہت موافق ثابت ہوا۔''
>
> (منتخب التواریخ: جلد۲ ص۲۰۰)

لیکن یہ معاملہ پھر یہیں تک نہ رکا اور صرف ائمہ مجتہدین اور دوسرے فقہاء و محدثین ہی ابو الفضل اور دوسرے لوگوں کی تنقید کا ہدف نہ بنے بلکہ معاملہ اس سے بھی آگے بڑھ گیا۔ بدقسمتی سے ہمایوں شیر شاہ سوری سے شکست کھانے کے بعد ایران چلا گیا۔ اور ایرانیوں نے کچھ شرائط کے تحت ہمایوں کی مدد کی اور اس کو دوبارہ ہندوستان کا تاج وتخت میسر آیا تھا۔ اس لیے نہ صرف بہ تقاضائے منت شناسی بلکہ شاہ ایران طہماسپ کی شرائط کے تحت عراق عجم اور ایران کے علماء اور شعراء نے ایک سیلاب کی طرح ہندوستان میں وارد ہونا شروع کیا۔ ہمایوں کے مرنے کے بعد بھی ایک سیلاب تھا جو مسلسل انقراض دولت مغلیہ تک ان ممالک سے برصغیر پاک و ہند میں آتا رہا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی قدس سرہ نے لکھا ہے کہ ''یہ سیلاب کس قسم کا تھا۔ اس زمانے کے کسی شاعر نے اس کو ایک شعر میں خوب ادا کیا ہے ؎

نفاق آمدہ در ہند از بلاد عراق
عراق قافیہ میدان برہ گزار نفاق

یہ ٹڈیوں کا بھوکا دل تھا جو ہندوستان کے کشف زاروں کی طرف بے تحاشا اڑا چلا آ رہا تھا، اور ہر ادنیٰ ہندوستان پہنچ کر اس درجہ عالی ہو جاتا تھا کہ بالآخر لوگوں کو کہنا پڑا ؂

پار بودم قطبک و امسال قطب الدین شدم
گر بیابم سال دیگر قطب دیں حیدر شوم

بہرحال یہ وہ گروہ تھا جو ائمہ دین اور مجتہدین سے آگے بڑھ کے بے محابا شرف صحبت کے سعادت یافتوں پر بھی حملہ کرنے میں قطعاً بے باک تھا۔ پھر جو یہ لوگ اکبر کو مشاجرت صحابہ کے غلط سلط واقعات نمک مرچ لگا کر سناتے، کان اگر ان کو سننے سے بہرے ہوتے تو بہتر تھا۔ ملا عبدالقادر بدایونی کا کہنا ہے کہ میں ان کو اپنی زبان سے ادا بھی نہیں کرسکتا۔ (منتخب التواریخ: جلد۲ص ۳۰۸)

اب دربار میں یہاں تک کہا جانے لگا کہ

''ملت اسلامی کا سارا سرمایہ حادث اور نامعقول تھا اور اس کے بنانے والے (معاذ اللہ) عرب کے وہ چند مفلس بدو اور ڈاکو قرار پائے جن میں سب کے سب راہزن، بٹ مار اور مفسد تھے۔ اور فردوسی کے شاہنامہ کے دو شعروں سے استدلال کیا گیا ؂

زشیر شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسید است کار
کہ ملک عجم را کنند آرزو — تفو باد بر چرخ گرداں تفو

نتیجہ یہ ہوا کہ اب دین کی ہر بات کا تمسخر اڑایا جانے لگا خواہ اس کا تعلق عقیدہ سے ہو یا ارکان اسلام سے۔ دین کی ہر بات کو ٹھٹھا اور تمسخر کا ہدف بنایا جانے لگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کا انکار کیا جانے لگا۔ بلکہ اب خود بادشاہ ایسی بھونڈی باتیں کرتا جو اس کی شان کے خلاف تھیں۔ ملا عبدالقادر نے لکھا ہے کہ

''کبھی کبھی بھرے دربار میں اکبر خلاف وقار شاہی بعض مذبوحی حرکتیں بھی کرتا تھا جیسے وہ بیٹھے بیٹھے یکا یک ایک ٹانگ پر کھڑا ہوتا اور پھر یوں گویا ہوتا: ''آخر اس بات کو عقل کس طرح درست تسلیم کرسکتی ہے کہ ایک شخص بھاری بھرکم جسم رکھنے کے باوجود یکا یک

نیند سے آسمانوں پر چلا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے نوے ہزار بات
کرتا ہے، لیکن اس کا بستر اس وقت تک گرم رہتا ہے، اور لوگ اس
کے دعویٰ کو درست مان لیتے ہیں۔ اور اسی طرح ''شق القمر'' وغیرہ
جیسی باتوں کو بھی مان لیتے ہیں۔''

پھر وہ اپنی اٹھی ہوئی ٹانگ کی طرف حاضرین کو مخاطب کر کے پوچھتا:
''جب تک دوسرا پاؤں زمین پر ٹکا نہ ہو میرا کھڑا رہنا ناممکن ہے۔ آخر
یہ کیا قصے ہیں؟ (ایں چہ حکایہاست) (منتخب التواریخ: جلد ۲ ص ۳۱۰)

زبان جب کھل جائے تو پھر اس کا رکنا مشکل ہوتا ہے، لہٰذا اب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اعتراضات کرنے سے زبانیں نہیں ہچکچاتی تھیں چند ہندو اور چند ہندو مزاج مسلمان بدنصیب ہونے کے ناطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کی ذات گرامی پر صریحاً اعتراضات کرتے تھے۔ عیسائی پادری اکبر کے دربار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والاصفات پر نہایت بے ہودہ اعتراضات کرتے، لیکن ان کے ان بیہودہ اور بدبختانہ اعتراضات کو سن کر بھی اکبر کی پیشانی پر بل تو کیا پڑتا بلکہ نہایت خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کرتا اور شاہزادہ مراد کو حکم دیتا کہ

''چند اسباق ان پادریوں سے برکت کے طور پر پڑھ لو۔''

دینی شعائر کی توہین اور ہجو میں اشعار بنائے گئے اور وہ اشعار کوچہ و بازار میں گائے جاتے تھے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے وہ اشعار بھی نقل کیے ہیں تاکہ قارئین کرام کو یہ پتہ چلے کہ حضرت مجددؒ نے اپنے مکتوبات میں ''دین کی غربت'' کا نوحہ جن دردناک الفاظ میں کیا ہے، اس کے اسباب کیا تھا۔ اسی وجہ سے مجدد صاحبؒ اپنے مکتوب میں اس شعر کو اکثر نقل فرماتے ہیں ؎

پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمہ و ناز
بسوخت عقل زحیرت ایں چہ بوالعجبی ست

دین الٰہی کا اجراء:

اس محضر نامہ میں جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا گیا ہے جب بادشاہ کو مجتہد

مطلق بنایا گیا۔ ایک ناخواندہ اور ان پڑھ شخص کے لیے یہ ایک بہت بڑی بات تھی۔ اب انہی لوگوں نے جنہوں نے یہ محضر نامہ تیار کیا تھا، بادشاہ کے ناہموار ذہن میں یہ بات ڈالی کہ اس دین اسلام پر ایک ہزار سال گزر چکے ہیں۔ یہی اس دین کی طبعی عمر ہے، اور اب چند سالوں میں دوسرے ہزار سال کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس نئے ہزار سال سے دنیا کی ایک نئی عمر شروع ہو گی۔ اس کے لیے ایک نیا دین، نیا آئین اور نیا شارع اور نیا حاکم مطلوب ہے۔ اور اس کے لیے اکبر جیسا صاحب تاج و نگین اور صاحب سطوت و مملکت اور امام عادل ہی موزوں ترین شخص ہے۔ اس محضر نامہ کے ذریعہ اکبر کو جو اختیارات اور پاورز (Powers) تفویض (Delagate) کی گئی تھیں، ان کے تحت اب مملکت میں تبدیلیاں شروع کر دی گئیں، اور اکبر شاہی دین کا آغاز شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے سکہّ پر جو ہر ایک کے ہاتھ میں جاتا ہے، اس وجہ سے یہ سب سے بڑا اشتہار سمجھا جاتا ہے، اس پر الف (ہزار) کی تاریخ ثبت کر دی گئی۔ اس نئی تاریخ کی تدوین کا کام علماء کے ایک بورڈ کے سپرد ہوا۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے کہ

> ''اسی سال چند رذیل بلکہ ارذل اور ادنیٰ قسم کے لوگ جو عالم نما جاہل تھے انہوں نے دلائل کا پشتارہ اس دعویٰ کے ساتھ باندھ دیا کہ اب وقت اس صاحب زمان کا آ گیا ہے جو ہندو اور مسلمانوں کے بہتر (72) فرقوں کے اختلاف کو مٹانے والا ہوگا۔ اور وہ ذات بادشاہ کی ہے۔'' (جلد۲ص ۲۷۹)

ملا عبدالقادر کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اکبری دین کی بنیاد کیا تھی۔ آج جس نظریہ کو ''قومیت'' یا نیشنلزم (Nationalism) کے نام سے روشناس کیا جا رہا ہے۔ اس نظریہ نے بعد میں جو رنگ اختیار کیا وہ آج بھی ہندوستان اور دوسرے کئی ایک ملکوں میں دیکھا جا سکتا بلکہ ''سب سے پہلے پاکستان'' بھی اسی نظریہ کی ایک جھلک ہے۔ آج اس نظریۂ قومیت کو تو صرف عقلی دلائل سے ثابت کیا جا رہا ہے، لیکن اکبر کے زمانہ میں اس نظریہ میں ''الہام'' اور ''پیش گوئی'' کی قوت بھی بھری جاتی تھی۔ ملا عبدالقادر ہی کا بیان ہے کہ

''ہندوستان کے قدیم دانشمندوں کے نام سے اس زمانہ میں برہمن ہندی اشعار نقل کر کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتے تھے جن کا مضمون یہ ہوتا تھا کہ جہان کا فتح کرنے ایک بادشاہ ہندوستان میں پیدا ہوگا۔ (بادشاہ عالمگیرے در ہند پیدا شود) جو برہمنوں کی بڑی عزت کرے گا اور گائے کی حفاظت کرے گا اور عالم کی نگرانی انصاف کے ساتھ کرے گا۔ یہ سب باتیں اور خرافات پرانے کاغذات پر لکھ کر بادشاہ کو دکھایا کرتے تھے اور بادشاہ (اپنی جہالت اور ناخواندگی کی وجہ سے) ان کو صحیح خیال کرتا تھا۔

(منتخب التواریخ: جلد۲ ص ۳۲۶)

یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ ایوان اقتدار میں براجمان لوگوں کی قصیدہ خوانی میں بڑا فخر محسوس کرتے ہیں۔ کوئی شخص بھی خواہ وہ کتنا ہی بے دین، بدمعاش اور وطن دشمن کیوں نہ ہو، جب اقتدار کی باگیں اس کے ہاتھ میں آجاتی ہیں تو خوشامد پرست ٹولہ اس کے اردگرد فوری طور پر اکٹھا ہوجاتا ہے تاکہ اس سے فائدہ حاصل کیا جائے۔ کچھ یہی معاملہ اس زمانہ میں بھی شروع ہوگیا۔ اکبر کے خوشامدیوں کی فہرست میں صرف ہندوستان کے برہمنوں ہی کے نام نہیں ہیں بلکہ کچھ مولوی حضرات بھی اس کو الہامی دلائل فراہم کرتے تھے، چنانچہ کوئی صاحب حاجی ابراہیم صاحب سرہندی تھے۔ یہ کوئی مولوی قسم کے آدمی تھے۔ اکبر کے زمانہ میں صوبہ گجرات کی صدارت پر فائز تھے۔ انہوں نے گجرات سے کچھ تحفے بادشاہ کی خدمت میں بھیجے۔ ان میں ایک تحفہ یہ بھی تھا۔

''ایک جعلی عبارت شیخ ابن عربی قدس سرہ کی ایک پرانی کرم خوردہ کتاب سے نامانوس حروف میں نقل کر کے بھیجی جس کا مطلب یہ تھا کہ ''صاحب زمان'' کے پاس بہت سی عورتیں ہوں گی اور وہ داڑھی منڈا ہوگا۔ اسی طرح کے چند صفات جو ''خلیفۃ الزمان'' میں تھیں، اس میں درج تھیں۔'' (منتخب التواریخ: جلد۲ ص ۲۷۸)

لیکن حاجی صاحب کی یہ بات اور خرافات جعلی ثابت ہوئی۔

ایک اور مولوی صاحب جن کا ذکر خواجہ شیرازی کے لقب سے کیا گیا ہے ان کے بارے میں ملا عبدالقادر نے لکھا ہے کہ

''شرفاء کے پاس سے یہ مکہ مکرمہ سے ایک رسالہ لائے جس میں لکھا تھا کہ صحیح احادیث میں دنیا کی پوری مدت عمر سات ہزار سال ہے۔ اور یہ مدت پوری ہو چکی ہے۔ بس یہی وقت اس مہدی کے ظہور کا ہے جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ خود اس خواجہ شیرازی نے بھی اس موضوع پر ایک رسالہ مرتب کیا تھا۔'' (منتخب التواریخ: جلد۲ص ۲۸۷)

پھر بادشاہ کو اس منصب پر فائز کرنے کے لیے اور اکبری دین کے اجراء کے لیے صرف سنی علماء اور افراد ہی شریک نہ تھے بلکہ شیعہ علماء اور افراد بھی شریک تحریک تھے۔ چنانچہ اکبر کے عہد میں ایک شیعی عالم ملا شریف آملی بھی تھے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف اور مؤلف تھے، انہوں نے محمود بسخوانی جو تیموری عہد کا ایک سطح نویس مصنف گزرا ہے، اس کی کتاب سے بھی یہ مضمون نکالا کہ

''نوسو نوے ہجری میں باطل کا مٹانے والا ایک شخص پیدا ہوگا۔ اور صاحب دین حق سے اس کی تعبیر کی گئی اور جمل کے قاعدہ سے وہی نوسو نوے کے عدد نکالے گئے۔'' (منتخب التواریخ: جلد۲ص ۲۷۸)

مختصر یہ کہ جس نئی تاریخ کی تدوین کا کام علماء کے جس بورڈ کے سپرد ہوا اس نے سنین میں بجائے ہجرت کے رحلت کا ذکر کیا۔ اس سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی گئی کہ ''اس صاحب زمان کا وقت آ گیا ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کے 72 فرقوں کے اختلافات مٹانے والا ہوگا اور وہ ذات بادشاہ کی ذات ہے۔ اس کے ساتھ ہی اب اسلام کے معتقدات و احکام میں تبدیلیاں شروع ہوئیں۔ توحید کے بجائے کواکب پرستی، ایمان بالبعث کے بجائے عقیدۂ تناسخ کو رائج کیا گیا۔ اس بارے میں اکبر با قاعدہ بیعت لیتا تھا۔ اس دین میں داخل ہونے والوں سے جو کلمہ پڑھوایا جاتا تھا اس میں لا الہ الا اللہ کے ساتھ اکبر خلیفۃ اللہ بھی شامل کیا جاتا تھا۔ کلمہ کے ساتھ ایک اقرار نامہ بھی ہوتا تھا جس میں یہ الفاظ مرقوم تھے:

> ''میں اپنی رغبت، خواہش اور دلی شوق کے ساتھ مجازی اور تقلیدی دین اسلام سے جو آباء واجداد سے سنا اور دیکھا تھا، علیحدگی اختیار کرتا ہوں اور اکبر شاہی دین الٰہی میں داخل ہوتا ہوں، اور اس دین کے اخلاص کے چاروں مرتبوں یعنی ترک مال، ترک جان، ترک ناموس اور ترک دین کو قبول کرتا ہوں۔''

یہ دین اکبری کیا تھا؟ اس میں سود، جوئے شراب اور خنزیر کے گوشت کی حلت تھی، اور ذبیحہ گاؤ کی ممانعت تھی کیونکہ اس سے ہندوؤں کی دل آزاری ہوتی تھی۔ پردہ اور رسم ختنہ کی ممانعت تھی۔ جسم فروشی کے کاروبار کو منظم کر دیا گیا تھا اور اس کی جگہ مقرر کر دی گئی تھی اور اس کے لیے ایک قانون بنا دیا گیا تھا۔ تدفین کے طریقہ میں بھی ترمیم کر دی گئی تھی۔ غرضیکہ دین اسلام کے مقابلہ میں ایک مستقل اکبری دین کی تدوین ہوئی تھی، جس میں رواداری اور صلح کل تحریک یا نئے دین و آئین میں ہندوؤں کے مذہب کا پلڑا جھکا ہوا تھا۔ چنانچہ مختصر تاریخ ہند کے مصنفین مسٹر مور لینڈ اور مسٹر اے سی چیٹر جی نے بھی لکھا ہے کہ ''اکبر نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے گاؤ کشی بھی بند کر دی تھی اور اس کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزائیں دیں۔ اکبری قوانین دین اسلام سے زیادہ ہندو مذہب کی موافقت اور حمایت میں ہوتے تھے اور اس کی یہ حکمت عملی کامیاب رہی۔ (A. Short History of India, P.25)

دین اکبری:

اکبر نے مجتہد مطلق ہوتے ہی جو دین اکبری لوگوں کے سامنے پیش کیا اس کو اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ دین اسلام اور اس کے معتقدات میں اس نے جو تبدیلیاں کیں وہ کیا تھیں؟ اس بارے میں اکبر کے نفس ناطقہ ابوالفضل علامی نے جو لکھا ہے اس کو یہاں بیان کیا جا رہا ہے، اور میرے خیال میں اس سے زیادہ معتبر اور کوئی شہادت نہیں ہے کیونکہ اکبر ابوالفضل کو عقل کل سمجھتا تھا، اور یہ اکبری دین انہی باپ بیٹوں ہی کی ذہنی فکر کا نتیجہ تھا، لیکن اس دین اکبری میں ایک بات ملحوظ رکھی گئی جس کو ملا عبدالقادر بدایونی نے یوں بیان کیا ہے کہ

"اسلام کی ضد اور اس کے توڑ پر ہر وہ حکم جو کسی دوسرے مذہب کا ہوتا اس کو بادشاہ نص قاطع اور قطعی دلیل خیال کرتے تھے، بخلاف اسلامی ملت کے کہ اس کی ساری باتیں مہمل، بیکار، نامعقول اور عرب کے قلاشوں اور مفلسوں کی گھڑی ہوئی خیال کی جاتیں۔"

(منتخب التواریخ: جلد۲ ص ۲۵۶)

اور آخر میں جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ یہ تھا کہ

"مسلمانوں کے سوا جس شخص کی جو بات پسند آ جاتی تھی اس کا انتخاب کر لیا جاتا تھا اور جو باتیں ناپسندیدہ اور بادشاہ کی خواہش کے خلاف ہوتی تھیں، ان سے احتراز اور پرہیز ضروری خیال کرتے تھے۔" (جلد۲ ص ۲۵۶)

بہر حال دین اکبری کے عناصر ترکیبی چند ایک حسب ذیل ہیں:

1- آتش پرستی:

ابوالفضل نے اس بارے میں اپنی کتاب آئین اکبری میں لکھا ہے کہ

"جہاں پناہ اپنی روشن ضمیری کی وجہ سے روشنی کو بے حد پسند کرتے ہیں اور اس کی تعظیم و تکریم کو خدا پرستی اور ستائش الٰہی خیال کرتے ہیں، لیکن نادان، کور باطن اس کو خدا فراموشی اور آتش پرستی خیال کرتے ہیں۔" (آئین اکبری: جلد ۱ ص ۴۸)

"ہوتا یہ ہے کہ آفتاب کے غروب ہونے کے بعد خدمت گزار بارہ کافوری شمعیں روشن کرتے ہیں اور ہر شمع چاندی اور سونے کے لگن میں رکھ کر حضور بادشاہ سلامت پیش کرتے ہیں، اور ان میں سے ایک شیریں زبان اور خوش گلو خادم شمع کو ہاتھ میں لے کر مختلف دل کش سروں میں خدا کی حمد کے اشعار گاتا ہے اور آخر میں خود جہاں پناہ کی زیادتی عمر و دولت کے لیے دعا کرتا ہے۔" (آئین اکبری: جلد ۱ ص ۶۹)

2- آفتاب پرستی:

"فرماتے ہیں کہ آفتاب کی سلاطین کے حال پر ایک خاص عنایت ہے، اسی وجہ سے اس کی عبادت خدا کی عبادت خیال کی جاتی ہے ،لیکن کوتاہ بین شخص بدگمانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔عوام کس لیے سیاہ دل دولت مندوں کی اپنے نفع کی غرض سے عزت واحترام کرتے ہیں اور اپنی نابینائی کی وجہ سے اس چشمۂ نور کے احترام میں کوتاہی کرتے ہیں اور عبادت گزار پر طعنہ زنی کرتے ہیں۔اگر خود ان کی عقل پر آفت نہ آ گئی ہو تو سورت الشّمس کیوں فراموش کر دی گئی ہے۔"

(آئین اکبری: جلد۳ ص ۱۸۴)

3- آداب ملاقات:

اس اکبری دین میں آداب ملاقات بھی اسلام کے آداب ملاقات سے مختلف تھے اسلام میں تو دو ملنے والے جب ملتے ہیں تو ایک السلام علیکم کہتا ہے اور دوسرا وعلیکم السلام سے اس کا جواب دیتا ہے، لیکن دین اکبری میں ابوالفضل لکھتا ہے کہ "ملاقات کے وقت ایک آدمی اللہ اکبر کہتا اور دوسرا جل جلالہ سے اس کا جواب دیتا۔"

(آئین اکبری: جلد ا ص ۱۰۰)

4- سجدہ تعظیمی:

اسلام میں جہاں عبادتی سجدہ ناجائز ہے وہاں تعظیمی سجدہ بھی ناجائز ہے لیکن دین اکبری میں ابوالفضل کا بیان ہے کہ "بندگان عقیدت مند سجدۂ تعظیمی کرتے اور اسے سجدۂ ایزدی شمار کرتے ہیں۔" (آئین اکبری: جلد ا ص ۱۰۷)

ملا عبدالقادر نے بھی لکھا ہے کہ "بادشاہ کے لیے سجدہ کو جائز قرار دیا اور اس کا نام "زمین بوس" رکھا گیا۔اور بادشاہ کے ادب کا خیال فرض ٹھہرایا گیا۔اور بادشاہ کو قبلہ مرادات اور اس کے چہرہ کو قبلہ حاجات مقرر کیا گیا۔ (منتخب التواریخ: جلد۲ ص ۲۵۹)

5- سود اور جوئے کی حلت:

سود اور جوا دونوں اسلام میں حرام ہیں لیکن دین اکبری میں ان دونوں کو حلال کر دیا گیا تھا۔ اس پر دوسری چیزوں کو قیاس کر لینا چاہیے۔ دربار اکبری میں ایک خاص جوا گھر بنایا گیا اور جواریوں کو جوا کھیلنے کے لیے شاہی خزانہ سے سودی قرض دیا جاتا تھا۔

6- شراب کی حلت:

اسی طرح شراب کا پینا بھی جائز کیا گیا۔ چنانچہ ایک دکان شراب فروشی کی بھی دربار کے پاس کھولی گئی جس کی دربان ایک عورت تھی جو شراب فروشوں کی نسل سے تھی۔ وہ اس دکان کا انتظام و انصرام کرتی اور اس کے نرخ بھی خود ہی مقرر کیے تھے۔ اور نوروز کی مجلسوں میں اکثر علماء اور صلحاء بلکہ قاضی اور مفتی تک شراب کے میدان میں اتارے جاتے تھے۔ اور شراب کا جام نوش کرتے وقت ملک الشعراء فیضی کہا کرتا تھا کہ ''یہ جام میں فقہاء کے اندھے پن کے نام سے پیتا ہوں۔''

7- داڑھی کی ممانعت:

جوا، سود، زنا اور شراب کی حلت کے بعد سب سے زیادہ زور جس چیز پر دیا جاتا تھا وہ ''ریش تراشی'' کا مسئلہ تھا۔ ملا عبدالقادر کا بیان ہے کہ داڑھی منڈانے کی ابتداء کا خیال سب سے پہلے بڑے بڑے راجاؤں کی بیٹیوں کو نکاح میں لانے کی وجہ سے ہوا۔ پھر اپنے اس غلط خیال کی تائید میں اکبر کے ہم نشینوں نے عقلی اور نقلی دلائل تلاش کرنے شروع کر دیئے کہا یہ جانے لگا کہ

> ''داڑھی کے بالوں کی سیرابی خصیتین سے ہوتی ہے اور داڑھی ان ہی سے پانی لیتی ہے۔ اسی وجہ سے خواجہ سراؤں کے داڑھی نہیں ہوتی۔ پھر اس کے رکھنے سے کیا ثواب ہوسکتا ہے۔''

پھر اور بہت سے واہیات عقلی اور نقلی دلائل صرف بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے تراشے گئے جن کو پڑھ کر ہنسی آتے ہیں کہ خوشامدی لوگ کتنے احمق ہوتے ہیں۔

8- گنگا جل:

اسلام میں آب زمزم کو تبرک کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ احادیث میں اس کے بارے میں بہت سے فضائل آئے ہیں لیکن ہندوؤں کے ہاں گنگا کا پانی نہایت متبرک سمجھا جاتا ہے۔ اکبر بھی اس پانی کو نہایت پوتر اور متبرک سمجھتا تھا اور اس کو ہر وقت نوش کرتا تھا۔ چنانچہ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ

> ''بادشاہ سفر و حضر میں ہر وقت گنگا کا پانی نوش کرتے تھے۔ قابل اعتماد ملازمین کی ایک جماعت دریائے گنگا کے کنارے مامور ہے جو سربمہر کوزوں اور برتنوں میں پانی بھر کر لاتی ہے۔ جب جہاں پناہ آگرہ اور فتح پور میں قیام فرماتے ہیں تو قصبہ سے پانی لایا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں جب کہ شاہی خیمہ لاہور میں نصب ہوتا ہے تو ہر دوار کے عمدہ پانی سے آبدار خانہ سیراب ہے۔ باورچی خانہ میں جمنا اور چناب کا پانی یا آب باراں صرف ہوتا ہے لیکن اس میں تھوڑا پانی گنگا کا ملایا جاتا ہے۔'' (آئین اکبری: جلد ۱ ص ۳۳)

9- مرتد ہونے پر کوئی قدغن نہیں:

دین اکبری کا ایک قانون یہ تھا کہ اگر ''کوئی ہندو عورت کسی مسلمان مرد پر فریفتہ ہو کر مسلمانوں کا دین اختیار کر لے تو اس عورت کو جبراً وقہراً اس کے گھر کے لوگوں کے سپرد کر دیا جائے۔'' (منتخب التواریخ: جلد ۲ ص ۳۱۲)

گویا ہندوؤں کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی کہ ایک مسلمان حکومت میں وہ جو چاہیں کریں ان کو کوئی پوچھنے والا نہیں اور ساری پابندیاں اور قدغنیں صرف اور صرف مسلمانوں کے لیے تھیں۔ اور خوشامدی اور حاشیہ نشین اتنے ذلیل ہو چکے تھے کہ صرف بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے ہر ذلیل سے ذلیل حرکت پر اتر آتے تھے۔ چنانچہ اکبری عہد کے ایک عالم اور عالم بھی معمولی نہیں فیضی شیخ مبارک کا بڑا لڑکا، اس کے بارے میں ملا عبدالقادر نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ

''چند سگ را در سفر ہمراہ گرفتہ طعام با آنہا می خورند، و بعضے شعراء زبانِ سگاں در دہان می گرفتند۔'' (ص ۲۵۷)

چند کتوں کو اپنے ساتھ سفر میں رکھتے تھے اور انہی کتوں کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔بعض شاعر تو کتوں کی زبان بھی اپنے منہ میں لیتے تھے۔

آج کل بھی ایوان اقتدار سے کوئی شخص غلط سے غلط بات بھی کہے تو اس کو بھی اپنی غلط بات کی تائید کے لیے لوگ مل جاتے ہیں خصوصی طور پر آج کل کے وزراء اور مشیران کرام کا کام تو سوائے خوشامد اور بادشاہ وقت کی غلط بات کی تائید میں دلائل فراہم کرنے کے اور کچھ نہیں ہوتا، اور بعض دفعہ تو یہ لوگ اس قدر مذبوحی حرکات کرتے ہیں کہ دیکھنے والے کو شرم محسوس ہوتی ہے۔

10- عربی علوم کی بندش:

جب تک یہ مدارس، مساجد اور عربی دینی علوم دنیا میں موجود ہیں، کوئی حکومت اسلام کے خلاف محاذ نہیں بنا سکتی۔ چنانچہ موجود دور میں بھی دنیا کو جتنا ان عربی مدارس اور دینی علوم سے خطرہ ہے اتنا اور کسی شی سے نہیں ہے۔ اسی وجہ سے امریکہ اور یورپی ممالک پاکستان اور دیگر مسلم ممالک پر ان مدارس کو بند کرنے یا ان کے سلیبس کی تبدیلی میں جتنا زور لگا رہے ہیں، اتنا زور کسی اور چیز پر صرف نہیں کر رہے ہیں۔ کیونکہ مدارس اور مساجد مجاہد اور عالم پیدا کرنے کی فیکٹریاں ہیں۔ مجاہد باطل کے سامنے ڈٹ جاتا ہے اور عالم ایک جابر اور ظالم حاکم کے سامنے کلمۂ حق کہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دینی مدارس میں اصل قرآنی علوم کو بند کرنے کے لیے کبھی انہیں انگریزی اور حساب پڑھانے کی تاکید کی جاتی ہے اور کبھی انہیں سوشل اسٹڈی اور جغرافیہ پڑھنے کی تلقین کی جاتی ہے اور بتایا یہ جاتا ہے کہ ہماری خواہش ہے کہ مدارس کے یہ طالب علم دینی علوم کے ساتھ دنیوی علوم بھی پڑھیں تاکہ مدرسہ سے فراغت کے بعد کوئی کام کر کے یا کہیں کلرکی کر کے اپنی روزی کما سکیں۔ حکومت کو ان کی روزی کی بہت فکر ہے لیکن یونیورسٹیوں اور کالجوں میں

الحاد کا جو سیلاب آیا ہوا ہے، اس کو ختم کرنے کے لیے وہاں تو دینیات کی کوئی مستند کتاب نہیں پڑھائی جاتی تا کہ ان یونیورسٹیوں سے فارغ ہونے کے بعد یہ طالب علم کوئی دین کی خدمت بھی کر سکیں یا یہ ذہنی، فکری، تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے نہیں بلکہ کم از کم اعتقادی ارتداد سے محفوظ رہ سکیں۔ دین اکبری میں بھی جہاں روشن خیالی پیدا کرنے کے لیے لوگوں کے لیے ہر حرام شی کو حلال اور ہر ناجائز چیز کو جائز قرار دے دیا گیا وہاں مدارس اور مساجد کو بھی تباہ و برباد کرنے کی سازش کی گئی۔ چنانچہ قصر شاہی سے یہ حکم صادر ہوا کہ

> ''مدرسے اور مسجدیں ویران پڑی ہیں۔ اکثر اہل علم جلاوطن ہو گئے اور ان کی نا قابل اولاد جو اس ملک میں رہ گئی ہے ''پاجی گیری'' میں نام پیدا کر رہی ہے۔'' (منتخب التواریخ: جلد۲ ص ۲۷۴)

پھر اتاترک کی طرح اکبر کو عربی زبان سے اس قدر دشمنی ہو گئی کہ اس نے ایسے تمام حروف جو عربی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں جیسے ث، ح، ع، ص، ض، ط، ظ، ان کو بول چال سے باہر کر دیا۔'' (منتخب التواریخ: جلد۲ ص ۳۰۷)

جب بادشاہ وقت مساجد و مدارس کے اتنا خلاف ہو تو پھر اس ٹٹ پونجیوں کا کیا حال ہوگا۔ حضرت مجددؒ نے اپنے مکتوبات میں اس کا رونا ان الفاظ میں رویا ہے:

> ''ہندوستان کے کافر بے تحاشا مسجدوں کو ڈھاتے پھرتے ہیں اور ان کی جگہ مندر بناتے ہیں۔ اسی طرح کفار اعلانیہ رسوم کفر انجام دیتے ہیں لیکن مسلمان اسلام کے اکثر احکام کے بجا لانے سے مجبور ہیں۔'' (مکتوبات: جلد۲ ص ۱۶۲)

یہ تو صرف چند چیزیں ہم نے نہایت بھاری اور بوجھل دل کے ساتھ ذکر کی ہیں وگرنہ ان چیزوں کے علاوہ اور بھی کئی غیر اسلامی چیزیں دین اکبری میں داخل کر دی گئی تھیں۔ سن ہجری سے تنفر کا اظہار کیا گیا کیونکہ اس کا بھی اسلام سے ایک ربط ہے۔ (آئین اکبری: جلد ۱ ص ۱۹۳) اور غیر اسلامی تہواروں کو منانے کی سخت تاکید کی گئی۔ (آئین اکبری: جلد ۱ ص ۴۶) اور شراب نوشی کی ہر جشن میں کھلے عام اجازت

تھی۔(آئین اکبری: جلد ۳ ص ۲۰۶) نماز اور دوسرے دینی فرائض کو پڑھنے اور ادا کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ چنانچہ بدایونی کا بیان ہے کہ ''دیوان خانہ میں کسی شخص کی مجال نہ تھی کہ اعلانیہ نماز ادا کر سکے'' اور ایک جگہ لکھتا ہے کہ ''نماز و روزہ اور حج تو اس سے پہلے ہی ساقط ہو چکے تھے۔'' (منتخب التواریخ: جلد ۲ ص ۳۱۵)

بلکہ بات یہاں تک پہنچ گئی کہ ملا مبارک ناگوری کے ایک بیٹے جو ابوالفضل کا شاگرد تھا، اسلامی عبادات کے بارے میں اعتراض اور تمسخر کے پیرایہ میں چند رسائل تصنیف کیے۔ شاہی دربار سے ان رسالوں کی بڑی پذیرائی ہوئی، اور اس کی سرپرستی کا یہی رسائل ذریعہ بن گئے۔'' (منتخب التواریخ: جلد ۲ ص ۲۵۱) معراج نبوی کا انکار کیا گیا اور نبوت کی اہانت میں بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی گئی۔ (منتخب التواریخ: جلد ۳ ص ۳۱۷)

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا یہ ایک سنگین موڑ تھا کہ ملا مبارک، فیضی اور ابوالفضل نے اکبر کی پشت پناہی میں اس وقت کے ہندوستان کو ایک ذہنی، دینی، فکری، تہذیبی بلکہ اعتقادی ارتداد کے راستہ پر ڈال دیا تھا حالانکہ اہل قلوب اور اصحاب صفا نے یہاں اسلام کے شجرہ طیبہ کو نصب اور بارآور کرنے کے لیے چار سو برس تک اپنی دماغی صلاحیتیں اور جسمانی توانائیاں صرف کر دی تھیں۔ اگر حالات کی رفتار اور واقعات کا تسلسل یہی رہتا اور کوئی طاقتور شخصیت ان کے راستہ کی رکاوٹ نہ بنتی تو اس ملک کا حال بھی وہی ہوتا جو نویں صدی ہجری میں اندلس کا ہوا تھا یا پھر انقلاب روس کے بعد ترکستان کا ہوا بلکہ ان سے بھی بدتر ہوتا کیونکہ وہ تو غیروں کے ہاتھوں سے ہوا اور یہ اپنوں کے ہاتھوں ہوتا اور اپنوں کے ہاتھ زیادہ سخت اور محکم ہوتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے غیب سے ایک شخصیت کو اپنے دین کی حفاظت کے لیے پردۂ غیب سے کھڑا کر دیا جس نے تمام سیاسی ماحول پر چھا کر دین کی ایسی تجدید کی کہ جو لوگ دین کی تباہ کاریوں کے منصوبے بنا رہے تھے انہیں کی اولاد دین کی حفاظت کرنے والی بن گئی۔

☆ ☆ ☆

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ

وہ کون شخص تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی حفاظت کے لیے اور دین میں تحریف اور تغییر کرنے والوں کے راستہ میں مزاحمت کرنے کے لیے کھڑا کر دیا؟ اور وہ اکبری فتنہ کے سامنے سیسہ پلائی دیوار کی طرح کھڑا ہو گیا یہاں تک کہ اس فتنہ کا منہ پھیر دیا؟ اس وقت کیا حالات تھے جن میں وہ تجدید دین کا عزم لے کر اٹھا اور شرک و بدعات اور مختلف الحادوں کے جھاڑ جھنکار سے دین کی کشت زار کو صاف کیا۔ بقول علامہ سیدنا سلیمان ندوی قدس سرہ کے

''یہ اکبر کا دور تھا جب عجم کے ایک جادوگر نے آ کر بادشاہ کے کان میں یہ منتر پھونکا کہ دین عربی کی ہزار سالہ عمر پوری ہو گئی ہے۔ اب وقت ہے کہ ایک شہنشاہ امی کے ذریعہ نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دین منسوخ ہو کر دین الٰہی کا ظہور ہو۔ مجوسیوں نے آتش کدے گرمائے، عیسائیوں نے ناقوس بجائے، برہمنوں نے بت آراستہ کیے اور جوگ اور تصوف نے مل کر کعبہ اور بت خانہ کو ایک ہی چراغ سے روشن کرنے پر اصرار کیا۔ اس بیچ میل تحریک کا جو اثر ہوا اس کی تصویر اگر کوئی دیکھنا چاہے تو ''دبستان مذاہب'' کا مطالعہ کرے۔ کتنے زنار داروں کے ہاتھوں میں تسبیح اور کتنے تسبیح خوانوں کے گلوں میں زنار نظر آئیں گے۔ بادشاہی آستانے پر کتنے امیروں کے سر سجدہ میں پڑے اور شہنشاہ کے دربار میں کتنے دستار بند کھڑے

دکھائی دیں گے، اور مسجدوں کے منبر سے یہ صدا سنائی دے گی:
تعالیٰ شانہ.................اللہ اکبر

یہ ہو ہی رہا تھا کہ سرہند کی سمت سے ایک پکارنے والے کی آواز آئی ''راستہ صاف کر دو کہ راستہ چلنے والا آتا ہے۔ ایک فاروقی مجدد فاروقی شان سے ظاہر ہوا یہ احمد سرہندی تھے۔''

اور حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ نے لکھا:

''تاریخ ہند میں اکبر کا عہد اس لحاظ سے خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ سلاطین پرست اور متبعین ہوائے نفس علماء کی دربار پر حکومت تھی، اور دینداری و تقدیس کے پردہ پر نفسانی تعصبات اور مفسدانہ اغراض کام کر رہے تھے۔ لیکن عین اس زمانہ میں حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کا ظہور ہوتا ہے جو ایک غیر معروف گوشے میں بیٹھ کر لاکھوں دلوں کو اپنی صدائے رعد آسائے حق کا شیفتہ بنا لیتے ہیں، اور احیائے شریعت و تجدید شعار اسلامی اور اعلان حق و امر بالمعروف کے لیے اپنے وجود کو یکسر وقف کر دیتے ہیں۔''

ولادت و تعلیم:

یہ فاروقی مجدد حضرت شیخ احمد سرہندیؒ 4 شوال 971ھ مطابق 26 جنوری 1563ء جمعہ کی رات سرہند کے شہر میں پیدا ہوا۔ آپ کا اسم گرامی احمد، لقب بدرالدین اور کنیت ابوالبرکات تھی۔ حضرت بابا فریدالدین گنج شکر کے آپ ہم جد تھے کیونکہ ان دونوں کا نسب نامہ شیخ شہاب الدین علیؒ سے ملتا ہے۔

ابتدائی تعلیم آپ نے اپنے والد مخدوم عبدالاحدؒ سے حاصل کی۔ اس کے بعد ملک کے بعض بہترین علماء سے فیض حاصل کیا۔ سیالکوٹ میں آپ نے ملا کمال الدین کشمیریؒ جن کے حلقہ درس سے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اور سعد اللہ خان علامی جیسے فاضل روزگار اٹھے، فنون کی کتابیں پڑھیں۔ حدیث میں آپ کے مشہور استاد شیخ یعقوب صرفی

کشمیری تھی۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی اساتذہ سے علوم وفنون حاصل کیے۔ تعلیم کی ابتداء حفظ قرآن سے ہوئی۔

علوم عقلیہ اور نقلیہ سے فراغت کے بعد درس وتدریس کے کام کا آغاز کیا اور عربی اور فارسی میں کچھ رسائل بھی لکھے۔ آپ اکبرآباد (آگرہ) بھی تشریف لے گئے اور فیضی اور ابوالفضل سے بھی کئی بار ملنے کا موقع ملا، اور بعض اختلافات کے باوجود دونوں بھائی آپ کے علم وفضل کے بڑے معترف تھے۔ ایک روز آپ فیضی کے مکان پر گئے۔ وہ غیر منقوط تفسیر سواطع الالہام کے لکھنے میں مشغول تھا۔ آپ کو دیکھ کر فیضی بڑا خوش ہوا اور کہا کہ آپ اچھے وقت پر تشریف لائے۔ اس وقت تفسیر کے لیے ایک ایسی بات لکھنا چاہتا ہوں جس کے لیے غیر منقوط الفاظ نہیں ملتے۔ بہت دماغ سوزی کی۔ آپ نے اسی وقت اس مقام کی تفسیر اس طرح فصاحت و بلاغت سے غیر منقوط الفاظ میں لکھوادی کہ فیضی انگشت بدنداں رہ گیا۔ (زبدۃ المقامات: ص ۱۴۱۔۱۴۲)

حضرت مجدد صاحبؒ آگرہ ہی میں تھے کہ آپ کے والد ماجد باوجود کبرسنی اور بعد مسافت کے آپ سے ملنے آگرہ تشریف لے گئے۔ کچھ روز وہاں قیام کرنے کے بعد مجدد صاحبؒ کو ساتھ لے کر وطن تشریف لائے۔ دہلی اور سرہند کے درمیان جب شہر تھانیسر سے گزر ہوا تو وہاں کے حاکم شیخ سلطان نے انہیں اپنے ہاں مہمان رکھا، اور حضرت مجدد کے اخلاق حسنہ اور خصائص عالیہ کو دیکھ کر ان سے نسبت مصاہرت قائم کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ آپ کے والد صاحب نے اس رشتہ کو منظور فرمالیا اور عقد مسنون انجام پایا اور آپ بہو کو لے کر سرہند تشریف لائے۔

حضرت باقی باللہ کی بیعت اور استفادہ:

سرہند میں آپ والد ماجد کی وفات تک انہی کی خدمت میں مصروف رہے اور سلسلہ چشتیہ قادریہ کا سلوک طے کیا۔ اس سلسلہ چشتیہ میں اپنے والد بزرگوار سے بیعت کی اور سلوک تمام کیا۔ پھر طریقہ قادریہ بھی اخذ کیا۔ اس سلسلہ میں خرقہ خلافت شاہ اسکندر نبیرہ حضرت شاہ کمال کیتھلی سے حاصل ہوا۔ گویا سترہ برس کی عمر میں آپ جامع کمالات

ظاہری اور باطنی بن کر اپنے والد کے سامنے کتب درسیہ کی تعلیم اور طریقہ کی تلقین فرمانے لگے۔ انہی ایام میں سلسلۂ کبرویہ کے مشہور ولی اللہ اور محدث حضرت مولانا یعقوب صرفی تھے۔ ان سے آپ نے طریقہ کبرویہ بھی حاصل کیا۔ بایں ہمہ کمالات طریقۂ نقشبندیہ کی طلب آپ کے قلب میں موجزن ہوئی اور یہ طلب بڑھتے بڑھتے عشق کی حد تک پہنچ گئی۔

1007ھ میں آپ کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا۔ 1008ھ میں آپ نے حرمین شریفین کی حاضری اور حج بیت اللہ کے لیے رخت سفر باندھا۔ جب آپ سرہند سے دہلی پہنچے تو دوسرے علماء کے ساتھ مولانا حسن کشمیری بھی آپ کی ملاقات کے لیے آئے۔ انہوں نے دوران گفتگو حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کے علو مرتبہ اور قوت باطنی کا تذکرہ کیا۔ حضرت مجددؒ کے دل میں آپ کی ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا۔ چنانچہ آپ مولانا حسن کاشمیری کی معیت میں وہاں حاضر ہوئے۔ حضرت باقی باللہؒ نے خلاف معمول فرمایا کہ آپ چند روز ہمارے مہمان رہیں۔ ایک ماہ یا ایک ہفتہ ہی سہی۔" حضرت مجدد کے لیے اس ارشاد کے بعد انکار کی کوئی گنجائش نہ تھی کیونکہ یہاں طالب خود مطلوب تھا۔ چنانچہ آپ نے دعوت قبول فرمالی اور رفتہ رفتہ یہ قیام ایک ماہ دو ہفتہ کو منجر ہوا۔ اس صحبت میں سلسلۂ نقشبندیہ کے اکتساب کا کچھ ایسا جذبہ طاری ہوا کہ بیعت کی درخواست کی جو حضرتؒ نے بلا تامل قبول فرمالی اور خلوت میں لے جا کر ذکر قلبی کی تلقین کی۔ آپ کی توجہ سے اسی وقت ذکر قلبی جاری ہو گیا۔ اس دو اڑھائی ماہ میں حضرت مجددؒ کو جو باطنی کیفیات اور ترقیات حاصل ہوئیں۔ الفاظ کے ذریعہ ان کا سمجھانا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ حضرت مجددؒ اس کے بعد سرہند تشریف لے گئے اور دوسری مرتبہ جب دہلی تشریف لائے تو حضرت باقی باللہؒ نے خرقۂ خلافت عطا فرمایا۔ اس کے بعد حضرت مجددؒ تیسری اور آخری مرتبہ حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت خواجہؒ نے شہر سے بہت دور باہر نکل کر استقبال فرمایا اور بڑی بشارتیں دیں مریدوں سے فرمایا کہ ان کی موجودگی میں کوئی شخص میری طرف متوجہ نہ ہوا کرے۔ حضرت خواجہؒ حضرت مجددؒ کے بڑے مدح خوان تھے کیونکہ انہیں پہلی ہی توجہ اور تلقین سے یہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ ایک چراغ بنیں گے جس سے ایک عالم روشن ہو جائے گا۔ حضرت خواجہؒ کا

ان کے ساتھ معاملہ کچھ اس طرح کا ہو گیا تھا جو کم تر کسی شیخ کا اپنے مسترشد کے ساتھ ہوا ہو گا۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے اپنے اس مسترشد کے بارے میں فرمایا کہ ''شیخ احمد آفتاب است کہ مثل ما ہزاراں سیارگان در ضمن ایشاں گم اند۔'' (زبدۃ المقامات ص ۳۳۰) یعنی شیخ احمد وہ آفتاب ہے کہ ہم جیسے ہزاروں سیارے اس کی روشنی میں گم ہیں۔ منازل سلوک طے کرنے کے حالات خود حضرت مجددؒ نے اپنے رسالہ مبداء و معاد میں اجمالاً لکھے ہیں۔ (مبداء و معاد: ص ۱۶)

حضرت مجددؒ نے سرہند میں حضرت باقی باللہ سے اکتساب فیض اور تکمیل نسبت کے بعد گوشہ نشینی اختیار فرمائی۔ آپ کی ہر لحہ طبیعت عروج کی طرف مائل تھی۔ آخر وہ وقت آ گیا کہ آپ کا فیض عام ہو اور طالبین کی تکمیل اور ارشاد کا کام شروع ہو۔ مجدد صاحب اپنے احوال مسترشدین اور برادران طریقت کی ترقیات باطنی کی تفصیل اپنے شیخ کو لکھتے رہے۔ کچھ ایسی بشارتیں بھی ظاہر ہوئیں جن سے آپ کو یقین ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ آپ سے کوئی بڑا کام لینا چاہتا ہے، اور آپ سے دین کی کوئی بہت بڑی خدمت وجود میں آئے گی۔

آخرکار وہ وقت آ گیا کہ آپ نے شیخ کے ارشاد پر لاہور کا سفر اختیار کیا۔ لاہور اس وقت ہندوستان کا دہلی کے بعد دوسرا بڑا علمی اور دینی مرکز تھا۔ لاہور میں بکثرت علماء اور مشائخ موجود تھے۔ آپ کی آمد پر ایک جم غفیر آپ کے پرجوش استقبال کے لیے آیا اور وہاں کے لوگ آپ سے بڑی تعظیم و تکریم سے پیش آئے۔ اس سفر میں مولانا طاہر لاہوریؒ، مولانا حاجی محمدؒ اور مولانا جمال الدین تلویؒ، خان خاناں اور مرتضیٰ خان وغیرہ آپ کے حلقۂ ارادت و بیعت میں داخل ہوئے۔ حضرت مجددؒ ابھی لاہور ہی میں مقیم تھے کہ حضرت خواجہ باقی باللہ کی رحلت کی اطلاع ملی۔ شیخ کے سانحۂ ارتحال کا سننا تھا کہ حضرت مجددؒ اضطرابی اور اضطراری حالت میں لاہور سے سیدھا دہلی تشریف لے گئے۔ راستہ میں اگرچہ سرہند پڑتا تھا لیکن آپ نے وہاں بالکل قیام نہیں فرمایا۔ دہلی میں شیخ کے مزار پر حاضر ہوئے۔ مرشد زادوں اور برادرانِ طریقت سے تعزیت فرمائی اور ان کی خواہش پر چند روز دہلی میں قیام فرمایا اور پھر سرہند تشریف لے گئے۔ 1026ھ میں

آپ نے اپنے بہت سے خلفاء کو تبلیغ و ہدایت کے لیے مختلف مقامات کی طرف روانہ کیا۔ ان میں ستر (70) مولانا محمد قاسم کی زیر قیادت ترکستان کی طرف روانہ کیے گئے۔ چالیس (40) حضرات مولانا فرخ حسین کی سیادت میں عرب، یمن، شام اور روم کی طرف بھیجے۔ دس تربیت یافتہ حضرات کو مولانا محمد صادق کابلی کی قیادت میں کاشغر روانہ کیا اور تیس (30) خلفاء کو مولانا شیخ احمد برکی کی امارت میں توران، بدخشان اور خراسان بھیجا۔ ان حضرات کو اپنے اپنے مقامات میں نمایاں کامیابی اور کامرانی ہوئی۔ (روضۃ القیومیہ ص ۱۶۶۔۱۶۷) ادھر ہندوستان میں بھی آپ نے اپنے خلفاء کو مختلف علاقوں میں دعوت وارشاد پر مامور فرمایا۔ اب حالت یہ تھی کہ حضرت مجددؒ کی جلالت شان اور قوت ارشاد و ہدایت اور حسن تربیت کا شہرہ نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ہند میں بھی پہنچ گیا کہ لوگ جوق در جوق زیارت واستفادہ کے لیے آنے لگے۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو احقر کی کتاب اسلام کی دعوتی قوت)

اسی اثناء میں شیطان نے بعض کو ورغلا کر آپ کا مخالف بنا دیا۔ آپ نے ہر چند پند و نصیحت کی اور سمجھانا چاہا لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ چنانچہ آخر کار آپ دہلی سے روانہ ہو کر اپنے وطن سرہند تشریف لے آئے۔ اس کے بعد آپ دو تین مرتبہ آگرہ تشریف لے گئے، اس کے علاوہ اور کہیں نہیں گئے۔ البتہ اخیر عمر میں تین سال تک شاہی لشکر کے ہمراہ بعض شہروں پر آپ کا گذر ہوا تو ان شہروں کے اکثر حضرات آپ کی صحبت سے مشرف ہو کر فیض یاب ہوئے۔ (زبدۃ المقامات: ص ۱۵۸)

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا خرقہ پیش ہونا:

اس سال وہ خرقہ جو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ نے اپنے صاحبزادے سید تاج الدینؒ کو تفویض فرما کر ارشاد فرمایا تھا کہ ایک زمانہ آئے گا جس میں ایک بزرگ وحید امت پیدا ہوگا جو دین اسلام کو نئے سرے سے تازگی بخشے گا اور شرکت والحاد کو نابود کر دے گا۔ یہ خرقہ اس بزرگ کو تفویض کرنا۔ چنانچہ وہ خرقہ سید تاج الدینؒ کے جانشینوں میں یکے بعد دیگرے امانتاً چلا آتا تھا حتیٰ کہ جب حضرت مجددؒ کو

تجدید و قیومت کی خلعت سے نوازا گیا تو حضرت شاہ کمال کیتھلیؒ نے عالم رؤیا میں اپنے پوتے شاہ سکندرؒ سے فرمایا کہ یہ خرقہ قیومت مآب حضرت مجددؒ کو پہنچا دو۔ جب دو تین بار ایسا ہی خواب دیکھا تو شاہ سکندر نے خرقۂ مبارک لے کر کیتھل سے حضرت مجددؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ اس وقت دوستوں کے ساتھ مراقب تھے۔ شاہ سکندر نے خرقہ آپ کے کندھوں پر ڈال دیا۔ جب حضرت نے آنکھ کھولی اور شاہ سکندر کو دیکھا تو تواضع کے ساتھ معانقہ فرمایا۔ اس کے بعد شاہ صاحب نے فرمایا کہ میرے دادا حضرت شاہ کمال نے وصال کے وقت یہ خرقہ مبارک امانتاً میرے سپرد کیا تھا۔ اب چند مرتبہ مجھ سے ارشاد فرمایا کہ یہ خرقہ میں آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ چنانچہ آپ نے تبرکاً اس جبہ کو پہن لیا اور اس کو پہنے ہوئے زنان خانہ میں تشریف لے گئے۔ جب کچھ دیر کے بعد باہر تشریف لائے تو آپ نے اپنے ایک محرم اسرار دوست سے فرمایا کہ اس خرقہ کو پہننے کے بعد عجیب معاملہ پیش آیا کہ مجھ پر قادریہ نسبت کا اس قدر غلبہ ہوا کہ وہ نقشبندیہ نسبت پر غالب آ گئی۔ پھر ذرا وقفہ کے بعد نقشبندیہ نسبت اس پر غالب آ گئی۔ چند مرتبہ ایسا ہوا کہ کبھی وہ نسبت غالب آ جاتی اور کبھی یہ۔ اتنے میں سید عبدالقادر جیلانی قدس سرہ شاہ کمال کیتھلی تک اپنے تمام خلفاء حضرات کے ہمراہ تشریف لائے۔ میرے دل کو اپنے تصرف میں کیا اور مجھے اپنے انوار و اسرار اور نسبت ہائے خاصہ سے نوازا۔ میں ان انوار و احوال میں غرق ہو کر اس دریائے نور میں غواصی کرنے لگا۔ جب کچھ دیر اسی حالت میں گزر گئی تو مجھے خیال آیا کہ میں تو اکابر نقشبندیہ کا پروردہ ہوں، اب یہ صورت کیا ہو گئی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی مشائخ نقشبندیہ کے خلفاء حضرات بھی حضرت خواجہ عبدالخالقؒ سے حضرت خواجہ باقی باللہ تک تشریف لے آئے اور حضرت خواجہ بہاء الدین نہایت ادب کے ساتھ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے ساتھ پہلو میں بیٹھے اور دونوں سلسلوں کے حضرات میں تکرار ہونے لگی۔ حضرت خواجہ ہاشم کشمیؒ اور مولانا بدرالدین سرہندیؒ اپنی تاریخوں میں لکھتے ہیں کہ اس روز اس قدر اولیائے امت کی روحیں سرہند میں تشریف لائیں کہ ہر جگہ ہر طرف وہی نظر آتی تھیں، اور صبح سے ظہر تک یہی مذاکرہ اور مناظرہ ہوتا رہا۔ آخر سب نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف

رجوع کیا۔ آپ ﷺ نے ہر ایک کو تسلی دی اور فرمایا کہ تم سب اپنی اپنی نسبتیں اس عزیز کو دے دو۔ جو شخص اس سلسلہ میں داخل ہوگا اس کا اجر تم کو بھی مل جائے گا، اور اس کے ذریعہ سلسلۂ نقشبندیہ کی اشاعت زیادہ ہوگی کیونکہ اسے نسبت محمود اسی سلسلہ سے حاصل ہوئی ہے۔ اور اس سلسلہ کے سردار سیدنا صدیق اکبرؓ ہیں جو حضرات انبیاء علیہم السلام کے بعد تمام مخلوق سے افضل ہیں۔ نیز اس طریقہ میں اتباع سنت اور امور بدعت سے کنارہ کشی حد درجہ ہے۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو زبدۃ المقامات: ص ۱۳۴۔۱۳۵، روضۃ القیومیہ: ص ۱۰۹)

اسی سال کے دوران سید صدر جہان اور خان اعظم جو اکبر بادشاہ کے مقرب وزراء میں سے تھے، حضرت مجددؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔

منصب تجدید پر فائز:

حضرت خواجہ محمد زبیرؒ فرماتے ہیں کہ حضرت مجددؒ 12 ربیع الاول 1011ھ میں منصب تجدید پر فائز ہوئے، اور آپ پر تجدید کی علامات ظاہر ہونا شروع ہوگئیں۔ روضۃ القیومیہ وغیرہ میں اگرچہ تاریخ میں کچھ اختلاف ہے، لیکن ہمارے نزدیک بروز جمعۃ المبارک 12 ربیع الاول 1011ھ ہی کو تجدید الف ثانی کا منصب عطا ہونے کا دن اس لیے قرار دیا ہے کہ

1- اول تو اس تاریخ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کو ایک ہزار سال پورے ہو جاتے ہیں۔
2- دوسرے یہ کہ حضرت مجددؒ کی عمر اس تاریخ کو پورے چالیس سال ہو جاتی ہے۔
3- تیسری بات یہ کہ آئندہ بھی زندگی کے پورے تئیس (23) سال بن جاتے ہیں۔
4- چہارم یہ کہ اس حساب سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف اور دعوت وتبلیغ کے سال کی سنت پوری ہو جاتی ہے۔
5- پنجم یہ کہ تقویم کے حساب سے بھی تاریخ اور دن صحیح ہو جاتے ہیں۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بتایا گیا ہے کہ حضرت مجددؒ کی پیدائش کے وقت

اکبر بادشاہ کی حکومت کا دور دورہ تھا اور اکبر کی وجہ سے پورے ملک میں بے دینی پھیلی ہوئی تھی۔ اکبر لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے دروازہ سے ہٹا کر اپنی چوکھٹ پر جھکنے کے لیے مجبور کرتا تھا۔ ان خرابیوں اور ظلم وستم اور جور و جبر کو دیکھ کر حضرت مجددؒ کی رگوں میں فاروقی خون موج زن ہوا۔ آپ نے خان خانان، خان اعظم، سید صدر جہاں اور مرتضیٰ خان وغیرہ کے ذریعہ جو اکبر کے مقربین میں سے تھے، بادشاہ کو نصیحت آمیز پیغامات بھیجے۔ یہ حضرات بادشاہ کے دربار میں آپ کے پیغامات لے کر حاضر ہوئے۔ اسے بہت سمجھایا اور حضرت مجددؒ کی روحانی قوت سے خوف دلایا۔ چنانچہ بحث ومباحثہ اور قیل وقال کے بعد بادشاہ اس بات پر رضا مند ہو گیا کہ ''لوگوں کو اختیار ہے خواہ وہ دین اسلام پر رہیں یا بادشاہ کے طریقہ پر۔ کسی کو بھی جبراً یہ نہیں کیا جائے گا کہ وہ بادشاہ کو تعظیمی سجدہ کرے۔

حضرت مجدد نے اکبرؒ کے زمانہ میں اس بات کی پوری کوشش کی کہ دین میں جو خرابیاں اور بدعات ومحدثات اس نے پیدا کی ہیں، یہ ان کو ختم کر دے اور ایمان کی سلامتی کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو، لیکن معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ شانہ کو کیا منظور تھا کہ بدھ کی رات 17 جمادی الاخری 1014ھ کو اکبر کا انتقال ہو گیا۔

خان بہادر شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ دہلوی مرحوم اپنی کتاب ''تاریخ ہندوستان جلد 5 ص 863 میں لکھتے ہیں کہ ''اکبر نے 1014ھ میں وفات پائی اور ملا عبدالقادر بدایونی کی تاریخ 1004ھ پر ختم ہو جاتی ہے۔ ابوالفضل کی موت 1011ھ میں واقع ہوئی اور اکبر کے مرنے سے اس کی آئین اکبری اور اکبر نامہ ختم ہو گئے، اس لیے اکبر کے مذہبی خیالات کے تغیرات کا ذکر آخر کے دس سالوں میں کسی مؤرخ نے نہیں لکھا۔ شہنشاہ اکبر کے مذہبی خیالات ہمیشہ بدلتے رہتے تھے۔ معلوم نہیں ان آخری دس سالوں میں ان میں کیا تغیر وتبدیل آیا۔ جہانگیر کی توزک جہانگیری کا ترجمہ انگریزی زبان میں میجر پرائس (Price) نے کیا ہے۔ ترجمہ میں یہ فقرہ ہے: ''شہنشاہ اکبر نے سب سے بڑے مولوی کے ہاتھ پر توبہ کی اور کلمہ پڑھ کر جنتی مسلمانوں کی طرح وہ اس دنیا سے رخصت ہوا،'' مگر اس مضمون کا کوئی فقرہ اس توزک جہانگیری میں نہیں ہے جو سر ڈاکٹر سید احمد خان نے 1281ھ مطابق 1864ء میں چھپوایا تھا۔ شمس العلماء موصوف

نے جلد ششم میں تحریر کیا ہے: ''جہانگیر نے چھوٹی توزک میں اپنے باپ کے مرنے کا حال بہت دلچسپ لکھا ہے (اس میں درج ہے) روز سہ شنبہ 8 جمادی الاولیٰ 1014ھ کو میرے باپ اور مرشد کا سانس تنگ ہوا اور وقت رحلت نزدیک آ گیا۔ فرمایا: ''بابا (جہانگیر کو خطاب کیا) کسی آدمی کو بھیج کر میرے کل امراء اور مقربوں کو بلا لو تا کہ میں تجھ کو ان کے سپرد کروں، اور اپنا کہا سنا ان سے معاف کراؤں۔ انہوں نے برسوں میری ہم رکابی میں جانفشانی کی ہے۔ امراء حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے ان کی طرف منہ کر کے اپنا کہا سنا معاف کرایا اور چند فارسی اشعار پڑھے۔ میراں صدر جہاں حاضر ہوئے اور دوزانو ادب سے بیٹھ کر کلمۂ شہادت پڑھنا شروع کیا۔ بادشاہ نے خود بھی اپنی زبان سے بلند آواز کے ساتھ کلمۂ شہادت پڑھا اور میراں صدر جہاں سے فرمایا کہ سرہانے بیٹھ کر سورۂ یٰسین اور دعائے عدیلہ پڑھیں۔ جب میراں صدر جہان نے سورۂ یٰسین پڑھ کر دعائے عدیلہ ختم کی تو بادشاہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور جان جاں آفرین کو سپرد کی۔

(علماء ہند کا شاندار ماضی: جلد ا ص ۱۰۱، بحوالہ خلاصہ تاریخ ہندوستان: جلد ۸ ص ۲۸۱)

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اکبر اتوار کی رات 5 رجب 949ھ مطابق 15 اکتوبر 1542ء امرکوٹ ضلع تھرپارکر سندھ میں پیدا ہوا اور بروز جمعہ 12 ربیع الثانی 963ھ کو کلانور ضلع گورداسپور، پنجاب، میں تاجپوشی ہوئی اور بدھ کی شب 17 جمادی الاخریٰ 1014ھ کو آگرہ میں وفات پائی۔

جہانگیر کا شیخ مجددؒ کے ساتھ رویہ:

17 جمادی الآخرہ 1014ھ کو اکبر کا انتقال ہوا اور اس کا بیٹا سلیم نور الدین جہانگیر کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اکبر کے دور حکومت میں اسلام اور مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو چکا تھا اور اس عظیم ملک میں جس کو محمد بن قاسمؒ، محمود غزنوی، سلطان محمد غوری اور دوسرے مسلمان فاتحین نے اپنے خون سے اور علماء اسلام نے اپنے خون پسینہ سے اور اہل قلوب نے اپنے اشک سحرگاہی سے سیراب اور بارآور کیا تھا، اسلام کی بیخ کنی کا کام جس قوت اور منصوبہ بندی کے ساتھ کیا گیا، وہ آپ (حضرت مجددؒ) کے

مضطرب اور درد مند دل کو ہر وقت تڑپاتا اور پریشان رکھتا تھا۔ لیکن آپ ابھی حالات کو موافق نہیں سمجھتے تھے کیونکہ ہر کام کی تکمیل کے لیے ایک مناسب وقت ہوتا ہے۔ لیکن آپ بہر صورت وہ حالات پیدا کرنا چاہتے تھے جن میں تند و تیز ہوا ہونے کے باوجود وہ اپنی دعوت کا چراغ جلا سکیں اور جن سے آپ سلطنت ,ور ارکان سلطنت اور مسلمانوں کے بارے میں ایوان اقتدار کی سیاست پر اثر انداز ہوسکیں۔ اس کے لیے آپ نے سب سے پہلے خان خانان، سید صدر جہاں اور مرتضٰی خان وغیرہ کے ذریعہ بادشاہ کو نصیحت آمیز پیغامات بھیجے کیونکہ ان حضرات کو بادشاہ کا تقرب حاصل تھا اور آپ کی عظمت و عقیدت بھی ان کے دلوں میں موجود تھی۔

اکبر اور جہانگیر کی طبیعتوں میں بہت اختلاف تھا۔ جہانگیر ایک طرح کی سلامت روی اور حسن اعتقاد کا حامل تھا۔ اس کو دین اکبری سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ حضرت مجددؒ نے اس کی اس سادہ طبیعت سے فائدہ اٹھا کر برصغیر پاک و ہند سے سابقہ حکومت کے اثرات کو ختم کرنے کا ارادہ فرمایا، لیکن قبل اس کے آپ اپنا یہ انقلاب انگیز پروگرام شروع کریں آپ کو گرفتار کر کے قلعہ گوالیار میں قید کر دیا گیا جو آپ کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے۔ بعض لوگوں نے آپ کے خلاف جہانگیر کے کان بھرے کہ سرہند کا ایک شیخ زادہ اپنے تئیں سیدنا صدیق اکبرؓ سے افضل سمجھتا ہے اور کچھ ایسی باتیں کرتا ہے جن سے کفر کی بو آتی ہے۔ ہزاروں لوگ اس کے حلقہ بگوش ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے کچھ اثرات حکومت پر بھی پڑیں۔ سلاطین کو دنیا کی ہر شی حتیٰ کہ اپنے والدین اور اولاد سے بھی سلطنت اور حکومت عزیز ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ یہ بات ہرگز برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی ان کے امور مملکت میں دخل اندازی کرے۔ چنانچہ جونہی جہانگیر کے کانوں میں ایسی باتیں پہنچیں اس نے حضرت مجددؒ کو بلا بھیجا۔ جہانگیر نے اس واقعہ کے بارے میں اپنی توزک میں بھی لکھا ہے۔ (توزک جہانگیری: ص ۲۷۵)

بعض روایات میں ہے کہ بادشاہ نے جب آپ کی تشریف آوری کی خبر سنی تو امراء اور وزراء کو آپ کے استقبال کے لیے بھیجا اور نہایت احترام کے ساتھ شاہی مہمان کی حیثیت سے آپ کا خیر مقدم کیا۔ اپنے محل کے قریب آپ کا خیمہ نصب کرایا۔ بالآخر

بادشاہ نے ملاقات کے لیے آپ کو دربار میں طلب کیا۔ آپ دربار میں تشریف لے گئے تو آداب شاہی جو خلاف شرع تھے ادا نہ کیے۔ بادشاہ نے جونہی حضرت مجددؒ کو دیکھا تو وہ اس درجہ متاثر ہوا کہ آداب شاہی بجا نہ لانے پر ذرا بھی معترض نہ ہوا۔ یہ حال دیکھ کر وزیر حیران رہ گیا اور بادشاہ سے کہا: ''حضور! یہ وہ شخص ہے جو اپنے آپ کو تمام انبیاء سے افضل بتاتا ہے اور حضرت موصوف کا وہ مکتوب گرامی بھی پیش کیا جو حضرت مجددؒ نے اپنے پیر بزرگوار خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں اپنے تفصیلی احوال کے سلسلہ میں تحریر کیا تھا۔

(ملاحظہ ہو مکتوبات، دفتر اول مکتوب:۱۱۱)

حضرت مجددؒ نے فرمایا کہ یہ سب جھوٹ ہے اور مسئلہ کی وضاحت بادشاہ کے سامنے بیان کی۔ بادشاہ آپ کی وضاحت سے متاثر ہو کر کہنے لگا: ''واقعی ہمارا خیال بھی ایسے ہی تھا کہ آپ جیسے بزرگ صالح اور متقی سے کیوں اہل حق کی مخالفت ظاہر ہو گی۔'' جب وزیر نے دیکھا کہ یہ داؤ بھی نہ چل سکا تو اس نے بادشاہ سے کہا: ''حضور! شیخ صاحب نے آداب سلطنت کی کوئی رعایت نہیں کی۔'' اس پر بادشاہ نے آپ سے وجہ دریافت کی۔ آپ نے فرمایا: ''میں نے آج تک اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے آداب واحکام کی پابندی کی ہے، ان کے علاوہ مجھے کوئی آداب نہیں آتے۔'' بادشاہ نے ناراض ہو کر کہا: ''مجھے سجدہ کرو۔'' آپ نے فرمایا: ''میں نے سوائے خدا کے نہ کسی کو سجدہ کیا نہ کروں گا۔'' بادشاہ نے کہا: ''نہیں، تم کو سجدہ کرنا پڑے گا۔'' حضرت مجددؒ نے فرمایا: ''تم مجھ سے ہرگز سجدہ نہیں کرا سکتے۔'' کہتے ہیں کہ اس واقعہ سے قبل شاہزادہ خرم یعنی شاہ جہان جو حضرتؒ سے خلوص کامل رکھتا تھا، علامہ افضل خان اور خواجہ عبدالرحمٰن مفتی کو کتب فقہ کے ساتھ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی خدمت میں بھیج چکا تھا کہ سجدہ تحیۃ سلاطین کے لیے آیا ہے۔ اگر آپ سجدہ کر لیں تو آپ کو بادشاہ سلامت سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ میں اس بات کا ضامن ہوں۔ آپ نے فرمایا: ''یہ حکم بطور رخصت ہے اور بطور عزیمت حکم یہ ہے کہ غیر حق کو کبھی سجدہ نہ کریں۔'' (حضرات القدس دفتر دوم: ص۹۰)

جب بادشاہ کو اندازہ ہو گیا کہ آپ کسی طرح اس کو سجدہ نہیں کریں گے تو کہا: ''اچھا! آپ کا سجدہ صرف اتنا ہے کہ سر کو ذرا خم کر دیں۔ باقی آداب میں نے معاف کر

دیئے کیونکہ مجھے آپ سے شرم آتی ہے، اور یہ کہ میری زبان سے ایک بات نکل گئی ہے اس کو پورا ہونا چاہیے۔" حضرت مجددؒ نے فرمایا: "میں اس بات کے لیے سر بھی نہ جھکاؤں گا۔" بادشاہ نے اپنے مقربین سے کہا کہ شیخ صاحب کے سر کو پکڑ کر ذرا جھکا دو اور پھر ان کو تحفے اور انعامات دے کر رخصت کر دو کیونکہ مجھے ان سے حیا آتی ہے۔ چنانچہ چند قوی ہیکل امراء نے حضرتؒ کے سر کو خم کرنا چاہا اور بہت زور لگایا کہ کسی طرح ذرا خم کر دیں لیکن ممکن نہ ہوا حتیٰ کہ زور آزمائی کی وجہ سے حضرت مجددؒ کی بینی مبارک سے خون جاری ہو گیا۔ بعد ازاں بادشاہ نے کہا: "اچھا، شیخ صاحب کو اس چھوٹے دروازے سے جو قدِ آدم سے چھوٹا ہے لے کر آؤ تا کہ اس سے گزرتے وقت تو سر جھکانا ہی پڑے گا" لیکن حضرت مجددؒ نے اس دروازے سے گزرنے کے لیے پہلے اپنا قدم نکالا اور پھر سر کو پچھلی جانب جھکا کر داخل ہوئے وزیر نے یہ حالت دیکھ کر بادشاہ کو اور بھڑکایا، کہ "شیخ صاحب جب آپ کے حضور میں اس قدر تکبر کرتے ہیں تو باہر نکل کر کس قسم کی شورش کا موجب ہوں گے؟ ایسا موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔ شیخ صاحب کو ابھی قید کر دینا چاہیے ورنہ بعد میں بڑی ندامت ہوگی اور اس وقت پچھتانا کچھ مفید نہ ہوگا۔" آخر بادشاہ وزیر کے کہنے پر حضرت مجددؒ کو قید کرنے پر راضی ہو گیا اور گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کرنے کا حکم دے دیا۔ (روضۃ القیومیہ: ص ۱۷۹۔۱۸۰)

حضرت مجددؒ قلعہ گوالیار میں:

بعض روایات میں ہے کہ حضرت مجدد کو الہام ہو چکا تھا اسی لیے آپ قید ہونے سے پہلے فرمایا کرتے تھے کہ ابھی تک میری تربیت جمالی طور سے ہوئی ہے۔ اب حق تعالیٰ شانہ کو منظور ہے کہ جلالی طور سے ہو، اور مجھ پر ایک مصیبت آنے والی ہے جو میرے مدارج قرب کی ترقیات کا موجب ہوگی۔ چنانچہ آپ نے قید و بند کی ان تکالیف کو بخوشی قبول فرما لیا۔

بعض روایات میں ہے کہ حضرت مجددؒ جب گوالیار کے قلعہ میں پہنچے تو وہاں کئی ہزار غیر مسلم بھی قید تھے۔ حضرتؒ نے ان کو تبلیغ و دعوت سے مشرف باسلام کیا اور

سینکڑوں قیدیوں کو ارادت سے سرفراز فرما کر درجات ولایت پر پہنچا دیا۔

(علماء ہند کا شاندار ماضی: جلد ا ص ۲۵۲)

ہندوستان کے امراء اور اراکین سلطنت مثلاً خان خانان، خان اعظم، سید صدر جہاں، مہابت خان، مرتضیٰ خان، قاسم خان، تربیت خان، خان جہاں لودھی، سکندر لودھی، حیات خان اور دریا خان جو حضرت مجددؒ کے مرید تھے، آپ کی نظر بندی کی خبر سن کر آگ بگولا ہو گئے۔ فوراً جنگ کی تیاری کے لیے باہمی خط و کتابت کی۔ آخر کار یہ طے پایا کہ کابل کے حاکم مہابت خان کو اپنا سردار مقرر کیا جائے اور باقی سب حاکم خزانے اور فوجیں کابل روانہ کر دیں، اور دوسری حکومتوں کے بادشاہوں نے بھی حتیٰ المقدور مہابت خان کی مدد کی۔ چنانچہ مہابت خان کافی فوج لے کر کابل سے روانہ ہو گیا، لیکن راستہ میں حضرت مجددؒ کی جانب سے اس کو ایک مکتوب ملا جس میں تحریر تھا کہ میری یہ کیفیت میری رضامندی سے ہے۔ خبردار! آپ حضرات کوئی حرکت نہ کریں۔

اسی اثناء میں بادشاہ اپنی شامت اعمال کی بنا پر سخت بیمار ہو گیا اور کسی طرح شفا کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ آخر ایک رات خواب میں کسی بزرگ نے فرمایا: ''اے ظالم! تو نے مجدد اسلام اور امام وقت کو تکلیف دی ہے۔ یہ بیماری اسی کی وجہ سے ہے۔'' بادشاہ نے بیدار ہوتے ہی آپ کی رہائی کا فرمان جاری کر دیا اور ایک عرض داشت جو خطا کی معافی اور ملاقات سے مشرف ہونے کی استدعا پر مشتمل تھی، اپنے ندیموں کے ہاتھ آپ کی خدمت میں بھیجی۔ (سیرت امام ربانی از محمد داؤد بن مولانا نور احمد امرتسری: ص ۱۳۰۔۱۳۱)

صاحب روضۃ القیومیہ نے ان واقعات کو یوں لکھا ہے کہ مہابت خان نے جب ہر طرح کے انتظامات مکمل کر لیے تو خطبہ اور سکہ سے بادشاہ کا نام نکال کر کابل سے ہندوستان کی طرف چلا۔ جب یہ خبر بادشاہ تک پہنچی تو بہت پریشان ہوا اور مہابت خان کا مقابلہ کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نظر نہ آیا۔ چنانچہ بادشاہ خود ایک لشکر جرار لے کر نکلا اور دریائے جہلم پر جہانگیر اور مہابت خان کا مقابلہ ہوا۔ شاہی لشکر میں حضرت مجددؒ کے مریدین کی کثرت تھی اور سب کو معلوم تھا کہ مہابت خان حضرتؒ کو قید کرنے کی وجہ سے بادشاہ سے جنگ کرنے پر مجبور ہوا ہے، اس لیے بادشاہ کے حکم کی تعمیل میں لشکر نے مہابت

خان پر حملہ صرف دکھانے کے لیے کیا۔ بادشاہ غصہ میں بھرا ہوا تھا۔ اس نے جنگی اصولوں کا لحاظ رکھے بغیر بڑھتا چلا گیا۔ مہابت خان جنگی چال کے تحت پیچھے ہٹتا چلا گیا حتیٰ کہ بادشاہ کو گھیرے میں لے کر گرفتار کرلیا۔ وزیر اور باقی لشکر کو جب بادشاہ کی گرفتاری کا علم ہوا تو بہت گھبرائے اور صلح کی پیشکش کی، اور وزیر بدتدبیر نے مہابت خان کی خدمت میں حاضر ہو کر بہت خوشامد کی اور معافی مانگی۔ بادشاہ تین یا سات روز مہابت خان کے پاس نظر بند رہا۔ اس دوران میں بعض امراء نے حضرت مجددؒ کو تخت پر بٹھانا چاہا، لیکن حضرت نے تخت پر بیٹھنا تو درکنار قید سے نکلنا بھی پسند نہ کیا بلکہ آپ نے امراء کے ذریعہ مہابت خان کو پیغام بھیجا کہ ''فتنہ وفساد فرو کرو اور بادشاہ کی اطاعت کرو۔''

جب مہابت خان نے جہانگیر کو حضرت مجددؒ کا یہ پیغام سنایا تو وہ حیران رہ گیا اور حضرت مجددؒ کی عظمت و ہیبت سے تھرا گیا۔ چنانچہ مہابت خان سے حضرت مجددؒ کی رہائی کا عہدو پیمان لے کر بادشاہ کو پھر تخت پر بٹھا دیا اور خود دست بستہ سامنے کھڑا ہو گیا اور آداب سلطنت بجا لایا۔ بادشاہ نے بھی اس کا قصور معاف کر دیا اور حضرت مجددؒ کی رہائی کا حکم صادر فرمایا۔ آپ کی نیک نیتی اور اخلاص کے اس عظیم مظاہرہ سے بے حد متاثر ہوا اور آپ کی ملاقات کا اشتیاق ظاہر کر کے تشریف لانے کی دعوت دی۔

(روضۃ القیومیہ: ص ۱۸۸، سوانح حضرت مجدد الف ثانی: ص ۸۹، احسان اللہ عباسی گورکھپوری)

حضرت مجددؒ نے بادشاہ کے پاس حاضر ہونے کے لیے چند شرطیں پیش کیں جن کو بادشاہ نے بخوشی منظور کرلیا۔

حضرت مجددؒ بڑی عزت و احترام سے رہا کیے گئے۔ تین روز سرہند میں قیام فرما کر آپ شاہی لشکر آگرہ میں تشریف لے آئے۔ ولی عہد شہزادہ خرم اور وزیر اعظم نے آپ کا پرجوش استقبال کیا۔ آپ نے شاہی محل میں نہایت درجہ احترام کے ساتھ قیام فرمایا۔ بادشاہ نے آپ کی پیش کردہ شرائط کو پورا کیا۔ چنانچہ

1- سجدۂ تعظیمی بالکل موقوف کر دیا گیا۔

2- گاؤکشی میں آزادی دی گئی۔ گائے کا گوشت سر بازار فروخت ہونا شروع ہو گیا۔

3- بادشاہ اور ارکان دولت نے ایک ایک گائے دربار عالم کے دروازے پر اپنے اپنے ہاتھ سے ذبح کی اور کباب تیار کرا کر کھائے۔

4- ملک کے جس جس حصہ میں مساجد شہید کی گئی تھیں دوبارہ تعمیر کی گئیں۔

5- دربار عام کے قریب ایک خوش نما مسجد تعمیر ہوئی۔ تیار ہونے پر بادشاہ امراء سمیت اس مسجد میں آیا اور حضرت مجدد کی امامت میں نماز ادا کی۔

6- ہر شہر اور قصبہ میں دینی تعلیم کے لیے مکتب اور مدرسے قائم کیے گئے۔

7- ہر شہر میں محتسب، شرعی قاضی اور مفتی مقرر ہوئے۔

8- کفار پر جزیہ مقرر ہوا۔

9- جس قدر قوانین خلاف شرع جاری تھے سب یک قلم منسوخ کیے گئے۔

10- جملہ بدعات اور رسوم جاہلیت بالکل ختم کر دی گئیں۔

اس طرح دین اسلام میں نئے سرے سے رونق اور تازگی پیدا ہوئی۔ مسلمانوں کے قلوب خوشی اور مسرت سے لبریز ہو گئے اور شبانہ روز کفار اپنی رضا و رغبت سے حلقۂ اسلام میں داخل ہونے شروع ہو گئے۔ (سیرت امام ربانی: ص ۱۳۲)

صاحب روضۃ القیومیہ نے لکھا ہے کہ

''بادشاہ گذشتہ گستاخیوں کی بابت بہت شرمندہ تھا۔ ہر روز اپنے خاتمہ بالخیر اور مغفرت کے لیے حضرت مجددؒ سے التجا کرتا۔ حضرت فرماتے: ''خاطر جمع رکھو، میں اس وقت بہشت میں داخل ہوں گا جب تم کو اپنے ساتھ لے لوں گا۔'' (روضۃ القیومیہ: ص ۱۹۷)

حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ نے حضرت مجددؒ کی رہائی کے واقعات کو اس طرح لکھا ہے:

''قید سے رہائی کا واقعہ بھی آپ کی روشن کرامت ہے۔ بادشاہ جہانگیر نے خواب دیکھا۔ خواب کیا قسمت جاگ اٹھی۔ دیکھا کہ سید الخلق اشرف الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم بطور تاسف اپنی انگلی دانتوں میں دبائے ہوئے فرما رہے ہیں کہ ''جہانگیر! تو نے کتنے

بڑے شخص کو قید کر دیا۔

''اس خواب کے فوراً بعد آپ کی رہائی عمل میں آئی مگر دشمنوں نے پھر کچھ کہہ سن کر بادشاہ سے یہ حکم دلوا دیا کہ چند روز آپ ہمارے ساتھ لشکر میں رہیں گے۔ گو یہ چیز حضرتؒ کے لیے قید سے کم تکلیف دہ نہ تھی لیکن کام جو بنا وہ اسی سے بنا۔ بادشاہ کو آپ کی صحبت نصیب ہوئی اور اس صحبت نے اس کے باطن کو مزکی کر دیا۔ پھر تو وہ آپ کا غلام تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ نے آپ کے دست حق پرست پر توبہ کی۔ شراب و کباب اور دوسرے منہیات سے ایسی کامل بے تعلقی اختیار کی کہ باید و شاید۔

''وہی بادشاہ جس کے غرور و بدمستی کی یہ حالت تھی کہ اپنے لیے سجدہ کراتا تھا۔ سجدۂ تعظیمی کے جواز کے فتوی علماء سے لیے تھے۔ وہی بادشاہ آخر عمر میں کہتا ہے کہ ''میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے نجات کی امید ہو، البتہ میرے پاس ایک دستاویز ہے اس کو اللہ کے سامنے پیش کروں گا۔ وہ دستاویز یہ ہے کہ ایک روز مجھ سے شیخ احمد سرہندیؒ نے فرمایا تھا کہ ''اگر اللہ تعالیٰ ہم کو جنت میں لے جائے گا تو تیرے بغیر نہ جائیں گے۔''

''حضرت امام ربانیؒ ہی کی برکت تھی کہ جہانگیر کے بعد شاہ جہاں جیسا دیندار اور شاہ جہان کے بعد اورنگ زیب جیسا جامع کمالات صوری و معنوی بادشاہ ہوئے۔

''جہانگیر کے اقبال نے یہاں تک ترقی کی کہ سرہند میں حضرت امام ربانی کا مہمان بنے اور آپ کے باورچی خانہ کا کھانا کھانے کا شرف حاصل کیا۔ کھانا اگرچہ بالکل سادہ تھا مگر بادشاہ نے کہا کہ میں نے ایسا لذیذ کھانا کبھی نہیں کھایا۔''

(تذکرہ مجدد الف ثانی: ص ۲۵۶۔۲۵۷)

حضرت مجددؒ کی لشکر میں شمولیت:

حضرت مجددؒ قریباً ایک سال گوالیار کے قلعہ میں قید رہے۔ قید کے دوران آپ کی حویلی، سرائے، کنواں، باغ اور کتابیں وغیرہ سب ضبط کر لی گئیں اور آپ کے متعلقین کو وہاں سے دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا۔ (توزک جہانگیری: دفتر ۳ ص ۳۷۲)

آپ کی گوالیار میں یہ نظر بندی حق تعالیٰ شانہ کی بہت سی حکمتوں اور دینی مصالح پر مبنی تھی۔ آپ نے یہاں اپنے رفقائے زندان میں تبلیغ و ارشاد کا کام پوری سرگرمی سے شروع کر دیا اور پس دیوار زندان کی آواز اس بلند آہنگی سے بلند کی کہ گوالیار کے قلعہ کے در و دیوار گونج اٹھے اور صحبت و تربیت کے فیض سے مشرف باسلام ہوئے اور سینکڑوں کیا ہزاروں قیدی ارادت و صحبت سے سرفراز ہو کر درجات عالیہ تک پہنچے۔ چنانچہ پروفیسر آرنلڈ (Arnold) نے اپنی مشہور کتاب پریچنگ آف اسلام (Preaching of Islam) میں لکھا ہے کہ

> ''بادشاہ جہانگیر (1628-1605) کے عہد میں ایک سنّی عالم احمد مجدد نامی تھے جو شیعی عقائد کی تردید میں خاص طور پر مشہور تھے۔ شیعوں کو اس وقت شاہی دربار میں بڑا رسوخ حاصل تھا۔ ان لوگوں نے کسی بہانہ سے انہیں قید کرا دیا۔ دو برس وہ قید میں رہے اور اس مدت میں انہوں نے اپنے رفقائے زندان میں سینکڑوں بت پرستوں کو دائرہ اسلام میں داخل کیا۔'' (پریچنگ آف اسلام: ص ۴۱۲)

اسی طرح انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس میں تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ

> ''ہندوستان میں سترھیوں صدی عیسوی میں ایک عالم دین جن کا نام شیخ احمد مجدد تھا جو ناحق قید کر دئے گئے، ان کے بارے میں روایت ہے کہ انہوں نے قید خانہ کے ساتھیوں میں سے کئی سو بت پرستوں کو مسلمان بنا لیا تھا۔'' (جلد ۸ ص ۷۴۸)

قلعہ گوالیار کی اس اسیری کے دوران حضرت مجددؒ پر جن انعامات الٰہیہ کی بارش ہوئی اور آپ کو جو باطنی ترقیات، حقیقی شکستگی اور وارستگی کی لذت اور خلوت میں جلوت کی جو نعمت حاصل ہوئی وہ نا قابل بیان ہے۔ چنانچہ آپ میر محمد نعمان کے نام ایک خط میں جو قلعہ گوالیار سے بھیجا گیا تھا، تحریر فرماتے ہیں:

> ''اگر محض فضل خداوندی سے فیوض و برکات اور واردات الٰہی کا تسلسل اور اس کے غیر متناہی انعامات و عطیات کا پے در پے ظہور اس محنت کدہ میں مجھ جیسے شکستہ پر کے شامل حال نہ ہوتا تو قریب تھا کہ معاملہ یاس و ناامیدی کی حد تک پہنچ جاتا اور رشتۂ امید ٹوٹ جاتا۔ حمد و ثنا ہے اس اللہ تبارک و تعالیٰ کی جس نے مجھ کو عین بلا میں عافیت عطا فرمائی اور ظلم و جفا میں عزت سے سرفراز فرمایا۔ مشقت و تکلیف میں مجھ پر احسان کیا اور راحت و مصیبت میں شکر کی توفیق عطا فرمائی۔ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی پیروی کرنے والوں اور اولیائے کرامؒ کے نقش قدم پر چلنے والوں اور علماء و صلحائے امت سے محبت رکھنے والوں میں داخل فرمایا۔ اس اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں انبیاء کرام پر اولاً اور ان کے متبعین پر ثانیاً۔'' (مکتوبات امام ربانی دفتر: ۳ مکتوب نمبر ۵)

مختصر یہ کہ حضرت مجددؒ قریباً ایک سال پس دیوار زندان رہنے کے بعد جمادی الآخرہ 1029ھ مطابق مئی 1620ء میں قلعہ گوالیار سے رہا ہوئے۔ رہائی کے بعد جہانگیر نے حضرت کو اجازت دی کہ وہ چاہیں تو لشکر کے ساتھ رہیں اور چاہیں تو گھر چلے جائیں (در رفتن و ماندن مختار گردانیدم) یہ جہانگیر نے حکومتی جھوٹ اور ڈپلومیسی کا اظہار کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے حضرت مجددؒ کو آخر وقت تک ایک لحاظ سے نظر بند رکھا۔ بہرحال مجدد صاحبؒ نے لشکر کے ساتھ رہنا قبول کیا۔ جہانگیر کا منشاء بھی یہی تھا، لیکن ع

عدو شرے بر انگیزد کہ خیر ما دراں باشد

اس طریقہ سے مجدد صاحبؒ کو سارے لشکر میں بلکہ ساری مملکت میں دعوت و

تبلیغ کا موقع ملتا رہا۔ لشکر کے ساتھ قیام کے دوران میں آپ کو بادشاہ کو دعوت وتبلیغ کرنے کا موقع بھی میسر آیا۔ چنانچہ مکتوبات کے تیسرے دفتر میں ایک خط بادشاہ کے نام ہے، اور ایک اور خط میں اس گفتگو کا ذکر ہے جو آپ نے مجلس شاہی کی تھی، فرماتے ہیں:

''عجیب وغریب صحبتیں گذر رہی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان گفتگوؤں سے امور دینیہ اور اصول اسلامیہ میں سرمو تکاسل، سستی اور مداہنت کا دخل نہیں۔ باقی باری تعالیٰ کی توفیق سے ان محفلوں میں بھی باتیں ہوتی ہیں جو خاص مجلسوں اور خلوتوں میں بیان ہوا کرتی ہیں۔ اگر ایک مجلس کا حال لکھا جائے تو اس کا پورا ایک دفتر بن جائے خاص کر آج ماہ رمضان کی سترھویں رات کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت اور عقل کے عدم استقلال اور آخرت کے ایمان اور اس کے عذاب وثواب اور رؤیت و دیدار کے اثبات اور حضرت خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی خاتمیت اور ہر صدی کے مجدد اور خلفائے راشدین کی اقتداء اور تراویح کی سنت اور تناسخ کے باطل ہونے اور جنوں اور جنیوں کے احوال اور ان کے عذاب وثواب کی نسبت بہت کچھ مذکور ہوا، اور بادشاہ (جہانگیر) بڑی خوشی ومسرت سے سنتا رہا۔ اسی اثناء میں اور بھی بہت سی چیزوں کا ذکر ہوا اور اقطاب واوتاد اور ابدال کے احوال اور ان کی خصوصیتوں وغیرہ کا بیان ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ بادشاہ سب کچھ قبول کرتے رہے اور کوئی تغیر نہ ہوا۔ ان واقعات وملاقات میں شاید کوئی اللہ کی پوشیدہ حکمت اور خفیہ راز تھا۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گوالیار کی اسیری سے رہائی کے بعد حضرت مجددؒ بادشاہ کے قریب ہی رہے اور انہوں نے دین کی طرف راغب کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ چنانچہ گوالیار سے رہائی کے تین سال بعد بادشاہ نے حضرت مجددؒ کے بارے میں توزک میں لکھا:

"بدستور ہر سال خود را بہ طلا و اجناس وزن فرمودہ در وجہ مستحقاں مقرر فرمودم۔ ازاں جملہ شیخ احمد سرہندی را دو ہزار روپیہ عنایت شد۔"

قلعہ گوالیار سے واپسی کے بعد قریباً چار سال حضرت مجددؒ جہانگیر کے لشکر میں رہے اور وہ بادشاہ کے ساتھ کشمیر اور کانگڑہ بھی گئے۔ پھر لشکر کے ساتھ ہی آپ 1622 میں اجمیر تشریف لے گئے جہاں انہوں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہ کے مزار کی زیارت کی اور دیر تک مراقبہ کر کے روحانی فیوض و برکات حاصل کیں۔ لشکر سے کبھی کبھی رخصت لے کر آپ سرہند تشریف لے جاتے اور رخصت ختم ہونے کے بعد واپس لشکر میں تشریف لے جاتے۔ بعض مکتوبات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت مجددؒ لشکر شاہی کے ساتھ لاہور پہنچے۔ وہاں سے سرہند کوچ ہوا سرہند میں حضرتؒ نے بادشاہ کی ضیافت کی۔ حضرتؒ کی خواہش سرہند رہ جانے کی تھی لیکن بادشاہ نے آپ کی جدائی گوارا نہ کی، لہٰذا وہاں سے دہلی روانگی ہوئی۔ دہلی سے بنارس اور پھر اجمیر قیام رہا۔

وفات:

لشکر جہانگیری میں حضرت مجددؒ کی شمولیت جو چار سال رہی اس نے جہانگیر پر کافی اچھے اثرات ڈالے۔ اس وجہ سے جہانگیر کو آپ کے ساتھ گہری عقیدت ہو گئی۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ جہانگیر آپ سے بیعت ہو گیا تھا لیکن اس بات کا کوئی مستند تاریخی ثبوت نہیں، لیکن اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اکبر کے دین الٰہی کے وہ ملحدانہ نظریات جو جہانگیر کو ورثہ میں ملے تھے حضرت مجددؒ کی صحبت سے وہ سب ختم ہو گئے بلکہ اس کے اندر نئے دینی رجحانات پیدا ہوئے۔ چنانچہ اس نے منہدم مساجد کی دوبارہ تعمیر اور مفتوحہ علاقوں میں دینی مدارس کے قیام میں بہت دلچسپی لی۔ 1031ھ میں قلعہ کانگڑہ کی فتح کے موقع پر اس نے جس طرح اپنی اسلامیت کا اظہار کیا اور وہاں اسلامی شعائر کا اجراء کرایا (جس کا تذکرہ توزک جہانگیری ص ۳۴۰ پر ہے) اس سے بھی اس کی ذہنی اور فکری تبدیلی کا پتہ چلتا ہے۔

زبدۃ المقامات ص ۲۸۳ میں ہے کہ 1032ھ میں آپ اجمیر تشریف رکھتے

تھے۔ آپ نے اپنے صاحبزادگان کو جو اس وقت سرہند میں تھے، ایک مکتوب میں تحریر فرمایا: ''ایام انقراض عمر نزدیک وفرزندان دور'' یعنی زندگی کے اختتام کے دن قریب ہیں اور فرزند دور۔ اس خط کا ملنا تھا کہ دونوں صاحبزادگان فوری طور پر اجمیر حاضر ہوگئے۔ ایک روز دونوں فرزند (خواجہ محمد سعیدؒ اور خواجہ محمد معصومؒ) سے خلوت میں فرمایا: ''اب اس دنیا سے کسی طرح کی دلچسپی اور اس کی طرف کوئی التفات نہیں۔ اب سفر کے دن قریب ہیں اور اس دوسرے عالم کا خیال ہر وقت ذہن پر مستولی رہتا ہے۔''

لشکر سے وطن واپسی پر حضرت مجدد کا سرہند میں قیام دس ماہ اور نو روز رہا۔ جب آپ نے اجمیر سے سرہند مراجعت فرمائی تو آپ نے سرہند پہنچ کر تمام تعلقات سے کنارہ کشی اختیار فرمائی اور تمام لوگوں سے خلوت اختیار فرمالی۔ حضرت جہاں تشریف فرما ہوئے وہاں سوائے صاحبزادگان اور دو تین مخصوص خادموں کے جن میں ایک خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ بھی تھے اور کسی کو آنے کی اجازت نہ تھی، اور آپ سوائے پنج گانہ نماز اور جمعہ کے باہر تشریف نہ لاتے تھے۔ سارا وقت ذکر وفکر اور استغفار میں گذرتا۔ گویا آپ باہمہ ہوکر بھی بے ہمہ تھے۔ وسط ذی الحجہ سے ضیق النفس (دمہ) کے عارضہ میں شدت ہوگئی۔ اکثر گریہ میں مصروف رہتے اور جب ضعف کی شدت ہوتی تو زبان پر ''**اللھم الرفیق الاعلیٰ**'' کا ورد جاری ہو جاتا۔ اسی عرصہ میں چند روز صحت کے ساتھ گزرے اور حاضرین اور معتقدین بلکہ صاحبزادگان کو بھی قدرے سکون ہوا۔ اسی حالت میں اکثر فرماتے: ''ضعف کی شدت میں وہ حلاوت ولذت محسوس ہوتی تھی جس کا اس چند روزہ صحت میں پتہ نہیں۔'' اس حالت میں بکثرت صدقہ اور خیرات کی۔ بیماری نے غلبہ پالیا اور روز بروز صحت کمزور ہوتی گئی۔ وفات سے ایک روز قبل فرمایا: ''میری تجہیز وتکفین میں سنت پر پورا پورا عمل کیا جائے اور اس بارے میں کوئی سنت ترک نہ کی جائے۔ اسی طرح کچھ اور وصیتیں فرمائیں اور چہار شنبہ کی رات 28 صفر المظفر 1034ھ مطابق 10 دسمبر 1624ء کو اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

غسل کے وقت لوگوں نے دیکھا کہ آپ نماز کے طریقہ پر ہاتھ باندھے ہوئے تھے ہاتھوں کو کتنا ہی الگ کیا جاتا وہ نماز کی کیفیت میں ایک دوسرے پر خود بخود

آ جاتے۔ تجہیز و تکفین سب سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہوئی۔ بڑے صاحبزادے خواجہ محمد سعیدؒ نے نماز جنازہ پڑھائی اور جسم مبارک کو آخری آرمگاہ میں پہنچا دیا گیا۔ (زبدۃ المقامات: ص ۲۵۶۔۲۸۰)

تجدید کا مرکزی نقطہ:

اب ایک سوال یہ ہے کہ حضرت مجددؒ جن کی تجدید کی دنیا میں اتنی شہرت ہوئی کہ لفظ ''مجدد'' ان کے نام کا قائم مقام بن گیا، کی وہ تجدید دین کیا تھی؟ یہ درست ہے کہ دین اکبری نے اسلام کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا اور لوگوں کے ذہنوں میں اسلام کے بارے میں طرح طرح کے شکوک وشبہات پیدا ہو چکے تھے۔ کئی نظریات جن میں بعض بظاہر اور بعض حقیقتاً خلاف اسلام تھے، مسلم معاشرہ میں جنم لے چکے تھے۔ آپ نے ان سب چیزوں کو اپنی دعوت و تبلیغ اور اپنے مکتوبات کے ذریعہ ختم کیا اور آپ کے ہاتھوں اسلام کی حفاظت وتقویت کا وہ تاریخ ساز اور عہد آفریں کام انجام پایا کہ تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ روح وفکر اسلامی کی جلاء اور تازگی، وقت کے سنگین ترین فتنوں کا استیصال، نبوت محمدی اور شریعت اسلامی کی صداقت و ابدیت پر از سر نو اعتماد اور اعتقاد بحال کرنا اور ایسی تلاش حقیقت اور خدا رسی کی کوشش کی طلسم شکنی جو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے بے نیاز ہو، وحدت الوجود، اور ہمہ اوست کے عقیدہ اور نظریہ کی پردہ کشائی جو اپنے غلو ومبالغہ اور اشاعت ومقبولیت کے نقطۂ عروج پر پہنچ چکا تھا جس سے نہ صرف عقائد میں تزلزل پیدا ہو گیا تھا بلکہ مسلم معاشرہ بھی تشتت و انتشار کا شکار ہو رہا تھا۔ بدعات کی کھلی تردید ومخالفت حتیٰ کہ بدعت حسنہ کے وجود سے بھی انکار، ان تمام چیزوں کی تجدید سے انہوں نے برصغیر پاک و ہند میں اسلام کے اکھڑتے ہوئے قدموں کو جمانے اور دین اکبری کے مخالف اسلام اثرات کو ختم کرنے کی ایک انقلابی کوشش کی، اور اس میں وہ نہ صرف بڑی حد تک بلکہ پوری طرح کامیاب بھی ہوئے۔ انہوں نے برہمنیت یا وحدت ادیان کی گود میں اسلام کو لے جانے کے بجائے دوبارہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور دین حجازی کی نگرانی میں دیا، بلکہ حقیقت میں برصغیر پاک و ہند کی

ملت اسلامیہ کو اس ہمہ گیر اعتقادی، ذہنی اور تہذیبی ارتداد کے فوری خطرہ سے محفوظ کر دیا جو بادشاہ اکبر جیسی با عزم اور قوی الارادہ شخصیت اور اس کے یگانہ روزگار سفیروں، ملا مبارک ناگوری، فیضی اور ابوالفضل کی ذہانت سے ایک امر واقعہ بن کر سامنے آ گیا تھا۔ اسی لیے اقبال مرحوم نے ان کے بارے میں فرمایا ؎

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار

لیکن حقیقت میں ان کا اصل کارنامہ جس کے جلو میں ان کے سارے تجدیدی کارنامے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور ان کی تجدید کا اصل کارنامہ جس سے ان کے تمام انقلابی اور اصلاحی کاموں کے چشمے پھوٹتے ہیں اور دریا بن کر سارے عالم میں رواں دواں اور جاری وساری ہو جاتے ہیں، وہ نبوت محمدی اور اس کی ابدیت وضرورت پر امت کا اعتماد بحال کرنے اور مستحکم کرنے کا وہ تجدیدی وانقلابی کارنامہ ہے جو ان سے پہلے اس تفصیل و وضاحت کے ساتھ کسی مجدد نے انجام نہیں دیا۔ شاید اس لیے کہ ان کے زمانے میں اس کی ضرورت پیش نہیں آئی اور اس کے خلاف کوئی مستحکم تحریک یا فلسفہ سامنے نہیں آیا۔ (تذکرہ امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ: ص ۲۷)

آپ کے ان تجدیدی اقدام سے ان تمام فتنوں کا دروازہ بند ہو گیا جو اس وقت عالم اسلام میں منہ پھیلائے اسلام کے شجرۂ طیبہ اور اس کے پورے اعتقادی، فکری اور روحانی نظام کو نگل لینے کے لیے تیار تھے۔ ان میں ایران کی نقطوی تحریک اور اس کے پیروکار، اکبر کا دین اکبری جو ہندوستان میں نبوت وشریعت محمدی کی جگہ لینے اور اس کا بدل بننے کا مدعی تھا، اور اس میں وہ دینی بدعات بھی تھیں جو دینی زندگی، اعمال وعبادات اور معاشرہ وتمدن میں پھیلی ہوئی تھیں اور جن کی ایک مستقل ''فقہ'' مدون ہو رہی تھی۔ اس سلسلہ میں وحدت الوجود کا فلسفہ بھی آتا ہے جو اپنے داعیوں اور علم برداروں کے بقول کشفی حقائق پر مبنی تھا۔ اس ضمن میں فرقہ امامیہ بھی آتا ہے جس کے اساسی عقائد میں امامت کا عقیدہ بھی ہے جس میں امام نبی کا ہمسر اور مساوی بن جاتا ہے۔ اسی طرح انہوں نے ''نبوت محمدی پر ایمان واعتماد کی تجدید'' کی شاہ کلید (Master Key) سے وہ

سارے بھاری اور پیچیدہ قفل کھول دیے جو یونانی اور ایرانی فلسفہ اور مصری اور ہندوستانی اشراقیت نے ایجاد کیے تھے۔ آپ نے اس ایک تیر سے ان سب فتنوں کو ختم کیا جن کا مسلمانوں کا ذہین طبقہ نشانہ بنا ہوا تھا۔

حضرت مجددؒ کا ایک تجدیدی کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے عقل اور کشف دونوں کے "غیبیات" ماوراء عقل علوم، ذات و صفات الٰہی کی صحیح معرفت، لاریبی علم اور قطعی الثبوت حقائق کے یقینی ادراک سے عاجز اور قاصر ثابت کیا اور یہ کہ ان کے حاصل کیے ہوئے نتائج شک و ریب اور خطا و لغزش اور غلط فہمی سے مبرا نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہی کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح عقل کا مرتبہ حواس سے ماوراء ہے اسی طرح نبوت کا مرتبہ عقل سے ماوراء ہے۔ خدا کی تعظیم کا صحیح طریقہ معلوم کرنا نبوت پر منحصر اور انبیاء علیہم السلام کی اطلاع اور تعلیم پر موقوف ہے۔ معرفت خداوندی میں عقلائے یونان نے سخت ٹھوکریں کھائی ہیں اور مضحکہ خیز غلطیاں کی ہیں۔ انہوں نے اعلان کیا کہ عقل کا خالص اور بے آمیز ہونا ممکن نہیں اور وہ بھی داخلی عقائد و مسلمات اور خارجی عوامل و اثرات سے متاثر ہوتی ہے، اور اس کے بہت سے فیصلے اور نتائج غلط ہوتے ہیں۔ انہوں نے ثابت کیا کہ عقل حجت میں ناقص ہے، حجت کامل انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت ہے۔

پھر عقل کی قوت اور اس کا عمل محدود ہے۔ اس کا ایک دائرہ ہے جس سے وہ باہر نہیں جا سکتی۔ جس طرح انسان کے حواس کے علیحدہ علیحدہ دائرے ہیں اور ان کا عمل انہی کے اندر محدود ہے اسی طرح عقل اگرچہ اس کا میدان ان حواس ظاہری سے زیادہ وسیع ہے لیکن بہر حال محدود ہے۔ چنانچہ علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے

> "عقل صحیح ترازو ہے۔ اس کے فیصلے یقینی ہیں جن میں کوئی جھوٹ اور کذب نہیں لیکن تم اس ترازو میں امور توحید، امور آخرت، حقیقت نبوت، حقائق صفات الٰہی کے وہ تمام امور و حقائق جو ماوراء عقل ہیں، تول نہیں سکتے۔ یہ ایک لاحاصل کوشش ہوگی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے ایک ترازو دیکھی جو سونے کا

وزن کرنے کے لیے ہے۔ اس کو اس ترزو میں پہاڑوں کو تولنے کا شوق پیدا ہوا جو ناممکن ہے۔ اس سے ترازو کی صحت پر کوئی حرف نہیں آتا، لیکن اس کی گنجائش کی ایک حد ہے۔ اسی طرح عقل کے عمل کا بھی ایک دائرہ ہے جس سے باہر وہ قدم نہیں نکال سکتی۔ وہ اللہ اور اس کی صفات کا احاطہ نہیں کر سکتی کہ وہ اس کے وجود کا ایک ذرہ ہے۔" (مقدمہ ابن خلدون: ص ۴۷۳)

اب حضرت مجددؒ کے عقل کے بارے میں مندرجہ ذیل ارشادات پر نگاہ ڈالیے جو ان کے مختلف مکاتیب سے اقتباس کیے گئے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"عقل اگر معرفت الٰہی کے مسئلہ میں کافی ہوتی تو فلاسفۂ یونان جنہوں نے عقل کو اپنا مقتدیٰ بنایا ہے، گمراہی کے بیابان میں نہ بھٹکتے پھرتے اور حق تعالیٰ شانہ کو دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ پہچانتے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے معاملہ میں جاہل ترین یہی لوگ ہیں کہ انہوں نے حق سبحانہ وتعالیٰ کو بیکار اور معطل سمجھ لیا اور سوائے ایک چیز (عقل فعال) کے اس کو کسی چیز کا فاعل اور خالق نہیں مانتے، اور وہ بھی ان کے خیال کے مطابق اس سے اضطراراً نہ کہ اختیاراً وجود میں آئی ہے۔ انہوں نے اپنی طرف سے عقل فعال تراشی ہے۔ حوادث کو زمین وآسمان کے خالق سے ہٹا کر اس کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور اثر کو مؤثر حقیقی سے روک کر اپنی تراشیدہ چیز یعنی عقل فعال کا اثر مانتے ہیں، اس لیے کہ ان کے نزدیک معلول علت قریبہ کا نتیجہ ہوتا ہے، اور اپنی نادانی سے ان اشیاء کی طرف نسبت نہ ہونے کو اللہ کی صفت کمال جانتے ہیں، اور اس کو بیکار اور معطل ماننے کو اس کی تعظیم سمجھتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنے کو خود زمین وآسمان کا خالق کہتا ہے اور "رب المشرق والمغرب" کے ساتھ اپنی تعریف بیان کرتا ہے۔

''ان بے عقلوں کو اپنے خیال کے مطابق اللہ تعالیٰ کی کچھ احتیاج نہیں اور نہ اس کے سامنے کچھ عجز و نیاز ہے۔ مجبوری اور ضرورت کے وقت چاہیے کہ وہ اپنی عقل فعال کی طرف رجوع کریں اور اپنی ضرورتوں کی تکمیل اسی سے چاہیں، اس لیے کہ اصل قدرت اور اصل اختیار ان کے نزدیک اسی کا ہے، بلکہ عقل فعال بھی ان کے خیال کے مطابق اپنا عمل کرنے میں مجبور اور غیر مختار ہے، اس لیے اس سے بھی اپنی ضرورت کی تکمیل چاہنا غیر معقول بات ہے اصل یہ ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے: ''ان الکافرین لامولیٰ لھم'' یعنی ان کافروں کا کوئی سرپرست اور کارساز نہیں، ان کا کوئی بھی حامی و ناصر نہیں۔ خدا بھی نہیں اور عقل فعال بھی نہیں۔ عقل آخر کیا چیز ہے؟ جو چیزوں کا انتظام کرتی ہے اور حوادث کے ظہور و خلق کی اس کی طرف نسبت کی جاتی ہے، محض اس کے ثابت ہونے اور اس کی ہستی میں ہزاروں اعتراض اور کلام ہیں کیونکہ اس کا ثبوت و وجود محض فلسفہ کے گھڑے ہوئے مقدمات پر مبنی ہے جو اسلام کے قواعد صحیحہ کی رو سے نامکمل اور ناقص ہیں۔ کوئی احمق ہی ہوگا جو اشیاء کو قادر و مختار جل شانہ سے ہٹا کر اسے محض ایک فرضی اور موہوم شی کی طرف منسوب کرے گا بلکہ خود ان چیزوں کو اس بات سے ہزار ہزار ننگ و عار ہے کہ وہ اپنے خلق میں فلسفہ کی ایک تراشی ہوئی بے حقیقت چیز کی طرف منسوب ہوں بلکہ یہ چیزیں اپنے نابود ہونے پر راضی اور مسرور ہوں گی، اور ان کے موجود ہونے کی کوئی خواہش نہ ہوگی۔ اس بات کے مقابلہ میں کہ ان کے وجود کی نسبت ایک بے حقیقت فرضی شی کی طرف ہو اور وہ قادر و مختار کی قدرت کی طرف منسوب ہونے کی سعادت سے محروم ہو جائیں۔ ''کبرت کلمۃ تخرج من افواھم ان یقولون الا کذبا'' یعنی بڑی بات

ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے۔ یہ محض جھوٹ کہتے ہیں۔
دارالحرب کے کافر اپنی بت پرستیوں کے باوجود اس جماعت فلاسفہ
سے بہترین ہیں کہ حق سبحانہ وتعالیٰ سے مشکل کے وقت التجاء کرتے
ہیں اور بتوں کو اس کے حضور میں شفاعت کے لیے وسیلہ بناتے
ہیں۔اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ایک گروہ ان احمقوں یعنی
حکمائے یونان کو حکماء کے لقب سے یاد کرتا ہے اور حکمت کی طرف
ان کو منسوب کرتا ہے۔ ان فلاسفہ کے اکثر مسائل خصوصاً الٰہیات
میں جو مقصد اعلیٰ ہے، غلط ہیں اور کتاب وسنت کے مخالف۔ حکماء کا
ان کو لقب دینا جن کا سرمایہ جہل مرکب ہے آخر کس لحاظ سے ہے؟
ہاں البتہ طنز و مذاق کے طور پر ہو سکتا ہے یا اس طرح جس طرح نابینا
کو بینا کہا جائے۔" (مکتوبات بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی دفتر:۳ نمبر ۲۳)

حضرت مجددؒ نے ہمارے علم کے مطابق علمائے اسلام میں پہلی مرتبہ یہ آواز بلند کی کہ عقل کا خالص اور بے آمیز ہونا جسم عنصری سے متعلق اور ماحول میں پھیلے ہوئے اوہام وتخیلات عقائد ومسلمات، باطنی رجحانات اور راسخ اخلاص اور خواہشات سے آزاد ہونا قریباً محال ہے۔ مجدد صاحبؒ کی یہ تحقیق ان مکتوبات میں کئی جگہ پر مرقوم ہے۔ یہ ان کی علمی اور فکری دنیا میں ایک دریافت اور ایک ایسا انقلابی اور جرأت مندانہ اعلان ہے جس کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ صحیح طور پر ابھی تک نہیں کیا گیا لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ حضرت مجددؒ سے قریباً دو سو سال بعد جرمنی کے مشہور فلسفی عمانویل کانٹ (Immaruel Kant) (1724-1804ء) نے عقل کے خالص اور مجرد ہونے اور اس کے ماحول، ورثہ، عادات و معتقدات سے آزاد ہو کر بے لاگ فیصلہ کرنے کی صلاحیت پر علمی اور تحقیقی بحث کا آغاز کیا اور اس نے عقل کے حدود کی جرأت اور وضاحت کے ساتھ تعیین کی۔ 1781ء میں اپنی معرکۃ الآراء "تنقید عقل محض" (Critique of our Reason) شائع کی جس نے دنیائے فکر وفلسفہ میں ہل چل مچا دی اور حضرت علامہ اقبال کے الفاظ میں "روشن خیالوں کے کارناموں کو خاک کا ڈھیر کر

دیا۔'' مغرب میں کانٹ کے اس کارنامہ کی عظمت کا شاندار طریقہ پر اعتراف کیا گیا اور کہنے والوں نے تو یہاں تک کہا کہ وہ جرمن قوم کے لیے خدا کا سب سے بڑا عطیہ تھا۔ تاریخ فلسفہ کا ایک غیر فانی کمال پارہ ہے جس نے فکر انسان کی ہرزہ گردیوں میں انگشت راہ نما کا کام کیا۔'' (تاریخ فلسفہ جدید ترجمہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم: جلد۲ص ۳۸)

کانٹ نے عقل پر جو تنقید کی ہے وہ نامکمل ہے اور کئی سوالوں کے وہ جواب نہیں دے سکا، لیکن حضرت مجددؒ نے ان سب سوالوں کے کافی اور شافی جوابات اپنے مکتوبات میں دیئے ہیں۔ پھر آپ نے مخالف عقل اور ماوراء العقل کا فرق بیان کر کے کشف اور مقام نبوت کو ثابت کیا ہے، لیکن یہ بحث ہم یہاں نہیں کرنا چاہتے۔ یہ کانٹ کی بات صرف اجمالی طور پر اس لیے کر دی کہ یہ بتایا جا سکے کہ حضرت مجددؒ نے جہاں سیاسی طور پر حکومت کے نظریات اور دین اکبری کو شکست فاش دی وہاں علمی طور پر بھی ان تمام نظریات کو غلط ثابت کیا جن کی بنیاد اس زمانہ میں عقل پرستوں کو رام کرنے کے لیے عقل پر رکھی گئی تھی، اور جو چیز مجدد صاحبؒ نے دوسو سال پہلے کہی تھی اس کو جرمنی کے ایک بہت بڑے فلسفی اور دانشور نے دوسال بعد کہی لیکن پھر بھی اتنی واضح طور پر نہ کہی جس وضاحت کے ساتھ حضرت مجددؒ نے اس نظریہ کو پیش کیا۔

کیا حضرت مجددؒ نے تنہا الحادی نظریات کو ختم کیا؟

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے اور کئی دلوں میں یہ کھٹکتا بھی ہے کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے کیا تنہا اس فتنۂ اکبری اور اس کے ان الحادی نظریات کو ختم کیا تھا؟ یا کچھ اور علماء بھی آپ کے اس کام میں شریک تھے؟ اور ان کا بھی اس اکبری الحاد کے استیصال میں کچھ حصہ ہے؟ یہ درست ہے کہ اس زمانہ میں اور بھی کئی علماء ایسے تھے جو موقع بموقع عہد اکبری میں اس الحاد پر اپنی ناگواری اور اسلامی جذبات کا اظہار کرتے رہتے تھے، جن میں ایک شیخ محمد ابراہیم محدث اکبر آبادیؒ (متوفی 1001ھ) بھی تھے۔ ان میں ایک شیخ حسین اجمیری تھے جنہوں نے نہ صرف اکبر کو سجدۂ تعظیمی نہیں کیا بلکہ اس سجدۂ کی مخالفت بھی کی جس سے بادشاہ ان سے ناراض ہو گیا اور ان کو بھکر کے قلعہ میں

نظر بند کر دیا۔ اسی سلسلہ میں جرأت مندانہ اقدام شہباز خان کنبوہ کا بھی ہے جو اکبر کے امرائے کبار میں سے تھے۔ یہ بھی بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہنے سے کبھی باز نہیں رہے۔ شیخ عبدالقادر اچی بھی انہی جری اور بہادر لوگوں میں سے تھے جنہوں نے کبھی بھی غیر شرعی امور میں بادشاہ کی موافقت نہیں کی۔ انہی کے ایک ہم نام شیخ عبدلقادر لاہوری تھے۔ ان سے بھی اکبر ان کی دینی صلابت کی وجہ سے ناراض تھا۔ اسی طرح مرزا عزیزالدین دہلوی کو کہ جو اکبر کے ہم عمر اور دودھ شریک بھائی تھے اور جن سے اکبر کو از حد محبت تھی، وہ بھی صاف گوئی میں اپنی مثال آپ تھے۔ انہوں نے اکبری الحاد کی کبھی موافقت نہیں کی۔ ان حضرات کے علاوہ اور بھی کئی حضرات تھے جو ان باتوں میں اکبر کے سخت مخالف تھے، لیکن حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جس ترکیب و ترتیب کے ساتھ فتنۂ اکبری کا قلع قمع کیا اس میں آپ یکہ وتنہا تھے۔ اور کوئی شخص بھی اس میں آپ کا شریک نہیں تھا۔ کوئی خون نہیں بہا، کوئی جلوس نہیں نکلا، کوئی تحریک نہیں چلی، کوئی نعرے بازی نہیں ہوئی۔ کسی کی مخالفت میں مضامین نہیں لکھے گئے۔ بس حضرت مجددؒ نے اپنے مکتوبات اور لشکر جہانگیری میں شمولیت کر کے وہ انقلاب برپا کیا جس نے تمام حکومت کی کایاپلٹ کر رکھ دی۔ یہ ایک ایسا خاموش انقلاب تھا جو اس سے قبل کبھی نہیں آیا تھا۔ اس سے قبل تو علماء کو سر دربار کوڑے مارے گئے، ان کی توہین کی گئی، ان کو سر بازار رسوا کیا گیا، لیکن یہاں صرف قلعہ گوالیار کی ایک سال کی قید نے پوری سلطنت مغلیہ کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ اسی وجہ سے آپ کے معاصرین جن میں شاید ملا عبدالحکیم سیالکوٹی پیش پیش تھے، اور متاخرین نے آپ کو الف ثانی کا مجدد قرار دیا۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ نے لکھا ہے

> ''شہنشاہ اکبر کے عہد کے اختتام اور عہد جہانگیری کے اوائل میں کیا ہندوستان علماء اور مشائخ سے بالکل خالی ہو گیا تھا؟ کیسے کیسے اکابر موجود تھے، لیکن مفاسد وقت کی اصلاح وتجدید کا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا۔ صرف مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کا وجود گرامی ''تن تنہا'' اس کاروبار کا کفیل ہوا۔'' (تذکرہ: ص ۲۳۸)

اس کے فٹ نوٹ میں مولاناؒ فرماتے ہیں:

''عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان (مجدد صاحب) کی تجدید محض ردّ بدعات جہال صوفیہ وتحقیق بعض معارف تصوف واعلان واشتہار توحید شہودی میں منحصر ہے حالانکہ معاملہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔''

ہمارے خیال میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے بالکل صحیح فرمایا ہے، اس لیے آج عوام الناس ہی نہیں بلکہ اہل علم حضرات بھی اکبری الحاد کا قاطع صرف حضرت مجددؒ ہی کو قرار دیتے ہیں۔

تجدید کا طریقہ کار:

حضرت مجددؒ نے تجدید کا طریقۂ کار یہ اختیار کیا کہ برائے راست مسلم سلطنت کے فرمانروا کو اپنی اصلاح کا مرکز بنایا کیونکہ آپ یہ سمجھتے تھے کہ اگر بادشاہ درست ہوگیا تو اس کی تمام سلطنت درست اور صحیح ہو جائے گی۔ چنانچہ آپ نے شیخ فرید جو بادشاہ کے بڑے مقرب تھے، ایک مکتوب میں لکھا کہ

''بادشاہ کی درستی سے عالم کی درستی ہے اور بادشاہ کے فساد سے عالم کا فساد ہے۔ (صلاح بادشاہ صلاح عالم است وفساد او فساد عالم) آپ جانتے ہیں کہ زمانہ ماضی (عہد اکبری) میں اہل اسلام پر کیا کچھ نہیں گزرا۔ زمانہ ماسبق میں جب کہ اسلام کی غربت حد کو پہنچی ہوئی تھی اہل اسلام کی بدحالی اس سے آگے نہیں بڑی تھی کہ مسلمان اپنے دین پر رہیں اور کافر اپنے طریقہ پر .... لیکن زمانہ ماضی میں تو یہ حال ہوا کہ کفار تو برملا پورے غلبہ کے ساتھ دارالاسلام میں احکام کفر جاری کرتے تھے اور مسلمان احکام اسلام ظاہر کرنے سے بھی عاجز وقاصر تھے۔ اگر ظاہر کرتے تھے تو قتل کیے جاتے تھے۔'' (دفتر اول حصہ دوم مکتوب نمبر ۴۷)

آپ کو اپنی تکمیل وتربیت کے بعد ہی اس بات کا اذعان پیدا ہوگیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے کوئی دوسرا ہی کام لینا ہے اور وہ پیری مریدی یا انفرادی عبادات و

ترقیات کے لیے پیدا نہیں کیے گئے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے سلسلہ ہی کے ایک بزرگ خواجہ عبید اللہ احرار (م895ھ) کا یہ مقولہ نقل کرکے ''حدیث دیگران'' میں ''سرِّ دلبراں'' کہہ دیا ہے کہ حضرت خواجہ احرار فرماتے تھے:

> ''اگر میں صرف پیری مریدی کرنے پر آ جاؤں تو دنیا میں کسی پیر کو کوئی مرید نہ ملے، لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے کچھ اور ہی کام سپرد کیا ہے اور وہ ترویج شریعت اور تائید ملت ہے۔''

پھر اس جملہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''آپ بادشاہوں کی مجلس میں تشریف لے جاتے تھے اور اپنی قوت باطنی اور تاثیر روحانی سے ان کو اپنا مطیع و منقاد بنا لیتے تھے۔ پھر ان کے ذریعہ شریعت کو رواج دیتے تھے۔''

(دفتر اول مکتوب نمبر ۵۶ بنام خان اعظم)

آپ نے اس راستہ میں پھونک پھونک کر قدم رکھا۔ آپ نے حالات میں انقلاب لانے کے لیے پرخطر اور مشتبہ راستہ اختیار نہیں کیا بلکہ تخریب کے بجائے تعمیر، نفی کے بجائے اثبات اور ازالہ کے بجائے امالہ کا راستہ اختیار کیا جو ایک بے ضرر اور ہر طرح کے خطرات سے محفوظ راستہ تھا۔ چنانچہ آپ نے سب سے پہلے ارکان سلطنت سے رابطہ قائم کیا جو بہر حال مسلمان تھے۔ آپ نے اپنی خداداد ذہانت سے معلوم کر لیا کہ دور اکبری کے مخالف اسلام منصوبہ میں وہ شریک نہیں تھے بلکہ وہ اکبر کے ملحدانہ اقدامات کو ناپسند کرتے تھے۔ ان حضرات میں کئی ان کے مرشد حضرت باقی باللہ قدس سرہ اور خود ان سے اگر ارادت کا نہیں تو محبت و عقیدت کا تعلق رکھتے تھے، اور وہ حضرت مجددؒ کے اخلاص و بے غرضی اور اسلام کے لیے دل سوزی اور دردمندی سے واقف و آشنا تھے۔ اور وہ حضرات درج ذیل ہیں:

1- نواب سید مرتضیٰ عرف شیخ فرید (م1025ھ)
2- خان اعظم مرزا کوکہ (م1033ھ)
3- خان جہاں لودھی (م1040ھ)

4- صدر جہاں سپانوی (م1027ھ)

5- لالہ بیگ جہاں گیری (م1027ھ)

چنانچہ آپ نے ان حضرات کو اور ان جیسے دوسرے ارکان سلطنت کو خطوط لکھے اور انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ جہانگیر کو نیک مشورہ دے کر سلطنت کا رخ اکبر کے ڈالے ہوئے راستے پر چلتے رہنے اور اسلام کے تقاضوں سے چشم پوشی اور بے تعلقی، اسلام اور مسلمانوں کی کس مپرسی سے حمایت دین اور شعائر واحکام اسلام کے احترام کی طرف موڑنے کی کوشش کریں۔ اس طریقہ سے آپ نے مکتوب الیہ اور مکتوب الیہ نے بادشاہ کو پھر بادشاہ نے سلطنت کے رخ کو حمایت سلام کے راستہ پر ڈالا، اور گذشتہ حکومت کے اثرات کو بتدریج مضمحل کیا۔ چنانچہ آپ نے سید فرید بخاری کو اپنے ایک خط میں جو غالباً جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد جلد ہی لکھا گیا، فرماتے ہیں:

> ''بادشاہ کو عالم سے وہی نسبت ہے جو دل کو بدن سے ہے۔ اگر دل صحیح وصالح ہے تو بدن بھی صحیح وصالح ہوگا، اور اگر وہ فاسد ہے تو بدن بھی فاسد ہوگا۔ بدن کی صلاح عالم کی صلاح اور اس کا فساد عالم کا فساد ہے۔''

یہ سارا خط پڑھنے کے قابل ہے۔ اسی طرح دوسرے حضرات کو بھی آپ نے اسی طرح کے خطوط لکھے۔ چنانچہ آپ کی یہ سعی رائیگاں نہیں گئی اور ان مکتوب الیھم نے اور خاص طور پر نواب سید فرید نے حکومت کا رخ بدلنے میں ایک بنیادی اور مرکزی کردار ادا کیا، لیکن ابھی جہانگیر کے مزاج میں وہ تبدیلی نہیں پیدا ہوئی تھی جس کی اس عظیم الشان کام کے لیے ضرورت تھی۔ شخصی سلطنتوں میں بادشاہ کی ذات مرکزی نقطہ ہوتی ہے جس کے گرد حکومت کا سارا نظام گردش کرتا ہے۔ اس کا کسی بات کے لیے ارادہ کر لینا اور خدا کے کسی مخلص اور بے لوث بندے سے اس کے دل میں عقیدت اور محبت کا پیدا ہو جانا ہزاروں میل کے فاصلہ کو گھنٹوں اور منٹوں میں طے کرا دیتا ہے، اور بعض اوقات بظاہر ممکن العمل چیز کو نہ صرف ممکن بلکہ واقعہ بنا دیتا ہے۔ گوالیار کی اسیری سے رہائی کے بعد حضرت مجددؒ ساڑھے تین چار سال لشکر شاہی کے ساتھ رہے اور اس عرصہ میں جہانگیر

سے صحبتیں رہیں اور مختلف اوقات میں مسائل دینیہ پر گفتگو رہی۔ اس سے بادشاہ کو مجدد صاحبؒ کی دینی صلابت اور استقامت کا نمونہ اور ان کے روحانی فیوض و برکات اور پھر جیل خانے میں ان کی صحبت کی تاثیر سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں غیر مسلموں کا مسلمان ہو جانا دیکھا، اور مجلس کی گفتگو میں ان کے رسوخ فی العلم کا بھی تجربہ کیا تو وہ سمجھ گیا کہ وہ ان لوگوں سے بہت مختلف ہیں جو ابھی تک دربار کی زینت اور بوریائے فقر کے مسند نشین ہیں۔ چنانچہ اس بات نے جلد ہی بادشاہ کا رخ شعائر اسلام کی سربلندی اور اسلام سے دلچسپی کی طرف پھیر دیا۔

پھر بادشاہ کا بیٹا شاہ جہاں جس کا عہد حکومت 31 سال رہا اور جو حضرت مجددؒ کی وفات کے دو سال بعد تخت خلاف پر بیٹھا۔ اس کے دل میں حضرت مجددؒ کے لیے نرم گوشہ اور احترام و اخلاص رہا۔ اب شاہ جہان کے فرزند اورنگ زیب عالم گیر کو تو حضرت مجددؒ کے خاندان سے عقیدت اور ان کی دعوت و مسلک سے ابتداء ہی سے مناسبت تھی۔ اسے حضرت مجدد کے صاحبزادے خواجہ محمد معصومؒ سے بیعت وارادت کا تعلق تھا۔ حضرت خواجہ معصومؒ کی اورنگ زیب کی شہزادگی کے وقت سے اس پر نظر خاص تھی اور وہ اس کو شہزادۂ دین پناہ کے لقب سے یاد فرماتے تھے۔ اورنگ زیب نے پھر دین کا وہ کام کیا کہ دینی حلقوں نے اسے ''محی الدین'' کا لقب دیا۔ حضرت علامہ اقبالؒ نے بھی ان کے بارے میں لکھا

شاہ عالم گیر گردوں آستان — اعتبار دودمان گورگان
پایۂ اسلامیاں برتر ازو — احترام شرع پیغمبر ازو
درمیانِ کار زار کفر و دین — ترکش مارا خدنگ آخریں
تخم اتحادے کہ اکبر پرورید — باز اندر فطرت دارا دمید
شمع دل درسینہ ہا روشن نبود — ملت مارا فساد ایمن نبود

☆ ☆ ☆

حضرت شاہ ولی اللہؒ میدان سیاست میں

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے بعد سرزمین پاک و ہند میں ایک اور ہستی نے جنم لیا جس نے بھی نہایت تجدیدی اور عظیم انقلابی اور سیاسی کارنامے انجام دیئے۔ وہ ہستی اور شخصیت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ کی تھی جس نے اگرچہ جنم تو ہندوستان کے مشہور شہر دہلی میں لیا لیکن تجدیدی اور سیاسی کارناموں کے منصوبے انہوں نے سرزمین حجاز میں بیٹھ کر بنائے۔ انہوں نے حجاز میں اپنے دو سالہ قیام میں عالم اسلام کی روحانی، علمی، اخلاقی، تہذیبی، تمدنی، معاشرتی اور سیاسی حالت کا جائزہ لیا اور مختلف ممالک عربیہ اسلامیہ کی ترقی وانحطاط اور عروج وزوال کا اندازہ کیا۔ عالم اسلام کی نبض حیات اور قلب اسلام کی دھڑکنوں کو سنا۔ شاہ ولی اللہ ایک نہایت بیدار مغز اور دردمند دل رکھنے والے انسان تھے جن کو تدبیر الٰہی تجدید احیائے دین اور برصغیر پاک و ہند کی سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے تیار کر رہی تھی۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی پیدائش اورنگ زیب عالم گیر کی وفات (1118ھ) سے چار سال قبل ہوئے۔ عالمگیر سرزمین پاک و ہند کا سب سے بڑا فرماں روا تھا۔ چنانچہ مؤرخین نے لکھا ہے کہ

> ”اس کی حکومت غزنی سے چٹاگانگ تک اور کشمیر سے کرناٹک تک وسیع تھی۔“ (کیمبرج ہسٹری آف انڈیا: جلد۴ ص ۳۱۶)

ایک اور مؤرخ نے لکھا ہے:

> ”قدیم زمانہ میں انگریزیوں کے عروج تک ہندوستان میں اتنی

طویل وعریض حکومت کبھی قائم نہیں ہوئی تھی۔''

(کیمبرج ہسٹری آف انڈیا: جلد۴ص ۳۱۶)

اورنگ زیب عالمگیر نے زمام حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد اپنی پوری توجہ عہد اکبری کے ملحدانہ نظریات اور خلاف اسلام اثرات مٹانے، ایران کے ان مجوسیت آمیز تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی اثرات کو جو عہد اکبری میں قائم ہو گئے تھے، ختم کرنے کے اقدامات کیے۔ محتسب کا شرعی عہدہ قائم کیا، حکومت کی بیش قرار غیر شرعی آمدنیاں موقوف کیں، رقص وسرود اور جھروکہ درشن کو یک قلم بند کیا، شرعی قاضی مقرر کیے، پوری سلطنت میں شرعی قوانین نافذ کرنے اور قاضیوں کی آسانی کے لیے مسائل فقہ کی تدوین و ترتیب کا بیڑا اٹھایا جس کے لیے فتاویٰ عالمگیری کا ایک مجموعہ تیار ہوا جو پوری اسلامی دنیا میں ''الفتاویٰ الہندیہ'' کے نام سے مشہور ہو کر اسلامی قوانین کا ایک مستند ماخذ سمجھا گیا۔ ان انقلابی کارناموں کے علاوہ اس کی سب سے نمایاں صفت اس کی بیدار مغزی، فرض شناسی اور امور سلطنت سے مکمل واقفیت و آشنائی اور نظم ونسق پر مطلع اور حاوی ہونا تھا، جو فولادی جسم اور آہنی عزم کے ساتھ خوف خدا اور احساس ذمہ داری کا جذبہ رکھتا تھا۔

لیکن افسوس کا مقام کہ اس نیک دل اور متقی و پرہیزگار بادشاہ کی اولاد میں اس کے انتقال کے بعد اس تخت پر وہ لوگ آئے جنہوں نے گویا قسم کھائی تھی کہ عالمگیر سے حمایت وحفاظت اسلام، احیائے دین اور اجراء شریعت کی جو غلطی ہوئی ہے وہ اس کی تلافی کریں گے۔ نیز اس نے سلطنت کے حدود میں وسعت پیدا کی ہے اور ملک کو جو استحکام بخشا ہے، وہ اپنی تعیش پسندی، کاہلی و نااہلی، اندرونی اختلاف و کشمکش اور امور سلطنت سے غفلت کے ذریعہ اس گناہ کا جو اورنگ زیب سے سرزد ہوا تھا، مسلسل کفارہ ادا کرتے رہیں گے۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ کے عہد (1114ھ۔ 1176ھ) میں عالمگیر کے بعد گیارہ مغل بادشاہ تخت نشین ہوئے، ان میں سے کسی کی مدت حکومت صرف دس ماہ، کسی کی چار ماہ سے کم اور کسی کی چند روز رہی۔

اس سیاسی انتشار اور اجتماعی بدنظمی اور انحطاط کے باوجود یہ دور انفرادی طور پر علمی کمالات، تصنیفی انہماک اور باطنی ترقی کا دور تھا جس میں علمی اور روحانی طور پر ایسی

باکمال شخصیتیں پیدا ہوئیں جن کو اس دورِ انحطاط سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ چنانچہ اس دور میں ملا جیون امیٹھوی صاحب نورالانوار، حافظ حمداللہ سندیلوی صاحب شرح سلم مشہور بحمداللہ، مولانا محمد حسن معروف بہ ملا حسن فرنگی محلی صاحب شرح ملا حسن، قاضی محبّ اللہ بہاری مصنف سلم العلوم و مسلم الثبوت، قاضی مبارک مصنف شرح سلم معروف بہ قاضی، مولانا رستم علی قنوجی، شیخ صفۃ اللہ خیرآبادی، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی، مولانا غلام نقشبند لکھنوی، مولانا محمد اعلیٰ تھانوی مصنف کشاف اصطلاحات الفنون اور ملا نظام الدین لکھنوی بانی درس نظامی جیسے سرآمد روزگار اور فخر بلاد و امصار حضرات پیدا ہوئے۔ اور روحانی حضرات میں سے سلسلہ قادریہ کے مشہور بزرگ سید عبدالرزاق ہانسوی، سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے مجدد شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی، شاہ فخرالدین دہلوی، شاہ محمد غوث قادری لاہوری، شیخ محمد عابد سنامی، خواجہ محمد ناصر عندلیب والد خواجہ میر درد اور شاہ منیب اللہ بالا پوری وغیرہ اس عہد میں مسند آرا نظر آتے ہیں۔

لیکن ان نامور اہل کمال اور مسیحا نفس شیوخ کے ہوتے ہوئے ہندوستان کا مسلم معاشرہ اور خاص طور پر طبقہ امراء سیاسی زوال، دولت کی فراوانی اور ایرانی تہذیب کے اثر سے اخلاقی زوال کے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا تھا۔ اس اخلاقی اور معاشرتی پستی سے زیادہ خطرناک اور خدا کی نصرت سے محروم کرنے والی خرابی ضعیف الاعتقادی تھی۔ مسلم معاشرہ میں بدعات کا زور، ہندوؤں اور شیعوں کے بہت سے رسوم و عادات کی تقلید تھی۔ قبر پرستی، مشائخ کے لیے سجدۂ تعظیمی، مزارات اور ان کے قرب و جوار کا حرم کی طرح احترام، قبروں پر چادریں چڑھانا، بزرگوں کے نام پر قربانیاں کرنا، مزارات پر میلے لگانا، مزارات کا طواف کرنا، گانا بجانا، شیخ سدّو کا بکرا، سید احمد کبیر کی گائے، محرم کے تعزیے، غیر اسلامی تہواروں کو شان و شوکت سے منانا، چیچک کی بیماری میں سیتلا کی تعظیم، اولیاء و صالحین کے لیے منتیں ماننا، خاص کھانے جیسے بی بی کی صحنک اور مخدوم صاحب کا توشہ وغیرہ۔ ان سب باتوں سے عقیدہ توحید جو اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے، اپنی وسعت کے باوجود اس مفہوم میں محدود ہو کر رہ گیا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی زمین و آسمان اور کائنات کا حقیقی خالق اور صانع ہے، اور بڑے بڑے امور وہی انجام دیتا ہے، لیکن اس نے

سلاطین عالم کی طرح اپنی سلطنت کے بہت سے شعبے اپنے اپنے مقبول بندوں کے سپرد کر دیئے ہیں جوان کے مالک ومختار ہیں۔ اب ان کو راضی کیے اور ان سے رابطہ کیے بغیر اس سلسلہ میں کوئی کار برآری اور کامیابی نہیں ہو سکتی۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس وقت کی اس مجموعی صورت حال کو اپنے الفاظ میں یوں بیان فرمایا ہے:

"مغلیہ سلطنت کا آفتاب لب بام تھا۔ مسلمانوں میں رسوم و بدعات کا زور تھا جھوٹے فقراء اور مشائخ اپنے بزرگوں کی خانقاہوں میں مسندیں بچھائے اور اپنے بزرگوں کے مزاروں پر چراغ جلائے بیٹھے تھے۔ مدرسوں کا گوشہ گوشہ منطق و فلسفہ کے ہنگاموں سے پرشور تھا۔ فقہ وفتاویٰ کی لفظی پرستش ہر مفتی کے پیش نظر تھی۔ مسائل فقہ میں تحقیق وتدقیق مذہب کا سب سے بڑا جرم تھا۔ عوام تو عوام خواص بھی قرآن پاک کے معانی ومطالب اور احادیث کے احکامات وارشادات اور فقہ کے اسرار ومصالح سے بے خبر تھے۔" (مقالات سلیمانی: ص ۴۴)

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے ملفوظات میں لکھا ہے کہ "محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں 22 بزرگ صاحب ارشاد ومختلف خانوادوں سے تعلق رکھتے تھے، دہلی میں موجود تھے اور ایسا کم اتفاق ہوتا ہے (وایں چنیں اتفاق کم می شود) (ص ۱۰۶) لیکن ایسے مسیحا نفس شیوخ کے ہوتے ہوئے بھی معاشرہ کی حالت نہایت ناگفتہ بہ تھی۔ ہندوستان کا مسلم معاشرہ خاص طور پر طبقۂ امراء سلطنت کے سیاسی اثر کے تحت اخلاقی زوال کی اتھاہ گہرائیوں میں گرا ہوا تھا۔ اس وقت سے وہ معاشرہ میں کوئی اہم کردار ادا نہ کر سکتے تھے۔ اب اس طبقہ کے وہ افراد سامنے آئے اور جنہوں نے اس خلا کو پر کیا جو مختلف اوقات میں انتظامی اور سیاسی میدان میں پیدا ہو جاتا ہے۔ سید ہاشمی فرید آبادی نے بالکل درست اور صحیح لکھا ہے:

"ہندوستان کی دولت وثروت نے خود اس طبقہ امراء کو نہایت عیش پسند اور تن آسان بنا دیا تھا............ہم ان امیروں کی ساری

کوشش و قابلیت ادنیٰ اغراض کے لیے سازش اور ریشہ دوانی میں صرف ہوتے دیکھتے ہیں۔ انقلاب سلطنت اور حصول بادشاہی تو درکنار کسی مسلمان امیر کو اپنے اپنے مقام پر علانیہ خود مختاری کا اعلان کرنے کی بھی جسارت نہ ہوتی، اوراس عرصہ میں ادھر تو نظم و نسق کی اندرونی خرابیاں بڑھتی رہیں اور ادھر حکمران طبقہ کے افراد سے انتظام حکومت اور اشتراک عمل کی صلاحیت ہی رفتہ رفتہ مفقود ہوگئی۔" (تاریخ ہند: جلد۳، مولوی سید ہاشمی فرید آبادی: ص۲۶۲)

اب اس تعیش اور مسرفانہ اور مترفانہ زندگی کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں:

"نواب قمرالدین کے گھر میں عورتیں اخیر کا غسل گلاب سے کرتی تھیں۔ دوسرے نواب کے گھر میں تین سو روپے کے پھول اور پان عورتوں کے لیے جاتے تھے۔" (ص۱۰۸)

اور مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے اس بارے میں لکھا ہے

"اورنگ آباد کے لوگ بالاتفاق بیان کرتے ہیں کہ امیرالامراء (حسین علی خان) کے عہد میں شہر کے اکثر لوگ اپنے گھروں میں کھانا نہیں پکاتے تھے۔ امیرالامراء کی سرکار کے باورچی اپنا حصہ فروخت کر دیتے تھے۔ پرتکلف پلاؤ کی ایک پلیٹ چند پیسوں میں لوگوں کو مل جاتی تھی (اس وجہ سے وہ اپنے گھروں میں کھانا نہیں پکاتے تھے۔) (ماثرالکرام: جلد۱ص۱۷۰)

محمد شاہ میں بہت سی کمزوریاں تھیں اور سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ تعیشانہ زندگی بسر کرتا تھا اور مالی اور ملکی تمام امور رتن کے اختیار میں تھے جو سوائے قوم بارہہ اور قوم بقال کے اور کسی پر نوازش نہ کرتا تھا، اس وجہ سے اس سے ہر شہر کے اشراف نہایت ذلت و نکبت کی زندگی بسر کرتے تھے اور اسی وجہ سے ہر چھوٹا بڑا اس سے متنفر تھا۔

(ملاحظہ ہو تاریخ ہندوستان: جلد۹ص۱۶۶، ص۱۸۲، سیرالمتاخرین طباطبائی: جلد۲ص۴۵۸)

محمد شاہ کے تعیش کا یہ حال تھا کہ اس کی عیش و عشرت میں ڈوبی زندگی کو دیکھ کر ہر شخص یہی کہتا تھا: ''حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے۔'' چنانچہ ہندوستان کے بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ

''محمد شاہ بادشاہ نے مذہب تو نہیں بدلا لیکن مشرب بدل دیا۔ ابر سیاہ ان کا نقیب قرار پایا۔ عام حکم تھا کہ ادھر ہمالیہ کے دامن سے گھٹا اٹھے، بادل گرجے کہ میرا خیمہ و خرگاہ صحرا روانہ ہو ؎

می دید صبح کلہ بستہ سحاب   الصبوح الصبوح یا اصحاب
ژالہ بارید بر رخ لالہ   المدام المدام یا احباب

سادات بارہہ امیر الامراء سید حسین اور قطب الملک نواب عبداللہ خان (حسن علی خان) مسند اقتدار پر چھائے ہوئے تھے۔ بادشاہ ان کے ہاتھ مردہ بدست زندہ کی مانند تھا۔ بادشاہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا تھا، اور وہ کرتا بھی کیا؟ اس کو تو شراب نوشی ہی سے فرصت نہیں ملتی تھی کہ کاروبار حکومت چلا سکے۔ لیکن ایک وقت وہ بھی آیا کہ حکومت کو سادات بارہہ سے خلاصی مل گئی اور ان کے اقتدار کا کلیۂ خاتمہ ہو گیا۔ لیکن ان کی زندگی کا جام لبریز ہونے کے باوجود بادشاہ کی جام نوشی ختم نہ ہوئی۔ اس کا یہی نعرہ تھا: ''باہر! بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔'' اس وجہ سے سادات بارہہ سے رہائی ملنے کے باوجود بھی سلطنت مغلیہ کی قسمت نہ بدلی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ بادشاہ میں حکمرانی کی ہر صلاحیت اور حکومتی خطرات کو سمجھنے کی بصیرت یک قلم ختم ہو چکی تھی۔ سید ہاشمی فرید آبادی نے حالات کا صحیح تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''بادشاہ گر سادات کے خاتمے اور محمد شاہ کی قوت و اختیار حاصل کرنے کی ملک میں عام طور پر خوشی منائی گئی، لیکن یہ خوشی اگر جذبۂ بادشاہ پرستی پر نہیں بلکہ آئندہ نظم و نسق کی بہتری اور ملکی رفاہ و بہبود کی امیدوں پر مبنی تھی تو اس کا انجام و مایوسی کے سوا کچھ نہ تھا کیونکہ اکبر و اورنگ زیب کا نیا جانشین درحقیقت اپنے اقبال مند اجداد کی شاہانہ صفات سے عاری تھا اسے اپنے عیش و عشرت کے

مشغلوں میں معاملات ملک کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ تھی۔
وہ محل سرائے شاہی کی بیگمات سے بھی زیادہ سلطنت کے حالات
سے بے خبر اور اس کی خرابی کی طرف سے بے پروا تھا حتیٰ کہ اس
کی دادی (شاہ عالم بہادر شاہ کی ملکہ مہر پرور) کی نسبت ہم جا بجا
پڑھتے ہیں کہ وہ بھی اپنے مدہوش پوتے کو بار بار خواب غفلت سے
بیدار کرنے کی کوشش کرتی تھی جس کا صریح نتیجہ زوال وادبار تھا۔''

(تاریخ ہند: جلد سوم ص ۲۶۱)

محمد شاہ (رنگیلا) کی کمزوریوں پر بہت سے لوگوں نے تبصرہ کیا کیونکہ جس سلطنت کو اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے خون سے حاصل کیا تھا وہ اب شراب کے جام میں بہی جارہی تھی۔ چنانچہ محمد شاہ کی کمزوریوں پر تبصرہ کرتے ہوئے جادو ناتھ سرکار نے لکھا ہے:

''محمد شاہ اگرچہ کسی قسم کی عزت کا مستحق نہیں لیکن وہ رحم کا مستحق ضرور ہے۔ کیونکہ حالات کے نشیب وفراز نے اس کو ایسی جگہ لا کھڑا کیا تھا جہاں کسی عبقری (Genius) کی ضرورت تھی، (اس جیسے شرابی اور مدہوش اور بے بصیرت شخص کی ضرورت نہ تھی) مگر وہ ایک معمولی انسان تھا۔ مؤرخ اسے اس بات پر کوستے اور ملامت کرتے ہیں کہ اس نے کاروبار حکومت انجام دینے کے بجائے عیش وعشرت میں اپنا وقت گزارا، لیکن حالات اور المیہ اور ٹریجڈی (Tredgy) یہ تھی کہ اس جیسا آدمی اگر کاروبار حکومت پر پوری توجہ دیتا پھر بھی وہ حالات کے دھارے کا رخ نہیں موڑ سکتا تھا۔ رفیع الدرجات اور رفیع الدولۃ جیسے لوگ کٹھ پتلیوں کی طرح اپنی ذلت کے احساس سے بھی عاری تھی، لیکن محمد شاہ میں بدترین حالات اور انہیں سدھارنے میں اپنی لاچاری دونوں کا احساس موجود تھا۔'' (Fall of The Mughal Empire, P.373)

آخر اورنگ زیب عالمگیر کے عزم جہاں کشا، جفاکشی اور صبر و استقلال سے قائم اور مستحکم کی ہوئی سلطنت کی بنیادیں اورنگ زیب کے نالائق جانشینوں نے ہلا کر رکھ دیں۔ اس کی چولیں ہل گئیں۔ اور یہ سب کچھ طاؤس و رباب اور جام و شراب کے باعث ہوا۔ چنانچہ 1151ھ میں نادر شاہ نے دہلی کا رخ کیا۔ اس نے اس سے پہلے محمد شاہ کو کئی خط بھی لکھے لیکن بقول مؤرخ!

> ”یہاں ان دنوں عیش و عشرت کا زور شور تھا۔ محمد شاہ بہادر صاحب سریر تھا، تن آسانی کے سوا کسی کام سے کام نہ تھا۔ ہر وقت ہاتھ میں جام اور بغل میں دل آرام تھا۔ کس کو دماغ تھا کہ نامہ کا جواب لکھتا۔“
>
> (تاریخ ہندوستان: جلد ۹ ص ۲۵۱)

نادر شاہ کا ہندوستان اور دہلی پر حملہ:

نادر شاہ نے جس سال دہلی پر حملہ کیا اس وقت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی عمر 37 سال تھی اور وہ حجاز مقدس سے واپس تشریف لا چکے تھے۔ نادر شاہ 1736ء کے موسم بہار میں ایران کا بادشاہ بنا۔ ہندوستان میں اس وقت مغل شہنشاہ محمد شاہ کو اقتدار میں آئے ہوئے سترہ (17) برس ہو چکے تھے۔ مغل خاندان بھی صفوی خاندان کی طرح وقت کے ساتھ زوال اور انحطاط کا شکار ہو چکا تھا۔ محمد شاہ کا موازنہ اکبر یا بابر کے ساتھ کسی بھی صورت نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی مثال صفوی حکمران شاہ سلطان حسین جیسی تھی جسے شاہ اسماعیل صفوی یا شاہ عباس اول صفوی کی صلاحیتوں سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ ہندوستان میں مغل سلطنت کی تحلیل کا آغاز ہو چکا تھا۔ اورنگ زیب (1658-1707ء) کی وفات کے بعد صرف بارہ برسوں میں تین بادشاہ یکے بعد دیگرے مسند نشین ہوئے۔ جنگ نے مغلوں کے زوال کی رفتار تیز کر دی تھی۔ ان کے زوال کا ایک اور سبب ایرانی، تورانی اور ہندوستانی گروہ بندیوں کا ابھر آنا تھا۔

ایرانی دربار سے کئی بار مغل شہنشاہ کو درخواست کی گئی تھی کہ افغان بھگوڑوں پر ہندوستانی سرحدیں بند کرنے کا انتظام کیا جائے لیکن شہنشاہ ہندوستان کی طرف سے ہامی

بھر لینے کے باوجود کبھی کوئی عملی اقدام نہ ہوا۔ بالآخر غصہ اور طیش میں آ کر نادر شاہ نے محمد خان ترکمان کی سفارت مغل دربار میں بھجوائی اور شہنشاہ ہند کو وعدوں کے باوجود کوئی کاروائی نہ ہونے پر شکایت کی۔ (تاریخ نادری: ص ۱۸۹)

شہنشاہ ہند نے نادر شاہ کی اس شکایت کا کوئی جواب نہ دیا کیونکہ یہاں تو جواب دینے کا ہوش ہی نہیں تھا۔ چنانچہ نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی ٹھان لی۔ 21 مئی 1738ء کو نادر شاہ نے نادر آباد سے غزنی کا رخ کر لیا۔ اور پھر چند روز کے بعد موکر کے مقام پر ہندوستانی سرحد عبور کر لی اور یوں ہندوستان پر حملے کا آغاز ہو گیا۔

ہندوستانی سرحد میں داخل ہونے کے بعد ایرانی فوج کچھ دنوں تک قراباغ میں مقیم رہی۔ یہ مقام غزنی سے 37 میل جنوب مغرب میں ہے۔ پھر نادر نے غزنی سے روانہ ہوتے وقت کابل کے کوتوال کو یہ پیغام بھیجا:

> ''محمد شاہ کی سلطنت سے کوئی سروکار نہیں رکھتا لیکن چونکہ یہ سرحدیں افغانوں کی بارودی سرنگوں کی طرح ہیں اور متعدد مغرور افغانوں نے یہاں پناہ لے رکھی ہے، اس لیے ہمارا ارادہ یہ ہے کہ ان شر پسندوں کی بیخ کنی کر دیں۔ خواہ مخواہ ہراساں ہونے کے بجائے ہماری میزبانی کے فرائض انجام دو۔'' (شیخ حازن: ص ۲۶۷)

کابل اور پشاور کے صوبیدار ناصر خان کو جب افغان مغروروں کا قلع قمع کرنے کا فریضہ سونپا گیا تو اس نے دہلی دربار کو رقم کی فراہمی کے لیے درخواست دی تاکہ سپاہیوں کو تنخواہیں دی جا سکیں۔ مورخ آنند رام کے لفظوں میں ناصر خان کی حالت دگرگوں تھی۔

> ''وہ خود ایک گلاب کا پودا تھا جو خزاں کی تباہ کاری سے مرجھا چکا تھا۔ اس کی سپاہ جوش و جذبہ سے عاری اور محرومیوں کی ماری ہوئی تھی۔ اس نے حکومت دہلی سے درخواست کی کہ پانچ سال سے تنخواہ سے محروم فوج کو کم از کم ایک سال کی تنخواہ ضرور ادا کی جانی چاہیے۔ اس طرح وہ کچھ مطمئن ہو جائے گی۔ کچھ رقم صوبے کے

سرکاری اخراجات کے لیے مہیا کی جائے۔"

مختصر یہ کہ ناصر خان کی درخواست پر دہلی کی مرکزی حکومت نے کوئی توجہ نہ دی، مال ان کے پاس کہاں۔ وہاں تو سب کچھ جام وسبو میں بہہ چکا تھا۔ تعیش نے بادشاہ کو مدہوش کیا ہوا تھا۔ کسے خبر تھی کہ ملک میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ چنانچہ کسی طرح ناصر خان کو وہ رقم نہ ملی۔ ہندوستانی مؤرخ غلام حسین طباطبائی کا کہنا ہے کہ صوبہ کابل کے دفاع کی غفلت کا اصل مجرم مغل افواج کا امیر الامراء تھا۔ اگر اس نے اپنا فریضہ ادا کیا ہوتا تو نادر کو ہندوستان آنے کا خیال کبھی نہ سوجھتا یا کم از کم اسے ادھر آنے میں اتنی آسانی نہ ہوتی۔

(تاریخ نادری: ص ۲۰۱)

غرضیکہ نادر شاہ پشاور پہنچا۔ وہاں کچھ روز قیام کے بعد اٹک کے مقام پر دریائے سندھ کو عبور کر کے 6 جنوری 1739ء کو پشاور سے نکلا اور دریائے سندھ اور دریائے جہلم کو عبور کرتے ہوئے لاہور پہنچا۔ لاہور میں گورنر زکریا خان نے خود کو عاجز سمجھتے ہوئے دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ نادر شاہ نے حوصلہ افزا جواب دیتے ہوئے عبدالباقی خان کو حکم دیا کہ 23 جنوری کو زکریا خان سے ملاقات کرے اور اسے ایرانی حکمران کے پاس لائے۔ گورنر کی آمد پر نادر شاہ نے انتہائی عزت واحترام کا مظاہرہ کیا۔ زکریا خان نے ایرانی فاتح کو بیس لاکھ سونے کے سکے، متعدد ہاتھی اور قیمتی تحائف پیش کیے اور اس طرح اس نے لاہور کو ایرانیوں کی لوٹ مار سے بچالیا۔ نادر بارہ روز لاہور میں رہا۔ پھر اس نے دہلی کا رخ کیا کیونکہ اسے اطلاع ملی تھی کہ محمد شاہ جنگ کی تیاریاں کر رہا ہے، چنانچہ نادر شاہ سرہند وغیرہ سے ہوتا ہوا کنج پورہ کرنال سے ساڑھے پانچ میل دور شمال مشرق میں ڈیڑھ میل کے فاصلے پر اپنے خیمے گاڑ دیئے۔

24 فروری 1739ء کو صبح نادر شاہ نے اپنی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کیا اور ہر حصہ کی قیادت ایک اعلیٰ جرنیل کو دی۔ دائیں بازو کے قائد نصر اللہ مرزا کو حکم دیا کہ وہ جمنا کی طرف سے کرنال پر حملہ آور ہو۔ (تاریخ نادری ص ۲۰۰) محمد شاہ اور نادر شاہ کی فوجوں میں کرنال میں جو مقابلہ ہوا وہ اگرچہ بہت سخت تھا لیکن نادر شاہ اپنی ذہانت سے فتح یاب ہوگیا۔ ہندوستانی فوجوں کو پہنچنے والے نقصان کے بارہ میں مختلف مورخین نے

انتہائی مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے، مثلا مرزا مہدی نے لکھا کہ 30 ہزار ہندوستانی سپاہی مارے گئے۔ غالب امکان یہی ہے کہ 10 ہزار کے قریب ہندوستانی سپاہی لقمہ اجل بنے۔ ایرانی سپاہیوں کے بارہ میں لکھا گیا ہے کہ ان کے 25 سو ہلاک اور 5 ہزار زخمی ہوئے۔ جنگ میں کامیابی کے بعد نادر شاہ نے فوراً سجدۂ شکر ادا کیا۔ پھر اس نے کمانڈروں کو مبارک باد کے اعزازات سے نوازا۔

شام کو نظام الملک (اعتماد الدولہ) اور شاہی حرم کے خواجہ سرا خان دوران جو اس معرکہ میں زخمی ہو گیا تھا، کی عیادت کے لیے گئے۔ زخمی سپہ سالار ہوش میں آ چکا تھا۔ اس نے نحیف سی آواز میں کہا: ''ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ شہنشاہ کو نادر سے نہ ملنے دیا جائے اور نہ ہی نادر کو دہلی لے جایا جائے۔ جیسے بھی ہو سکے اس بلا ''نادر'' کو ہندوستان سے نکال دو''۔ (تاریخ نادری ص ۲۰۳) لیکن یہ دونوں باتیں ہو گئیں۔

خان دوران کی بستر مرگ سے وصیت کے باوجود محمد شاہ نے نادر کے کھانے کی دعوت قبول کر لی۔ ایرانی مؤرخ مرزا مہدی کا بیان ہے کہ 26 فروری کو شہنشاہ رسمی طور پر تاج وتخت سے دست بردار ہو گیا اور اپنے سر سے تاج اتار کر ایرانی لشکر گاہ کو روانہ ہوا۔ عجیب بات یہ ہے کہ مؤرخ شہنشاہ ہند کی دست برداری کا ذکر کرتے ہوئے یہ نہیں بتاتا کہ محمد شاہ نے اپنا تاج اتار کر باقاعدہ نادر شاہ کے حوالے کیا یا نہیں۔ اور اگر ایسا ہوا تو کیا یہ اسی موقع پر کیا گیا یا بعد میں کسی اور موقع پر۔

محمد شاہ جب ایرانی لشکر میں گیا تو بظاہر نادر شاہ نے مغل شہنشاہ کا مکمل آداب و احترام کیا اور عبدالباقی خان کو حکم دیا کہ شہنشاہ کی ضروریات کا خیال رکھے لیکن عملاً بادشاہ سپاہیوں کی حراست میں تھا۔ شہنشاہ کی ایرانی لشکر گاہ میں آمد کے بعد قزلباش سپاہیوں کی ایک جمعیت کو ہندوستانی لشکر گاہ میں بھیجا گیا تا کہ تمام توپ خانہ پر قبضہ کے ساتھ ساتھ وہاں موجود امراء اور عمائدین کو گرفتار کر لیا جائے، اور ہندوستانی سپاہیوں سے کہا گیا کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق چاہیں تو کرنال میں رہیں یا دہلی چلے جائیں یا پھر اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔ اپنے قائدین کی بے بسی اور خوراک کی کمی کے پیش نظر انہوں نے اپنے اپنے گھروں کے لوٹ جانے کا فیصلہ کیا لیکن ان کی زیادہ تر تعداد راستے میں قزلباش

سپاہیوں کے علاوہ رہزنوں کے ہاتھوں اور کسانوں کے ہاتھوں ماری گئی۔

(آنند رام: ص۱۷۳، بیان واقعی: ص۲۲، تاریخ نادری: ص۲۰۳)

14 مارچ مطابق یکم ذی الحجہ کو نادر شاہ اور محمد شاہ کرنال سے دہلی کو روانہ ہوئے۔ محمد شاہ کی سواری نادر شاہ سے ایک کوس پیچھے تھی۔ اپنی روانگی سے قبل نادر شاہ نے سعادت خان کو وکیل المطلق (اصل حاکم کا نائب) مقرر کر کے طہماسپ خان جلائر کو چار ہزار سواروں کے ساتھ دہلی روانہ کر دیا۔ ان کے پاس محمد شاہ کی طرف سے گورنر لطف اللہ خان کے نام شاہی مکتوب تھا جس میں ہدایت کی گئی تھی کہ شہر کی چابیاں طہماسپ خان کے حوالے کر دی جائیں۔ ان کے پاس نادر شاہ کی طرف سے ایک تقرر نامہ بھی تھا جس کے تحت لطف اللہ خان کو اس کے منصب پر بحال رکھنے کی توثیق کی گئی تھی۔

(بیان واقعی: ص۲۲، خواجہ عبدالکریم کاشمیری)

دہلی میں قتل عام:

جب کرنال کی لڑائی میں محمد شاہ کی شکست کی خبر پہنچی تو دانش مند کوتوال شہر فولاد خان نے فوراً ایسے اقدامات کیے کہ شہر میں کسی قسم کا خوف و ہراس نہ پھیلے اور نہ ہی امن و امان کی صورت حال خراب ہو۔ اس لیے شہر کو دفاعی کیفیت میں رکھا کیونکہ کئی موقع پرست صورت حال کا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔

طہماسپ خان جالائر اور سعادت خان دہلی پہنچے تو شہر کے دروازے مقفل تھے۔ چنانچہ انہوں نے گورنر لطف اللہ کو محمد شاہ اور نادر شاہ کے احکام بھجوائے تو دروازے کھل گئے اور طہماسپ خان کو شہر کی چابیاں دے دی گئیں۔ ان میں قلعے، خزانے اور گوداموں کی چابیاں بھی شامل تھیں۔ اب نادر شاہ اور محمد شاہ کے استقبال کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

دریں اثناء دونوں تاجدار 18 مارچ کو دہلی کے باہر شالا ر مار باغ میں پہنچے۔ اگلے روز نادر شاہ نے محمد شاہ کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت دے دی تاکہ وہ ایرانی فاتح کے شاندار استقبال کی تیاریاں کر سکے۔ جب 20 مارچ کو نادر شاہ شہر دہلی میں داخل

ہوا تو گلیوں بازاروں میں دو رویہ سپاہی ایستادہ تھے۔ نادر شاہ کے جلوس کے آگے ایک سو ہاتھی اور ہر ہاتھی پر نادر شاہ کے خصوصی دستے کے سپاہی بیٹھے تھے۔ نادر شاہ خود گھوڑے پر سوار تھا۔ جب وہ قلعہ میں پہنچ کر گھوڑے سے اترا تو توپیں داغ کر سلامی دی گئی۔

محمد شاہ نے نادر شاہ کا استقبال بڑی شان و شوکت اور پر تکلف تقریب کے ساتھ کیا۔ نادر شاہ کو بیش قیمت تحائف پیش کیے۔ مرزا مہدی اس موقع پر انتہائی مبالغہ آرائی اور زیب داستان سے کام لیتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بقول محمد شاہ نے نہایت عجز و انکساری سے میزبانی کا دستر خوان سجا دیا جس کے جواب میں نادر نے محمد شاہ کا شکریہ ادا کیا اور اسے مطلع کیا کہ معاہدۂ کرنال کے مطابق وہ (محمد شاہ) ایک دفعہ پھر سلطنت ہند کا مالک ہے۔ نادر شاہ کی طرف سے اس فیاضی پر محمد شاہ نے اپنے مہمان کو تمام تر شاہی خزانے اور ہیرے جواہرات کی پیش کش کر دی۔ اگرچہ دنیا بھر کے بادشاہوں کے خزانے ہندوستان کے بادشاہ کے خزانوں کا دسواں حصہ بھی نہیں تھے لیکن نادر شاہ ان تحائف کو قبول کرنے سے مسلسل انکار کرتا رہا جب کہ محمد شاہ کا اصرار تھا کہ ”عظیم مہمان انہیں شرف قبولیت بخشے۔“ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ نادر شاہ کا مسلسل انکار محض ایک فریب اور تصنع تھا۔

محمد شاہ کی طرف سے استقبالیہ تقریبات کے بعد نادر شاہ نے شاہ جہان کے بنائے محل میں دیوان خاص کے قریب اپنا قیام رکھا جب کہ محمد شاہ نے برج اسد کے ساتھ بنی ہوئی ایک عمارت میں رہائش اختیار کی۔

ہفتہ دس ذالحجہ (21 مارچ) کو اسلامی تقویم کے مطابق عیدالاضحیٰ اور ایرانی کیلنڈر کے مطابق نوروز تھا۔ پہلے سے دی گئی ہدایات کے مطابق نماز عید کا خطبہ میں سنی عقیدہ کے مطابق بادشاہ وقت کا نام ”نادر شاہ“ پڑھا گیا۔ دہلی کی تمام مساجد میں یہی کیا گیا۔ علاوہ ازیں دہلی کی ٹکسال میں جو نئے سکے ڈھالے گئے، ان پر یہ عبارت درج کی گئی۔ ”زمین پر مسلمانوں کا سلطان نادر ہے جو بادشاہوں کا بادشاہ اور خوش قسمتی کا سنگم ہے۔“ اس روز نادر شاہ نے معمول کے مطابق نوروز کی تقریب منعقد کی اور اپنے مرکزی عہدیداروں کو اعزازات سے نوازا۔

اسی روز سعادت خان کا انتقال ہو گیا۔ کچھ مؤرخین کا خیال ہے کہ وہ زخموں کی وجہ سے مراجب کہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس نے خودکشی کی۔ گمان غالب یہی ہے کہ وہ زہر کھانے سے ہلاک ہوا اور یہ زہر خورانی اس نے نادر شاہ کی طرف سے ہتک آمیز گفتگو کے بعد شدید مایوسی اور احساس ذلت کے تحت کی۔

10 ذی الحجہ کی سہ پہر نادر شاہ محمد شاہ کی قیام گاہ پر ملاقات کے لیے گیا۔ یہ جوابی ملاقات ایک روز پہلے نادر شاہ کی آمد کے ضمن میں ہوئی تھی۔ شام کے وقت نادر شاہ کی واپسی کے بعد شہر میں افواہ پھیل گئی بلکہ ہمارے خیال میں پھیلا دی گئی تاکہ دہلی کے لوگوں کو لوٹا جا سکے اور ان کا قتل عام کیا جا سکے، کہ نادر شاہ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ کچھ اور افواہوں کے مطابق انہیں محمد شاہ کے حکم کے تحت گرفتار کر کے زندان میں ڈال دیا گیا۔ کسی نے بھی ان افواہوں کی تصدیق کرنے کی کوشش نہ کی، چنانچہ یہ افواہیں مصدقہ خبریں بن کر جنگل کی آگ کی طرح کوچہ و بازار میں پھیل گئیں۔ مختلف مقامات پر شہریوں کے ہجوم جوش میں آ کر ایرانی سپاہیوں پر حملہ آور ہونے لگے۔ ان افواہوں اور نقض امن کی بنیاد دراصل کچھ اور واقعہ تھا۔ اس روز دوپہر کے وقت طہماسپ خان جالائر نے اپنے کچھ شہسواروں کو پہاڑ گنج کی منڈی میں بھیجا کہ دکانیں کھلوائی جائیں اور اناج کی قیمت طے کی جائے ایرانی سپاہیوں نے اناج کی قیمت ایک روپیہ فی سیر مقرر کی۔ یہ قیمت مقامی تاجروں کے لیے انتہائی اشتعال انگیز تھی۔ غلہ فروش احتجاج کے طور پر اکٹھے ہو گئے۔ احتجاجی تاجر کچھ دیر بعد مشتعل ہو گئے اور انہوں نے طہماسپ کے بھیجے ہوئے سپاہیوں اور دیگر ایرانی سپاہیوں کو جو غلہ خریدنا چاہتے تھے، ہلاک کر دیا۔ ان سپاہیوں پر حملہ کے لیے اکسانے والے تاجر پھیل گئے اور انہوں نے شہر بھر میں مذکورہ افواہیں پھیلا دیں۔ یہ افواہیں آگے بڑھتی ہوئی زیادہ مسخ ہو گئیں۔ ہتھیار رکھنے والے احمق افراد بتدریج اکٹھے ہوتے گئے اور باقاعدہ ایک شورش کی شکل اختیار کر گئے۔ شہر کی تنگ گلیوں میں سے گزرنے والے ایک ایک یا دو دو قزلباش، شورش پسندوں کے اچانک حملوں کا نشانہ بن کر قتل ہونے لگے۔ ہندوستانی مؤرخ محمد بخش آشوب اس شام کو کابلی دروازہ کے قریب واقع اپنے علاقہ میں کھانا کھا رہا تھا کہ اس نے قیامت کا شور سن کر چھت پر جا کر دیکھا کہ

سعادت خان کی سپاہ کے لوگ قزلباشوں کو تہ تیغ کر رہے تھے۔ سعادت خان کے یہ سپاہی کابل اور پشاور سے آئے تھے اور کرنال کی شکست کا انتقام لینا چاہتے تھے۔

ایرانی سپاہ نے جب نادر شاہ کی موت کی خبر سنی تو ان کے حوصلے اتنے پست ہو گئے کہ وہ مزاحمت کے قابل بھی نہ رہے۔ اس دوران محمد شاہ کے منصب دار یا امراء جو اس طرح کی صورت حال پر قابو پانے اور نظم و نسق برقرار رکھنے کے ذمہ دار تھے، انہوں نے کوئی سرگرمی نہ دکھائی اور شورش پر قابو پانے کے لیے کہیں کوئی اقدام نہ کیا۔ بلکہ اس کے برعکس کچھ ہندوستانی منصب داروں نے اپنی ہی درخواست پر گھروں کی حفاظت کے لیے متعین کیے گئے ایرانی سپاہیوں کو نادر شاہ کے قتل کی خبر سن کر ہلاک کر دیا۔ اس شورش میں ہلاک ہونے والے ایرانی سپاہیوں کی تعداد کے بارے میں مؤرخین کے بیانات مختلف ہیں، اور وہ چند سو سے لے کر ہزار تک کی تعداد کا ذکر کرتے ہیں، لیکن محتاط اندازے کے مطابق یہ تعداد قریباً تین ہزار تھی۔

شورش کے دوران کچھ ہندوستانی عمائدین (جن میں سید نیاز خان، قمر الدین خان کا داماد، اور شاہ نواز خان شامل تھے) نے پانچ سو افراد اکٹھے کر کے شاہی اصطبل پر حملہ کر دیا۔ ناظم کو قتل کر دیا اور ہاتھی نکال کر لے گئے۔ اب وہ شہر سے باہر نکلے اور ایک نزدیکی قلعہ پر قبضہ کر لیا۔

نادر شاہ کو جب پہلی دفعہ شہر میں ہونے والی شورش کے بارے میں بتایا گیا تو اس نے یقین کرنے سے انکار کر دیا، اور کہا کہ ایرانی سپاہی شہریوں پر من گھڑت الزام لگا رہے ہیں۔ دراصل یہ اس بہانے شہر کو لوٹنا چاہتے ہیں۔ پھر اس نے اپنے خصوصی دستے میں سے ایک آدمی کو حالات کا جائزہ لے کر اسے رپورٹ کرنے کے لیے باہر بھجوایا، لیکن یہ آدمی ابھی قلعہ سے باہر نکلا ہی تھا کہ ایک ہجوم نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کچھ دیر کے بعد نادر شاہ نے ایک اور آدمی کو حالات سے آگاہی کے لیے بھیجا لیکن اس کے نصیب میں بھی پہلے جیسا انجام لکھا تھا۔ اب نادر شاہ کو اندازہ ہو گیا کہ حالات واقعی بہت سنگین ہیں، اور ایرانی سپاہیوں کے خلاف دہلی کے شہری ہلاکت خیز تشدد پر اتر آئے ہیں۔ نادر شاہ نے ایک ہزار بندوقچیوں کو فسادیوں پر قابو پانے کے لیے بھیجا، لیکن تاریکی

اور تعداد میں کم ہونے کی وجہ سے وہ پورے شہر میں امن بحال کرنے میں ناکام رہے۔ چنانچہ نادر شاہ نے اپنے آدمیوں کو کہا کہ وہ رات بھر مسلح رہیں تاکہ خود پر ہونے والے کسی حملہ کی صورت میں اپنا دفاع کر سکیں لیکن اس کی اجازت کے بغیر کوئی اور قدم نہ اٹھائیں۔

اگلے روز سورج طلوع ہوا تو نادر شاہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اپنے محافظوں کے ساتھ دہلی کی گلیوں سے گزرتا ہوا شہر کر مرکزی چاندنی چوک میں واقع سنہرے گنبد والی مسجد (مسجد روشن الدولہ) کو روانہ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ مسجد کی طرف جا رہا تھا تو راستہ میں ایک جگہ کسی بالکونی یا کھڑکی سے اس پر فائر کیا گیا۔ نادر شاہ تو بچ گیا لیکن اس کا ایک عہدیدار مارا گیا۔ مسجد میں پہنچ کر نادر شاہ چھت پر چڑھ گیا اور شہر کا جائزہ لیتے ہوئے حکم دیا کہ جس علاقہ میں ایک بھی قزلباش سپاہی مارا گیا ہے وہاں کوئی بھی شہری زندہ نظر نہیں آنا چاہیے۔ صبح نو بجے کے قریب ایرانی سپاہیوں نے یہ خون آشام فریضہ سرانجام دینا شروع کیا اور کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ گلیوں اور بازاروں میں نظر آنے والے ہر فرد کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد ایرانی سپاہی دکانوں اور گھروں میں گھس گئے۔ سامنے آنے والا کوئی شخص ان کے قہر سے نہ بچ سکا۔ جو چیز قیمتی نظر آئی اسے قبضہ میں لے لیا گیا۔ بہت سی گھروں کو منہدم کر دیا گیا۔ صراقہ بازار، زر مبادلہ والی دکانوں کے بازار اور سوداگروں کو خاص طور پر لوٹا گیا۔ لوٹ مار کرنے کے بعد ان گنت عمارتوں کو اس طرح نذر آتش کیا گیا کہ مکینوں کو باہر نکلنے کی اجازت نہ دی گئی۔ وہ شعلوں میں گھرے چیختے چلاتے رہ گئے۔ ایرانیوں نے اندھے انتقام کے غیظ و غضب میں مجرم یا بے گناہ عورت یا مرد اور بچوں یا بوڑھوں میں کوئی تفریق نہ کی۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ نادری: ص ۲۰۵، بیان واقعی: ص ۲۲، آشوب: جلد ۲ ص ۳۱۵، آنند رام: ص ۳۷ وغیرہ)

جب تک شہر میں موت اور بربادی کا ہولناک کھیل جاری رہا نادر شاہ مسجد کی چھت پر اپنی تلوار نیام سے نکالے موجود تھا۔ اس دوران محمد شاہ نے نظام الملک اور قمر الدین خان کو نادر شاہ کے پاس بھیجا اور درخواست کی کہ اب شہریوں پر رحم کرتے ہوئے یہ قتل عام بند کر دیا جائے۔ نادر شاہ نے شہر کے کوتوال فولاد خان کو حکم دیا کہ ایرانی

سپاہیوں کے دستۂ خاص کو لے کر شہر میں جائے اور ایرانی سپاہیوں کو مزید قتل و غارت سے باز رہنے کی ہدایات پہنچا دیں۔ شہر بھر میں فوراً اس حکم پر عمل درآمد ہو گیا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ نادر شاہ کو اپنے لشکریوں پر مکمل کنٹرول حاصل تھا۔ مورخ عبدالکریم نادر شاہ کے احکامات کی فوری تعمیل کو ''دنیا کی حیرت انگیز چیزوں میں سے ایک'' قرار دیتا ہے۔ چھ گھنٹے تک قتل عام جاری رہنے کے بعد تین بجے کے قریب بند ہو گیا۔ نادر شاہ نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ گرفتار کیے جانے والے لوگوں کو اپنے گھروں کو جانے دیا جائے۔

ایرانیوں نے ان چھ گھنٹوں میں کس قدر لوگوں کو ہلاک کیا، اس کے ٹھیک ٹھیک اعداد و شمار تو کبھی بھی مرتب نہ ہو سکے لیکن مختلف مؤرخین کے اندازے 8 ہزار سے لے کر چار لاکھ تک ہیں۔ سرجے سرکار کے مطابق قتل عام نسبتاً محدود علاقے میں ہوا اور یہ تھوڑی دیر تک ہی جاری رہا۔ اس کے خیال میں قتل ہونے والوں کی تعداد کسی طرح بھی بیس (20) ہزار سے زیادہ نہ تھی، اس میں ان عورتوں کی تعداد بھی شامل ہے جنہوں نے خودکشی کر لی۔

نادر شاہ کا اگلا اقدام ان دونوں ہندوستانی امرا، سید نیاز خان اور شاہ نواز خان کی سرکوبی کے لیے عظیم اللہ خان اور فولاد خان کی قیادت میں ایک فوج کی روانگی تھی۔ مذکورہ امراء گذشتہ رات شاہی اصطبل پر حملہ کر کے ہاتھی ہانک کر شہر سے باہر واقع ایک قلعہ میں لے گئے تھے۔ قلعہ پر حملہ کیا گیا اور دونوں امراء کو ان کے ساتھیوں سمیت گرفتار کر کے نادر شاہ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ شام کے وقت ان سب کی گردنیں اڑا دی گئیں۔

قتل عام کے بعد کئی دنوں تک دہلی کی گلیاں لاشوں سے اٹی رہیں۔ بالآخر مفاد عامہ میں نادر شاہ نے کوتوال شہر کو حکم دیا کہ لاشیں اکٹھی کر کے جلا دی جائیں۔ لاشیں جلانے کے لیے مسمار کیے گئے مکانوں کی چھتیں، کھڑکیاں اور دروازے ''چتاؤں'' میں استعمال کیے گئے۔ کئی لاشیں دریائے جمنا میں بہا دی گئیں۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ نادر شاہ نے 1738ء مطابق 1151ھ میں دہلی میں جو قتل عام کیا اس میں ہندو مسلمان کی کوئی تمیز نہ کی تھی بلکہ جانی و مالی لحاظ سے تباہ کاریوں اور تاخت و تاراج کا شکار بننے والوں کا تعلق عموماً مسلمانوں سے تھا۔ کیونکہ

یہی مدّ مقابل تھے۔ انہی کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور تھی اور انہی کے قبضہ میں ملک کے خزانے تھے اور انہی کی غلط کاری نے نادر شاہ کو قتل عام کے لیے مشتعل کیا تھا۔ اسی طرح احمد شاہ ابدالی کا سب سے بڑا تصادم اگرچہ مرہٹوں سے ہوا لیکن اس کے ہندوستان پر بار بار حملوں میں مسلمانوں کا نقصان بھی مجموعی حیثیت سے کچھ کم نہیں رہا۔ بقول مولوی ذکاء اللہ خان نادر شاہ کی قوت دو روزہ تھی اور ابدالی کی فوجیں دو ماہ تک دہلی کو اس طرح لوٹتی رہیں کہ نادر گردی کو بھی بھلا دیا۔ گو احمد شاہ ابدالی اپنی طبیعت اور مزاج سے نادر شاہ کی مانند بے رحم اور سفاک نہ تھا لیکن اس کی سپاہ نادر شاہ کی سپاہ سے زیادہ اجڈ اور وحشی تھی اور وہ اس کے کہنے میں نہ تھی۔ 11 ستمبر 1170ء کو وہ دہلی میں داخل ہوا اور دو مہینے تک برابر لوٹتا رہا۔ بڑے بڑے امیروں کے گھر میں جھاڑو کا تنکا تک نہ چھوڑا۔

(تاریخ ہندوستان: جلد ۹ ص ۲۹۷)

ان گنت انسانوں کی جانیں لینے کے بعد نادر شاہ نے مال و دولت اور زر و جواہر اکٹھے کرنے پر توجہ مرکوز کر دی۔ خان دوراں اور مظفر خان کی املاک قبضہ میں لے لی گئیں۔ قزلباشوں کی ایک مضبوط جمعیت کو اودھ روانہ کر دیا گیا کہ سعادت خان کے خزانے قبضہ میں لے کر دہلی لائے جائیں۔ بعد ازاں نادر شاہ نے طہماسپ خان جالائر کی سربراہی میں ایک کمیشن مقرر کیا جس کے ذمہ دہلی کے امراء، تاجروں اور عوام کی املاک کا اندازہ لگانا تھا۔ اس کام کے دوران ایرانی سپاہیوں کی بھاری نفریاں شہر کو حصار میں لیے رہیں۔ دروازے بند کر کے کسی کو شہر چھوڑنے کی اجازت نہ دی گئی، البتہ شہر میں داخل ہونے والوں پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اناج کے ذخیروں پر بھی قبضہ کر کے ایرانی محافظ بٹھا دیئے گئے۔ ان سب اقدامات کا مقصد دہلی والوں سے خراج وصول کرنا تھا۔

دہلی میں ہونے والے ان خوفناک واقعات کا زبردست قسم کا اثر پورے ہندوستان پر پڑا۔ آنند رام کا کہنا ہے کہ دہلی سے ایسی تباہی اس سے پہلے صرف ایک بار دسمبر 1398ء میں اس وقت دیکھی تھی جب تیمور کے سپاہیوں نے شہر پر قبضہ کر لیا تھا۔ شہریوں کی ایک بغاوت کو کچلنے کے لیے تیمور کے سپاہیوں نے ہزاروں شہریوں کو قتل اور عمارتوں کو تاراج اور منہدم کر دیا تھا۔ 1739ء میں تاریخ نے سفاکی کے ساتھ اپنے آپ

کو دہرایا تھا۔ آشوب نے اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی تاریخ میں لکھا کہ خون بہانا تورانیوں کی فطرت ہے اور نادر شاہ خون ریزی میں چنگیز خان اور تیمور کا شاگرد ثابت ہوا تھا۔ نادر کا قتل عام آج بھی ہندوستانیوں کو یاد ہے اور ''نادر شاہی'' کی اصطلاح اب بھی سفا کی اور بے رحمی کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔

دہلی کے لوگ ابھی اپنے مرنے والوں کے لیے سوگوار تھے کہ نادر شاہ نے اپنے بیٹے نصر اللہ کے لیے مغل شاہزادی کا رشتہ طلب کرلیا۔ یہ شہزادی یزدان بخش کی بیٹی اور شہنشاہ اورنگ زیب کی پڑپوتی تھی۔ سر جان میلکم نے ایک ایرانی حوالے سے لکھا ہے کہ مغلوں میں رواج تھا کہ رشتہ مانگنے والے سے سات پشت کا شاہی شجرہ پوچھتے تھے۔ نادر شاہ نے اس موقع پر چیخ کر کہا:

''انہیں بتا دو.......... نصر اللہ نادر شاہ کا بیٹا ہے اور نادر شاہ تلوار کا بیٹا.......... تلوار کا پوتا، تلوار کا پڑپوتا.......... (علی ہذا القیاس)

یوں سات پشتوں کے بجائے ستر پشتوں کا شجرہ سنایا گیا اور مغلوں کو یہ رشتہ بہر طور قبول کرنا پڑا۔

شادی 2 ذی الحجہ (6 اپریل) کو منعقد ہوئی۔ نادر شاہ نے اس موقع پر شہر میں چراغاں کا حکم دیا۔ آتش بازی اور دیگر تفریحی تقریبات کا اہتمام کیا گیا۔ شادی کی رات پندرہ یا بیس قزلباشوں نے رقص کیا اور ترکی زبان کے گیت گائے۔ انہوں نے مرثیہ حسینؓ سے بھی کچھ اقتباسات پڑھے۔ نادر شاہ کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ سخت ناراض ہوا۔ اس نے برہمی سے کہا کہ میں نے کئی سال سے تعزیہ اور مرثیہ پر پابندی لگا رکھی ہے۔ ان سپاہیوں نے میری حکم عدولی ہی نہیں کی بلکہ قرآن اور روایات حدیث کے منافی قدم اٹھایا ہے۔ انہوں نے میرے بیٹے کی شادی کی خوشی نہیں منائی۔ اس جرم کی سزا کم سے کم موت ہے۔ چنانچہ اگلے روز ان بدقسمت سپاہیوں کو گرفتار کر کے شہر کے دروازں پر پھانسی دے دی گئی۔ ان کی نعشیں انتباہ کے طور پر ایک ماہ تک وہیں لٹکی رہیں۔ کیونکہ محرم شروع ہونے والا تھا۔ نادر شاہ اپنے آدمیوں کو شیعہ عقائد سے دور رکھنے کا خواہش مند رہتا تھا۔ (آشوب: جلد۲ص ۳۸۶)

شہریوں کے اثاثوں کے ٹیکس کا تعین کرنے کے کام میں کچھ عرصہ لگا۔ کوتوال شہر کا عملہ ایرانی سپاہیوں کے ساتھ ایک ایک گھر گیا۔ گھر کے تمام مکینوں کو سامنے آنے کا حکم دیا جاتا اور پھر اثاثے کی تفصیلات لکھی جاتیں۔ ہر فرد کی املاک کا الگ الگ اندراج کیا جاتا۔ امیر افراد پر پچاس فی صد تک ٹیکس عائد کیا گیا۔ نادرشاہ نے حکم دے رکھا تھا کہ شہر کے لوگ ٹیکس عائد کرنے والے عملہ سے احترام کے ساتھ پیش آئیں اور کوئی مزاحمت نہیں ہونی چاہیے۔ جب تمام تفصیلات مکمل ہو گئیں تو نظام الملک، سربلند خان اور تین دیگر سرکردہ افراد کو محاصل اکٹھے کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ تخمینہ کے مطابق دہلی شہر سے دو کروڑ روپے اکٹھے کیے جانے تھے اس مقصد کے لیے دہلی کو پانچ زونوں (Zones) میں تقسیم کیا گیا۔ سربلند خان نے یہ کام انتہائی نرمی، ہمدردی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا لیکن بقیہ کلکڑوں نے لوگوں کے ساتھ بہت درشت اور ظالمانہ رویہ اپنایا جس کے نتیجہ میں بہت سے خاندان بالکل کنگال ہو کر رہ گئے۔ کچھ لوگوں نے تو بے بسی کے عالم میں خودکشی کر لی۔ کچھ واقعات میں وصولی کے لیے وحشیانہ تشدد سے کام لیا گیا۔

نادرشاہ کو امراء اور دہلی کے عوام سے زر و جواہر، بیش قیمت اشیاء اور نقدی کی صورت میں کم از کم ستر کروڑ روپے حاصل ہوئے۔ آنند رام مؤرخ کے مطابق تین سو اڑتالیس (348) برسوں سے جمع کی گئی دولت کے مالک چند لمحوں میں تبدیل ہو گئے۔ اس تمام دولت کے علاوہ نادرشاہ کو دہلی سے طلائی تخت طاؤس اور شہرہ آفاق قیمتی ہیرا کوہ نور بھی ہاتھ لگا۔

تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ بائیس کروڑ روپیہ نقد خزانہ شاہی سے اور قریباً نوے (90) کروڑ کے جواہرات اور تخت طاؤس وغیرہ قلعہ سے لوٹے گئے۔ (عماد السعادت ص ۳۱) اور جو دولت شہر سے لوٹی گئی اس کی تعداد بھی ستر کروڑ تک بتائی گئی ہے۔ اس مالی بربادی اور تباہی کے علاوہ سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ملکی وحدت پارہ پارہ ہو گئی۔ شمال مغرب میں دریائے سندھ تک کا پورا علاقہ اور پنجاب کے چند محال کا دہلی کے بجائے ایران کے ساتھ باقاعدہ الحاق کر دیا گیا۔ (تاریخ ہندوستان جلد ۹ ص

۲۵۹) دریائے سندھ سے دہلی تک اگرچہ محمد شاہ کی حکومت رہی مگر اس افراتفری میں مرکزی حکومت کا وقار کم ازکم اس علاقہ میں ختم ہوگیا، لہٰذا یہ اقتدار بھی بے وقار رہا۔ مشرق میں علی وردی خان مہابت جنگ نے موقع غنیمت دیکھ کر مستقل حیثیت اختیار کر لی اور اس طرح بنگال، بہار اور اڑیسہ مرکز سے الگ ہو گئے۔

12 مئی کو نادر شاہ نے ایک بہت بڑا دربار منعقد کیا۔ اس میں محمد شاہ اور اس کے امراء کو مدعو کیا گیا اور اپنے ہاتھوں سے محمد شاہ کے سر پر ہندوستان کا تاج رکھا۔ جواہرات سے مرصع ایک تلوار اور ایک بیش قیمت طلائی کمر بند عطا کیا۔ محمد شاہ کے امراء کو بھی خلعات فاخرہ پیش کی گئیں۔

اب دہلی کی مساجد میں خطبہ کے دوران نادر شاہ کے بجائے محمد شاہ کا نام لیا جانے لگا اور سکوں پر بھی محمد شاہ کا نام درج کرنے کے احکام جاری کر دیئے گئے۔ محمد شاہ اب ایک بار پھر ہندوستان کے اقتدار اعلیٰ کا مالک تھا۔ لیکن اب یہ وہ محمد شاہ نہیں تھا۔ یہ ایک ایسا محمد شاہ تھا جس کی سلطنت سکڑ گئی تھی، اس کا سپہ سالار، کئی ہزار سپاہی اور غلام گرفتار کر لیے گئے تھے۔ اس کے زرو جواہر چھن چکے تھے اور خزانہ خالی تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کا وقار اور جاہ و جلال خود اس کی اپنی کاہلی، بزدلی اور تعیّشانہ زندگی کے باعث خاک میں مل کر رہ گیا تھا۔

اس لوٹے ہوئے خزانے کو ایران منتقل کرنے کے لیے اونٹوں، خچروں پر مشتمل ایک بڑا غول لشکر کے ساتھ رکھا گیا۔ کئی سو ہاتھیوں کے علاوہ گھوڑوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی لوٹ کے مال میں شامل تھی۔ 16 مئی کو بالآخر کوچ کا اعلان ہو گیا۔ نادر شاہ عراقی گھوڑے پر بیٹھ کر دہلی کی گلیوں سے ہوتا ہوا کابلی دروازے سے نکلا۔ دہلی کی گلیوں میں نادر شاہ کی واپسی کا منظر دیکھنے والے ہزاروں تماشائیوں میں آشوب بھی موجود تھا۔ اس نے اپنی تاریخ میں روانگی کا منظر بڑی خوبصورتی سے تحریر کیا ہے۔ نادر شاہ نے سر پر ایک سرخ رنگ کی ٹوپی پہن رکھی تھی جس پر قیمتی موتی جڑا تھا۔ ٹوپی کے گرد سفید کشمیری شال لپٹی تھی۔ آشوب کا کہنا ہے کہ دیکھنے میں نادر کڑیل جوان، تنومند اور سیدھی کمر کے ساتھ بیٹھا نظر آرہا تھا۔ اس کی داڑھی اور مونچھوں کو

خضاب سے کالا کیا گیا تھا۔ وہ دہلی کی گلیوں سے اس طرح گزرا کہ اس کا سر اونچا اور نظر سامنے تھے۔ جب لوگوں نے ایسے دیکھ کر نعرے بلند کیے تو اس نے ان پر دونوں ہاتھوں سے روپے نچھاور کیے۔

شالا مار باغ پہنچ کر وہ رک گیا اور ایک روز وہاں قیام کیا، اس کے ایران کا طویل سفر شروع ہو گیا۔

تین اور جنگ جو قوتیں:

نادر شاہ کے حملہ نے مغلیہ سلطنت پر بڑھاپا نازل کر دیا۔ اور جب کسی فرد پر بڑھاپا آ جائے تو پھر آپ اگر اس کو صبح و شام بھی بادام اور پستہ کھلائیں اس میں شباب کے آثار کبھی بھی پیدا نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح جب کسی حکومت پر بڑھاپا آ جائے تو اس پر از سر نو شباب آنا محال ہوتا ہے۔ چنانچہ مشہور اندلسی دانشور اور مفکر علامہ ابن خلدون نے فرمایا ہے کہ:

ان الهرم اذ انزل بدولة لایرتفع (مقدمہ ابن خلدون: ص۲۰۶)

”جب کسی ریاست اور سلطنت پر بڑھاپا آتا ہے تو پھر اس کا از سر نو جوان ہونا ممکن نہیں ہوتا“

نادر شاہی حملہ نے مغلیہ سلطنت کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔ نادر شاہ کے اس سفاک حملہ کے علاوہ تین اور نوخیز طاقتیں بھی تھیں جو مغلیہ سلطنت پر آئے روز حملے کر کے اس کی طاقت کو کمزور سے کمزور تر کر رہی تھیں۔ اب حالت یہ تھی کہ مغلیہ سلطنت ایک حکمران مسلمان خاندان کے طویل ترین اور قوی ترین اقتدار کی علامت بن کر رہ گئی تھی جس کے پیچھے نہ کوئی طاقت تھی اور نہ کوئی سلیقہ۔ وہ تین نوخیز طاقتیں جو آئے روز مغلیہ سلطنت کو کمزور کر رہی تھیں حسب ذیل تھیں

(1) مرہٹے (2) سکھ (3) جاٹ

1- مرہٹے:

مرہٹے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے عہد کی تاریخ کا سب سے نمایاں اور خوفناک

ترین عنصر رہے ہیں، یہ بنیادی طور پر علاقہ مہاراشٹر (راجستھان) کی رعایا تھے۔ جنہیں ایک نظام شاہی جرنیل ملک عنبر (م1625ء) نے کسان سے سپاہی بنا دیا تھا۔ اور بعد میں اسے چھاپہ مار جنگ کی تربیت حاصل ہو گئی تھی۔ اس طوائف الملوکی میں مرہٹے تاریخ ہند کا ایک حصہ بن کر ابھرے۔

مرہٹے اگرچہ ان کی سرگرمیاں دکن میں محدود تھیں لیکن مغلیہ حکومت کی کمزوری کے باعث ان کے احتجاجی گروہ اور چھاپہ مار پارٹیاں ہر موقع بے موقع حکومت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی تھیں بلکہ ان کی جرأت یہاں تک بڑھی کہ ان کے دلوں میں دہلی کے تخت کی خواہش انگڑائیاں لینے لگی۔ ان لوگوں نے مغلیہ سلطنت اور مسلمانوں کو ہر ممکن وقت نقصان پہنچانے کی کوشش کی جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ مرہٹوں کی تاخت صرف فوجی حدود اور عوام کے استحصال ہی تک محدود نہ تھی بلکہ ان کی دلی خواہش ہندو مذہب، ہندو تہذیب کا احیاء تھا۔ اس تحریک کا قائد اول شیواجی تھا جو کہ ایک نہایت متعصب ہندو تھا۔ چنانچہ اس کے بارے میں ماؤنٹ رسٹوارٹ الفنسٹن اپنی تاریخ ہند میں لکھتا ہے کہ

> ''اس کی طبیعت نے ہندوانہ تعصب سے تربیت پائی تھی۔ اس طبیعت پر مجبور ہونے سے وہ مسلمانوں اور ان کے رسم و رواج سے سخت نفرت اور ہندوؤں اور ان کے طور طریقوں سے بڑی رغبت رکھتا تھا، اور یہ ترقی روز افزوں تھی۔ اس کا یہ مزاج تدبیر ملکی سے ایسا راس آیا تھا کہ اس نے بھگتوں کی صورت بنائی اور اوتاروں کی کرامتوں اور دیوتاؤں کی عنایتوں کا دعویٰ کیا۔''
>
> (تاریخ ہند (اردو ترجمہ) ص ۱۰۴۰)

مرہٹے بہت خودسر ہو گئے تھے اور خود بادشاہ کے عزل و انتخاب میں ان کا عمل دخل تھا۔ اگر احمد شاہ ابدالی دو مرتبہ انہیں شکست دے کر ان کا قتل عام نہ کرتا (پہلی مرتبہ بمقام باؤلی 1760ء میں اور دوسری بار پانی پت 1761ء میں) تو عین ممکن تھا کہ وہ مغلوں کی اس برائے نام سلطنت کا قصہ ہی ختم کر ڈالتے اور پایۂ تخت دہلی میں اپنا شاہی

سلسلہ قائم کر لیتے۔ پانی پت کی لڑائی کے بعد مرہٹوں نے پھر سر اٹھایا اور لوگوں کو بہت پریشان کیا۔ ان کی خون آشامی کا مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے تمام لوگ بلاتفریق مذہب وملت، شکار تھے۔ چنانچہ اس زمانہ کے بزرگوں کی تحریرات میں اس عہد کی مرہٹہ گردی کا ذکر ملتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے علاوہ حضرت مظہر جان جاناں کے مکتوبات میں بھی ان کی خون آشامیوں کا ذکر ملتا ہے۔ اسی وجہ سے ان دونوں بزرگوں نے جہاد پر بڑا زور دیا ہے کیونکہ ان دونوں کے نزدیک مسلمانوں کی مغلوبیت اور پستی کا ایک ہی علاج تھا اور وہ یہ کہ مسلمان صحیح جذبہ سے فریضہ جہاد ادا کریں۔

اورنگ زیب عالمگیر بھی انہیں مرہٹوں کی ریشہ دوانیوں کو ختم کرتے کرتے اپنی زندگی کے کئی اہم سال دکن میں گذار چکے تھے حتیٰ کہ ان کی وفات بھی دکن میں ہوئی، لیکن پھر جب ان کی ہنگامہ آرائیوں نے وسعت اختیار کی اور انہوں نے دیہاتوں کو نہایت بے دردی سے لوٹنا شروع کیا، اور بلاتفریق مذہب وملت عورتوں کو اپنی نفسانی ہوس کا شکار بنانا شروع کر دیا، اور پانی پت کے میدان میں احمد شاہ ابدالی نے ان کو شکست فاش دی، تو پانی پت کے میدان میں آخری فیصلہ ہونے سے قبل انہوں نے نواب شجاع الدولہ کی معرفت جو اس سے پہلے مرہٹوں کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے، کوشش کی کہ احمد شاہ ابدالی سے صلح ہو جائے۔ شجاع الدولہ نے ان کی تلخ حقیقتوں اور اپنے مسلسل تجربات کی بنا پر ان کو جو جواب دیا، اس سے مرہٹوں کے قومی مزاج پر نہایت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ نواب شجاع الدولہ نے انہیں کہا:

> ''دکن کے برہمن ہندوستان پر مدت سے مسلط ہیں۔ ان کے سر پر وفور طمع وحرص وبدعہدی وبدقولی کے سبب سے یہ بلا شاہ درانی کی آئی ہے۔ ایسوں کے ساتھ کیا کوئی صلح کرے جو کسی کی آبرو اور آسائش کے روادار نہ ہوں۔ سب چیزیں اپنے اور اپنی قوم کے لیے جانتے ہوں۔ آخر سب ان کے ہاتھوں سے ایسے عاجز ہوئے کہ انہوں نے اپنے پاس نفوس اور حفظ آبرو اور رفاہ خلائق کے لیے شاہ ابدالی کو منتیں کر کے ولایت سے بلایا ہے اور اس کے

صدمات کو مرہٹوں کی ایذا رسانی سے سہل سمجھا۔‘‘

(تاریخ ہندوستان، مولوی ذکاء اللہ دہلوی: جلد ۹ ص ۳۰۵)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان مرہٹوں کی ایذا رسانی سے ملک کا ہر باشندہ تنگ تھا۔ آخر کار لوگوں نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ کر کے مرہٹوں کی طاقت کا قلع قمع کرنے کی دعوت دی۔ اس نے ان لوگوں کی دعوت کے جواب میں 14 جنوری 1761ء مطابق 6 جمادی الآخرۃ 1174ھ کو پانی پت کے تاریخی میدان میں مرہٹوں کو شکست فاش دی اور لوگوں کو ان کی ایذا رسانیوں سے ہمیشہ کے لیے نجات مل گئی۔

2- سکھ:

سکھ ایک ایسا مذہبی گروہ تھا جو پندرھویں صدی عیسوی میں بابا گورونانک (1469-1539ء) کی زیر قیادت وجود میں آیا۔ بابا گورونانک نے فارسی اور دینیات کی تعلیم ایک بزرگ سید حسن سے حاصل کی، اور اسے یہ تعلیم پسند آئی لہٰذا وہ لوگوں کو نفس کشی اور سچائی کی تعلیم دیتے تھے۔ سکھوں کے تیسرے گورو امرداس نے سکھوں کی مذہبی اور معاشرتی کی تعلیم کے بارے میں پہلے قدم اٹھایا اور بابا گورونانک کی تعلیمات کی روح کو قائم رکھا۔ انہیں کے زمانہ میں امرتسر کے مذہبی مرکز کی بنیاد پڑی۔ اس طریقہ سے سکھوں کو اپنی قومی زندگی کے لیے ایک روحانی مرکز مل گیا۔ ان کے ایک گرو نے اپنے آپ کو ’’سچا بادشاہ‘‘ کا نام دیا جس سے اس کی سیاسی اقتدار کی ہوس کا پتہ چلتا ہے۔ جہانگیر کے حکم سے ان کے اس گرو کو گرفتار کر کے لاہور میں قید کر دیا گیا اور بعد میں شہزادہ خسرو کی مالی امداد کے الزام میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے جانشین نے اعلانیہ عملی مدافعت کا طرزِ عمل اختیار کر کے سکھوں کی فوجی زندگی کا آغاز کیا۔ انہوں نے جہانگیر کے خلاف دشمنی کے جذبات کو پالا اور اس سے انتقام لینے کے لیے ہرگووند پور کا ایک مضبوط قلعہ بنایا جہاں سے نکل کر وہ میدانی علاقوں کو تاخت و تاراج کرتے۔ آخر جہانگیر نے انہیں قلعہ گوالیار میں قید کر دیا لیکن پھر تھوڑے ہی عرصے کے بعد انہیں رہا کر دیا۔ جہانگیر کے انتقال اور شاہ جہان کی تخت نشینی کے فوراً بعد انہوں نے کھلم کھلا

سرکشی اور بغاوت کا روپ دھار لیا۔ اور حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور 1645ء میں انتقال کیا۔

شاہ جہاں کے بعد اورنگ زیب مسند حکومت پر بیٹھا تو 1664ء میں اورنگ زیب نے انہیں موت کی سزا دے دی۔ گورو تیغ بہادر کے قتل کی ذمہ داری صرف اورنگزیب پرنہیں بلکہ اس میں ان کے مخالفوں کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ان کی موت کے بعد ان کے بیٹے گووند رائے کو گورو تسلیم کیا گیا۔ انہوں نے صرف اپنے باپ کے انتقام کی خاطر سکھوں کو ایک جنگ جو قوم بنا دیا اور انہیں ایک قوم کی صورت میں منظّم کیا۔ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد اس کے جانشین بہادر شاہ اول نے گورو کے ساتھ مصالحت اور مفاہمت کی کوشش کی اور انہیں دکن کی فوجی کمان دے دی لیکن اکتوبر 1708ء میں ایک افغان ملازم کے زخم سے انہوں نے انتقال کیا۔ انہوں نے کسی کو اپنا جانشین نامزد نہ کیا اور اپنے ماننے والوں کو حکم دیا کہ گرنتھ کو وہ اپنا آئندہ گورو اور اللہ تعالیٰ کو اپنا واحد محافظ تصور کریں۔

ہر گووند رائے تو اس دنیا سے چلے گئے اور انہوں نے کسی کو اپنا جانشین نہ بنایا لیکن ایک کشمیری راجپوت سکھ مت اختیار کر کے سکھوں کا فوجی قائد بن گیا۔ اس نے اپنے فوجی قائد ہونے کو غلط استعمال کیا اور پنجاب میں وسیع پیمانے پر راہزنی اور ڈاکہ زنی کی وارداتیں شروع کر دیں۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد چونکہ سلطنت مغلیہ پر بہت جلد زوال آنا شروع ہو گیا، اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سکھوں نے اپنی طاقت میں اضافہ کر لیا۔ بندہ بیراگی نے مسلمانوں کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا اور ہزاروں کی تعداد میں انہیں بے رحمی سے قتل کیا۔ 1710ء میں اس نے سرہند پر دھاوا بول دیا اور قصبہ کے لوگوں پر بے پناہ ظلم ڈھائے۔ بہادر شاہ نے پنجاب کا رخ کیا اور بندۂ بیراگی کو شکست دی، لیکن بندہ پہاڑوں میں چھپ گیا۔ فرخ سیر کی تخت نشینی کے بعد بندہ بیراگی نے پھر دہشت گردی شروع کر دی، آخر کار اسے 1716ء میں گرفتار کر لیا گیا اور دہلی لا کر اسے قتل کر دیا گیا۔

سلطنت مغلیہ کے زوال کی رفتار بہت تیز تھی۔ پنجاب کی حکومت احمد شاہ

ابدالی کے پے در پے حملوں کی وجہ سے بہت کمزور ہوگئی تھی لہٰذا سکھوں کو دوبارہ اٹھنے کا موقع مل گیا اور انہوں نے احمد شاہ درانی کے فرزند شہزادہ تیمور کو نہ صرف لاہور سے نکال دیا بلکہ لاہور پر قبضہ بھی کرلیا اور ان کے فوجی سردار جسا سنگھ کلال نے اپنے نام کا سکہ بھی جاری کر دیا، لیکن 1758ء میں رگھوبا کے زیر کمان مرہٹوں کی آمد پر وہ لاہور سے نکل گئے۔ پھر احمد شاہ نے 1762ء میں لدھیانہ میں سکھوں کو شکست فاش دی، لیکن احمد شاہ کے جانے کے بعد 1763ء میں سکھوں نے سرہند کو تاخت و تاراج کر کے اور ایک بار پھر لاہور پر قبضہ کر کے خالصہ حکومت کا اعلان کر دیا۔ اور مسلم عوام سے نفور اور ان سے برسرپیکار ہو گئے، خصوصی طور پر اٹھارویں صدی کے وسط میں بڑے شہروں کے پرامن شہریوں کے لیے ایک دہشت انگیز طاقت میں تبدیل ہو گئے۔ چنانچہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں تو مساجد اور مقابر کی بہت بے حرمتی کی گئی اور مسلمانوں کی عبادات میں خلل ڈالا گیا، جس کے بارے میں اقبال نے کہا ؂

خالصہ شمشیر و قرآں را ببرد
اندراں کشور مسلمانی بمرد

آخر حضرت سید احمد شہید نے 1830 میں رنجیت سنگھ کی فوجی حکومت کے خلافت علم جہاد بلند کیا۔

3- جاٹ:

تیسری جنگ جو طاقت اس زمانہ میں جاٹوں کی تھی۔ جاٹ نہ تو مرہٹوں کی طرح کوئی منظم فرقہ تھے اور نہ ہی سکھوں کی طرح کوئی مذہبی گروہ تھے لیکن مغلیہ سلطنت کی کمزوری اور سیاسی انتشار کی وجہ سے یہ ایک تخریبی اور انتشار انگیز طاقت بن گئے جن کا مقصد کوئی حکومت قائم کرنا یا کوئی سیاسی انقلاب لانا نہیں تھا بلکہ اپنے اقتصادی مقاصد کی تکمیل تھی۔ جمنا کے جنوبی علاقہ میں آگرہ سے دہلی تک جاٹ آباد تھے۔ اس علاقہ میں انہوں نے مرکزی حکومت کا ناک میں دم کر رکھا تھا، چنانچہ دہلی سے آگرہ نقل و حرکت میں نہ صرف عوام کو بلکہ فوجی آمد و رفت میں بھی بڑی احتیاط برتنی پڑتی تھی۔

بات یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ پرانی دہلی تک بھی قتل و غارت کرنے لگے۔ چنانچہ دہلی کے باشندے گھبراہٹ اور پریشان حال نظر آتے تھے۔ دہلی کے سومیل پر جاٹوں کا عمل دخل تھا، حالات نہایت پریشان کن صورت اختیار کر چکے تھے۔ ان کی قیادت اس زمانہ میں راجہ سورج مل کے ہاتھ میں تھی جو بڑا ہوشیار اور کایاں آدمی تھا، اس نے آگرہ سے مرہٹہ سردار کو نکال دیا، میوات پر قبضہ کرلیا اور چار قلعے نہایت مضبوط اور مستحکم بنائے۔ آخر نجیب الدولہ نے اپنی حسن تدبیر اور بلوچوں کی مدد سے جاٹوں پر فتح حاصل کی۔ راجہ سورج مل مارا گیا۔ اس کے بعد جاٹوں کی ریاست میں بہت جھگڑے اور تنازعات اٹھ کھڑے ہوئے۔ سورج مل کے دو بیٹے مارے گئے۔ تیسرا بیٹا رنجیت سنگھ راجہ ہوا۔ اس کے عہد میں جاٹوں کی سلطنت کا بڑا عروج تھا۔ ان کی حکومت کی آمدنی دو کروڑ روپے تھے اور ساٹھ ہزار فوج ان کے پاس تھی۔

فتنہ سامانیاں:

ان تینوں فتنہ انگیز اور فتنہ زا طاقتوں نے روزانہ حملہ کر کے اہل دہلی کو پریشان کر رکھا تھا۔ اور حکومت کی طرف سے حفاظت اور دفاع کی ہر قسم کی طاقت اور اہلیت کے فقدان سے دہلی ایک ایسا پرثمر اور غیر محفوظ درخت بن گیا تھا جس پر ہر طرف سے غول بیابانی حملہ کرتا اور اس کو برگ و بار سے محروم کر دیتا۔ دہلی کے باشندے جو علم، زبان، اخلاق، شرافت اور عادات واطوار میں قریباً تمام ہندوستان میں اپنا ایک معیار رکھتے ہیں اور لوگوں کے لیے ایک مثال کا درجہ رکھتے تھے، حملہ آوروں کے لیے خوان یغما بن گئے تھے۔ بدامنی، بے اطمینانی اور بے یقینی ان کا روز کا معمول بن چکے تھے۔ چنانچہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں قدس سرہ نے اپنے مختلف مکتوبات میں اس بے اطمینانی اور پریشانی کا تذکرہ بھی کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ پریشانی اور بدامنی غضب الٰہی کا شاخسانہ معلوم ہوتی ہے اور اس پر مزید یہ کہ سلطنت کا کوئی نظم ونسق باقی نہیں رہا۔ ہر طرف سے فتنہ نے دہلی کا رخ کیا ہوا ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کلمات طیبات، مکتوبات: ص ۴۰، ۴۵، ۶۸)

بداعتقادی اور بدعت وشرک کا زور:

ان سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی پستی سے زیادہ خطرناک اور خدا کی نصرت سے محروم اس زمانہ کے مسلمانوں کی ضعیف الاعتقادی اور شرک و بدعات سے ملوث زندگی تھی۔ بدعات کا ہر سمت زور تھا۔ ہندوؤں اور شیعوں کے بہت رسوم و عادات ان کی زندگی کا حصہ بن چکے تھے۔ قبر پرستی، مشائخ کے لیے سجدہ تعظیمی، قبروں پر چادریں چڑھانا، منتیں ماننا، مزارات کا طواف، شیخ سدّو کا بکرا، سید احمد کبیر کی گائے، غازی میاں کے جھنڈے، محرم کے تعزیے، مختلف بیماریوں کو دفع کرنے میں ارواح خبیثہ اور بعض اوقات دیوی دیوتاؤں کی رضا جوئی غرضیکہ عقائد فاسدہ اور رسوم جاہلیت کی پابندیوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جو پورے مسلم معاشرہ میں جاری وساری تھا۔

ان سب امراض کا علاج حضرت شاہ ولی اللہؒ نے قرآن حکیم کے مطالعہ اور تدبر اور اس کے فہم کو قرار دیا۔ حقیقت توحید اور حقیقت شرک کو ظاہر کرنے کے لیے اسلام کی پوری تاریخ دعوت اور سرگزشت اصلاح وتجدید گواہ ہے کہ قرآن حکیم سے بہتر اور کوئی شئی نہیں ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہؒ کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر نے موضح القرآن کے مقدمہ میں نہایت دل نشین انداز میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ”بتانے والا بہتیرا بتائیں جیسا خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں آپ بتایا ہے ویسا کوئی نہیں بنا سکتا اور جیسا اثر اور راہ پانا خدا کے کلام میں ہے، کسی کے کلام میں نہیں۔“

حجاز مقدس کے قیام کے زمانہ میں برصغیر پاک و ہند کی اس دینی صورت حال اور اس کے قرآنی اور اسلامی تعلیمات سے بُعد اور منافات کا احساس شدت سے پیدا ہوا چنانچہ حجاز سے واپسی پر آپ نے اس زمانہ کی رائج زبان فارسی میں قرآن حکیم کا ترجمہ ”فتح الرحمٰن“ کے نام سے کیا۔ شاہ ولی اللہؒ نے یہ کام 10 ذی الحجہ 1150ھ کو شروع کیا اور 1151ھ میں اس کو مکمل کیا۔

اصلاح عقائد اور توحید خالص کی دعوت کے سلسلہ میں حضرت شاہ صاحبؒ

نے صرف قرآن حکیم کے ترجمہ اور درس قرآن ہی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ ایک عالم و محقق کے انداز سے آپ نے عقیدہ توحید کی علمی تنقیح و تحقیق کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا۔ آپ کی فکر رسا نے یہ معلوم کیا کہ اس امت میں قرون مشہود لہا بالخیر کے گزرنے، نئے نئے ملکوں کے فتح ہونے، وہاں کی آبادی کے قبول اسلام، غیر مسلم اقوام کی مخالطت و مجاورت اور مرور زمانہ کے اثر سے عوام کے ایک بڑے طبقہ میں یہ مشرکانہ عقائد اور اعمال داخل ہو گئے۔ یہ عقائد کیوں اور کہاں سے داخل ہوئے، اس کی وجہ توحید کی حقیقت اور مشرکین جاہلیت اور اہل عرب کے خدا کے خالق کائنات اور مدبر امور عظام ہونے کے بارے میں عقیدہ کو صحیح طور پر نہ سمجھا ہے۔ عوام کے ایک بڑے طبقہ نے شرک کی حقیقت یہ سمجھی کہ کسی زندہ یا فوت شدہ ہستی کو اللہ تعالیٰ کا بالکل ہمسر اور ہم پایہ بنا لیا جائے۔ خدا تعالیٰ کی تمام صفات اور افعال اس کی طرف منسوب کیے جائیں۔ باقی اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کا اس کے کسی مقبول بندہ کی طرف منسوب کرنا اور بعض ان افعال کا جو خدا تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں، ان سے صدور ماننا، اللہ کا اپنی مرضی سے اپنے بعض اختیارات ان کے سپرد کر دینا اور قدرت کے بعض کارخانوں کا ان سے متعلق ہو جانا یہ سب کچھ توحید کے منافی اور شرک کے مترادف نہیں ہیں۔ اس قسم کے التباسات اور مغالطات کی وجہ سے اس امت کی ایک کثیر تعداد شرک کی اس ارض ممنوعہ میں جا پڑی تھی اور اس سرحدی لکیر کو پار کر گئی تھی جو شرک اور توحید کی حد فاصل ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی مختلف کتابوں میں اسلام کے ان بنیادی عقائد کی صحیح تفصیل و تشریح کر کے بتایا کہ یہ سب باتیں اسلام کے منافی ہیں، اور آپ نے عقیدہ توحید کی تجدید، اس کی تنقیح و توضیح اور اس کی اشاعت و ترویج اور اس سلسلہ کی غلط فہمیوں کو رفع کیا اور امت کو کتاب و سنت کی روشنی اور صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین کے مسلک کے مطابق چلانے کی کوشش کی اور ایک حدیث کی جو تشریح آئی ہے وہ ان پر پورے طور پر صادق تھی۔

﴿ینفون عن ھذا الدین تحریف الغالین، وانتحال المبطلین وتاویل الجاھلین﴾

''وہ غالی لوگوں کی تحریف، باطل پرستوں کے غلط انتساب اور جاہلوں کی تاویلات سے دین کی حفاظت کرتے ہیں۔''

چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے رسالہ ''وصایا'' میں لکھا ہے کہ

''اس فقیر کی پہلی وصیت یہ ہے کہ اعتقاد و عمل میں کتاب وسنت کو مضبوط ہاتھوں سے تھاما جائے اور ہمیشہ ان پر عمل کیا جائے۔ عقائد میں متقدمین اہل سنت کے مذہب کو اختیار کیا جائے اور صفات و آیات متشابہات کے سلسلہ میں سلف نے جہاں تفصیل وتفتیش سے کام نہیں لیا، ان سے اعراض کیا جائے اور معقولیان خام کی تشکیکات کی طرف التفات نہ کیا جائے۔''

(المرأۃ الوضیۃ فی النصیحۃ والوصیۃ: ص۳)

مختصر یہ کہ دین کے عقائد اور اعمال کے بارے میں حضرت شاہ صاحبؒ نے تجدیدی کارنامے انجام دیئے اور اس زمانہ میں جس قدر مذہبی فتنے مسلمانوں کی صفوں میں تشتت و انتشار پیدا کر رہے تھے، ان کے بارے میں نہایت احسن طریق سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ لیکن سیاسی امور کے بارے میں بھی آپ خاموش تماشائی نہیں بنے رہے۔ تجدید دین کے بارے میں تو آپ مصائب و حوادث کے گرد و غبار بلکہ ان کی موسلا دھار بارش کے درمیان زیر آسمان بیٹھے ہوئے تصنیف و تحقیق اور درس و تعلیم میں اس طرح منہمک رہے کہ نہ ہوا کے تیز جھونکے سے آپ کی زیر تسوید کتاب کا کوئی ورق الٹتا تھا اور نہ بارش کا کوئی قطرہ اس کے کسی نقش کو مٹاتا تھا۔ وہ ''زمانہ باتو نہ سازد تو با زمانہ ستیز'' کے اصول پر کاربند تھے۔ وہ ان حالات کو بھی تبدیل کرنے، اس ملک میں مسلمانوں کے اقتدار کو دوبارہ واپس لانے اور ایک فرض شناس، احکام شریعت پر عمل کرنے والی، عام شہریوں کی عزت و ناموس کی محافظ اور انتشار انگیز طاقتوں کو ختم کرنے والی مستحکم اور خوش حال حکومت کے قیام کے خواہاں اور ساعی تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بھی ان کا کردار قائدانہ تھا جو بڑے سے بڑا سیاسی شخص ہی ادا کر سکتا ہے۔ آپ نے اپنے علمی مشاغل اور احیاء و تجدید کی مساعی اور مصروفیات کے ساتھ ساتھ ایسے سیاسی تدبر

اور بلند نگاہی سے کام لیا کہ ان کو دیکھ کر امام ابن تیمیہؒ کی یاد آ جاتی تھی۔ اگر مغلوں میں کچھ بھی صلاحیت یا ارکان حکومت میں تھوڑی سی بھی ہمت اور سیاسی شعور ہوتا تو برصغیر پاک و ہند نہ صرف ملکی انتشار پسندوں اور تنگ نظروں سے محفوظ ہو جاتا بلکہ غیر ملکی طاقت انگریزوں سے بھی محفوظ ہو جاتا جنہوں نے مغلیہ سلطنت کو کمزور سمجھ کر اپنے قدم جما لیے تھے، اور ملک کے تمام وسائل اور قوت پر قبضہ کر لیا تھا اور اسی کی وجہ سے دنیا کی پوری سیاست پر اثر انداز ہوئے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا اضطراب:

حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے سن شعور کی ابتداء میں اورنگ زیب کی سلطنت کے اقبال اور دبدبہ کے آثار دیکھے تھے اور اس سے پہلے کے بادشاہ کی شان وشکوہ اور جاہ وجلال کے قصے اپنے بزرگوں سے ضرور سنے ہوں گے۔ پھر انہوں نے اپنی آنکھوں سے وہ طوائف الملوکی بھی دیکھی جو اورنگ زیب کے جانشینوں کے درمیان واقع ہوئی۔ طوائف الملوکی کے اس زمانہ میں ملک کی بدنظمی، لوگوں کی عزت و آبرو کا عدم تحفظ اور نادر شاہ کے ہاتھوں انسانی خون کی ارزانی، شعائرِ اسلام کی بے حرمتی اور ان کے جان و مال کا عدم تحفظ، راستوں کی بدامنی، ان سب چیزوں کو شاہ صاحبؒ نے اپنے عنفوان شباب میں دیکھا۔ کہاں وہ شاہان مغلیہ کا جاہ و جلال اور کہاں یہ ذلت و خواری۔ ان حالات کو دیکھ کر آپ کا دردمند دل خون کے آنسو رویا، اور خون کے یہ قطرے ان کے گوہر بار قلم سے ان کے خطوط میں الفاظ کی شکل میں ٹپک پڑے جو آپ نے اس زمانہ میں مختلف با اثر لوگوں اور اہل دول کو لکھے۔ چنانچہ ایک خط میں انہوں نے بعض حضرات کے قیاس کے مطابق احمد شاہ ابدالی کو لکھا جس میں سورج مل جاٹ کی چیرہ دستیوں اور اسلام کی غربت کا حال یوں لکھا:

> ”اس کے بعد سورج مل کی شان وشوکت ترقی حاصل کر گئی۔ دہلی سے دو کوس کے فاصلہ سے آگرہ کے آخر تک طول میں اور میوات کے حدود سے فیروز آباد اور شکوہ آباد تک عرض میں سورج مل کا

قبضہ ہو گیا۔ اب حالت یہ ہے کہ کسی کی طاقت نہیں کہ وہاں اذان و نماز جاری کر سکے۔'' (واذان وصلاۃ مقدور کسے نہ کہ برپا دارد)

(شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات، خلیق احمد نظامی: ص ۱۵)

اپنے اسی مکتوبات میں حضرت شاہ صاحبؒ ایک مردم خیز شہر بیانہ کی ویرانی اور تاخت و تاراجی کا رونا ان الفاظ میں روتے ہیں:

''شہر بیانہ جو کہ اسلام کا ایک قدیم شہر تھا اور گذشتہ سات سو سال سے علماء اور مشائخ یہاں اقامت پذیر تھے، اس شہر پر قہراً و جبراً قبضہ کر لیا گیا اور مسلمانوں کو ذلت و خواری کے ساتھ وہاں سے نکال دیا گیا۔'' (ص ۹)

حکومت کے ملازمین جن کی تعداد ایک لاکھ سے اوپر تھی، ان کی خستہ حالی کا ذکر کرتے ہوئے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''جب شاہی خزانہ ہی نہ رہا اور نقدی بھی موقوف ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ملازمین تتر بتر ہو گئے اور کاسۂ گدائی اپنے ہاتھ میں لے لیا اور سلطنت کا بجز نام کے اور کچھ باقی نہ رہا۔'' (ص ۱۱)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط اس زمانہ کا ہے جب نادر شاہ شاہان مغلیہ کا صدیوں سے جمع کردہ خزانہ سمیٹ کر ایران لے گیا تھا جس میں تختِ طاؤس اور کوہ نور ہیرا بھی، اور اس کے جانے کے بعد خزانہ بالکل خالی ہو گیا، لہٰذا شاہی ملازمین کو تنخواہیں کہاں سے ملیں، اس لیے انہوں نے کاسۂ گدائی ہاتھ میں پکڑ کر مانگنا شروع کر دیا۔ اس قابل رحم حالت کا تذکرہ اس خط میں کیا گیا ہے۔ ویسے ایک جگہ مسلمانوں کے مختلف طبقات کا حال لکھتے ہوئے ان کے قلم سے یہ جملہ بھی نکل گیا۔

بالجملہ این جماعت مسلمین قابل ترحم اند (ص ۱۱)

مختصر یہ کہ مسلمانوں کی جماعت قابل رحم ہے۔

کفار کا مسلمانوں پر اس قسم کا غلبہ اور مسلمانوں کی بے کسی اور بے بسی کو دیکھ کر حضرت شاہ صاحبؒ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اگر غلبہ کفر معاذ اللہ اسی انداز پر رہا تو مسلمان اسلام کو فراموش کر دیں گے اور تھوڑا ہی زمانہ گزرے گا کہ یہ مسلم قوم ایسی قوم بن جائے گی کہ اسلام اور غیر اسلام میں تمیز نہ کر سکے گی۔" (ص ۱۲)

حضرت شاہ صاحبؒ نے نہ صرف بیرونی حکمرانوں کو خط لکھے جن میں احمد شاہ ابدالی ایک اہم شخصیت ہے، ان کے علاوہ حضرت شاہ صاحبؒ نے مغل بادشاہوں اور امرائے سلطنت کو بھی وقتاً فوقتاً خطوط لکھے جن میں ان کی اصلاح کے لیے مختلف باتیں تجویز کیں، لیکن افسوس کا مقام ہے کہ کسی نے آپ کی ان باتوں کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ آپ نے ہر موقع پر ارباب اقتدار کو حکیمانہ اور دانشمندانہ مشورے دیئے جو تاریخ و سیاست اور نظم مملکت کے بارے میں عمیق و وسیع مطالعہ پر مبنی تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے ایک مغل بادشاہ (جس کا نام معلوم نہیں ہو سکا) کو خط لکھا جس میں اس کو اصلاح احوال اور تقویت سلطنت پر مبنی نصائح تھیں۔ آپ نے لکھا:

"اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے امید ہے کہ اگر ان کلمات کے مطابق آپ عمل کریں گے تو امور سلطنت کی تقویت، حکومت کی بقا اور عزت و منزلت کی بلندی ظہور پذیر ہو گی شاعر کہتا ہے

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استاذ ازل گفت ہماں می گویم

(شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، مکتوب اول)

اس خط میں جو بادشاہ اور ارباب اقتدار اور امراء حکومت کو لکھا گیا چند سیاسی اور انتظامی مشوروں کے بعد جن کے بغیر قیام سلطنت ناممکن ہے، آخر میں لکھا کہ قاضی اور محتسب ایسے لوگوں کو بنایا جائے جن کو رشوت کی تہمت نہ لگی ہو اور ان کا تعلق عقیدہ کے لحاظ سے اہل سنت والجماعت سے ہو۔ علاوہ ازیں ائمہ مساجد کو تنخواہ اچھے طریقہ سے دی جائے، نماز باجماعت کی حاضری کی تاکید کی جائے اور اس بات کا پورے اہتمام کے ساتھ اعلان کیا جائے کہ رمضان المبارک کی بے حرمتی نہ ہو۔ آخر میں لکھا کہ بادشاہ اسلام اور امرائے عظام ناجائز عیش و عشرت میں مشغول نہ ہوں۔ گذشتہ گناہوں سے

سچے دل سے توبہ کریں اور آئندہ گناہوں سے اجتناب کرتے رہیں۔ اگر ان باتوں پر عمل کیا جائے گا تو مجھے امید ہے کہ بقائے سلطنت، تائید غیبی اور نصرت الٰہی میسر ہوگی۔"
وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب."

(شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات: ص ۸۰)

اس زمانہ میں آج کل کی جمہوریت کی طرح نہ تو سیاسی پارٹیاں ہوتی تھیں اور نہ ہی بھوک ہڑتال اور احتجاج اور پہیہ جام ہڑتالیں اور نہ ہی سڑکوں پر جلوس، بلکہ اس زمانہ میں بادشاہ وقت خواہ کتنا ہی عیش وعشرت کا دلدادہ ہو، اس کا بزرگوں سے تعلق ضرور ہوتا تھا۔ ان کی باتیں غور سے سنتا اور کوشش کی بھی کہ ان پر عمل کرے، یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی بعض ماحولیاتی اور معاشرتی مجبوریوں یا اپنی بعض بری عادتوں کی وجہ سے ان پر عمل نہ کر سکتا، لیکن وہ آج کل کے حاکموں اور ایوان اقتدار پر غاصبانہ قبضہ کیے ہوئے بزرجمہروں کی طرح علماء اور مشائخ کو جاہل اور دقیانوس نہ کہتا۔ اصل بات یہ ہے کہ جولوگ آج علماء کو دقیانوس اور جاہل کہتے ہیں، انہوں نے علماء کو دیکھا ہی کب ہے۔ صرف انگریزی زبان نے ان کی جہالت پر پردہ ڈالا ہوا ہے ورنہ یہ لوگ امور سیاسیہ اور انتظامیہ میں علماء سے مقابلہ کر کے دیکھ لیں۔ یہ بڑی بڑی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ ہونے کے دعویدار علماء کے مقابلہ میں امور جہانداری میں ایک منٹ نہیں چل سکیں گے۔ ایک شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہی کو لے لیں مسجدوں میں بیٹھ کر علماء کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا، پھر دو تین برس حجاز میں گزارے۔ ہندوستان میں جو زندگی گزاری وہ بھی امن وامان کی زندگی نہ تھی۔ کہیں آئے روز مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں کے حملوں کا خطرہ اور آخر میں نادر شاہی نے اپنی بہیمانہ سفاکی کا مظاہرہ کیا اور ایسا مظاہرہ کیا کہ سوائے امریکہ کی ویٹ نام، افغانستان اور عراق وغیرہ میں کارپیٹنگ بمبارڈ منٹ کے اور کہیں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کے ایک نامور معاصر اور سلسلۂ نقشبندیہ کے گل سرسبد مرزا جان جاناں اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

از تشویشات ہر روزہ دہلی تنگ آمدہ ام۔ (کلمات طیبات مکتوب: ۴۰)

دہلی کے روزمرہ کے ہنگاموں سے تنگ آ گیا ہوں۔

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں کہ

از ہر طرف فتنہ قصد دہلی می کند۔ (مکتوب:۵۴)

ہر طرف سے فتنہ دہلی کا رخ کرتا ہے۔

لیکن اتنے خطرناک ماحول میں رہنے کے باوجود اس دور میں حضرت شاہ صاحبؒ نے کہ ابھی انقلاب فرانس 1789ء جس کو دنیا کا ایک عجوبہ کہا جاتا ہے اور ہے بھی حقیقتاً وہ عجوبہ ہی، نصف صدی بعد آنے والا تھا، اور نظریہ کمیونزم کا معلم اول کارل مارکس کی پیدائش میں ابھی پوری ایک صدی باقی تھی، اور اس سے قریباً چالیس سال پہلے جب کہ یورپ میں مشینوں اور کلوں کا آغاز ہوا، اقتصادیات اور معاشیات کے بارے میں کچھ اصول قائم کیے جن کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کارل مارکس اور اس کا نفس ناطقہ اینگلس بھی وہ اصول دنیا کے سامنے پیش نہ کر سکے۔ انہوں نے کمیونزم کے فلسفہ میں جو کچھ کہا وہ ایک صدی کے اندر فیل ہو گیا لیکن حضرت شاہ صاحبؒ نے قرآن وسنت کی روشنی میں اقتصادیات کے بارے میں جو اصول بتائے وہ تا قیام قیامت لوگوں کے لیے مفید رہیں گے وہ اصول حسب ذیل ہیں:

1- دولت کی اصل بنیاد محنت ہے۔ مزدور اور کاشت کار قوت کاسبہ ہیں۔ باہمی تعاون، مدنیت (شہریت) کی روح رواں ہے۔ جب تک کوئی شخص ملک اور قوم کے لیے کام نہ کرے ملک کی دولت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔

2- جوا، سٹہ اور عیاشی کے تمام اڈے ختم کیے جائیں جن کی موجودگی میں تقسیم دولت کا صحیح نظام قائم نہیں ہو سکتا، اور بغیر اس کے کہ قوم اور ملک کی دولت میں اضافہ ہو دولت بہت سی جیبوں سے نکل کر ایک طرف سمٹ آتی ہے۔

3- مزدور، کاشتکار اور جو لوگ ملک اور قوم کے لیے دماغی کام کریں، دولت کے اصل مستحق ہیں۔ ان کی ترقی اور خوش حالی ملک اور قوم کی ترقی اور خوش حالی ہے۔ جو نظام ان قوتوں کو دبائے وہ ملک کے لیے خطرہ ہے، اس کو ختم ہو جانا چاہیے۔

4- جو معاشرہ محنت کی صحیح قیمت ادا نہ کرے، مزدوروں، کاشتکاروں پر بھاری ٹیکس لگائے، وہ قوم کا دشمن ہے، اس کو ختم ہو جانا چاہیے۔

5- ضرورت مند مزدور کی رضامندی قابل اعتبار نہیں جب تک اس کی محنت کی وہ

قیمت ادا نہ کی جائے جو امداد باہمی کے اصول پر لازم ہوتی ہے۔

-6 جو پیداوار یا آمدنی تعاون باہمی کے اصول پر نہ ہو، وہ خلاف قانون ہے۔

-7 کام کے اوقات محدود کیے جائیں۔ مزدوروں کو اتنا وقت ضرور ملنا چاہیے کہ وہ اخلاقی اور روحانی اصلاح کر سکیں، اور ان کے اندر مستقبل کے متعلق غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔

-8 تعاون باہمی کا بہت بڑا ذریعہ تجارت ہے، لہٰذا اس کو تعاون کے اصول پر ہی جاری رہنا چاہیے۔ لہٰذا جس طرح تاجروں کے لیے جائز نہیں کہ وہ بلیک مارکیٹ یا غلط قسم کے کمپی ٹیشن (Competition) سے روح تعاون کو نقصان پہنچائیں۔ ایسے ہی حکومت کے لیے درست نہیں کہ بھاری ٹیکس لگا کر تجارت کے فروغ و ترقی میں رکاوٹ پیدا کرے یا رخنہ ڈالے۔

-9 وہ کاروبار جو دولت کی گردش کو کسی خاص طبقہ میں منحصر کر دے، ملک کے لیے تباہ کن ہے۔

-10 وہ شاہانہ نظام زندگی جس میں چند اشخاص یا چند خاندانوں کی عیش و عشرت کے سبب سے دولت کی صحیح تقسیم میں خلل واقع ہو، اس کا مستحق ہے کہ اس کو جلد از جلد ختم کر کے عوام کی مصیبت ختم کی جائے اور اس کو مساویانہ نظام زندگی کا موقع دیا جائے۔ (علمائے ہند کا شاندار ماضی: جلد۲ص ۷۔۸)

بات اس بارے میں کچھ طویل ہو گئی ہے۔ بتانا یہ چاہتا تھا کہ آج علماء کو دقیانوس اور جاہل کہا جاتا ہے کہ علماء اور مشائخ کی نظر اس قدر دور بین ہوتی ہے اس کی ایک مثال شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ تھے۔ پھر ان کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور موجودہ زمانہ میں ان کے ماننے والے بے شمار عالم موجود ہیں جن کے سامنے موجودہ ایوان اقتدار کے بڑے بڑے لوگ طفل ابجد معلوم ہوتے ہیں۔ صرف ان کی انگریزی نے ان کی جہالت کو چھپایا ہوا ہے۔

جس زمانہ کی بات ہو رہی ہے وہ زمانہ نہایت ہولنا کی کا زمانہ تھا جس میں مختلف فتنوں نے لوگوں کی زندگی کو اجیرن بنا رکھا تھا اور امن و سکون کی نعمت عظمیٰ ان سے چھین

رکھی تھی لیکن شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے معاصر حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ اور دوسرے کئی ایک علماء نہایت جمعیت خاطر اور نہایت اطمینان وسکون اور اہتمام وانصرام کے ساتھ درس وتصنیف، دعوت الی اللہ، تزکیۂ نفوس اور تربیت طالبین کرر ہے تھے۔ گویا کہ

ہوا ہے گو تندو تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان جیسے کئی علماء ایسے بھی تھے جو اس پرآشوب زمانہ میں ایک گوشۂ عافیت میں بیٹھے ہوئے علمی تحقیق، اخلاقی تربیت اور احیائے ملت کے کاموں میں ہمہ تن مصروف تھے۔ وگرنہ اس قسم کے پرآشوب زمانہ میں نہ تو جمعیت خاطر ہوسکتی ہے اور نہ ہی ذہنی سکون اور نہ ہی قلبی اطمینان، اور جب تک یہ سب کچھ میسر نہ ہو کوئی تحقیقی اور فکری کام نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اپنے ایک مضمون میں اس بات کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

"ایسے کم مصنف گزرے ہیں جن کی تصانیف میں ان کے زمانے کی روح نہ ہو، یا اس میں زبان ومکان کی جھلک نہ ہو، اور کم ازکم یہ کہ اپنے زمانہ کی علمی ناقدرشناسی اور اضطراب احوال کا ذکر نہ ہو، مگر شاہ صاحبؒ کی تصانیف کا یہ حال ہے کہ وہ زمان و مکان کی قید سے بالکل پاک اور گلہ و شکایت اور حرف و حکایت سے سراپا بے نیاز ہیں۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ کتابیں اس زمانہ میں لکھی گئی ہیں جب امن واطمینان اس ملک سے حرف غلط کی طرح مٹ گیا تھا۔ سارا ملک طوائف الملوکی، خانہ جنگی، سیاسی بدامنی اور ہر طرح کے شوروشر میں مبتلا تھا۔ دلی کی سیاسی مرکزیت مٹ چکی تھی۔ ہر شمشیر زن اپنی بادشاہی کا خواب دیکھ رہا تھا۔ سکھ ایک طرف، مرہٹے دوسری طرف، جاٹ تیسری طرف اور روہیلے چوتھی طرف، ملک میں ہر طرف اودھم مچا رہے تھے، اور نادرشاہ اور احمد شاہ جیسے پرجوش سپہ سالار خیبر کے دروازہ کے پاس کھڑے جب چاہتے تھے، آندھی کی

طرح آجاتے اور سیلاب کی طرح نکل جاتے تھے۔ اس درمیان میں دلی خدا جانے کتنی دفعہ لٹی اور کتنی دفعہ بنی، مگر اللہ رے دلی کے تاجدار علم کا امن و اطمینان کہ یہ سب کچھ آنکھوں کے سامنے ہوتا رہا مگر نہ دل کو اضطراب، نہ خیال کو انتشار، نہ قلم میں اضطرار، نہ زبان میں زمانہ کا گلہ نہ قلم سے بے اطمینانی کا اظہار، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلندی کے جس آسمان یا صبر و رضا کے جس لامکان میں تھے وہاں تک زمین کی آندھیاں نہیں پہنچیں اور زمان و مکان کی گردشیں وہاں اپنی کام نہیں کرتیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سچے اہل علم کی شان کتنی بلند، اور اصحاب تسلیم و رضا کا منصب کتنا اونچا ہے۔"

﴿الا بذکر اللہ تطمئن القلوب﴾ (الرعد:۲۸)

"ہاں اللہ کی یاد ہی سے دل اطمینان پاتے ہیں۔"

صحیح علم کی صحیح خدمت بھی ذکر اللہ کی دوسری شکل ہے، اس لیے اگر وہ بھی قلب میں اطمینان اور روح میں سکون پیدا کرے تو عجب نہیں، شاہ صاحب کی تصنیفات کے ہزاروں صفحے پڑھ جایئے، آپ کو یہ معلوم بھی نہ ہوگا کہ یہ بارہویں صدی ہجری کے پرآشوب زمانہ کی پیداوار ہے، جب ہر چیز بے اطمینانی اور بدامنی کی نذر تھی۔ صرف یہ معلوم ہوگا کہ علم و فضل کا ایک دریا ہے جو کسی شور وغل کے بغیر سکون و آرام کے ساتھ بہہ رہا ہے، جو زمان و مکان کے خس و خاشاک کی گندگی سے پاک وصاف ہے۔"

(مقالہ سید سلیمان ندوی مندرجہ شاہ ولی اللہ نمبر الفرقان: ص ۳۴۸۔۳۴۹)

بادشاہوں کو نصیحت:

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے قوموں کے عروج و زوال کا مطالعہ فرمایا ہوا تھا اور اس بارے میں ان کے قلم سے کئی قیمتی باتیں صفحہ قرطاس پر لکھی جا چکی تھیں۔ پھر خاندان مغلیہ کے عروج اور زوال دونوں کو آپ نے اپنی نظروں سے دیکھا تھا۔ اورنگ زیب

عالمگیر کے عروج کا زریں عہد بھی دیکھا اور محمد شاہ اور اس کے بعد آنے والوں کے زوال اور بے بسی کو بھی ملاحظہ کیا۔ مرہٹہ گردی، سکھ گردی، جاٹ گردی، روہیلہ گردی اور نادر شاہی کو بھی دیکھا تھا، اور عروج و زوال کی اس داستان سے انہوں نے قرآن و سنت کی روشنی میں وہ نتائج بھی اخذ کیے تھے جو بام عروج پر پہنچی ہوئی قوموں کو پستی کی اتھاہ گہرائیوں دھکیل دیتے ہیں۔ ان کے سامنے اس خاندان کی طویل موروثی سلطنت کا مزاج، بادشاہوں اور ان کے وزراء کی عیش و عشرت کی فراوانی، شہزادوں کی تعیّشانہ اور کاہلانہ زندگی اور مصاحبین اور مشیرانِ سلطنت کی کوتاہ نظری سب کچھ آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور دیکھ رہے تھے۔ آپ نے ایوان اقتدار میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو نہایت درد دل اور خلوص کے ساتھ سمجھایا، اگرچہ آپ کو کامیابی کی امید موہوم تھی، لیکن آپ نے ایک طبیب حاذق کی طرح اپنی نصیحتوں کے نسخہ جات کو مریض کی آخری سانس تک استعمال کرنے سے دریغ نہ کیا۔ آپ قلعہ معلیٰ کے حالات کو اچھی طرح جانتے تھے لیکن پھر بھی آپ نے ان کو اصلاح احوال، تقویت سلطنت اور خدا کی رحمت و نصرت کے حصول کے لیے ایسے حکیمانہ اور دانشمندانہ مشورے دیئے کہ اگر قلعہ معلیٰ کے باسی ان پر عمل کرتے تو ان کا کھویا ہوا جاہ و جلال یقیناً واپس آجاتا اور اس کی لڑکھڑاتی ہوئی حکومت مستحکم و مضبوط ہو جاتی اور ان کی شان و شوکت کا چراغ سحری نہ صرف قلعہ معلیٰ کو بلکہ پورے ہندوستان کو روشنی مہیا کرتا۔ شاہ صاحبؒ نے تو ایک مبلغ اور جید عالم دین اور امت کے مصلح اور مجدد کی حیثیت سے اپنا فریضہ ادا کر دیا لیکن ارباب اقتدار عیش و عشرت کی مستی میں کچھ اس قدر مدہوش ہو چکے تھے کہ ان کے کان بہرے، ان کی آنکھوں بصیرت و بصارت سے محروم اور ان کے دلوں پر غلاف چڑھ چکے تھے جو آپ کی باتوں کو خانۂ دل میں داخل نہیں ہونے دیتے تھے۔ آپ نے سرکار و دربار سے اپنے اسلاف کی طرح کوئی تعلق نہیں رکھا کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ "بئس الفقیر علیٰ باب الامیر" لیکن ان کی زبان ان لوگوں کی نصائح اور ان کا دل حکومت وقت، ارباب اقتدار کی صحیح راہ نمائی کے لیے دعا میں مشغول تھا اور انہوں نے اپنی زبان و قلم سے صحیح مشورہ دینے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔

آپ کے مکتوبات سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوا کہ بادشاہ وقت اچانک ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور دعا کی درخواست کی۔ آپ نے اس کے لیے دعا بھی کی اور پند و نصائح بھی کیں، لیکن بادشاہ لوگ دعا کی درخواست تو کر لیتے ہیں لیکن پند و نصائح سننے کو اپنی توہین سمجھتے ہیں، اور توہین نہ بھی سمجھیں تو ان پر عمل کرنا ان کے لیے مشکل ہوتا ہے کیونکہ تعیشانہ زندگی نے عادتیں بگاڑ دی ہوتی ہیں۔ یہ لوگ اکثر بزرگوں کو کم اور اپنے آپ کو زیادہ دھوکہ دینے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کی درخواست کرتے ہیں، اور ان کی یہ درخواست محض ایک تکلف ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ نے بمبئی کے ایک سیٹھ سے پوچھا کہ آپ کے پاس بے شمار مال و دولت ہے جس کی وجہ سے آپ پر حج بیت اللہ فرض ہے۔ کیا آپ نے حج کر لیا ہے؟ سیٹھ صاحب نے جواب دیا: ”حضرت! حج تو ابھی نہیں کیا، بس آپ دعا فرمائیں۔“ حضرت حاجی صاحبؒ نے جواب دیا کہ دعا تو میں ضرور کروں گا مگر ایک شرط کے ساتھ، اور وہ شرط یہ ہے کہ بمبئی کی بندرگاہ پر جب جدّہ جانے والا جہاز آئے تو میں آپ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر آپ کو اس جہاز میں ڈال دوں اور پھر اللہ سے دعا کروں کہ وہ آپ کو بخیر و عافیت جدّہ کی بندرگاہ پر پہنچا دے۔“ آپ نے سیٹھ صاحب سے فرمایا: ”بندۂ خدا! دل تو آپ کا حج کرنے کو چاہتا نہیں اور آپ مجھے صرف دعا پر ٹرخا رہے ہیں۔“

ایسے ہی بادشاہ نے (جس کے نام کی خط میں وضاحت نہیں ہے) حضرت شاہ ولی اللہؒ سے دعا کی درخواست کی۔ حضرت شاہ صاحب اپنے ایک خط میں اپنے مسترشد اور برادر نسبتی محمد عاشق پھلتیؒ کو تحریر فرماتے ہیں:

> ”جمعرات کے روز بادشاہ حضرت نظام الدین اولیاؒ اور دوسرے مشائخ کے مزارات کی زیارت کرنے کے لیے سوار ہو کر گیا تھا۔ مجھے پہلے سے اطلاع دیئے بغیر کابلی دروازے سے سادہ تخت پر سوار ہو کر غریب خانہ پر وارد ہوا۔ فقیر کو کوئی اطلاع ہی نہ تھی۔ مسجد میں بوریوں پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس قدر توقیر سلطان کرنا لازم ہوئی

کہ فقیر جس مصلی پر بیٹھتا ہے اور نماز ادا کرتا ہے اس کو اس طریقہ سے بچھا دیا گیا کہ اس کی ایک جانب میں بیٹھ گیا اور دوسری جانب بادشاہ۔ بادشاہ نے اول مصافحہ کیا بڑی تعظیم کے ساتھ بعد ازاں کہا: ''میں مدت سے آپ کی ملاقات کا مشتاق تھا لیکن آج اس جوان کی راہنمائی میں یہاں پہنچا ہوں۔ اشارہ وزیر کی طرف کیا، پھر کہا کہ غلبۂ کفر اور رعیت تفرق و انتشار اس درجہ پر پہنچ گیا ہے کہ سب کو معلوم ہے۔ چنانچہ مجھے تو سونا اور کھانا پینا دوبھر اور تلخ ہو گیا ہے۔ اس بارے میں آپ سے دعا مطلوب ہے۔ میں نے کہا: ''پہلے بھی میں دعا کرتا تھا اور اب تو انشاء اللہ اور زیادہ دعا میں مشغول رہوں گا۔''

''اسی دوران میں وزیر نے مجھ سے کہا کہ ''حضرت بادشاہ پانچوں وقت کی نماز کا بڑا اہتمام فرماتے ہیں۔'' میں نے کہا: ''الحمدللہ! یہ وہ بات ہے کہ ایک مدت کے بعد سننے میں آ رہی ہے، ورنہ ماضی قریب کے بادشاہوں میں سے کسی میں یہ نماز کی پابندی سننے میں نہیں آئی تھی۔''

آخر میں حضرت شاہ صاحبؒ نے بادشاہ کو سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی وہ وصیت سنائی جو انہوں نے اپنے جانشین سیدنا فاروق اعظمؓ کو خلیفہ بناتے وقت سنائی تھی۔

''خلیفہ کو بھی عجیب عجیب مشکلات درپیش ہوتی ہے۔ اعدائے دین کی طرف سے بھی اور موافقین کی طرف سے بھی۔ ان تمام مشکلات کا بس ایک ہی علاج ہے کہ مرضیات حق کو اپنا نصب العین بنا کر حق تعالیٰ ہی سے مدد طلب کی جائے اور اس کے غیر سے قطع نظر کر لی جائے۔'' (شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات: ص ۱۳۵)

ایک اور خط میں شاہ محمد عاشق پھلتیؒ کو لکھتے ہیں:

''بادشاہ (محمد شاہ رنگیلا کا لڑکا احمد شاہ) آئے تھے۔ پہلے مسجد میں

میں زنانہ کا انتظام کیا گیا۔ اس صورت میں بادشاہ کے آنے کی غرض یہ تھی کہ بے تکلف ہو کر کچھ دیر ٹھہرے۔ قریباً تین چار گھنٹے وہ بیٹھا، کھانا بھی کھایا۔ اس کی زیادہ تر باتیں مخلوق خدا کی بھلائی کے کاموں میں مدد چاہنے سے متعلق تھیں۔''

(شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات: ص ۱۱۱)

لیکن سلطنت کے حالات کچھ اس قسم کے ابتر ہو چکے تھے کہ اس زوال کو عروج میں اور سلطنت کی اس کمزوری کو تقویت دینے میں نہ تو بادشاہ اور نہ ہی حضرت شاہ صاحب کی دعائیں کارگر ہو سکتی تھیں، کیونکہ جب کسی حکومت اور سلطنت کا زوال اپنی آخری حدوں کو چھو لیتا ہے اور مخالفتوں اور سازشوں کے ڈائنا میٹ سلطنت کو اڑانے میں مصروف ہوتے ہیں تو پھر کسی پرعزم، قوی الارادہ اور جفاکش بادشاہ کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ سلطنت کے جسم میں نئی روح پھونک سکے۔ اور اس کی شریانوں میں منجمد خون کو جاری و ساری کر سکے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے مختلف طبقات امت کو بھی مخاطب کر کے خصوصی خطاب کیا جن میں سلاطین اسلام، امراء اور ارکان دولت، فوجی سپاہی، اہل صنعت وحرفت، پیرزادوں اور غلط کار علماء، خوردہ گیر اور متقشف واعظوں اور تارک الدنیا اور عزلت گزین زاہدوں کو الگ الگ خطاب کیا۔ ان کے روگوں کی نشان دہی کی، ان کی دکھتی ہوئی رگوں پر انگلی رکھی۔ ان خطابات میں اگرچہ انہوں نے بڑی ژرف نگاہی سے کام لیا لیکن اس عہد و معاشرہ اور اہل علم کی مصلحت اندیشی اور داعیوں کی اصلاح احوال سے مایوسی نے حضرت شاہ صاحبؒ کے ان خطابات کو ثمر آور نہ کیا اور مسلم معاشرہ نے آ کر 1857ء کی جنگ آزادی میں مغلیہ حکومت کا یک قلم خاتمہ کر دیا، اور اس خاندان کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو اس سرزمین میں قبر کے لیے دو گز زمین بھی نہ مل سکی جس سرزمین کو اس کے آباؤ واجداد نے شمشیر و سنان سے فتح کیا تھا۔ اور علامہ اقبالؒ نے شاید انہی کے مقدر کو دیکھ کر یہ شعر کہا تھا ؎

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

ان خطابات میں حضرت شاہ صاحبؒ نے بڑی جامعیت کے ساتھ ان طبقات پر تنقید کی کہ اس گندے اور حرص و آز اور تعیّشانہ زندگی میں ملوث معاشرہ میں جو صالح عناصر موجود ہیں، ممکن ہے کہ ان کے ضمیر و ایمان میں زندگی اور برے بھلے کی تمیز کے جذبات جاگ اٹھیں۔ ان کی قوت ایمانی بیدار ہو جائے اور اس خارزار جاہلیت کی ہر کھٹک انہیں اصلاح کے لیے بے چین کر دے، لیکن نتیجہ مایوس کن نکلا۔ یہ سارے خطابات حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی کتاب التفہیمات الالٰہیہ میں نقل کیے ہیں، اور حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی قدس سرہ نے اپنے مضمون مندرجہ الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر میں ان کا اردو میں ترجمہ اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ ہم اسی مضمون سے انہی کا یہ ترجمہ نقل کر رہے ہیں:

سلاطین اسلام سے خطاب:

"اے بادشاہو! ملاءِ اعلیٰ کی مرضی اس زمانہ میں اس امر پر مستقر ہو چکی ہے کہ تم تلواریں کھینچ لو اور اس وقت تک ان کو نیام میں داخل نہ کرو جب تک مسلم شرک سے بالکلیہ جدا نہ ہو جائے، اور اہل کفر و فسق کے سرکش لیڈر کمزوروں کے گروہ میں جا کر شامل نہ ہو جائیں، اور یہ کہ ان کے قابو میں پھر کوئی ایسی بات نہ رہ جائے جن کی بدولت وہ آئندہ سر اٹھا سکیں "وقاتلوهم حتى لاتكون فتنه ويكون الدين كله الله" (یعنی ان سے جنگ کرتے رہو تا آنکہ فتنہ فرد ہو جائے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو جائے) پھر جب کفر و اسلام کے درمیان ایسا کھلا نمایاں امتیاز پیدا ہو جائے تب تمہیں چاہیے کہ ہر تین دن یا چار دن کے سفر کی منزلوں پر اپنا ایک ایک حاکم مقرر کرو، ایسا حاکم جو عدل و انصاف کا مجسمہ ہو، قوی ہو جو ظالم سے مظلوم کا حق وصول کر سکتا ہو اور اللہ کے حدود کو قائم کر سکتا ہو، اور اس میں سرگرم ہو کر پھر لوگوں میں بغاوت اور سرکشی کے جذبات پیدا نہ ہوں، نہ وہ جنگ پر آمادہ ہوں اور نہ دین

سے مرتد ہونے کی کسی میں جرأت باقی رہے، نہ کسی گناہ کبیرہ کے ارتکاب کی کسی کو مجال ہو۔ اسلام کا کھلے بندوں اعلان ہو اور اس کے شعائر کا اعلانیہ اظہار کیا جائے۔ ہر شخص اپنے متعلقہ فرائض کو صحیح طور پر ادا کرے۔ چاہیے کہ ہر شہر کا حاکم اپنے پاس اتنی قوت رکھے جس کے ذریعہ سے اپنی متعلقہ آبادی کی اصلاح کر سکتا ہو۔ مگر اس کے ساتھ اس کو اتنی قوت فراہم کرنے کا موقع نہ دیا جائے جس کے بل بوتے پر وہ خود ان سے نفع گیر ہونے کی تدبیریں سوچنے لگے اور حکومت کے مقابلہ پر آمادہ ہو جائے۔

"چاہیے کہ اپنے متعلقہ مقبوضات کے بڑے علاقہ اور تعلیم پر ایسے میر مقرر کیے جائیں جو جنگی مہمات کا بھی اختیار رکھتے ہوں۔ ایسے امیر کے ساتھ بارہ ہزار کی جمعیت رکھی جائے، مگر جمعیت ایسے افراد سے بھرتی ہو جن کے دل میں جہاد کا ولولہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں کسی کی ملامت سے خوف زدہ نہ ہوں۔ ہر سرکش اور متمرد سے جنگ اور مقابلہ کی ان میں صلاحیت ہو۔

اے بادشاہو! جب تم یہ کر لو گے تو اس کے بعد ملاء اعلیٰ کی رضا مندی یہ چاہے گی کہ تم لوگوں کی منزلی اور عائلی زندگی کی طرف توجہ کرو، ان کے باہمی معاملات کو سلجھاؤ، اور ایسا کر دو کہ پھر کوئی معاملہ ایسا نہ ہونے پائے جو شرعی قوانین کے مطابق نہ ہو۔ اس کے بعد لوگ امن وامان کی صحیح مسرت سے فائز المرام ہو سکتے ہیں۔"

(تفہیمات الٰہیہ: جلد ا ص ۲۱۵۔۲۱۶)

امراء اور ارکان دولت سے خطاب:

حضرت شاہ صاحبؒ نے امراء اور ارکان دولت سے بھی خطاب فرمایا۔ چنانچہ فرمایا:

''اے امیرو! دیکھو تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ دنیا کی فانی لذتوں پر تم ڈوبے جا رہے ہو اور جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہوئی ہے ان کو تم نے چھوڑ دیا ہے تاکہ ان میں بعض بعض کو کھاتے اور نگلتے رہیں۔ کیا تم علانیہ شرابیں نہیں پیتے؟ اور پھر اپنے اس فعل کو تم برا بھی نہیں سمجھتے۔ تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ بہت سے لوگوں نے اونچے اونچے محل اس لیے کھڑے کیے ہیں کہ ان میں زنا کاری کی جائے اور شرابیں بنائی جائیں، جوا کھیلا جائے لیکن تم اس میں دخل نہیں دیتے اور اس حال کو نہیں بدلتے۔ کیا حال ہے ان بڑے بڑے شہروں کا جن میں چھ سو سال سے کسی پر حد شرعی نہیں جاری ہوئی۔ جب کوئی کمزور مل جاتا ہے تو اسے پکڑ لیتے ہیں اور جب کوئی قوی ہوتا ہے تو اسے چھوڑ دیتے ہو، اور نرم اور گداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے ہو۔ اچھے کپڑوں اور اونچے مکانات کے سوا تمہاری توجہ اور کسی طرف منعطف نہیں ہوتی۔ کیا تم نے اپنے سر کبھی اللہ کے سامنے جھکائے۔ اللہ کا نام تمہارے پاس صرف اس لیے رہ گیا ہے کہ اللہ کے لفظ سے تمہاری مراد زمانہ کا انقلاب ہے کیونکہ تم اکثر بولتے ہو خدا قادر ہے کہ ایسا کر دے یعنی زمانہ کے انقلاب کی یہ تعبیر ہے۔''

فوجی سپاہیوں کو خطاب:

حضرت شاہ صاحبؒ نے فوجی سپاہیوں کو بھی خطاب فرمایا اور انہیں ان کی کوتاہیوں پر جھنجھوڑا اور انہیں دین پر کاربند رہنے کی تلقین کی۔

> ''اے فوجیو! اور عسکریو! تمہیں اللہ تعالیٰ نے جہاد فی سبیل اللہ کے لیے پیدا فرمایا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اللہ کی بات اونچی ہوگی اور خدا کا کلمہ بلند ہوگا اور شرک اور اس کی جڑوں کو تم دنیا سے نکال پھینکو گے، لیکن جس کام کے لیے تم پیدا کیے گئے تھے اسے تم چھوڑ بیٹھے۔ اب جو تم گھوڑے پالتے ہو، ہتھیار جمع کرتے ہو اس کا مقصد صرف یہ رہ گیا ہے کہ تم اس سے اپنی دولت میں اضافہ کرو۔

اس سلسلہ میں جہاد کی نیت سے تم بالکل خالی الذہن رہتے ہو۔ تم شرابیں پیتے ہو، بھنگ کے پیالے چڑھاتے ہو، داڑھیاں منڈواتے ہو اور مونچھیں بڑھاتے ہو، عام لوگوں پر زیادتیاں اور ظلم کرتے ہو حالانکہ جو کچھ ان کا لے کر کھاتے ہو اس کی قیمت ان تک نہیں پہنچتی۔ اللہ کی قسم! تم عنقریب اللہ کی طرف واپس جاؤ گے، پھر تمہیں وہ بتائے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے۔ تمہارے ساتھ خدا کی یہ مرضی ہے کہ اچھے پارسا صالحین غازیوں کا لباس اور ان کی وضع قطع اختیار کرو، چاہیے کہ اپنی داڑھیاں بڑھاؤ، مونچھیں کٹواؤ، پنج وقتہ نماز ادا کیا کرو اور عام لوگوں کے مال سے بچتے رہو۔ جنگ اور مقابلہ کے میدان میں ڈٹے رہو۔ تمہیں چاہیے کہ سفر اور جنگ وغیرہ کے موقع پر نماز میں جو آسانیاں اور رخصتیں رکھی گئی ہیں انہیں سیکھ لو، مثلاً قصر کرنا، جمع کرنا، سنتوں کے ترک کرنے کی اجازت ہے، اس سے واقف ہونا، تیمّم کی اجازت سے مطلع ہونا، پھر اس کے بعد نماز کو خوب زور اور مضبوطی سے پکڑ لو اور اپنی نیتوں کو درست کر لو، اللہ تعالیٰ تمہارے جاہ و جلال میں برکت دے گا۔“

(تفہیمات الٰہیہ: جلد ۱ ص ۲۱۶)

اہل صنعت وحرفت سے خطاب:

حضرت شاہ صاحبؒ نے اہل صنعت وحرفت کو بھی خطاب فرمایا اور ان کو کھری کھری سنائیں کیونکہ یہ لوگ مسلمان معاشرہ کا ایک بہت اہم ستون ہیں۔ آپ نے فرمایا:

”ارباب پیشہ! دیکھو، امانت کا جذبہ تم سے مفقود ہو گیا ہے۔ تم اپنے رب کی عبادت سے بالکل خالی الذہن ہو چکے ہو اور تم اپنے فرضی بنائے ہوئے معبودوں پر قربانیاں چڑھاتے ہو تم مدار (یعنی شاہ بدیع الدین مدار مکپنوری) اور سالار (سید سالار مسعود غازی) کا حج کرتے

ہو۔ تم میں سے بعض لوگوں نے فال بازی اور ٹوٹکا اور گنڈے وغیرہ کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے۔ یہی ان کی دولت ہے اور یہی ان کا ہنر ہے۔ یہ لوگ خاص قسم کا لباس اور جامہ اختیار کرتے ہیں، خاص طرح سے کھانے کھاتے ہیں اور ان میں جن کی آمدنی کم ہوتی ہے وہ اپنی عورتوں کو کرایہ پر چلا کر پیٹ پال لیتے ہیں۔ یہ کیسا بدبخت آدمی ہے جو اپنی دنیا اور آخرت دونوں کو برباد کر رہا ہے، حالانکہ حق تعالیٰ شانہ نے تمہارے لیے مختلف قسم کے پیشے اور کمانے کھانے کے دروازے کھول رکھے ہیں جو تمہاری اور تمہارے متعلقین کی ضرورتوں کے لیے کافی ہو سکتے ہیں بشرطیکہ تم اعتدال کی راہ اپنے خرچ میں اختیار کرو اور محض اتنی روزی پر قناعت کرنے کے لیے آمادہ ہو جاؤ جو تمہیں بآسانی اخروی زندگی کے نتائج تک پہنچائے، لیکن تم نے خدا کی ناشکری کی اور غلط راہ حصولِ رزق کی اختیار کی۔ کیا تم جہنم کے عذاب سے نہیں ڈرتے جو بڑا برا بچھونا ہے۔

''دیکھو! اپنی صبح و شام کو تم خدا کی یاد میں بسر کیا کرو اور دن کے بڑے حصہ کو اپنے پیشہ میں صرف کرو اور رات کو اپنی عورتوں کے پاس گزارو۔ اپنے خرچ کو اپنی آمدنی سے ہمیشہ کم رکھا کرو، پھر جو بچ جایا کرے اس سے مسافروں کی اور مسکینوں کی مدد کیا کرو، اور کچھ اپنے اتفاقی مصائب اور ضرورتوں کے لیے پس انداز بھی کیا کرو۔ تم نے اگر اس راہ کو اختیار نہ کیا تو تم غلط راہ پر جا رہے ہو اور تمہاری تدبیر درست نہیں ہے۔'' (تفہیمات الٰہیہ: ص ۲۱۷ جلد ۱)

پیرزادوں سے خطاب:

پھر حضرت شاہ صاحبؒ نے مشائخ کی اولاد سے بھی خطاب فرمایا اور انہیں علی الاعلان فرمایا کہ تم لوگوں نے اپنے آباؤ اجداد کے ناموں کو بٹہ لگا دیا۔ تمہارا وجود ان کی

بدنامی کا باعث ہے۔ چنانچہ آپ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"اے لوگو! جو اپنے آباؤ اجداد کے رسوم کو بغیر کسی حق کے پکڑے ہوئے ہو یعنی گزشتہ بزرگان کی اولاد میں سے ہو۔ میرا آپ سے سوال ہے کہ آپ کو کیا ہو گیا ہے کہ ٹکڑیوں ٹکڑیوں اور ٹولیوں ٹولیوں میں آپ بٹ گئے ہیں۔ ہر ایک اپنے اپنے روگ اپنی اپنی منڈلی میں الاپ رہا ہے، اور جس طریقہ کو اللہ نے اپنے رسول، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راہ نمائی فرمائی تھی، اسے چھوڑ کر ہر ایک تم میں ایک مستقل پیشوا بنا ہوا ہے، اور لوگوں کو اسی طرف بلا رہا ہے۔ اپنی جگہ اپنے کو راہ یافتہ اور راہ نما ٹھہرائے ہوئے ہے حالانکہ دراصل وہ خود گم کردہ راہ اور دوسروں کو بھٹکانے والا ہے۔ ہم ایسے لوگوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے جو محض لوگوں کو اس لیے مرید کرتے ہیں تاکہ ان سے ٹکے وصول کریں۔ ایک علم شریف کو سیکھ کر دنیا بٹورتے ہیں کیونکہ جب تک اہل دین کی شکل و شباہت اور طرز و انداز نہ اختیار کریں گے، دنیا حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور نہ ان لوگوں سے راضی ہوں جو سوائے اللہ و رسول ﷺ کے خود اپنی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں اور اپنی مرضی کی پابندی کا لوگوں کو حکم دیتے ہیں۔ یہ لوگ بٹ مار اور راہ گیر ہیں، ان کا شمار دجالوں، کذابوں، فتانوں اور ان لوگوں میں ہے جو خود فتنہ و آزمائش کے شکار ہیں۔

خبردار! خبردار! ہرگز اس کی پیروی نہ کرنا جو اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت کی طرف دعوت نہ دیتا ہو اور اپنی طرف بلاتا ہو، اور چاہیے کہ زبانی جمع خرچ صوفیائے کرام کے اشاروں کے متعلق عام مجلسوں میں نہ کیا جائے۔ کیونکہ مقصد تو (تصوف) سے صرف یہ ہے کہ آدمی کو احسان کا مقام حاصل ہو جائے۔ لوگو! دیکھو، کیا

تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں کوئی عبرت نہیں ہے۔
وان ھذا صراطی مستقیماً فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم من سبیلہ ۔ یہ میری راہ ہے سیدھی، تم اس پر چل پڑو اور مختلف راہوں کے پیچھے نہ پڑو، وہ تمہیں اللہ کی راہ سے بچھڑا دیں۔''

(الانعام:۱۵۳)

غلط کار علماء سے خطاب:

پھر آپ نے اس زمانہ کے غلط کار علماء کو خطاب فرمایا، کیونکہ ہر گروہ میں کچھ نہ کچھ کالی بھیڑیں ہوتی ہیں، اسی طرح علماء میں بھی کچھ کالی بھیڑیں تھیں اور ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے ان غلط کار اور بدعمل علماء کو خطاب کر کے فرمایا:

''ارے بدعقلو! جنہوں نے اپنا نام 'علماء'' رکھ چھوڑا ہے، تم یونانیوں کے علوم میں ڈوبے ہوئے ہو اور صرف ونحو ومعانی میں غرق ہو، اور سمجھتے ہو کہ یہی علم ہے۔ یاد رکھو! علم یا تو قرآن حکیم کی کسی آیت محکم کا نام ہے، یا سنت ثابتہ قائمہ کا۔ چاہیے کہ قرآن سیکھو۔ پہلے اس کے غریب لغات کو حل کرو، پھر سبب نزول کا پتہ چلاؤ اور اس کی مشکلات کو حل کرو۔ اسی طرح جو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح ثابت ہو چکی ہیں، اسے محفوظ کرو یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کس طرح پڑھتے تھے؟ وضو کرنے کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا طریقہ تھا؟ اپنی ضرورت کے لیے کس طرح جاتے تھے؟ اور حج کیوں کر ادا کرتے تھے؟ جہاد کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا قاعدہ تھا؟ گفتگو کا کیا انداز تھا؟ اپنی زبان کی حفاظت کس طرح فرماتے تھے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے؟ چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری روش کی پیروی کرو، آپ کی سنت پر عمل کرو، مگر اس میں بھی اس بات کا خیال رہے کہ جو سنت ہے اسے

سنت ہی سمجھو، نہ کہ اسے فرض کا درجہ عطا کرو۔ اسی طرح چاہیے کہ جو تم پر فرائض ہیں انہیں سیکھو، مثلاً وضو کے ارکان کیا ہیں؟ نماز کے ارکان کیا ہیں؟ زکوٰۃ کا نصاب کیا ہے؟ قدر واجب کیا ہے؟ میت کے حصوں کی مقدار کیا ہے؟ پھر سرکار دو عالم ﷺ کی عام سیرت کا مطالعہ کرو جس سے آخرت کی رغبت پیدا ہو۔ صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ کے حالات پڑھو، اور یہ چیزیں فرائض سے فاضل اور زیادہ ہیں، لیکن ان دنوں تم جن چیزوں میں الجھے ہوئے ہو اور جس میں سرکھپا رہے ہو اس کو آخرت کے علم سے کیا واسطہ، یہ دنیا کے علوم ہیں۔" (تفہیمات: جلد ا ص ۲۱۴)

پھر آپ کتاب کے اگلے صفحہ پر انہی علماء وطلباء کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

"جن علوم کی حیثیت صرف ذرائع اور آلات کی ہے (مثلاً صرف و نحو وغیرہ) تو ان کی حیثیت آلہ اور ذریعہ ہی کی رہنے دو نہ کہ خود ان کو مستقل علم بنا بیٹھو۔ علم کا پڑھنا تو اس لیے واجب ہے کہ اس کو سیکھ کر مسلمانوں کی بستیوں میں اسلامی شعار کو رواج دو، لیکن تم نے دینی شعار اور اس کے احکام کو تو پھیلایا نہیں اور لوگوں کو زائد از ضرورت باتوں کا مشورہ دے رہے ہو۔

"تم نے اپنے حالات سے عام لوگوں کو یہ باور کرا دیا ہے کہ علماء کی بڑی کثرت ہو چکی ہے حالانکہ ابھی کتنے بڑے بڑے علاقے ہیں جو علماء سے خالی ہیں، اور جہاں علماء پائے بھی جاتے ہیں وہاں بھی دینی شعاروں کو غلبہ حاصل نہیں۔" (تفہیمات: جلد ا ص ۲۱۵)

ملاحظہ فرمائیں کہ آپ نے علماء کے اس طبقہ کو کیسی کھری کھری باتیں سنائیں۔

دین میں تنگی پیدا کرنے واعظوں اور عزلت نشین زاہدوں سے خطاب:

علماء کو خطاب کرنے کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے ان لوگوں سے خطاب

کیا جو ہر معاملہ میں دین میں تنگی پیدا کرتے ہیں اور خود زہد وتقشف کی زندگی گزارتے ہیں اوران کی خواہش یہ ہے کہ عوام بھی ایسی ہی زندگی گزاریں کیونکہ اُن لوگوں نے اسی بات اور اپنے انہی وسوسوں کو دین کا نام دیا ہوا ہے اور جو شخص بھی ان کے اس وسواسی معیار پر پورا نہیں اترتا وہ ان کے نزدیک دین اسلام سے خارج ہے۔ اس گروہ میں زیادہ عباد، زہاد اور وعاظ ہی اس زمانہ میں مبتلا ہیں۔ اس لیے آپ نے انہیں لوگوں کو خطاب کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"دین میں خشکی اور سختی کی راہ اختیار کرنے والوں سے میں پوچھتا ہوں، اور واعظوں اور عابدوں اور ان کنج نشینوں سے سوال ہے، ہر بری بھلی بات اور ہر رطب ویابس پر تمہارا ایمان ہے، لوگوں کو تم جعلی اور گھڑی ہوئی حدیثوں کا وعظ سناتے ہو، اللہ کی مخلوق پر تم نے زندگی تنگ کر رکھی ہے حالانکہ تم تو (اے امت محمدیہ!) اس لیے پیدا ہوئے تھے کہ لوگوں کو آسانیاں بہم پہنچاؤ گے نہ کہ ان کو دشواریوں میں مبتلا کر دو گے۔ تم ایسے لوگوں کی باتیں دلیل میں پیش کرتے ہو جو بیچارے مغلوب الحال تھے اور عشق ومحبت الٰہی میں عقل وحواس کھو بیٹھے تھے، حالانکہ اہل عشق کی باتیں وہیں کی وہیں لپیٹ کر رکھ دی جاتی ہیں نہ کہ ان کا چرچا کیا جاتا ہے۔ تم نے وسواس کو اپنے لیے گوارا کر لیا ہے اور ان کا نام احتیاط رکھ چھوڑا ہے حالانکہ تمہیں صرف یہ چاہیے تھا کہ اعتقاداً وعملاً احسان کے مقام کے لیے جن امور کی ضرورت ہے بس اس کو سیکھ لیتے، لیکن جو بیچارے اپنے خاص حال میں مغلوب تھے خواہ مخواہ ان کی باتوں کو احسانی، خالص امور میں گڈمڈ کرنے کی حاجت نہ تھی، اور نہ ارباب کشف کی چیزوں کو ان میں مخلوط کرنے کی ضرورت تھی۔ چاہیے کہ مقام احسان کی طرف لوگوں کو بلاؤ، پہلے اسے خود سیکھ لو پھر دوسروں کو دعوت دو۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ سب سے بڑی

رحمت اور سب سے بڑا کرم اللہ کا وہ ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنچایا ہے۔ وہی صرف ہدایت ہے جو آپ کی ہدایت ہے، پھر تم کیا بتا سکتے ہو؟ تم جن افعال کو کرتے ہو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ کیا کرتے تھے۔''

(تفہیمات: جلد ا ص ۲۱۵)

عام امت مسلمہ سے خطاب:

ان سب خطابات کے آخر میں حضرت شاہ صاحبؒ عام مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''میں مسلمانوں کی عام جماعت کی طرف اب مخاطب ہوں اور کہتا ہوں: اے آدم کے بچو! دیکھو تمہارے اخلاق سو چکے ہیں۔ تم پر بے جا حرص و آز کا ہوکھا سوار ہوگیا ہے۔ تم پر شیطان نے قابو پا لیا ہے۔ عورتیں مردوں کے سر چڑھ گئی ہیں اور مرد عورتوں کے حقوق برباد کر رہے ہیں۔ حرام کو تم نے اپنے لیے خوشگوار بنا لیا ہے اور حلال تمہارے لیے بدمزہ ہو چکا ہے۔ پھر قسم ہے اللہ کی! اللہ تعالیٰ نے ہرگز کسی کو اس کے بس سے زیادہ تکلیف نہیں دی ہے۔ چاہیے کہ تم اپنی شہوانی خواہشوں کو نکاح کے ذریعہ پوری کرو خواہ تمہیں ایک سے زیادہ نکاح ہی کیوں نہ کرنے پڑیں، اور اپنے مصارف وضع قطع میں تکلف سے کام نہ لیا کرو، اس طرح خرچ کرو جس کی تم میں سکت ہو۔ یاد رکھو! ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا اور اپنے اوپر خواہ مخواہ تنگی سے کام نہ لو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تمہارے نفوس بالآخر فسق کی حدود تک پہنچ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتا ہے کہ بندے اس کی آسانیوں سے نفع اٹھائیں جیسا کہ یہ بھی اسی کو پسند ہے کہ جو چاہیں وہ اعلیٰ مدارج پر احکام کی پابندی بھی کر

سکتے ہیں۔ اپنے شکم کی خواہشوں کی تکمیل چاہیے کہ کھانوں سے کرو اور اتنا کمانے کی کوشش کرو جس سے تمہاری ضرورتیں پوری ہوں۔ دوسروں کے سینوں کے بوجھ بننے کی کوشش نہ کرو کہ ان سے مانگ مانگ کر کھایا کرو۔ تم ان سے مانگو اور وہ نہ دیں۔ اسی طرح بیچارے بادشاہوں اور حکام کے اوپر بھی بوجھ نہ بن جاؤ۔ تمہارے لیے یہی پسندیدہ ہے کہ تم خود کما کر کھایا کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو خدا تمہیں معاش کی بھی راہ سجھائے گا جو تمہارے لیے کافی ہوگی۔

''اے آدم کے بیٹو! جسے اللہ تعالیٰ نے ایک جائے سکونت دے رکھی ہو جس میں وہ آرام کرے، اتنا پانی جس سے وہ سیراب ہو، اتنا کھانا جس سے بسر ہو جائے، اتنا کپڑا جس سے تن ڈھک جائے، ایسی بیوی جو اس کی شرمگاہ کی حفاظت کر سکتی ہو اور اس کو رہن سہن کی جدوجہد میں مدد دے سکتی ہو۔ تو یاد رکھو کہ دنیا کامل طور پر اس شخص کو مل چکی ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔ بہرحال کوئی نہ کوئی کمائی کی راہ آدمی ضرور اختیار کرے اور اسی کے ساتھ قناعت کو اپنا دستور زندگی بنائے اور رہنے سہنے میں اعتدال کا جادہ اختیار کرے اور اللہ کی یاد کے لیے جو فرصت ہم دست ہو اسے غنیمت شمار کرے۔ کم از کم تین وقتوں صبح و شام اور پچھلی رات کے ذکر کا خاص طور پر خیال رکھے۔ حق تعالیٰ کی یاد اس کی تسبیح و تہلیل اور قرآن حکیم کی تلاوت کے ذریعہ سے کیا کرے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے اور ذکر کے حلقوں میں حاضر ہوا کرے۔

''اے آدم کے بیٹو! تم نے ایسے بگڑے ہوئے رسوم اختیار کر لیے ہیں جن سے دین کی اصلی صورت بگڑ گئی ہے۔ تم عاشورا کے دن جھوٹی باتوں پر اکٹھے ہوتے ہو، اسی طرح شب برأت میں کھیل

کود کرتے ہو اور مردوں کے لیے کھانا پکا پکا کر کھلانے کو اچھا خیال کرتے ہو۔ اگر تم سچے ہو تو اس کی دلیل پیش کرو۔

''اسی طرح اور بھی بری بری رسمیں تم میں جاری ہیں جس نے تم پر تمہاری زندگی تنگ کر دی ہے، مثلاً تقریبات کی دعوتوں میں تم نے حد سے زیادہ تکلف برتنا شروع کر دیا ہے، اسی طرح ایک بری رسم یہ بھی ہے کہ کچھ بھی ہو جائے لیکن طلاق کو تم نے گویا ناجائز ٹھہرا لیا ہے۔ یونہی بیوہ عورتوں کو نکاح سے روکے رہتے ہو۔ ان رسموں میں تم اپنی دولت ضائع کرتے ہو، وقت برباد کرتے ہو اور جو صحت بخش روش تھی اسے چھوڑ بیٹھے ہو۔

''تم نے اپنی نمازیں برباد کر رکھی ہیں۔ تم میں کچھ لوگ ہیں جو دنیا کمانے میں اور اپنے دھندوں میں اس قدر پھنس گئے ہیں کہ نماز کا انہیں وقت ہی نہیں ملتا۔ کچھ لوگ ہیں جو قصہ کہانی سننے میں وقت گنواتے ہیں، خیر پھر بھی اگر ایسی مجلسیں لوگ ایسے مقامات پر قائم کیا کرتے جو مسجدوں سے قریب ہوں تو شاید ان کی نمازیں ضائع نہ ہوتیں۔ تم نے زکوٰۃ کو بھی چھوڑ دیا ہے حالانکہ کوئی ایسا دولت مند نہیں ہے جس کے اقرباء اور اعزہ میں حاجت مند لوگ نہیں ہوتے۔ اگر ان لوگوں کی وہ مدد کیا کریں تو یہ بھی ان کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔

''تم میں سے بعضوں نے روزے چھوڑ رکھے ہیں خصوصاً جو فوجی ملازم ہیں، کہتے ہیں کہ وہ روزہ رکھنے پر قادر نہیں ہیں یعنی جو محنت اور مشقت انہیں برداشت کرنا پڑتی ہے، اس کے ساتھ وہ روزے نہیں رکھ سکتے۔ تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ تم نے راہ غلط کر دی ہے اور تم حکومت کے سینہ پر بوجھ بن گئے ہو۔ بادشاہ جب اپنے خزانہ میں اتنی گنجائش نہیں پاتا جس سے تمہاری تنخواہ ادا کرے تب رعایا

پر زندگی کو دشوار کرتا ہے۔ سپاہیو! یہ تمہاری کیسی بری عادت ہے۔
کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو روزے رکھتے ہیں لیکن سحری نہیں کرتے
اور رمضان المبارک میں ان سخت کاموں کو نہیں چھوڑتے جن کی
وجہ سے روزے ان پر گراں ہو جاتے ہیں۔

''ملاء اعلیٰ کی طرف سے اصلاحی مطالبات کا اس زمانہ میں جن جن
امور سے متعلق تقاضا ہو رہا ہے اس کا ایک طویل باب ہے، لیکن
کھڑکی سے آدمی بڑی نیکیوں کو جھانک سکتا ہے اور ڈھیر کے لیے
اس کا نمونہ کافی ہے۔'' (تفہیمات: جلد اص ۲۱۷۔۲۱۸)

حضرت شاہ صاحبؒ نے جہاں مختلف طبقات کو خطاب کیا وہاں شرک و بدعت اور ہندوانہ رسوم اور غیر اسلامی شعائر کی غلاظتوں کی بھی نشان دہی فرمائی جنہوں نے اس زمانہ میں پورے معاشرہ کو گندہ کیا ہوا تھا۔ ان تمام عقائد شرکیہ اور رسوم فاسدہ کی پرزور مذمت کی جس کو مسلم معاشرہ کے اس زمانہ میں اپنایا ہوا تھا۔ ایک سلیم الفطرت ان تمام غلط رسومات، شرکیہ عقائد اور بدعات سے اسی طرح نفرت کرتا ہے جیسے ایک نفیس الطبع انسان بول و براز کی غلاظتوں سے نفرت کرتا۔ اور حضرت شاہ صاحبؒ نے تو تجدید کا بیڑا اٹھایا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ نہایت کھلے کھلے اور صاف لفظوں میں قوم کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

''ہندوؤں کی بری عادات میں سے ایک یہ ہے کہ جب کسی عورت
کا خاوند مر جاتا ہے تو اسے وہ دوسری شادی نہیں کرنے دیتے۔
اہل عرب کی یہ عادت بالکل نہیں تھی، نہ بعثت رسول صلی اللہ علیہ
سلم سے قبل، نہ آپ کے زمانہ میں اور نہ بعد میں۔ حق تعالیٰ شانہ
اس شخص پر رحم فرمائیں جو ان بری عادات اور خصائل شنعیہ کو ختم
کرے۔ اگر عام لوگوں سے ان بری باتوں کا رواج ختم نہ ہو سکے
تو اپنی قوم کے درمیان ہی اہل عرب کے طریقہ کو رواج دینا
چاہیے۔ اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو اس عادت کو برا اور قبیح سمجھنا اور

دل سے اس کا دشمن ہونا چاہیے کہ یہ نہی عن المنکر کا سب سے
آخری درجہ ہے۔

ہماری دوسری بری عادت یہ ہے کہ ہم حق مہر بہت زیادہ باندھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ (کہ آپ سے ہمارے دین و دنیا کی عزت و آبرو وابستہ ہے یعنی ''آبروئے ما زنام مصطفےٰ است۔'') اپنے گھر والوں کے مہر (جو بہترین خلائق تھے) ساڑھے بارہ اوقیہ مقرر فرمائے تھے جس کے پانچ سو درہم ہوتے ہیں۔

''ہماری ایک دوسری عادت شنیعہ اسراف ہے کہ ہم خوشی کے مواقع اور رسموں میں بہت خرچ کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ سے شادیوں میں صرف ولیمہ اور عقیقہ ثابت ہے۔ چنانچہ ان دونوں کی پابندی کرنا چاہیے اور اس کے علاوہ جو چیزیں ہم نے خود رواج دے رکھی ہیں ان سے اجتناب کرنا چاہیے یا ان کا زیادہ اہتمام نہیں کرنا چاہیے۔

ہماری عادات شنیعہ میں سے کچھ یہ بھی ہیں کہ غم کے موقع (یعنی موت وغیرہ پر) سّیم، چہلم، شش ماہی، فاتحہ اور سالانہ کے نام پر بھی اسراف ہے حالانکہ ان میں سے کسی کا عرب اولین میں رواج نہیں تھا۔ بہتر یہی ہے کہ متوفی کے ورثاء کی تین دن تعزیت اور ایک شب و روز کے کھانے کے علاوہ کوئی اور رسم نہ کریں۔ تین روز کے بعد قبیلہ کی عورتیں اکٹھی ہو کر میت کی عورتوں کے کپڑوں میں عطر ملیں، اور اگر میت کی زوجہ حیات ہو تو عدت گزرنے کے بعد سوگ کا سلسلہ ختم کر دیں۔'' (تفہیمات: جلد ا ص ۲۴۶۔۲۴۷)

حضرت مجدد الف ثانیؒ کا طرزِ عمل:

حضرت مجدد الف ثانیؒ کا طریقہ دعوت و تجدید یہ تھا کہ وہ امرائے سلطنت اور بادشاہ وقت کے حاشیہ نشین لوگوں کو خط لکھتے اور ان کے اندر غیرت دینی اور حمیت ملی کو

بیدار کرنے کی کوشش کرتے۔ وہ آج کل کے تحریک پسند لیڈروں کی طرح ارباب وقت اور شرانگیز طاقتوں سے پنجہ آزمائی کے لیے تیار نہ ہوتے۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا طریقہ یہی ہے اور نتائج کے لحاظ سے یہی مفید ثابت ہوتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ اس قسم کی دعوت میں نہایت کامیاب رہے اور ان کے مکتوبات نے بادشاہ وقت سے لے کر تمام امرائے سلطنت کے ذہنوں کو تبدیل کر کے رکھ دیا، اور وہ لوگ جو شرک و بدعات اور الحاد و زندقہ کے پاسبان تھے اب شریعت کی کما حقہ پاسبانی کرنے لگے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بھی درباری امراء کے محدود حلقہ سے باہر نکل کر ان آزمودہ کار قائدین اور عالی حوصلہ سرداروں اور امرائے سلطنت سے خط و کتابت کی جن کی خاکستر میں ان کو دینی حمیت، ملی غیرت اور قومی عزت کی کوئی دبی ہوئی چنگاری نظر آئی۔ ان میں سے حسب ذیل امرائے سلطنت اور قائدین مملکت قابل ذکر ہیں۔ وزیر مملکت آصف جاہ، نواب فیروز جنگ نظام الملک احمد شاہی، نواب مجد الدولہ بہادر، نواب عبید اللہ خان کشمیری، عماد الملک امیر تاج محمد خان بلوچ، میاں نیاز گل اور سید احمد روہیلہ۔ لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کی خصوصی نگاہِ انتخاب اس عہد کی دو عظیم شخصیتوں پر پڑی جن میں سے ایک ہندوستان کے اندر کی تھی اور دوسری باہر کی۔ ہندوستان کے اندر کی شخصیت سے مراد نواب نجیب الدولہ تھی اور ہندوستان سے باہر کی شخصیت سے مراد احمد شاہ ابدالی والیٔ افغانستان تھی۔ آپ نے ان دونوں کو خطوط لکھے۔

نواب نجیب الدولہ:

نواب نجیب الدولہ اس زمانہ کی ایک نہایت عظیم الشان شخصیت تھی۔ ان میں وہ تمام صفات اور خصائص پائے جاتے تھے جو ایک اسلامی حکومت کے سربراہ میں پائے جانے ضروری ہیں۔ انہوں نے ہر موقع پر اپنے ولی نعمت کے ساتھ وفاداری، ماتحتوں سے شفقت و شرافت اور دوستوں اور رفیقوں سے احسان سے کبھی اعراض نہ کیا۔ شرافت و احسان کی تمام صفات ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں اور قائدانہ صلاحیتوں کے جوہر شجاعت و بہادری ان میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔ آج کل کے سیاست دانوں کی

طرح غداری، بے وفائی، لوٹا پن اور کور نمکی کا ان میں نام و نشان نہیں تھا اور نہ ہی ان قبیح صفات کو انہوں نے ''فن شریف'' کا درجہ دیا تھا۔ آج کل تو بے اصولی اور بدکرداری کو اعلیٰ درجہ کی سیاست سمجھا جاتا ہے اور موقع سے فائدہ اٹھانے کو دانش مندی اور دوراندیشی کو سیاست کا ایک جزو لاینفک سمجھا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے نواب نجیب الدولہ اور نظام الملک آصف جاہ کو کچھ اسی قسم کے ساتھی ملے تھے جن میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو آج کل کے پاکستان کی مختلف جماعتوں کے سیاست دانوں اور ممبران اسمبلی میں موجود ہیں۔ جن پر کسی مشکل وقت میں اعتماد نہیں کیا جا سکتا جو ہر وقت اپنی پارٹی تبدیل کر کے لوٹا نام رکھوانے میں بھی کوئی غیرت و حمیت نہیں محسوس کرتے۔ اس زمانہ میں سیاست نام صرف لوٹا بازی کا رہ گیا ہے۔ ایسے لوگوں کا قائد خواہ کتنا ہی قابل، اعلیٰ اور سپاہیانہ کردار کا کیوں نہ ہو، اس کی جیب کے یہ کھوٹے سکے ہر وقت اس کے لیے ذلت و رسوائی کا باعث بنتے ہیں۔ اسی وجہ سے قائداعظم مرحوم کہا کرتے تھے کہ میری جیب میں سب کھوٹے سکے ہیں۔ چنانچہ ان کھوٹے سکوں نے پھر پاکستان میں کیا کیا گل کھلائے، پاکستان کی تاریخ کا ہر آشنا ان لوگوں کے کردار سے واقف ہے۔ پہلے انہوں نے قائداعظم کو ختم کیا پھر لیاقت علی خان کو گولی سے مارا، پھر پاکستان بنانے والی جماعت مسلم لیگ کو مشرقی پاکستان میں جگتو فرنٹ بنا کر ختم کیا، اور پھر بنگلہ دیش بننے تک پاکستان میں کوئی ایسی عوامی جماعت نہ بننے دی جو پاکستان کے دونوں بازوں میں ہو اور ان دونوں بازوؤں کو یکجا رکھ سکے۔ آخر میں بھی جو الیکشن ہوا اس میں مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی برسر اقتدار آئی۔ پیپلز پارٹی کا مشرقی پاکستان میں کوئی ممبر نہیں تھا اور عوامی لیگ کا مغربی پاکستان میں کوئی ممبر الیکشن نہ جیت سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان دولخت ہو کر رہ گیا۔ اور اب حالت یہ ہے کہ سیاست دان کم اور لوٹے زیادہ ہو گئے ہیں، اور الیکشن میں حصہ لینے والے حضرات جو روپیہ خرچ کرتے ہیں وہ دراصل Invest کرتے ہیں تاکہ جتنا خرچ کیا جائے اس سے کئی گنا زیادہ بنایا جائے کیونکہ آئندہ پھر بھی الیکشن لڑنا ہے سیاست تو اب پیشہ بن گیا ہے، خدمت عوام کرنے والے سیاست دان اب اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے چلے گئے ہیں، اور جن لوگوں

کو چھوڑ گئے ان کے نام نیب کے ہاں محفوظ ہیں۔ کچھ کی فائلیں کھل چکی ہیں اور کچھ کی عارضی طور پر بند ہیں کیونکہ وہ بعض سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے وزارت کی کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔

نہایت بدقسمتی کی بات ہے کہ جو شخص ایوان صدارت یا مسندوزارت پر براجمان ہوتا ہے وہ پبلک کے سامنے اپنے کو سب سے زیادہ ایمان دار اور خدمت ملک و وطن کا نمائندہ ظاہر کرتا ہے، لیکن جونہی وہ صدارت و وزارت سے ہٹتا ہے یا ہٹایا جاتا ہے تو پھر بتایا یہ جاتا ہے کہ اس نے لاکھوں میں نہیں کروڑوں میں ملک کی دولت لوٹ کر بیرون ملک بھیج دی ہے۔ گذشتہ نصف صدی سے یہی کچھ ہو رہا ہے اور مستقبل میں بھی اصلاح کی کوئی امید نہیں۔

بدقسمتی سے اس زمانہ میں بھی بڑے بڑے لوگوں کے حواشی اسی قسم کے لوگ تھے اور ان کو بھی ایسا ہی گندا، غلیظ اور فاسد ماحول ملا تھا حالانکہ نجیب الدولہ بذات خود نہایت بہترین، عاقل، ہوشیار، دانش منداور وضع دار شخص تھے۔ امانت و دیانت کے مجسمہ تھے۔ علم دوست اور عالم پرور تھے، اور دہلی کی ساری سیاست ان کے گرد گھومتی تھی۔ قریباً تمام مؤرخین نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ نواب نجیب الدولہ واقعتاً نجیب تھے اور وہ نہایت عاقل و دانش منداور دانش ور تھے۔ چنانچہ شمس العلماء مولانا ذکاءاللہ دہلوی نے لکھا ہے:

> ”نجیب الدولہ ایسا عاقل، ہوشیار اور دانش مند تھا کہ کمتر ہوتے ہیں۔ امانت داری اور ایمانداری تو اس وقت میں اس پر ختم تھی۔ وہ اپنے پرانے آقاؤں نواب دوندے خان روہیلہ، نواب شجاع الدولہ کی فرمانبرداری کیے جاتا تھا۔ ملہر راؤ ہلکر سے بھی اس کا ساز باز چلا جاتا تھا۔ یاد ہو گا یہ مرہٹہ پانی پت کی لڑائی سے اپنے ہم وطنوں کو چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ غرض یہ جواں مرد اس ٹوٹی پھوٹی سلطنت کو نباہ رہا تھا۔“ (تاریخ ہندوستان: جلد ۹ ص ۳۱۵)

اور جادو ناتھ سرکار نے نجیب الدولہ کے بارے میں اپنے خیالات کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے:

''ایک مؤرخ کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اس کی کس خوبی کی سب سے زیادہ تعریف کرے۔ میدان جنگ میں اس کی حیرت انگیز قیادت کی یا مشکلات میں اس کی تیز نگاہ یا صحیح رائے کی یا اس کی اس فطری صلاحیت کی جو اس کو انتشار و ابتری میں ایسی راہ دکھاتی تھی جس سے نتیجہ اس کے موافق نکل آتا تھا۔''

(Sarkar: Fall of the Mughal Empire. Vol. II P.916)

حضرت شاہ صاحبؒ کی نگاہ مردم شناس نے اپنے اس کام کی تکمیل میں نجیب الدولہ کا انتخاب کیا اور آپ نے اس کے اندر چھپی ہوئی دینی حمیت اور اسلامی غیرت کو دیکھ لیا۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا اور اس کے اندر کی ان مخفی چنگاریوں کو فروزاں کرنے کی پوری پوری کوشش کی جو اس کے دل و دماغ کی خاکستر میں دبی ہوئی تھیں۔ چنانچہ خلیق احمد نظامی نے حضرت شاہ صاحبؒ کے جو سیاسی مکتوب شائع کیے ہیں، ان میں سے ایک مکتوب میں حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد سلام محبت مشام واضح ہو کہ نصرت مسلمانوں کے لیے یہاں دعا کی جا رہی ہے اور سروش غیبی سے آثار قبول محسوس ہوتے ہیں۔ امید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ہاتھ پر دینی طریقۂ جہاد کو زندہ کر کے اس کے برکات اس دنیا و آخرت میں عطا فرمائے گا۔'' انه قريب مجيب.

(سیاسی مکتوبات: ص۲۰)

حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی خطوط میں ان کو بڑے مفید مشورے دیئے اور ان کو اس بات کی تلقین کی بلکہ تاکید کی کہ ماضی کی غلطیوں کا اعادہ کرنے سے اجتناب و احتراز کیا جائے اور ان غلطیوں سے بھی اپنے آپ کو باز رکھا جائے جو نصرت اور تائید خداوندی سے روکتی ہیں۔ چنانچہ اگلے ہی صفحہ پر ایک مکتوب میں حضرت شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''جب افواج شاہی کا گذر دہلی میں ہو تو اس وقت اس بات کا پورا

پورا انتظام واہتمام ہونا چاہیے کہ شہر سابق کی طرح ظلم سے پامال نہ ہو جائے، دہلی والے کئی مرتبہ لوٹ مار، ہتک عزت اور بے آبروئی کا تماشا دیکھ چکے ہیں، اسی وجہ سے مطلب برآری اور مقاصد میں تاخیر پیش آرہی ہے۔ آخر میں مظلوموں کی آہ بھی اثر رکھتی ہے۔ اگر اس بار آپ چاہتے ہیں کہ وہ کام جو تشنۂ تکمیل تھے وہ مکمل ہو جائیں تو اس بات کی پوری تاکید اور پابندی ہونی چاہیے کہ کوئی فوجی دہلی کے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں سے جو ذمی کی حیثیت رکھتے ہیں، تعرض نہ کرے۔'' (شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات: ص ۲۱)

حضرت شاہ صاحبؒ کو نواب نجیب الدولہ سے ایک خاص قسم کا تعلق خاطر تھا آپ اس کے لیے بہت دعائیں فرماتے۔ اس کو ہر قسم کی تسلی دیتے اور اس کی فتح و کامرانی کے لیے شام و پگاہ دعا میں مشغول رہتے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے نواب نجیب الدولہ ہی کو احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان بلانے کی دعوت دینے کے لیے ذریعہ بنایا۔ ان کے نام براہ راست خط لکھنے کے علاوہ ان سے بھی خطوط لکھوائے اور ان کو بار بار تاکید کی۔ نواب نجیب الدولہ نے حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے آٹھ سال بعد 31 اکتوبر 1770ء کو انتقال کیا۔

احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آنے کی دعوت:

حضرت شاہ ولی اللہؒ کئی سالوں سے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ رہے تھے کہ ارکانِ سلطنت اور امراء دربار بدعمل اور بدکردار ہو گئے ہیں اور حکمران خاندان کی روز افزوں نااہلی اور بدکرداری سے آپ نے دو باتیں کو ذہن میں رکھ لیں۔ ایک یہ کہ اس وقت کی پہلی ملکی ضرورت یہ ہے کہ اس بدنظمی اور طوائف الملوکی کو جلد از جلد دور کیا جائے جس سے نہ تو اہل ملک کی عزت و آبرو اور جان و مال محفوظ ہے اور نہ ہی ملک میں کوئی تعمیری اور بہتری کا کام ہوسکتا ہے۔ اس انتشار، پریشان حالی اور افراتفری اور بے یقینی کی دائمی فضاء کی ذمہ داری تین گروہوں پر ہے جو نہ کسی ایسے ملک میں حکومت کا تجربہ رکھتے تھے جس

میں مختلف مذاہب، اقوام اور تہذیبیں صدیوں سے رائج تھیں اور جس کے انتظام کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے ایک اعلیٰ درجہ کا احساس ذمہ داری، قوت ضبط وتحمل، بالغ نظری، دور بینی، دور اندیشی اور فراخ دلی ضروری تھی۔ موجودہ حکمران ان تمام صفات سے عاری تھے۔ نہ اس کے پاس ملک کو اعتدال وسکون عطا کرنے، اہل ملک کا اعتماد بحال کرنے اور نظم ونسق کو بہتر بنانے کے لیے کوئی جامع منصوبہ تھا۔ جو تین انتشار پسند اور جنگجو گروہ تھے وہ بھی حکمرانی کی صفات سے یک قلم عاری تھے، اس لیے آپ نہایت ضروری سمجھتے تھے کہ ان تینوں طاقتوں خصوصی طور پر مرہٹوں کی چیرہ دستیوں اور ستم رانیوں سے ملک کو محفوظ و مصئون کر دیا جائے۔ پھر دوسرا خطرہ سکھوں اور جاٹوں کی شکل میں تہذیب وتمدن اور دولت وثروت کے ان مرکزوں کو بلائے ناگہانی کی طرح پیش آتا رہتا تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور ان سے نجات حاصل کرنے کی تدابیر پر غور وفکر کر رہے تھے۔ ان تمام خطرات کو دور کرنے اور ان گروہوں کی بلائے ناگہانی کے لیے موجودہ ارباب اقتدار نااہل تھے۔ یہ سب حضرات بدنظمی اور نشست وانتشار کا شکار تھے۔ ان میں وہ عسکری صفات مفقود تھیں جو ان خطرات کو دور کر سکیں۔ شاہ صاحبؒ ایک ایسے عسکری قائد کی تلاش میں تھے جو نئی جنگی طاقت سے معمور تو ہو لیکن مخمور نہ ہو۔ اس میں نہ صرف شجاعت و بہادری اور سپہ گری کے اوصاف موجود ہوں بلکہ اس میں ایمانی غیرت اور دینی اہمیت بھی ہو۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ ارباب اقتدار اور ملک کے اہل سیاست کو باہمی رقابتیں اور پرانے کینے اور دشمنیاں گھن کی طرح کھا رہی تھیں جن کی موجودگی میں ان لوگوں سے کسی ایسے بلند تر مقصد کی تکمیل کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی جس سے ملت کا فائدہ، اسلام کی تقویت اور ملک کی حفاظت مقصود ہو۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی نظر میں ایک ذریعہ اور واسطہ کی حیثیت سے نواب نجیب الدولہ کی افادیت تھی لیکن حالات کچھ اس قسم کے سنگین ہو چکے تھے کہ حالات کی تبدیلی کے لیے وہ بھی تنہا کافی نہ تھے اور ان کے ذریعہ ان طاقتوں کو نہیں توڑا جا سکتا تھا جنہوں نے اپنی عسکری قوت کو اتنا بڑھا لیا تھا کہ ملک کی کوئی واحد فوجی طاقت ان کو شکست نہیں دے سکتی تھی۔ اس کے لیے ایک تازہ دم قائد کی ضرورت تھی جو اگرچہ بیرونی ہو لیکن اس ملک کے لیے اجنبی اور نو وارد نہ ہو۔ وہ اس ملک

کے لوگوں کے راہ و رسم، مزاج اور کمزوریوں سے بخوبی آشنا ہو اور اس ملک کے نشیب و فراز سے بھی کما حقہ واقف ہو، پھر اس وہ بات کا حوصلہ اور ہمت بھی رکھتا ہو کہ اس ملک کی جنگ جو اور باشندگان ملک کے لیے سب سے خطرناک اور اذیت ناک قوم کے حملوں سے محفوظ کر کے عنانِ حکومت اپنے پاس نہ رکھے بلکہ یہیں کے حکمران خاندان کے کسی اہل اور باصلاحیت فرد یا کسی اور نیک اور باصلاحیت شخص، امیر یا وزیر کے سپرد کر کے خود واپس چلا جائے۔ یہی حب الوطنی اور ملی مفاد کا تقاضا تھا۔

ہر نازک اور دشوار کام کے دو پہلو ہوا کرتے ہیں۔ ایک پہلو منفعت کا اور دوسرا مضرت کا۔ ان سب چیزوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرت شاہ ولی اللہ کی نگاہِ انتخاب احمد شاہ درّانی (1723-1772ء) والی قندھار پر پڑی۔ یہ اگرچہ بیرونی تھا لیکن ہندوستان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اس کی پیدائش ملتان کی تھی (مقالہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام) چنانچہ اب تک وہاں ایک سڑک ابدالی روڈ کے نام پر موجود ہے۔ پھر اس نے 1747ء سے 1769ء تک برصغیر پاک و ہند پر نو حملے کیے تھے۔ پانی پت کی جنگ اس نے حضرت شاہ صاحبؒ اور نواب نجیب الدولہ کی دعوت پر لڑی تھی، وہ چھ مرتبہ ہندوستان آ چکا تھا اور یہاں کے ملکی نشیب و فراز، یہاں کے باشندوں کے مزاج سے بخوبی آشنا اور امراء اور اراکین سلطنت کے رجحانات سے واقف تھا۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے بہت خوبیاں رکھی ہوئی تھیں اور جرنیلوں کی خرابیوں سے وہ ناآشنا تھا۔ چنانچہ ایک انگریز مؤرخ اور دانش ور نے لکھا ہے

> "مشرقی ممالک کی بہت سی خرابیوں اور نقائص سے احمد شاہ بالکل مبرا تھا۔ شراب نوشی اور افیون وغیرہ سے وہ کلی طور پر احتراز و اجتناب کرتا تھا۔ لالچ اور منافقانہ حرکتیں اسے اچھی نہیں لگتی تھیں۔ مذہب کا بہت پابند تھا اس کی سادہ اور باوقار عادات نے ہر شخص کے دل میں اس کی جگہ پیدا کی ہوئی تھی اور اس کو ہر دل عزیز بنایا ہوا تھا۔ اس تک پہنچنا آسان تھا۔ وہ عدل و انصاف کا اپنے فیصلوں میں خاص خیال رکھتا تا کہ کسی سے کوئی زیادتی نہ ہو۔ اس

وجہ سے کبھی کسی نے اس کے فیصلہ کی شکایت نہیں کی تھی۔

(History fo the Aghans ماخوذ از سیاسی مکتوبات: ص ۲۲۵)

ڈاکٹر گنڈا سنگھ کی ایک کتاب احمد شاہ ابدالی کے حالات میں چھپ چکی ہے۔ اس میں اس کی اخلاقی اور عسکری خوبیوں کو ذکر کیا گیا ہے۔ احمد شاہ نے بڑی خوبی اور کامیابی کے ساتھ منتشر افغانوں کی شیرازہ بندی کی، عدل و انصاف پر مبنی قوانین جاری کیے، ملک میں کرپٹ اور بددیانت لوگوں اور بیوروکریسی کے لیے محکمۂ احتساب قائم کیا۔ وہ مکارم اخلاق، شرافت نفس اور سپہ گری کے فنون سے واقف و آشنا تھا۔ اسے علم و ادب کا ذوق و شوق بھی تھا حالانکہ وہ ایک سپاہی تھا۔ وقار و رعب ہونے کے باوجود وہ اپنی قوم میں محبوب و مانوس تھا۔ رحم دل، فیاض اور مذہبی رواداری کا حامل تھا۔ اس نے بعض ایسی سنتوں کا احیاء کیا جن کا افغان معاشرہ میں نام لینا بھی جرم تھا جیسے نکاح بیوگان۔ وہ تعلیم یافتہ اور اہل قلم ہونے کے ناطے اپنی روحانی ترقی کا متمنی رہتا تھا اور یہی سب خوبیاں اپنی قوم میں دیکھنا چاہتا تھا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو احمد شاہ ابدالی کے حالات از ڈاکٹر گنڈا سنگھ۔ اصل کتاب انگریزی میں ہے)

پھر شاہ صاحبؒ کے زمانہ میں احمد شاہ ابدالی چھ مرتبہ ہندوستان آ چکا تھا۔ ان حملوں میں اگرچہ وہ اپنی فوجی طاقت کا مظاہرہ کر چکا تھا، لیکن اس کے علاوہ وہ اور کوئی مفید کام انجام نہ دے سکا تھا۔ اگرچہ اس کی فوج نے ان حملوں میں اسلامی اصولوں کی پابندی نہیں کی تھی جس کی وجہ سے شاہ صاحبؒ اور ان کے متعلقین کو مصائب اور پریشانی برداشت کرنی پڑتی تھی، لیکن شاہ صاحبؒ کو اور کوئی ستارۂ امید بھی نظر نہیں آتا تھا۔ ہر طرف سے ہر پھر کر نظر احمد شاہ ابدالی ہی پر پڑتی تھی اور آپ کو امید بھی تھی کہ فتح و فیروز مندی احمد شاہ کے قدم چومے گی۔ ایک مرتبہ تو ایک شخص کے سوال کے جواب میں کچھ لگی لپٹی کہے بغیر فرمایا: ''دریں ملک غلبہ کلی وے خواہد شد'' یعنی اس ملک میں اس کا پورا پورا غلبہ ہوگا۔ ایک مرتبہ شیخ محمد عاشق پھلتی کے سوال پر ارشاد فرمایا:

''جو معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ احمد شاہ درّانی اس ملک میں پھر آئے گا اور ان کفار کو زیروزبر کر کے رکھ دے گا۔ باوجود ان مظالم

کے جو وہ کر رہا ہے اس کو اسی لیے اب تک اللہ نے باقی رکھا ہے۔"

(سیاسی مکتوبات: ص ۲۶)

مختصر یہ کہ حضرت شاہ صاحبؒ کو احمد شاہ ابدالی سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں، اور انہیں امید تھی کہ وہ اس غیر یقینی صورت حال سے ملک کو نکالے گا۔ دہشت گردوں کا قلع قمع کر کے اس ملک کو شاہی خاندان کے کسی نسبتاً لائق تر آدمی کے حوالہ کر دے گا۔ شاہ صاحبؒ اس کے بارے میں ایک پیش گوئی بھی کر دی تھی کہ "ابدالی یہاں ٹھہرے گا نہیں بلکہ اولاد ملوک میں سے کسی کے حوالے ملک کو کر کے چلا جائے گا۔" (مکتوبات: ص ۳۰)

نہایت غور و فکر اور سوچ و بچار کے بعد بالآخر حضرت شاہ صاحبؒ نے احمد شاہ ابدالی کو خطوط لکھوائے۔ پھر خود ایک نہایت پرزور اور پر اثر خط لکھا جو حضرت شاہ صاحبؒ کی سیاسی بصیرت، اخلاقی جرأت، دینی غیرت اور زور انشاء کا آئینہ دار ہے۔ آپ نے اس خط میں برصغیر پاک و ہند کی موجودہ صورت حال اور اس کے مختلف صوبوں کا نظم ونسق اور ملک کی مختلف نسلی اور مذہبی گروہ کی طاقت، مسلمان بادشاہوں کی سیاسی غلطیاں اور ان کی کوتاہ نظری، دہشت گرد گروہوں کا طاقت پکڑنا جن میں مرہٹوں اور جاٹوں کا آپ نے خصوصی طور پر ذکر کیا اور پھر ان لوگوں کے بار بار حملوں کی وجہ سے مسلمانوں کی مظلومیت کا ایسا نقشہ کھینچا اور اس باغیرت اور باحمیت مسلمان بادشاہ کو جو اس وقت ہندوستان سے لے کر ایران تک کی سب سے بڑی منظم طاقت کا مالک تھا، مرہٹوں اور جاٹوں سے مسلمانوں کی جان بچانے اور لڑکھڑاتی ہوئی مغلیہ سلطنت کو اس کے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اسے لکھا کہ

"اس زمانہ میں ایسا بادشاہ جو صاحب اقتدار اور صاحب شوکت ہو اور کفار اور دشمنانِ دین کے لشکر کو شکست دے سکتا ہو، اور دور اندیش ہونے کے ساتھ ساتھ جنگ آزما بھی ہو آنجناب کے سوا اور کوئی اس وقت موجود نہیں ہے۔"

اس خط میں آپ نے مزید لکھا:

"ہم بندگان الٰہی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو شفیع بناتے ہیں اور

خدائے عزوجل کے نام پر التماس کرتے ہیں کہ آپ اپنی ہمت مبارک اور توجہ اس طرف منعطف فرمائیں اور کفار اور دشمنان اسلام سے مقابلہ کریں تاکہ خدائے عزوجل کے یہاں بہت بڑا ثواب جناب کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے اور مجاہدین فی سبیل اللہ کی فہرست میں نام درج ہو جائے۔ دنیا میں بے حساب غنیمتیں ملیں اور مسلمان کفار کے ہاتھوں خلاصی پا جائیں۔''

پھر آپ نے ان مرہٹوں کے بارے میں ایک سیاسی مبصر کی طرح ان کا جائزہ پیش کیا جن کی دلیری، جرأت اور شجاعت کی دھاک لوگوں کے دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی اور اس وجہ سے لوگ انہیں ناقابل تسخیر سمجھتے تھے۔ آپ نے مرہٹوں کے بارے میں لکھا:

''قوم مرہٹہ کو شکست دینا آسان کام ہے بشرطیکہ غازیانِ اسلام کمر ہمت باندھ لیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قوم مرہٹہ خود قلیل ہے لیکن اس گروہ کثیر ان کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ایک گروہ میں سے ایک صف کو بھی اگر درہم برہم کر دیا جائے تو یہ قوم منتشر ہو جائے گی اور اصل قوم اسی شکست سے ضعیف ہو جائے گی۔ چونکہ یہ قوم قوی نہیں ہے اس لیے ان کا تمام تر سلیقہ ایسی کثیر فوج جمع کرنا ہے جو چیونٹیوں اور ٹڈیوں سے زیادہ ہو۔ دلاوری اور سامان حرب کی بہتات ان کے یہاں نہیں ہے۔'' (شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات: ص ۸۶)

حضرت شاہ صاحبؒ کی ہدایت کے مطابق اور نواب نجیب الدولہ کے خطوط کے سبب اور پھر شاہ صاحبؒ کے طویل اور مؤثر خط کے باعث احمد شاہ ابدالی نے 1759ء میں مرہٹوں کے زور کو توڑنے اور ان کی بڑھتی ہوئی طاقت کو کچلنے اور نجیب الدولہ اور شجاع الدولہ کی مدد کرنے کے لیے ہندوستان کا قصد کیا۔ ایک سال تو مختلف جھڑپوں میں گزر گیا۔ بالآخر 14 جنوری 1761ء کو پانی پت کے میدان میں مرہٹوں اور افغانوں اور ہندوستانی اسلامی متحدہ محاذ کے درمیان وہ فیصلہ کن جنگ ہوئی جس نے ہندوستان کی تاریخ کا رخ بدل کر رکھ دیا اور مرہٹوں کو ہندوستان کے سیاسی نقشے سے

نکال باہر کیا۔ چنانچہ اس بارہ میں شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ نے لکھا ہے:

''لڑائی میں بڑا گھمسان ہو گیا، مگر اب بھی مرہٹوں کا پلہ بھاری تھا۔ احمد شاہ نے اپنے بھگوڑے سپاہیوں کو گھیر کر قتل کرنے کا حکم سنایا اور یہ کہہ دیا جو بھاگے گا مارا جائے گا۔ بعد اس کے اس نے اپنی صف کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ ایک سپاہ کو اپنی بائیں طرف دشمن کے بازو پر حملہ کا حکم دیا۔ اس تدبیر کا تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھا۔ قلب سپاہ میں بھاؤ، بسواس راؤ گھوڑوں پر سوار لشکر کو لڑا رہے تھے۔ خنجر اور کھانڈے بازی ہو رہی تھی کہ یکایک خدا معلوم کیا ہوا کہ مرہٹوں کے لشکر کا قدم میدان جنگ سے اٹھ گیا۔ قدم کا اٹھنا تھا کہ میدان جنگ کا ان کے مردوں سے بھرنا تھا۔ لشکر اسلامیہ نے ان کا تعاقب بڑے جوش و خروش سے ہر جانب میں پندرہ پندرہ بیس بیس میل تک کیا اور مرہٹوں کو مار مار کر ڈھیر لگا دیا۔ جو مرہٹے ان دشمنوں کے ہاتھ سے بچ گئے ان کو گنواروں نے مار ڈالا۔ بسواس راؤ اور بھاؤ مارے گئے جن کو جی سیندھیا کو کسی درّانی نے چھپا رکھا تھا، وہ بھی تلاش کرنے سے پکڑا گیا اور مارا گیا۔ ابراہیم خان گاردی بھی قید ہوا۔ ایک ہفتہ کی موت نے اس کے زخموں پر بھی مرہم رکھا۔ شمشیر بہادر بھی بھاگتے ہوئے مارے گئے۔ مالوہ میں طہار راؤ جان بچا کر نکل گیا۔ آپا جی سیندھیا بھی لنگڑا ہو کر وہاں جا پہنچا اور دوسرداروں کے سوا کوئی اور نامور سردار نہیں بچا۔ مرہٹوں کو ایسی شکست کبھی نہیں ہوئی تھی نہ ایسی مصیبت پڑی تھی۔ اس شکست سے ساری قوم کا دل پژمردہ اور افسردہ ہو گیا۔ اس صدمہ سے بالا جی بھی تھوڑے دنوں کے بعد مر گیا۔ جب سے شکست کی خبر سنی تھی ایک مندر میں بیٹھ کر سنسکرت پڑھنا اختیار کر لیا تھا۔'' (تاریخ ہندوستان: جلد ۹ ص ۳۹)

مرہٹوں کی طاقت جس کا عوام الناس کے دلوں پر ہیبت اور رعب طاری تھا چشم زدن میں کافور کی طرح اڑ گئی۔ سرجادوناتھ سرکار نے لکھا ہے کہ مہاراشٹر میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں صفِ ماتم نہ بچھ گئی ہو۔ جرنیلوں کی پوری نسل ایک ہی معرکہ میں ختم ہوگئی۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے خود اور نواب نجیب الدولہ کی معرفت لکھنے سے قبل جو کچھ سوچا تھا اور ذہن میں جو کچھ نقشہ بنایا تھا اور خاکے میں جو رنگ بھرے تھے وہ سب درست ثابت ہوئے۔ احمد شاہ ابدالی وقت کا یہ ضروری کام انجام دے کر قندھار واپس چلا گیا۔ چنانچہ مولوی ذکاء اللہ نے لکھا ہے:

”بعد اس فتح کے احمد شاہ پانی پت سے نواح دہلی میں آیا اور چند روز متوقف رہا۔ ہندوستان کا بادشاہ شہزادہ عالی گوہر یعنی شاہ عالم کو مقرر کیا اور بادشاہ سے شجاع الدولہ کے وزیر نجیب الدولہ کے امیر الامراء ہونے کی سفارش کی۔ شاہ عالم اس وقت دہلی میں نہ تھا۔ اس لیے اس کے بیٹے جواں بخت کو بادشاہ کا نائب دہلی میں مقرر کیا اور نجیب الدولہ کو منتظم مقرر کیا، اور شجاع الدولہ کو خلعت دے کر اودھ اور الٰہ آباد کے صوبوں پر بھیج دیا اور خود قندھار کو چلا گیا۔

(تاریخ ہندوستان: جلد ۹ ص ۳۰۹)

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے کہ

”جنگ پانی پت کے بعد احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم کو دہلی بلانے کے لیے بے حد کوشش کی اور اپنا آدمی بھیجا۔ جب بھی نہ آیا تو احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم کی والدہ زینت محل سے خط لکھوایا۔ احمد شاہ نے شاہ عالم کو بلانے کی کوشش اس لیے کی تھی کہ وہ انگریزوں کے اثر سے نکل آئے اور دہلی آکر احمد شاہ کی موجودگی میں اپنی طاقت کا استحکام کرے۔“ (سیاسی مکتوبات: ص ۴۵)

مؤرخین نے لکھا ہے کہ شاہ عالم نے اپنی پست ہمتی اور کوتاہ نظری سے یہ سنہری موقع کھو دیا، اور ساری کوششوں اور اپنی والدہ زینت محل کے مشفقانہ خط کے

باوجود پورے دس برس کے بعد 1771ء کے آخر میں 25دسمبر 1771ء کو قلعہ معلیٰ میں داخل ہوا۔ اس کے بعد اس کے اور اس کے جانشینوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا وہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔ انگریزوں نے اپنی دانش مندی اور سیاسی ذہانت سے 1857ء کو پورے ہندوستان پر مکمل قبضہ کرلیا اور مغلیہ خاندان کے افراد کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے کہ

''مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں کی تحریک میں اتنی وسعت اور ہمہ گیری نہ تھی کہ وہ ہندوستان کی مرکزیت اور وحدت کو برقرار رکھ نہ سکنے کی تدبیر سوچتی۔ شاہ صاحبؒ اپنے مجوزہ نظام میں اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور اورنگ زیب کے زمانہ کی مرکزیت اور سلطنت ہند کے اقتدار اعلیٰ کو بحال دیکھنا چاہتے تھے لیکن اس طرح سے کہ مطلق العنان بادشاہوں کے بجائے انصاف کی حکومت ہو۔

(سیاسی مکتوبات:ص ۴۷)

''اگر سلطنت میں تھوڑی سی بھی جان ہوتی تو وہ جنگ پانی پت کے نتائج سے فائدہ اٹھا کر اپنے اقتدار کو ہندوستان میں پھر کچھ صدیوں کے لیے قائم کرسکتی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت اس وقت بے روح جسم کی مانند تھی۔ جنگ پانی پت کا اصلی فائدہ فاتحین جنگ پلاسی نے اٹھایا۔'' (سیاسی مکتوبات:ص ۴۵)

شاہ ولی اللہؒ کا انقلابی نعرہ:

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس زمانہ میں جو انقلاب برپا کیا وہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی زندگی میں تھا جس کے لیے انہوں نے یہ نعرہ لگایا **''فک کل نظام''** یعنی سیاسی اور سماجی زندگی کے ہر شعبہ میں انقلاب برپا ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے حضرت شاہ صاحبؒ نے اقتصادی اور سیاسی زندگی کے بارے میں قرآن وسنت کی روشنی میں کچھ

اصول وضع فرمائے۔ اقتصادی دس اصول تو ہم نے گذشتہ صفحات میں بیان کر دیئے ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے احمد شاہ ابدالی کو جو خط لکھے یا نواب نجیب الدولہ سے لکھوائے اور احمد شاہ نے ہندوستان پر حملہ کر کے مرہٹوں کو پانی پت کی لڑائی میں شکست فاش دی جن سے ان کی کمر ہمت ٹوٹ گئی۔ حضرت شاہ صاحبؒ صرف دہشت گردوں اور دشمنان دین کا صفایا ہی نہیں چاہتے تھے بلکہ خود مسلمانوں کی معاشی، معاشرتی اور اقتصادی و سیاسی زندگی میں ایک انقلاب لانا چاہتے تھے جس سے معاشی نا انصافی اور اقتصادی عدم مساوات کا دور دورہ ختم ہو۔ چنانچہ بعض حضرات کا خیال ہے کہ احمد شاہ ابدالی کو نظام الملک آصف جاہ، حافظ رحمت خان اور نجیب الدولہ روہیلہ سرادروں نے ہندوستان پر حملہ کی دعوت دی تھی تا کہ اپنے سیاسی حریف شیعہ نوابوں اور مرہٹوں وغیرہ کے مقابلہ میں ان کو قوت حاصل ہو۔ اور سلطنت دہلی کی وزارت عظمیٰ ان کے ہاتھ آ جائے، لیکن پروفیسر خلیق احمد نظامی، استاد شعبۂ تاریخ علی گڑھ یونیورسٹی نے حضرت شاہ صاحبؒ کے خطوط کا جو مجموعہ شائع کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب نجیب الدولہ کو آپ کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس مجموعہ میں ایک خط حضرت شاہ صاحب کا بھی احمد شاہ ابدالی کے نام ہے۔ اگر وہ خط درست اور صحیح ہے تو احمد شاہ ابدالی سے امداد طلب کرنے کا مقصد صرف یہ ہو سکتا ہے کہ اس دور کی افراتفری اور شب و روز کی ان آفتوں کا جو مرہٹوں جاٹوں، سکھوں، میواتیوں اور کبھی کسی اور گروپ کی طرف سے دہلی پر آتی رہتی تھیں، وقتی تدارک ہو جائے کیونکہ "فک کل نظام" یعنی سماجی اور سیاسی زندگی کے ہر شعبہ میں انقلاب لانا جس کا نصب العین ہو، وہ بادشاہوں کی تبدیلی پر راضی نہیں ہو سکتا۔ اصل تبدیلی تو نظام کی تبدیلی ہے۔ ایسے شخص کے لیے بادشاہوں کی تبدیلی فتح و شکست کے سلسلہ کی کڑی تو بن سکتی ہے، سفر انقلاب کی آخری منزل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ یہ وقتی ہنگامے یکے بعد دیگرے ختم ہو گئے اور حضرت شاہ صاحبؒ کی تحریک کا انقلابی قافلہ برابر چلتا رہا۔

ہو سکتا تھا کہ اس پر آشوب دور میں جنگجو سرداروں کی طرح حضرت شاہ صاحبؒ بھی تلوار ہاتھ میں لے کر کھڑے ہو جاتے اور فوج بھرتی کر کے کسی شہر پر قبضہ کر لیتے،

لیکن اس طریقہ سے وہ ہمہ گیر انقلاب نہ برپا کر سکتے جوان کی زندگی کا نصب العین تھا بلکہ آپ بھی کسی حکمران کا ضمیمہ بن کر رہ جاتے۔ آپ کے نصب العین **"فک کل نظام"** کی تکمیل اسی وقت ہوسکتی تھی جب رائے عامہ آپ کے اصلاحی نظریات کو اپنا لیتی۔

یہ نعرہ آپ نے اس وقت لگایا جب ہندوستان کی اقتصادی، سماجی اور سیاسی زندگی تباہ حالی کے دہانہ پر پہنچ چکی تھی۔ اس کی وجوہات بھی حضرت شاہ صاحبؒ نے ان الفاظ میں بیان کی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ

> "ایران اور روم کے ماضی کی تاریخ ہمارے لیے ایک روشن مثال ہے، اور جو کچھ آپ اپنے ملک میں دیکھ رہے ہیں اس سے ایران اور روم کی حالت کا اندازہ کر لیں۔
>
> دولت اور ثروت کے ساتھ فلسفہ اور سائنس کی تحقیقات نے ایجادات کا راستہ کھولا۔ نئی نئی صنعتیں عالم وجود میں آئیں اور ملک اپنے دور میں تمدن کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ پر پہنچ گیا، لیکن بدقسمتی سے اہل ثروت و دولت اور حکمران طبقہ میں عیش و عشرت، فیشن اور وجاہت یا اقتدار پرستی اور ایک دوسرے کے مقابلہ میں تفاخر کا مرض پیدا ہو گیا یہاں تک کہ اس بات پر فخر ہونے لگا کہ کس کا تاج زیادہ قیمتی ہے اور کس کے سریر سلطنت میں زیادہ زروجواہر لگے ہوئے ہیں۔
>
> ارباب حکومت کے اس ٹھاٹھ باٹھ نے معاشرہ کا مزاج بگاڑ کر رکھ دیا۔ نئے نئے فیشن، امیرانہ شان و شوکت اور شاہانہ تکلفات نبھانے کے لیے ہر ایک صاحب اقتدار اپنے ماتحت کو لوٹنے لگا۔ زمیندار اور جاگیردار کاشت کاروں کا خون چوسنے لگے اور جو مزدوروں پر اختیار رکھتے تھے انہوں نے غریب مزدوروں کو نوچنا شروع کر دیا۔ اب اس با اقتدار طبقہ کی تمام عملی اور فکری طاقتیں ترقی ملک و ملت کے بجائے عیش و عشرت، شاہانہ تکلفات، نفع

اندوزی، ذخیرہ اندوزی اور استحصال بالجبر پر صرف ہونے لگیں، اور ماتحت طبقہ اس قدر گر گیا کہ اس کی زندگی کھیت جوتنے والے بیلوں اور بوجھ اٹھانے والے گدھوں کی مانند ہو گئی۔ زرکشی اور زراندوزی کے لیے نئے نئے قوانین ایجاد ہوئے۔

مزدوروں اور کسانوں کا طبقہ اگر اس سے سرتابی کرتا تو مجرم بن کر طرح طرح کی سزاؤں میں مبتلا ہوتا، اور اگر سزاؤں سے بچنا چاہتا تو لامحالہ بار بردار گھوڑوں اور گدھوں کی زندگی پر مجبور ہوتا۔ یہ دونوں طبقے اپنے اپنے حالات میں ایسے غرق ہو گئے کہ پیدائش انسان کا حقیقی مقصد کسی کے سامنے بھی نہیں رہا۔ ایک طبقہ کو حد سے بڑھے ہوئے عیش اور دولت کی چمک دمک نے اندھا کر دیا، اور دوسرا طبقہ پیٹ کی فکر میں ایسا سرگرداں ہوا کہ فکر مستقبل کی صلاحیت بھی ختم کر بیٹھا۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ تمام دولت سمٹ کر چند افراد کے ساتھ مخصوص ہو گئی جس کا سربراہ بادشاہ تھا۔

''اقتصادی عدم توازن اور طبقۂ اعلیٰ کی شان و شوکت اور عیش پرستی نے ایک تیسرا طبقہ پیدا کر دیا۔ یہ تن آسان، آرام طلب، سرکار پرست اور کاسہ لیس اور خوشامدیوں کا طبقہ تھا جو بادشاہ اور شاہ پرستوں کے گرد جمع ہو گیا تھا، اور مختلف عنوانات سے رقمیں وصول کرتا رہتا تھا۔ ان میں بہت سے صاحب فن اور اہل علم بھی ہوتے تھے اور فن اور علم کے نام پر روپیہ وصول کرتے تھے، مگر ان کا مطمح نظر ملک کی خدمت نہیں بلکہ اپنی ذاتی اغراض، ذاتی جاہ و جلال اور ذاتی اقتدار ان کی جدوجہد کا نصب العین ہوتا تھا۔ کوئی اس نام سے روپیہ وصول کرتا تھا کہ وہ فن سپہ گری کا ماہر ہے۔ بہترین جرنیل یا کمانڈر ہے۔ کوئی اپنے علم و ہنر اور اپنی سیاست دانی کے نام پر روپیہ وصول کرتا تھا۔ خانقاہ نشینوں کی ایک جماعت تھی جو

تقدس کے نام پر وظائف حاصل کرتی تھی۔ ایک جماعت فنون لطیفہ اور ادب و شاعری کے نام پر رقمیں اینٹھتی تھی کہ شانِ خسروانہ یہی ہے کہ فنون لطیفہ کے ماہرین کی قدر کرتے ہیں۔

”بادشاہ یا امراء کا خوش کرنا، خوش گپیوں سے گرمی مجلس پیدا کرنا ایک فن قرار دے دیا گیا تھا اور اس فن کے ماہرین طرح طرح کے ڈھونگ رچا کر روپیہ وصول کرنے لگے تھے۔ شاہانہ آداب، درباری آداب ایک خاص فن بن گیا اور ایک گروہ اسی طرح اس نام پر رقمیں وصول کرنے لگا۔ یہ تمام جماعتیں جن کو لازمۂ تمدن مان لیا گیا تھا، درحقیقت مفت خوروں کے گروہ تھے جو ملک اور قوم کی خدمت کے بجائے اپنی اپنی صلاحیتیں مٹھی بھر شاہ پرستوں کی اغراض اور ان کی خوشنودی کے لیے صرف کرتے تھے اور ملک اور ملک کے مزدوروں اور کسانوں پر بار بنتے جا رہے تھے۔ اس طرح خدا کی تمام مخلوق دن بدن افلاس، فلاکت اور تباہ حالی میں مبتلا ہو کر روحانی فلاح و بہبود سے بھی محروم ہو رہی تھی یہاں تک کہ پورے ملک میں بھی کوئی شخص ایسا نہیں ملتا تھا جس کو عاقبت کی فکر ہو۔ اللہ تعالیٰ جو تمام مخلوق کا پروردگار ہے، اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تاکہ وہ روحانی اصلاحات کے ساتھ اقتصادی تباہ حالی اور بربادی بھی ختم فرمائیں اور معیشت و اقتصاد کے ایسے اصول تلقین فرمائیں جن سے اقتصادی امراض کے مسموم جراثیم کا قلع قمع ہو جائے۔

حضرت شاہ ولی اللہ اس مفہوم کو ذہن نشین کرانے کے لیے کہ اقتصادی حالات کا روحانی اصلاحات پر کیا اثر پڑتا ہے، ایک مثال پیش فرماتے ہیں۔ اس مثال سے یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ شاہ صاحبؒ جس حکومت کی حمایت کر سکتے ہیں، اس کا نقشہ ان کے نزدیک کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

”ایک ایسی قوم فرض کرو جس میں ملوکیت نہ ہو، شاہانہ شان و

شوکت اور عیش پرستی کے لوازمات سے محفوظ ہو۔ ہر شخص اقتصادی طور پر آزاد ہو اور ٹیکسوں کے بوجھ سے اس کی کمر دوہری نہ ہوئی ہو۔ ایسی قوم کو یہ فراغت میسر ہوگی کہ وہ دین وملت کے کام انجام دے سکے۔ اخلاقی اور روحانی ترقی حاصل کر سکے، لیکن اگر اس قوم کی گردن پر ملوکیت، شاہ پرستی اور سرمایہ کا بھوت سوار ہو جائے تو اس کے ہوش وحواس گم ہو جائیں گے، اور وہ انسان شرف وعظمت سے گر کر چوپاؤں کی زندگی پر مجبور ہو جائے گا جن کو رات دن پیٹ کی فکر رہتی ہے اور پھر بھی یہ جہنم بھرنے نہیں پاتا۔"

(حجۃ اللہ البالغہ: جلد اول باب اقامۃ الارتفاقات واصلاح الرسوم)

چند سیاسی اور انتظامی اصول:

حضرت شاہ صاحبؒ صرف بادشاہ تبدیل نہیں کرانا چاہتے تھے بلکہ ان کے وہ اصول تبدیل کرنا چاہتے تھے جو انہوں نے اور ان کے بڑوں نے اپنی سیادت اور قیادت قائم کرنے کے لیے وضع کر رکھے تھے۔ چنانچہ اقتصادیات ومعاشیات کے بارے میں آپ نے دس اصول اس وقت وضع کیے جب یورپ اور امریکہ کے ماہر اقتصادیات ان اصول سے ناآشنا تھے اور کارل مارکس اور اس کی کتاب داس کیپٹل ابھی وجود میں نہیں آئی تھی۔ ہر طرف سرمایہ دارانہ نظام کا دور دورہ تھا۔ امیر عیش وعشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے جب کہ غریب اور مزدور طبقہ رات کو بھوکے پیٹ سوتا تھا۔ اسی طرح حضرت شاہ صاحبؒ نے سیاسیات اور نظام حکومت کے بارے میں بھی کچھ بنیادی اصول دنیا کو فراہم کیے۔ فرماتے ہیں:

1- زمین کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ اور ظاہری نظام کے لحاظ سے ریاست (اسٹیٹ) ہے۔ باشندگان ملک کی حیثیت وہ ہے جو کسی مسافر خانہ میں ٹھہرنے والوں کی ہے۔ ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حق انتفاع میں دوسرے کی دخل اندازی قانوناً ممنوع ہو۔

2- سارے انسان برابر ہیں۔ کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے آپ کو مالک ملک، ملک الناس، مالک قوم یا انسانوں کی گردنوں کا مالک تصور کرے۔ نہ یہ کسی کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی صاحب اقتدار کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرے۔

3- ریاست کے سربراہ کی وہ حیثیت ہے جو کسی وقف کے متولی کی ہوتی ہے۔ وقف کا متولی اگر ضرورت مند ہو تو اتنا وظیفہ لے سکتا ہے کہ وہ ملک کے ایک عام باشندہ کی طرح اپنی زندگی گزار سکے۔

4- ہر انسان کے لیے خواہ وہ مزدور ہو یا کسان کہ روٹی، کپڑا، مکان اور ایسی استطاعت کہ نکاح کر سکے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کر سکے۔ بلالحاظ مذہب و نسل ہر ایک انسان کا یہ بنیادی اور پیدائشی حق ہے۔

5- اسی طرح مذہب، نسل یا کسی رنگ کے تفاوت کے بغیر عام باشندگان ملک کے معاملات میں یکسانیت کے ساتھ عدل و انصاف، ان کے جان و مال کی حفاظت، ان کی عزت اور ناموس کی حفاظت، حق ملکیت میں آزادی، حقوق شہریت میں یکسانیت ہر باشندہ ملک کا بنیادی حق ہے۔

6- زبان اور تہذیب کو زندہ رکھنا ہر ایک فرقہ کا بنیادی حق ہے۔

یہ تھا ''فک کل نظام'' کا مطلب کہ ہر غیر اسلامی نظام کو ختم کر کے زندگی کے ہر شعبہ میں اسلام کے نظام کو نافذ کیا جائے۔ اس کے لیے آپ نے ایک جماعت تیار کی، جس کا مرکز دہلی تھا جہاں علمی اور عملی تربیت ہوتی تھی۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کے سب سے بڑے صاحبزادے اور آپ کے جانشین شاہ عبدالعزیزؒ نے اس تحریک کو زندہ رکھا۔

دوسرا مرکز رائے بریلی کا وہ مشہور دائرہ تھا جو ''تکیہ شاہ علم اللہ'' کے نام سے مشہور تھا اور جو اودھ کے علاقہ میں قریباً نصف صدی پہلے سے تعلیم و تربیت کا سرچشمہ بنا ہوا تھا۔ سلطان ٹیپو مرحوم کا بھی اسی مرکز سے روحانی تعلق تھا۔ انگریزی اقتدار کے خلاف جب دہلی کے مرکز سے جہاد آزادی کا فتویٰ صادر ہوا تو رائے بریلی کے اسی مرکز سے وہ مشہور تحریک اٹھی جس کی قیادت حضرت سید احمد شہیدؒ نے سنبھالی تھی۔

1763ء میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی وفات ہوگئی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بڑے صاجبزادے شاہ عبدالعزیزؒ جن کی عمر اس وقت صرف 17 سال تھی ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ اب "فک کل نظام" یعنی ہمہ گیر نظام کا تصور جو حضرت شاہ ولی اللہ کی وفات تک صرف چند ذہنوں کی مخصوص امانت تھا، شاہ عبدالعزیزؒ کی وفات کے وقت وہ ملک کا عام جذبہ بن چکا تھا۔ ہزاروں نوجوان اس کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر چکے تھے اور اس کی صدائے بازگشت ہندوستان سے گزر کر ایشیا کے دور دراز ملکوں تک پہنچ چکی تھی۔

تحریک کے دو گروہ:

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ 6 مئی 1824ء کی صبح کو اس تلون مزاج دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئے، لیکن آپ کی وہ تحریک جس کی آبیاری کے لیے آپ نے اپنی زندگی کے تریسٹھ سال خرچ کیے، وہ آپ کی وفات کے بعد دو گروہوں میں منقسم ہوگئی۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے "ہمہ گیر انقلاب" کا جو بیج بویا تھا، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی آبیاری سے وہ ایک تناور درخت بن چکا تھا۔ چنانچہ تعلیم و تربیت اور ایک مخصوص قسم کی اخلاقی ٹریننگ جو اس نصب العین اور اس منزلِ مقصود تک پہنچنے کا بہت ضروری پروگرام تھا، اس کا حلقہ اتنا وسیع ہو چکا تھا کہ پورے ہندوستان میں قرآن و حدیث کا کوئی ایک قابل اعتماد عالم ایسا نہ تھا جس کا رشتۂ تلمذ بالواسطہ یا بلاواسطہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے دامن فیض سے وابستہ نہ ہو۔

عسکری تنظیم کے سلسلہ میں سید صاحبؒ کی زیر قیادت قریباً آٹھ سو مجاہدین حریت کی فوج تیار ہو چکی تھی جس کے ہر ایک رضا کار کے رجحانات و جذبات ولی اللہی اصول کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے اور وہ سیاسی اور سماجی انقلاب کی زندہ تصویر بن چکا تھا۔ "قافلہ کے پے در پے دوروں نے لاکھوں انسانوں کے دلوں میں جذبۂ انقلاب کی وہ حرارت پیدا کر دی تھی جس کو 1857ء کے قیامت خیز ہنگاموں کا خونین سیلاب بھی سرد نہ کر سکا۔

اس کی پاک باز زندگی اور مخلصانہ اخلاص نے لوگوں میں وہ گرویدگی پیدا کر دی تھی کہ جنازہ کی نماز جو ایک مرتبہ پڑھی جاتی ہے، اس علم وعمل کے شہنشاہ کے جنازے پر پچپیس (55) مرتبہ پڑھی گئی۔

اقتصادی سلسلہ میں شاہ ولی اللہؒ کا بنیادی اصول یہ ہے کہ معیار معیشت مساویانہ ہو۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ صاحب اس اصول کے یہاں تک پابند تھے کہ ساری عمر گاڑھے اور دھوتر کے کپڑے پہنے اور مرنے کے وقت وصیت کر دی کہ ان کا کفن بھی اسی کپڑے کا ہو جو وہ اپنی زندگی میں پہنا کرتے تھے۔ آپ نے تاکید فرمادی تھی کہ آپ کی وفات کی خبر بادشاہ کو نہ دی جائے کیونکہ آپ نہیں چاہتے تھے کہ بادشاہ آپ کے جنازہ میں شرکت کرے (حیات ولی: ۳۴۴) یہ وصیت اور تاکید اس وجہ سے نہیں تھی کہ بادشاہ کی ذات سے آپ کو نفرت تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ بادشاہ آپ کا نہایت احترام کیا کرتا تھا، اور آپ بھی بادشاہ کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آتے تھے، بلکہ اس وصیت کا اصل سبب وہ تنفر تھا جو خدا پرست مومن کو ملوکیت اور ملوکانہ شان وشوکت سے ہوتا ہے، اور جو ''ہمہ گیر انقلاب'' کا ایک جزو تھا۔

شاہ محمد اسحاق حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی زندگی ہی میں اس گروپ کے سربراہ اور انچارج کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہے تھے جو تعلیم وتربیت اور مرکزی تنظیم کا ذمہ دار تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ بھی آپ پر وہی اعتماد کرتے تھے جو صحیح جانشین پر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا شاہ عبدالعزیزؒ کی وفات کے بعد حضرت شاہ محمد اسحاق ہی جانشین قرار دیئے گئے۔

دوسرا گروپ جس کو فوجی خدمات اور امور خانہ سپرد تھے وہ بدستور حضرت سید احمد شہید کی زیر قیادت اپنے فرائض انجام دیتا رہا، بلکہ حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد پہلے سے زیادہ چست ہوگیا۔ حضرت سید احمد شہیدؒ نے فوجی خدمات کے سلسلہ میں جو کچھ کیا اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ اس بارے میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی کتاب سید احمد شہید کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ، حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ اور حضرت مولانا عبدالحی صاحبؒ نے اپنے دوروں سے پورے ہندوستان میں جو شعلے بھڑکائے تھے وہ

خون شہادت کے چھینٹوں سے سرد ہونے والے نہ تھے۔ یہ زمزمہ لاکھوں دلوں کو گرما چکا تھا اور بقول ولیم ہنٹر اب یہ تحریک کسی راہ نما کی موت وحیات سے بالکل مستغنی ہوگئی تھی۔

(ہمارے ہندوستانی مسلمان، ہنٹر ص ۳۴)

چنانچہ شہدائے بالاکوٹ کا خون ابھی جمنے نہیں پایا تھا کہ مجاہدین سرمست وکفن بردوش کا ایک گروہ ''ستھانہ'' میں جمع ہوا اور اپنا امیر منتخب کر کے سرنگوں جھنڈے کو دوبارہ سربلند کر دیا جو نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک لہراتا رہا اور ہزاروں پاک نفوس اس کی عزت وعظمت پر قربان ہوتے رہے۔ مختصر یہ کہ جہاد اور شہادت کی جو رسم سید صاحبؒ اور ان کے ساتھیوں نے جاری کی تھی وہ ایک لمحہ کے لیے بھی موقوف نہ ہوئی۔ بے شمار محبان وطن اور فداکاران حریت وہ تھے جو اگرچہ ترک وطن کر کے محاذ پر نہیں جا سکے تھے مگر ان کی نیک تمنائیں اور دلی ہمدردیاں مجاہدین کی ممد ومعاون رہی تھیں۔ ان کی امداد کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ایک بہت بڑے انگریز نے ولیم ہنٹر کو بتایا کہ اس کے بہت سے دیندار مسلمان ملازموں کا یہ عام قاعدہ تھا کہ وہ اپنی تنخواہوں کا ایک معین حصہ ستیانہ کیمپ کے لیے علیحدہ کر دیا کرتے تھے۔ (ہمارے ہندوستانی مسلمان: ص ۳۳)



جنگ آزادی اور علماء کا کردار

1757ء میں جنگ پلاسی ہوئی جس میں میر جعفر کی غداری کے باعث بنگال کے سپوت سراج الدولہ کو شکست فاش ہوئی اور اس کے پورے ایک سو سال بعد یعنی 1857ء میں جنگ آزادی میں شکست ہوئی جس کے نتیجہ میں انگریز سارے ہندوستان پر چھا گیا۔ اس شکست کے کیا اسباب تھے؟ ہمیں اس سے بحث نہیں لیکن اتنی بات مسلمہ ہے کہ یورپ کے یہ سفید فام جو دلوں کی سیاہی اور اپنی جلاد اور سفاک طبیعت کو چٹی چمڑی اور بھولی بھالی صورتوں میں چھپائے ہوئے تھے، اپنے کردار کی وحشت و بربریت پر بھی رنگ برنگ نقاب ڈالتے رہے، لیکن ہندوستانی کوتاہ اندیش حکمرانوں کی نگاہیں ان کی سیاسی چال بازیوں کے پس منظر تک نہ پہنچ سکیں اور وہ رنگ برنگ نقابوں کے نظر فریب نظاروں میں کچھ ایسے محو ہو گئے تھے کہ انداز قد و قامت کے بعد بھی پری اور دیو میں فرق نہ کر سکے۔ لیکن علمائے اسلام تو اول روز ہی سے اور اورنگ زیب عالمگیر سے قبل کے بادشاہ اور سربراہان مملکت اسی روز سے ہی جب واسکوڈی گاما کالی کٹ پہنچا تھا، ان کی اصل حقیقت سے آشنا ہو چکے تھے۔ وہ یہ سمجھ گئے تھے کہ یہ لوگ سوداگروں کے لباس میں قزاق ہیں۔ مغل اعظم جلال الدین اکبر نے ایک مرتبہ اپنے دربار میں پرتگیزی وفد کا اعزاز و اکرام کر کے اپنی بلند حوصلگی، سرچشمی اور اعلیٰ کردار کا ثبوت دیا لیکن اس کے ساتھ ہی جب پرتگیزی قزاقوں کے بارے میں شکائتیں پہنچیں تو گجرات اور مالوہ کے گورنروں کے ذریعہ ان کی گوش مالی بھی کرا دی۔ پھر جہانگیر کے عہد حکومت میں انگلستان کے نمائندے سر طامس رو کی قیادت میں ہندوستان پہنچے تو شاہی اعزاز و اکرام

کے ساتھ ان کا ستقبال کیا گیا، لیکن شاہجہان (شاہزادہ خرم) ان کے چہرے بشرے سے ان کی نیتیں تاڑ رہا تھا۔ اس کی کوشش بھی یہی تھی کہ یہ سفارت ناکام رہے۔ پھر جب شاہ جہان خود تخت حکومت پر براجمان ہوا تو اس نے اور اس کے بعد اس کے بیٹے اورنگ زیب نے جس طرح ان کو بار بار ہندوستان کی سرحدوں سے ہنکایا، پیش قدمی کرنے والوں کو سزائیں دیں، وہ اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ یہ فرمانروا نہایت بیدار مغز تھے اور وہ ان کے سبز قدموں کی نحوست سے غافل نہ تھے۔

یہ تو بیدار مغز فرمانروا تھے لیکن گوشۂ تنہائی میں بیٹھنے والے علماء اور درویش صفت لوگ بھی ان گوری چٹی چمڑی والوں کی اصلیت سے روز اول ہی سے آشنا ہو گئے تھے۔ چنانچہ عہد اکبر و جہانگیر کے سب سے بڑے عالم جن کو دنیائے معرفت نے ''مجدد الف ثانی'' کا خطاب دیا، ان کا ایک عارفانہ جملہ مشہور ہے جس میں انہوں نے کفر و عصیان کے بدترین نمونہ کے طور پر ''کافر فرنگ'' کا نام لیا ہے۔

''معرفت مرآں کس حرام است کہ خود را از کافر فرنگ بہتر داند۔''

مختصر یہ کہ عالمگیر اورنگ زیب سے پہلے کے بادشاہ اور علماء انگریزوں کی اندرونی حقیقت سے واقف تھے، اور اورنگ زیب کے بعد کے بادشاہ تو ان کی حقیقت سے آشنا نہ ہو سکے البتہ علماء اور مشائخ بخوبی جانتے تھے کہ یہ بحری قزاق ایک روز ضرور کوئی نہ کوئی گل کھلائیں گے۔ عالمگیر کی وفات کے بعد وہ دور آیا جو سلطنت مغلیہ کی جان کنی کا دور تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس ملک کی عزت و عظمت بھی حالت نزع میں گرفتار ہونے لگی، جس نے دوسو برس سے اپنی قسمت کے تارو پور مغل بادشاہت کے دامنوں سے باندھ دیئے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب مرکزیت فنا کے گھاٹ اتاری جا رہی تھی اور طوائف الملوکی کے عفریت برصغیر پاک و ہند کے چپہ چپہ پر رینگ رہتے تھے۔ اس دور میں لوگ خود اپنے آپ سے غافل ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنے مستقبل کو پہچاننا چھوڑ دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ وہ کچھ نہیں کر سکے جو کرنا چاہیے تھا۔ خود پرستی نے خود غرضی اور ذاتی مفاد کی ہوس جو قومی عظمت و وقار اور حیات اجتماعی کے لیے سرطان سے بھی زیادہ مہلک امراض ہیں اور جن کی وجہ سے طوائف الملوکی عروج پاتی ہے۔ انہیں مہلک

امراض نے ارباب اقتدار کی چشم بینا کو نابینا اور گوش سخن نیوش کو مدہوش اور اصم بنا دیا تھا۔ یہ ایک عجیب فلسفہ ہے کہ انسان جتنا زیادہ اپنی پرستش میں مشغول ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ وہ خود فراموش ہو جاتا ہے۔ ذاتی مفاد اور خود پرستی کے شوالے جو دکن، بنگال اور اودھ میں تعمیر کیے گئے تھے، ان کی خصوصیت یہ تھی کہ ان کے پجاری انگریزوں کو پہچاننے، سمجھنے اور بوجھنے کے باوجود اس پر مجبور تھے کہ سنی کو ان سنی اور دیدہ کو نادیدہ بنا دیں کیونکہ وہ اغراض جن سے آب و گل سے یہ شوالے تعمیر ہوئے تھے، ان کا تقاضا ہی یہ تھا، ورنہ یہ شوالے مسمار ہو رہے تھے۔

البتہ اس زمانہ میں ایک جماعت ایسی تھی جس کے جذبات مقدس، مقاصد بلند، جان پرسوز اور جس کی جدوجہد ہر قسم کے شبہ سے پاک تھی۔ بادشاہوں، نوابوں، شہزادوں اور راجاؤں وغیرہ کے بارے میں تو جاگیر شاہی کی زریں تمناؤں کا شبہ کیا جا سکتا ہے، لیکن اس مقدس جماعت کا دامن ایسے تمام داغوں سے یک قلم پاک اور مبرا ہے۔ یہ وہ جماعت ہے جو نہ اقتدار کی خواہاں، نہ سلطنت و حکومت کی آرزومند، نہ ان کے دلوں میں اعلیٰ خطابات کی تمنا' نہ اعزاز و اکرام کی خواہش، اور نہ خوشامد و کاسہ لیسی کی ہوس ان کے دامنوں سے الجھی ہوئی ہے۔ ان کے سامنے صرف اسلام اور وطن ہے، اہل اسلام اور اہل وطن کی ہمدردی و خیر خواہی اور اپنے ملک و وطن کی تعمیر و ترقی۔ یہی ان کا نصب العین اور یہی ان کی زندگی کی تمنا۔ اور سب سے بڑھ کر اس دین کی حفاظت اپنے لیے ضروری سمجھتے ہیں جس نے ان کے پاک نفوس میں یہ پاکیزہ جذبات پیدا کیے۔ اگر تاریخی واقعات کی ترتیب اور ان کے سلسلہ میں اس جماعت کی سنہری زنجیر کو نکال دیا جائے تو نہ صرف یہ کہ یہ با اخلاص اور ایثار شیوہ جماعت کے حق میں ناانصافی ہوگی بلکہ وطن عزیز کے حق میں خیانت اور ایثار و قربانی کی پوری تاریخ میں ایک ظلم عظیم ہوگا۔ اگر ان علماء کے سلسلہ الذہب کو درمیان سے الگ کر دیا جائے جن کو نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا ہے تو بہت سے واقعات ایک معمہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس ایثار پیشہ جماعت نے اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط سے رفتار زمانہ کو بھانپ کر جو نظریے مرتب اور قائم کیے اور وطن عزیز کی ترقی اور کامیابی کے لیے جو تدابیر سوچیں وہ تاریخ کے ہر طالب علم پر عیاں ہے۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بتایا جا چکا ہے کہ اٹھارویں صدی کے قریباً وسط میں سلطنت مغلیہ کی کشتی ڈانواں ڈول تھی اور انگریزی اقتدار اور تسلط کی گھٹائیں دن بدن گہری ہوتی جارہی تھیں، وطنی سیاست کے چاند تارے ان گھمبیر اور گاڑھی گھٹاؤں میں قریباً چھپ چکے تھے، اس وقت حکیم الامت حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے خوش حال، ترقی پذیر، متمدن اور فوجی لحاظ سے نہایت مضبوط وطن کا نقشہ پیش کیا' قرآن وسنت کی روشنی میں اقتصادی اور سیاسی نظریات مرتب کیے اور ان نظریات کے بارے میں علماء اور عوام کی ذہنی تربیت کے لیے چند مراکز بھی قائم کر دیئے۔

ان مراکز میں سب سے بڑا مرکز دہلی کا مدرسہ رحیمیہ تھا جس نے استاذ العلماء حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی زیر تربیت برصغیر پاک و ہند کے علمی حلقوں میں ایک نئی زندگی پیدا کی۔ اور حضرت سید احمد شہیدؒ، حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ، حضرت مولانا عبدالحئیؒ اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب پھلتیؒ جیسے جرنیل، حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحبؒ، حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی صدرالدین صاحب آزردہؒ، حضرت مولانا رشید الدین دہلویؒ، حضرت مولانا مرزا حسن علی محدث لکھنویؒ، حضرت مولانا سید اولاد حسین صاحب قنوجیؒ، حضرت مولانا الٰہی بخش صاحب کاندہلویؒ، حضرت مولانا قطب الدین صاحب دہلویؒ، حضرت مولانا فضل حق صاحب خیرآبادیؒ جیسے محدث، مفکر اور مدبر پیدا کیے۔ اسی مرکز کے مربی اور سرپرست نے 1806ء میں دہلی پر انگریزی اقتدار کے بعد وہ مشہور فتویٰ دیا جو بعد کے علماء کے لیے نشان راہ بنا۔ اور آپ کی زندگی ہی میں سینکڑوں تربیت یافتہ انقلابی نوجوان حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کی زیر قیادت انقلاب کے لیے قدم بڑھا چکے تھے۔

حضرت سید احمد بریلویؒ اگرچہ مئی 1831ء میں بالاکوٹ کے مقام پر جام شہادت نوش فرما چکے تھے لیکن دہلی کا وہ مرکز جو انہیں مجاہد اور مالی امداد فراہم کرتا تھا اور جس کی قیادت اب شاہ محمد اسحاقؒ کے سپرد تھی، وہ زندہ تھا، محفوظ تھا اور متحرک تھا۔ چنانچہ اس محاذ کو متحرک اور سرگرم عمل رکھنے کے لیے حضرت شاہ محمد اسحاق صاحبؒ نے اپنے داماد مولانا سید نصیر الدین دہلویؒ کو اپریل 1835ء میں دہلی سے روانہ کر دیا اور جب یہ

نخل آرزو بار آور ہونے سے قبل 1840ء میں وفات سے پژمردہ ہوگیا تو حضرت شاہ محمد اسحاقؒ اور ان کے بھائی شاہ محمد یعقوب صاحبؒ نے وطن عزیز کو خیر باد کہہ کر مکہ مکرمہ میں ڈیرے ڈال دیئے۔ کیونکہ یہاں ان کے راستہ میں بہت سی مشکلات پیدا ہو رہی تھیں اور ان کی راہ میں بہت سے روڑے اٹکائے جا رہے تھے۔ اب مولانا شاہ محمد اسحاق صاحبؒ نے اولاً مکہ معظمہ پہنچ کر پوری آزادی سے ہندوستانی تحریک کی راہنمائی کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس پر دولت عثمانیہ کی وزارت خارجہ کو ان کے اخراج پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی۔
(حضرت شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک: ص ۱۸۴)

وہاں سے اخراج کا معاملہ تو شاہ صاحبؒ نے شیخ الحرم کو درمیان میں ڈال کر ٹھیک کر لیا۔ چنانچہ بطور پناہ گزین آپ کو وہاں رہنے کی اجازت مل گئی۔ (ایضاً ص ۱۸۵) لیکن ہندوستان کی انگریزی حکومت کے غیظ و غضب کو فرو کرنا ان کے بس میں نہ تھا۔ ہندوستان میں ان کی تمام املاک بحق سرکار ضبط کر لی گئیں۔ جب ضبطی املاک کی خبر آپ کو پہنچی تو آپ پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی۔

1857ء کی فوجی بغاوت:

انگریزوں نے اگرچہ ہندوستانی فوجیوں کے ذریعہ ہی سے ہندوستان کو فتح کیا کیونکہ انگریز فوج تو آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ لیکن فوجیوں کے دلوں میں ایک بے چینی سی تھی کیونکہ حکومت کی بعض پالیسیاں واقعی دلوں میں گھبراہٹ پیدا کرنے والی تھیں۔ 22 فروری 1857ء کو ڈم ڈم جو کلکتہ سے 13 میل کے فاصلہ پر واقع ہے، وہاں کے سپاہیوں نے اپنے انگریز افسر سے شکایت کی کہ ان فیلڈ رائفلوں کے لیے جو کارتوس بنائے جاتے ہیں، ان میں گائے اور سور کی چربی ہے۔ اس افسر نے اس خبر کو غلط بتایا لیکن یہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی، یہاں کے فوجیوں نے یہ صاف کہہ دیا کہ ''حکومت ہمارا دین بگاڑ رہی ہے۔'' یہ خبریں کسی قدر مبالغہ کے ساتھ شمالی ہندوستان تک پہنچ گئیں۔ اپریل 1857ء کے آخری ہفتہ میں میرٹھ میں ہندوستانی سپاہیوں نے مختلف صورتوں میں بے چینی کا اظہار کیا۔ چونکہ میرٹھ میں انگریزی سپاہیوں کی ایک پوری

رجمنٹ موجود تھی اور یہاں کا توپ خانہ پورے ملک میں سب سے بہتر توپ خانہ تھا، اس لیے یہاں کے فوجی حکام مطمئن تھے۔ چنانچہ 23اپریل کو یہاں پر پریڈ کا حکم نافذ کیا گیا۔ 24اپریل کو دیسی فوج نے پریڈ کی۔ پریڈ کے بعد حوالدار میجر اور اس کے اردلی نے ان کارتوس کو چلایا جن کے بارے میں خیال تھا کہ ان کو چلاتے وقت دانتوں سے کاٹنا پڑتا ہے۔ پریڈ ختم ہوئی۔ ہندوستانی سپاہی اپنی بارکوں میں چلے گئے اسی رات اردلی کے خیمہ کو آگ لگا دی گئی۔ اگلے روز ہندوستانی سپاہیوں نے کارتوس لینے سے انکار کر دیا۔ 25اپریل کو ڈپٹی جج کے سامنے اس معاملہ کی انویسٹیگیشن (Investigation) کی گئی۔ سپاہیوں نے کارتوسوں کو ناپاک بتایا۔ انہیں کہا گیا کہ ان میں کوئی حرام شی نہیں ہے۔ وہ خاموش ہوگئے لیکن ان کے سامنے سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ ان کارتوسوں کے خلاف پراپیگنڈہ کچھ اتنا زیادہ کر دیا گیا تھا کہ اگر فوج کے سپاہی مطمئن ہو کر کارتوسوں کو لے بھی لیتے تو فوج سے باہر ان کی بات ماننے والا کوئی نہیں تھا۔ ان کی ذات برادری کے لوگ بھی ان سے نفرت کرتے۔ ان کے لیے ''نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن'' والا معاملہ تھا۔ ادھر سفید چمڑی والا اقتدار کے نشہ میں مدہوش تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ دلوں کی بے چینی زبانوں تک اور زبانوں سے بڑھ کر ہاتھ پاؤں تک پہنچ گئی ہے۔ مختصر یہ کہ 6 مئی کو میرٹھ چھاؤنی میں پریڈ کرائی گئی۔ ہر ایک فوج سے پندرہ پندرہ آدمی منتخب کئے گئے۔ کل نوے آدمی پریڈ میں موجود تھے۔ کارتوسوں کی تقسیم کا حکم دیا گیا۔ پانچ کے سوا سب نے انکار کر دیا جن میں انچاس (49) مسلمان تھے اور 36 غیر مسلم 9 مئی کو فیصلہ سنانے کا دن تھا۔ پوری فوج پریڈ میں حاضر تھی۔ سب کے سامنے بہت بلند آواز سے سزا کا حکم سنایا گیا۔ دس دس سال قید بامشقت۔ پھر ان کو ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑ دیا گیا۔ بیڑیوں میں جکڑے ہوئے سپاہیوں نے حسرت ناک آنکھوں سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور اشاروں ہی اشاروں میں بغاوت کا سبق پڑھا دیا۔ پھر جب ان پچاسی جوانوں کو پا پیادہ جیل خانہ میں پہنچا دیا گیا۔ جدھر سے یہ گزرتے ان کے مایوس دلوں کی سوزش ہندوستانی غیرت وحمیت کی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں میں چنگاریاں چھوڑے جاتی تھیں۔ عورتیں ان کو دیکھ کے بیتاب ہو کر چیختی تھیں کہ اگر تم مردوں میں ان کو چھڑانے کی

ہمت نہیں ہے تو چوڑیوں اور ہتھیاروں کا تبادلہ کر لیں۔ چوڑیاں مرد پہن لیں اور اپنے ہتھیار ہمیں دے دیں۔ ہم انہیں بتادیں گے کہ غیرت اور حمیت کس چیز کا نام ہے۔

10 مئی اتوار کا دن تھا۔ جیسے جیسے موسم کے درجۂ حرارت میں تیزی آتی گئی تو چھاؤنی میں موجود سپاہیوں کے جذبات کے تنور بھی دہکنے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ 31 مئی بغاوت کے لیے مقرر تھی مگر جس کو رات گذارنی مشکل تھی وہ 31 مئی کا انتظار کہاں تک کرتا۔ افق مغرب میں آفتاب دن بھر کی بکھری ہوئی کرنوں کو ابھی سمیٹنے نہیں پایا تھا اور رات نے ابھی سیاہ آنچل نہیں اوڑھا تھا، گرجا میں ابھی شام کا گھنٹہ بجنا شروع ہی ہوا تھا کہ بغاوت کا آتش فشاں انگارے اگلنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دستہ نے تو بارکوں کو آگ لگائی اور دوسرے نے جیل کے دروازے توڑ کر آج ان سپاہیوں کی بیڑیاں کاٹ ڈالیں اور آٹھ سو اخلاقی قیدیوں کو بھی ان قیدیوں کے ساتھ رہا کروا دیا گیا۔ جو انگریز بھی سامنے آیا اس کو گولی کا نشانہ بنادیا گیا۔ اب جوش اور وحشت سے لبریز دماغوں کا یہ سوال تھا کہ اب کیا کیا جائے؟ جواب ایک تھا دہلی چلو اور اتنا تیز چلو کہ انگریزوں کی تیاری سے قبل ایک منزل طے ہو جائے۔

سپاہی دن چھپنے کے بعد میرٹھ سے چلے اور راستہ میں کچھ کھائے پیے اور آرام کیے بغیر صبح سویرے دہلی پہنچ گئے۔ رات خوش گوار تھی۔ جوش جنوں نے قدموں کی رفتار بڑھادی یا پھر زمین کی طنابیں کھینچ لیں کہ نو گھنٹے میں پاپیادہ 44 میل کا سفر طے کر لیا۔ اس بغاوت نے تو انگریزوں کی مت ماردی۔ وہ حیران تھے کہ ہندوستانی سپاہیوں نے یہ کیا کر دیا۔ انہیں یہ بھی پتہ نہ چلا کہ باغی فوجی کس طرف گئے ہیں۔ جب انگریزوں کے ہوش ٹھکانے ہوئے تو بر سبیل احتیاط دہلی تار دیا۔ تار فوراً پہنچ گیا لیکن ریذیڈنٹ کمشنر دہلی، مسٹر سائمن فریزر جن کے نام تار تھا، نیند یا نشہ میں ایسے مدہوش تھے کہ تار کو بغیر پڑھے جیب میں رکھ لیا اور سو گئے۔

11 مئی 1857ء صبح کے سہانے وقت جمنا کے ایک کنارے لال قلعہ کی سرخ و سفید برجیاں اور ان کے سنہرے کلس آفتاب کی کرنوں سے شوخیاں اور بادنسیم سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے اور دوسرے کنارے پر جوش و خروش سے وارفتہ انقلابی فوج نہایت

بے چینی سے اپنی گزرگاہ تلاش کر رہی تھی۔ایک روایت یہ بھی ہے کہ ہندوستانی رسالہ کا کمانڈر کرنل اسمتھ بغاوت کی خبر سنتے ہی جان بچانے کے لیے کہیں چھپ گیا جیسے اخبارات کی خبر کے مطابق ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کی خبر سن کر صدر بش کہیں چھپ گیا تھا۔ اور جب توپ خانہ کے کمانڈر نے توپیں تیار کرائیں اس وقت ہندوستانی فوج دہلی کے راستہ پر بہت دور نکل چکی تھی۔انگریزی فوج کو بہانہ ہاتھ آ گیا۔وہ بجائے تعاقب کے چھاؤنی میں پڑ کر سو گئی۔

مختصر یہ کہ میرٹھ سے جو انقلابی فوج دہلی آئی وہ قلعۂ معلیٰ کے جھروکوں کے نیچے سے گزرتی ہوئی آگے بڑھی اور راج گھاٹ کے دروازہ سے شہر میں داخل ہوئی اور پھر بلا مزاحمت قلعہ میں داخل ہو کر بادشاہ کے حضور میں پہنچ گئی۔

اعلان آزادی:

قلعہ معلیٰ میں بادشاہ سے کافی سوال و جواب ہو گئے۔ بالآخر انقلابی فوج نے شہر کا رخ کیا اور جہاں جہاں انگریزوں کے بنگلے تھے، وہیں انگریزوں کا قتل عام کیا۔ مظلوم فوج کو نہ صرف انگریزوں سے نفرت تھی بلکہ انگریزی ہر شی سے نفرت تھی اس وجہ سے دہلی گزٹ کا پریس تباہ کیا گیا۔قلعہ کی شمالی دیوار سے قریباً تین فرلانگ کے فاصلہ پر کشمیری گیٹ کی جانب ایک بہت بڑا اسلحہ کا میگزین تھا جس میں ہر قسم کا سامان جنگ بافراط موجود تھا جس میں نو لاکھ کارتوس، دس ہزار رائفلیں اور بہت سی توپیں اور توپ گاڑیاں اور سینکڑوں من بارود تھی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ اس میگزین پر قبضہ کر لیا جائے۔ ادھر انگریز افسروں کی غیرت بیدار ہوئی۔ لیفٹیننٹ ولوبی (Willoughby) اس میگزین کا افسر انچارج تھا۔اس نے اپنے انگریز ساتھیوں کے ساتھ یہ طے کیا کہ اپنی جانیں قربان کر دیں گے لیکن میگزین پر قبضہ نہ ہونے دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے میگزین کے دروازے بند کر کے اس کے دروازوں کے اندر ریت کے بورے چن دیئے اور زمین میں بارود کی سرنگیں بچھا دیں۔ دیواروں پر توپیں نصب کر دیں۔ گویا اپنی اور اس میگزین کی حفاظت کا پورا انتظام کر لیا۔انگریزوں کو یقین تھا کہ اس باغی فوج کے پیچھے میرٹھ سے

انگریزی فوج بھی آ رہی ہو گی لیکن اس طرف سے کوئی فوج نہ آئی انقلابی فوج نے بڑی سیڑھیاں حاصل کر لیں جن سے اونچی دیوار پر چڑھا جا سکتا تھا۔ اب انگریزوں نے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ دیکھا کہ اس میگزین کو تباہ کر دیا جائے۔ چنانچہ فتیلہ روشن کر دیا گیا اور ایسا دھماکہ ہوا کہ پورا شہر دہل گیا۔ انگریزوں میں چار بچ گئے جن مین ایک ولوبی بھی تھا۔ اس کا چہرہ جھلس گیا اور وہ وہاں سے بھاگ گیا لیکن غازی آباد کے دیہات میں وہ پہچان لیا گیا اور لوگوں نے اسے ختم کر دیا۔

میگزین پورا تو اڑا نہ ہزاروں کی تعداد میں بندوقیں اور دوسرا اسلحہ بچ گیا جو انقلابی فوجوں کے کام آیا۔ لیکن اتنے بڑے میگزین سے کافی اسلحہ تباہ ہو گیا جو انقلابی فوجوں کے لیے ناکامی کا نشان تھا۔ انگریزوں کی عورتوں اور بچوں کو بھی قتل کر دیا گیا اگر چہ علماء اور سنجیدہ راہ نماؤں نے بہت سمجھایا لیکن جنون انتقام میں ان کی کچھ نہ سنی گئی۔ آزادی کا اعلان کیا گیا اور بادشاہ دیوان خاص میں کرسی پر آ کر بیٹھا اور انقلابی سپاہیوں نے اپنے توپ خانہ سے اکیس (21) توپیں سلامی کے طور پر سر کیں۔

12 مئی کو شاہی جلوس اور اعلان کے بعد رفتہ رفتہ کاروباری مراکز کھلنے لگے اور حالات معمول پر آ گئے۔ بہادر شاہ نے یہ حکم جاری کیا کہ سلطنت اور عدالت کے کاموں میں شہزادے اور سپاہ مداخلت نہ کرے۔ عدالت کے سارے کام صرف مفتی اور صدر الصدور کیا کریں۔ نہ سپاہ نہ مال کے حکام اس عدالت میں دخل دیں۔ (تاریخ عروج عہد انگلیسیہ ص ۶۷۷) شہر میں پہلا کوتوال معین الدین حسن خان مقرر ہوا جو نواب قدرت اللہ خان کا بیٹا تھا۔ (ایضاً ص ۶۸۸) یہ دل سے انگریزوں کے حامی تھے۔ ان کا اس وقت کوتوال کا عہدہ سنبھالنے کا مقصد بھی یہ تھا کہ "انگریزوں کی خیر خواہی اس بدخواہی کے لباس میں کروں۔" (ایضاً ص ۶۸۸) لیکن چند روز بعد ان کو اس عہدہ سے الگ کر دیا گیا اور اس کے بعد خواجہ وحید الدین کی سفارش سے قاضی فیض اللہ کوتوال شہر اور قاضی عبدالرحیم نائب کوتوال مقرر ہوئے۔ تھانوں میں تھانیدار بھی مقرر ہوئے۔ ان کاموں میں بخت خان دخیل تھا کیونکہ بادشاہ نے حکم جاری کر دیا تھا کہ وہ بخت خان کے حکم کی تعمیل کیا کریں۔

اگرچہ شہر میں امن وامان قائم نہ ہوسکا کیونکہ انقلابی فوجی بھی کوئی ڈسپلن اور نظم وضبط کے پابند نہ تھے لیکن اس کے باوجود کچھ لوگ ایسے تھے جو اگرچہ بادشاہ کے نہایت مقرب تھے لیکن انگریزوں کے جاسوس تھے۔ ان میں حکیم احسن اللہ خان اور بہادر شاہ کا وزیر محبوب علی خان بھی تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ جاسوسی کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ اگر ان میں کسی کو پکڑا جاتا تو شہزادے یا بادشاہ کے مقرب سفارش کر کے اس کو چھڑا لیتے۔ ان جاسوسوں میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ چنانچہ مہاراجہ پٹیالہ انگریزوں کا سب سے بڑا دوست تھا۔

انگریزوں کا ردّ عمل:

ادھر انقلابی فوجیں یہ سب کچھ کر رہی تھیں۔ ادھر انگریزی فوجوں کے کمانڈر انچیف جنرل آنسن کو (جو اس وقت شملہ میں مقیم تھا) فوراً ہی گورنر جنرل لارڈ کیننگ کی ہدایت پہنچ گئی کہ وہ دہلی پر حملہ آور ہوں۔ جنرل آنسن نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پہلا کام یہ کیا کہ پٹیالہ، نابھہ اور جنید وغیرہ ریاستوں کی وفاداری کو پختہ کیا۔ ان سے فوجیں حاصل کیں، اور پھر کالی اور گوری فوجوں کے ساتھ دہلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ 25 مئی کو انبالہ سے روانہ ہوا اور ابھی کرنال تک ہی پہنچا تھا کہ 27 مئی کو ہیضہ کا شکار ہو کر راہی ملک عدم ہوا۔ اس کے مرنے کے فوراً بعد ہنری برنارڈ نے فوج کی کمان سنبھال لی اور وہ راستہ میں کشت وخون کرتا ہوا دہلی پہنچا، لیکن 5 جولائی کو ہیضہ کا شکار ہو کر وہ بھی راہی ملک عدم ہو گیا۔ اب فوج کی کمان جنرل ریڈ نے سنبھال لی، لیکن اس دوران انقلابی فوجوں کے حملے پے در پے اور اتنے شدید رہے کہ اس نے استعفاء دے کر ذمہ داری کا جوا اتار پھینکنے ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔ اب انگریزی فوج کی ہمتیں پست ہو رہی تھیں، لیکن اس فوج میں کچھ ایسے جانباز بھی تھے جو شکست کے مقابلہ میں موت کو ترجیح دیتے تھے۔ مسٹر ولسن ایسا ہی بہادر کمانڈر تھا۔ جنرل ریڈ کے ہٹتے ہی ولسن نے فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لی۔ پھر قدرت نے اس کی مدد کی کہ فوراً ہی ایک اور کمانڈر دو ہزار فوج لے کر اس کی مدد کو پہنچا۔ اس کمانڈر کا نام نکلسن تھا۔ اس کے بارے میں یہ کہنا درست

ہے کہ اس نے اپنے خون کو بھینٹ چڑھا کر دہلی حاصل کی۔ اسی طرح جنرل ہڈسن انگریزی فوج کو مل گیا جو نہایت سفاک تھا اور کہتے ہیں کہ اس کی پیاس صرف انسانی خون کے گھونٹوں سے بجھتی تھی، اس نے نادر شاہ کی یاد پر بھی پانی پھیر دیا۔

اس فوجی کاروائی کے علاوہ مختلف ریاستوں نے بھی انگریزوں کی بہت مدد کی یہ مدد فوج سے بھی کی تھی اور مال سے بھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی جو حکومت کے ساتھ مہاجنی کاروبار بھی کرتی چلی آتی تھی، اس کے بھر پور خزانوں میں اب بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ تاہم زمینداروں، جاگیرداروں اور ساہوکاروں نے جس طرح دل کھول کر انگریزوں کی اس موقع پر امداد کی اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ضلع بجنور کے صرف دو گاؤں سے مبلغ دس ہزار روپے انگریز دوستی کی نظر کر دیئے گئے اس کے مقابلہ میں انقلابی فوجوں کی مالی طور پر کوئی مدد نہ کی گئی۔ دہلی کے قرب و جوار کے رؤسا اور نواب جو ہم نوا ہو گئے تھے، بادشاہ کی طرف سے ان کو احکام بھیجے گئے کہ وہ مالیہ وصول کر کے شاہی خزانہ میں جمع کرائیں، لیکن اول تو وہ خود ضرورت مند تھے۔ اس کے علاوہ جو حوصلے انگریزوں کی امداد کے لیے فراخ اور وسیع ہو جاتے تھے، اس مصیبت زدہ بادشاہ اور انقلابی فوجوں کے حق میں ان کی تمام بلندیاں پست ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ انگریزوں کو پٹیالہ، کشمیر، رام پور اور حیدر آباد کے راجاؤں اور نوابوں نے دل کھول کر مالی امداد دی۔ علاوہ ازیں متھرا کے مشہور مہاجن لکشمی چند نے 25 لاکھ روپے، پانی پت اور کرنال کے مہاجنوں نے تین لاکھ دیئے۔ لالہ چونی پرشاد نے گورنر سے وعدہ کیا کہ جس قدر روپیہ کی ضرورت ہوگی، میں دوں گا۔

انقلابی فوجوں کی تعداد دہلی میں پچاس ہزار کے قریب تھی اور اوسطاً فوج کا ماہانہ خرچ پانچ لاکھ 73 ہزار تھا (غدر کی صبح و شام ص ۲۴۲) اس طرح چار ماہ کے دور حکومت میں قریباً 23 لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ یہ خرچہ بڑی مشکل سے پورا کیا گیا یہاں تک کہ بہادر شاہ کا فرنیچر بھی فروخت ہو گیا۔ پھر بقول شمس العلماء ذکاء اللہ خان کے ایک وقت ایسا بھی آیا کہ لوگ ان کو مبارک باد دیتے تھے کہ بادشاہت ان کے گھر آئی ہے، وہ مبارک باد کے جواب میں کہتے کہ اس بادشاہت سے وہ غلامی بہتر تھی کہ دو وقت کھانے

کومل جاتا تھا۔ اب تو اس کے بھی لالے پڑے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں بھی چار ماہ مسلسل ایسی شان سے مقابلہ ہوتا رہا کہ بار بار انگریزی فوجوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ ہمتیں ٹوٹ گئیں اور انہی پریشانیوں اور رات دن کی گھٹن سے ان کے دو کمانڈر جان سے گئے اور ایک نے استعفیٰ دے کر جان بچائی۔ بہرحال ہندوستانیوں کو غلامی کا مزہ چکھنا تھا، لہٰذا باوجود اس بات کے کہ محبان وطن چپہ چپہ پر اپنی جانیں قربان کر رہے تھے اور انگریزی فوج کے بڑے بڑے افسر کام آچکے تھے۔ فوج دہشت زدہ ہوگئی تھی، اور جنرل نکلسن جو اکیلا دو ہزار کے برابر مانا جاتا تھا، زخموں سے چور ہو کر زندگی سے مایوس ہوگیا۔

15 ستمبر کی صبح کو انگریز جرنیل ولسن فوجوں کو پیش قدمی کا حکم دے یا پسپائی کا، لیکن خوش قسمتی سے جنرل نکلسن کے بدن میں ابھی جان باقی تھی اسے پتہ چلا کہ ولسن شش و پنج میں پڑا ہوا ہے ہوسکتا ہے کہ وہ فوجوں کو پسپائی کا حکم دے دے۔ اس نے غصہ اور جوش سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

''ابھی مجھ میں اتنی طاقت باقی ہے کہ ولسن کو گولی سے اڑا دوں۔''

مرنے والے کی اس گرج نے مردہ دلوں میں زندگی پیدا کر دی۔ اب حالت یہ تھی کہ شہیدوں کے پشتوں پر گزرتے ہوئے انگریزی فوجوں نے لال قلعہ کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ ایک ایک قدم پر خون ریز جنگ ہوئی اور 6 فرلانگ کا فاصلہ پانچ دن میں طے ہوا، اور وہ بھی اس لیے کہ بادشاہ قلعہ کو خالی کر چکا تھا۔ 19 ستمبر کو بادشاہ قلعہ سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے میں پناہ گزین ہوا۔ 20 ستمبر کو ولسن نے قلعہ میں داخل ہو کر دیوان خاص کو اپنا صدر مقام بنایا اور تخت طاؤس کے چبوترے پر بیٹھ کر بادۂ نافرجام سے ملکہ وکٹوریہ کا جام صحت نوش کیا۔

ابھی بہادر شاہ لال قلعہ سے روانہ نہیں ہوا تھا کہ جنرل بخت خان بادشاہ کے پاس آیا۔ اس نے بادشاہ کو تسلی دی۔ پورا ملک آپ کے لیے جان کی بازی لگانے کے لیے تیار ہے۔ اس نے دہلی میں اپنی فوج کی شکست کے اسباب بھی بیان کیے اور کہا کہ آپ میرے ساتھ چلیں۔ کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔ بادشاہ نے جنرل بخت خان کی کسی دلیل کی بھی تردید نہ کی۔ وہ خاموش رہا لیکن معلوم ایسا ہوتا تھا کہ وہ جنرل بخت

خان کی باتوں سے متاثر ہوا ہے۔ اس نے جنرل بخت کو صرف یہ کہا کہ کل کو ہمایوں کے مقبرہ میں مجھ سے ملاقات کریں۔ فیصلہ اس وقت ہوگا۔ انگریزوں کے جاسوسوں نے انہیں اس ملاقات کی اطلاع دی۔ وہ بادشاہ کو یہاں سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اگر بادشاہ جنرل بخت خان کے ساتھ دہلی سے نکل گیا تو پھر فتح اور کامرانی ناممکن نہ سہی مشکل ضرور ہو جائے گی۔ اب انگریزوں نے اپنے مہروں کو استعمال کیا۔ منشی رجب علی ان کا خاص مہرہ، تھا مرزا الہی بخش بہادر شاہ کا سمدھی تھی۔ یہ انگریزوں کا تنخواہ دار تھا۔ غرضیکہ مختلف عناصر نے بوڑھے بادشاہ کو ہر طرف سے گھیر لیا۔ اور اپنی باتوں سے بادشاہ کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ دہلی نہ چھوڑے۔ بادشاہ کو سیل حوادث نے نہ صرف ضعیف الرائے بلکہ خفیف العقل بھی بنا دیا تھا۔ آخر میں مرزا الہی بخش نے ایک چبھتی ہوئی بات بادشاہ کو یہ کہی کہ بخت خان روہیلہ پٹھان ہے اور پٹھان ہمیشہ مغلوں کے مخالف رہے ہیں۔ شیر شاہ نے ہمایوں کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ یہ ساری باتیں سن کر 20 ستمبر کو جب جنرل بخت خان بادشاہ سے ملا تو بادشاہ کا اس کو جواب یہ تھا کہ بے شک آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ درست اور صحیح ہے لیکن میرا بڑھاپا اس پر عمل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ میں اپنے کو تقدیر کے حوالے کرتا ہوں آپ اپنا کام کرتے رہیں۔ بخت خان بادشاہ کا جواب سن کر خاموش ہو گیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ رائے بادشاہ کی نہیں بلکہ اس کے پیچھے انگریز جاسوس بول رہے ہیں، لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتا۔ چنانچہ وہ بادشاہ کو خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گیا اور اپنی پوری فوج کے ساتھ جمنا پار آ کر روہیل کھنڈ پہنچ گیا۔

بخت خان ایک نہایت بہادر جرنیل تھا۔ اس کے جنگی کمالات جو کچھ بھی ہوں اس کے جنگی تدبر اور حسن انتظام کی بہترین مثال یہ ہے کہ دو ماہ کی معرکہ آرائی کے بعد وہ اپنی پوری فوج کو صحیح و سالم نکال کر لے گیا۔ جب آیا تھا تو پوری فوج کی چھ ماہ کی تنخواہ پہلے ادا کر چکا تھا۔ مزید مصارف کے لیے چار لاکھ روپیہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ غرضیکہ وہ اور اس کی فوج کا کوئی سپاہی شاہی خزانہ یا باشندگان دہلی پر بار نہیں تھا۔

بخت خان چلا گیا۔ اب دوسرے ہی روز بادشاہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ جوان بخت

کے علاوہ جو شاہزادے ہاتھ لگے وہ قتل کر دیئے گئے اور باقی کی تلاش جاری رہی۔ زینت محل کے علاوہ شاہی خاندان کی خواتین جان بچانے کے لیے محلوں سے نکلیں۔ اللہ جانے ان کے ساتھ کیا ہوا اور انہوں نے کیا کیا مصیبتیں اٹھائیں۔

جنگ آزادی کا یہ سارا واقعہ جس کو اختصار کے ساتھ ہم نے ذکر کیا ہے یہ علماء دین کی وجہ سے شکست میں تبدیل نہیں ہوا بلکہ اس کے کئی اسباب تھے جن میں ہندوستانیوں کی غداری اور انگریز دوستی سب سے بڑا سبب تھا، بادشاہ بھی خفیف العقل اور بے ہمت تھا۔ پھر میرٹھ میں یہ فوجی بغاوت اور دہلی میں معرکہ آرائی ہر قسم کے نظم ونسق سے عاری تھی۔ اس وجہ سے یہ ساری جدوجہد آزادی شکست پر منتج ہوئی، اور ہندوستان انگریزوں کی غلامی میں چلا گیا۔

جنگ آزادی اور علماء کا کردار:

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے سب سے بڑے بیٹے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ جو اپنے وقت کے سب سے بڑے مفتی تھے، انہوں نے فتویٰ دیا تھا کہ ''جہاد اور جب تک جہاد کی طاقت نہ ہو تو جہاد کی تیاری۔''

''یہاں رؤساء نصاریٰ کا حکم بلا دغدغہ اور بے دھڑک جاری ہے، اور ان کا حکم جاری اور ساری ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ملک داری، انتظامات رعیت، خراج، باج، عشر و مال گذاری، اموال تجارت، ڈاکوؤں اور چوروں کے انتظامات، مقدمات کا تصفیہ، جرائم کی سزاؤں وغیرہ (یعنی سول، فوج، پولیس، دیوانی اور فوجداری معاملات، کسٹم اور ڈیوٹی وغیرہ) میں یہ لوگ بطور خود حاکم اور مختار مطلق ہیں۔ ہندوستانیوں کو ان کے بارے میں کوئی دخل نہیں۔ بے شک نماز جمعہ، عیدین، اذان اور ذبیحہ گاؤ جیسے اسلام کے چند احکام میں وہ رکاوٹ نہیں ڈالتے، لیکن جو چیز ان سب کی جڑ اور حریت کی بنیاد ہے (یعنی ضمیر اور رائے کی آزادی

اور شہری آزادی) وہ قطعاً بے حقیقت اور پامال ہے۔ چنانچہ بے تکلف مسجدوں کو مسمار کر دیتے ہیں۔ عوام کی شہری آزادی ختم ہو چکی ہے۔ انتہاء یہ کہ کوئی مسلمان یا ہندو ان کے پاسپورٹ اور پرمٹ کے بغیر اس شہر یا اس کے اطراف و جوانب میں نہیں آ سکتا۔ عام مسافروں یا تاجروں کو شہر میں آنے جانے کی اجازت دینا بھی ملکی مفاد یا عوام کی شہری آزادی کی بنا پر نہیں بلکہ خود اپنے نفع کی خاطر ہے۔ اس کے بالمقابل خاص خاص ممتاز اور نمایاں حضرات مثلاً شجاع ملک اور ولایتی بیگم ان کی اجازت کے بغیر اس ملک میں داخل نہیں ہو سکتے۔ دہلی سے کلکتہ تک انہی کی عمل داری ہے۔ بے شک کچھ دائیں بائیں مثلاً حیدرآباد، لکھنؤ، رام پور میں چونکہ وہاں کے فرمانرواؤں نے اطاعت قبول کر لی ہے، براہِ راست نصاریٰ کے احکام جاری نہیں ہوتے۔" (مگر اس سے پورے ملک کے دارالحرب ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔)

(فتاویٰ عزیزی: جلد ۱ ص ۱۷، فارسی)

آپ نے ایک اور فتویٰ میں بھی مخالفین کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے ہندوستان کا دارالحرب ہونا ثابت کیا ہے۔ (فتاویٰ عزیزی: جلد ۱ ص ۱۰۵)

ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ

1- قانون سازی کے جملہ اختیارات عیسائیوں کے ہاتھ میں ہیں۔

2- مذہب کا احترام ختم ہے۔

3- شہری آزادی سلب کر لی گئی ہے۔

لہٰذا ہر محبِ وطن شہری کا یہ فرض ہے کہ اس اجنبی طاقت سے اعلان جنگ کر دے اور جب تک اس کو ملک بدر نہ کر دے اس ملک میں زندہ رہنا اپنے لیے حرام جانے۔

اس فتویٰ کا فوری اثر یہ ہوا کہ باہمت جنگ جو طبقہ جا بجا اس طاقت سے وابستہ ہو گیا جو اس وقت انگریزوں سے برسرِ پیکار تھی۔ چنانچہ اس دور میں مسلمانوں اور

مرہٹوں کی پرانی جنگ ختم ہوگئی، اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ مرہٹی علاقوں کے مسلمان مرہٹوں کی فوج میں شامل ہوکر انگریزوں کے خلاف برسرپیکار ہوگئے۔ خود شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے ایک خاص مرید سید احمد کو امیر علی خان سنبھلی کے پاس بھیجا جو جسونت راؤ ہلکر کے ساتھ ایک عرصہ سے انگریزی سلطنت پر شب خون مار رہے تھے۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے اس فتویٰ کے بعد انگریز کی ڈپلومیسی کا دارالافتاء بھی برابر کام کرتا رہا، اور ان تمام لوگوں کو لا دین اور خارج از دین قرار دیا۔ پھر مسئلہ کو الجھانے اور ایک کھلی حقیقت کے چہرہ پر نقاب ڈالنے کے لیے کئی تاویلات کی گئیں۔ کبھی کہا گیا کہ

> ''انگریز حاکم وقت ہے۔ مسلمان اس کی پناہ میں ہیں (یعنی مستامن ہیں) پس ان کی اطاعت واجب ہے اور غدر حرام۔''

اس مغالطہ کو جس طرح مفاد پرست سرکاری ملازموں اور خود غرض اقتدار پرستوں نے اپنے دفاع اور بچاؤ اور اپنی کرتوتوں کے جواز کے لیے سند بنایا تھا ایسے ہی کچھ سادہ لوح علماء اور مشائخ بھی اس فریب میں آ گئے تھے۔ چنانچہ مولانا شاہ محمد اسحاق کی پہلی صف میں سے علماء اور صوفیہ کا کثیر حصہ بادشاہ دہلی کی لڑائی میں غیر جانب دار بن گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خود شاہ محمد اسحاق کی جماعت میں سے ایک مخالف جماعت دہلی میں بھی پیدا ہوگئی۔ مولانا سید نذیر حسین دہلوی اور مولانا شیخ محمد تھانوی اس جماعت کے مشہور بزرگوں میں سے ہیں۔ (شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک: ص ۳۲۰۰)

سرسید کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر انگریز نے اپنی ڈپلومیسی کو کام میں لانے کی کوشش کی اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے اس فتویٰ جہاد کے مقابلہ میں ایک فتویٰ مرتب کیا گیا کہ یہ جنگ آزادی جہاد نہیں بلکہ فساد ہے، ایک ہڑبونگ ہے، لہٰذا اس میں شرکت حرام ہے۔

یہ فتویٰ لیا تو گیا لیکن اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ باوجود اس بات کے کہ یہ فتویٰ حکومت کے ایماء پر دیا گیا لیکن اس کی اشاعت نہ ہوسکی۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ لوگوں کے جذبات انگریزوں کے سخت خلاف تھے اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ

ایسا فتویٰ دینے والے انگریزوں کے تنخواہ دار ہیں یا پھر ان کے ایجنٹ یا بزدل ترین لوگ۔ چنانچہ اس فتویٰ کی اصل ایسی ناپید ہوئی کہ خود سر سید کو بھی دستیاب نہ ہو سکی۔ حالانکہ خود سر سید کا مسلک بھی یہی تھا اور اسی وجہ سے وہ انگریزی کی وفاداری میں یہاں تک بڑھے ہوئے تھے کہ ان کے نزدیک اپنے ملک اور ملت کے کسی بڑے سے بڑے آدمی کی بھی کوئی وقعت ان کی نظر میں نہ تھی۔ اس پر طرفہ یہ کہ مجاہدین حریت کے تذکرہ کے وقت وہ کچھ ایسے جذباتی بلکہ بے قابو ہو جاتے ہیں کہ دہلی کی روایتی تہذیب کا دامن بھی ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور بعض دفعہ ایسے الفاظ ان لوگوں کے لیے استعمال کرتے ہیں کہ ان کو لکھتے وقت قلم کو بھی حیا آتی ہے۔

سر سید مرحوم نے اس سلسلہ میں ایک کتاب بھی لکھی جس کا نام ہے ''اسباب بغاوت ہند'' اس میں 1857ء کی جنگ آزادی کو فساد اور غدر قرار دیا اور جن لوگوں نے اس لڑائی کو انگریزوں کے خلاف جہاد کا نام دیا، سر سید ان پر اس طرح برسے ہیں کہ آپے سے باہر ہو گئے ہیں، اور اپنی خاندانی شرافت بلکہ تہذیبی شرافت کو بھی پامال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ تحریر کرتے ہیں:

> ''مسلمانوں کا بہت روزوں سے آپس میں سازش اور مشورہ کرنا اس ارادہ سے کہ ہم باہم متفق ہو کر غیر مذہب کے لوگوں پر جہاد کریں اور ان کی حکومت سے آزاد ہو جائیں، نہایت بے بنیاد بات ہے۔ جب کہ مسلمان ہماری حکومت گورنمنٹ کے مستامن تھے، کسی طرح گورنمنٹ کی عمل داری میں جہاد نہیں کر سکتے تھے۔''

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

> ''اور یہ جو ہر ضلع میں پاجی اور جاہلوں (اتنے بڑے شخص کی زبان دیکھئے کہ کوثر و تسنیم میں کیسے دھلی ہوئی ہے) کی طرف سے جہاد کا نام ہوا۔ اگر ہم اس کو جہاد ہی فرض کر لیں تو بھی اس کی سازش و اصلاح قبل دسویں مئی 1857ء مطلق نہ تھی۔ غور کرنا چاہیے کہ اس زمانہ میں جن لوگوں نے جھنڈا جہاد کا بلند کیا، ایسے خراب، بدرویہ

اور بداطوار آدمی تھے کہ بجز شرابخوری اور تماش بینی اور ناچ و رنگ دیکھنے کے کچھ وظیفہ ان کا نہ تھا۔ بھلا یہ کیونکر پیشوا اور مقتدا جہاد کے گنے جا سکتے ہیں۔ اس ہنگامہ میں کوئی بات بھی مذہب کے مطابق نہیں ہوئی۔ سب جانتے ہیں کہ سرکاری خزانہ اور اسباب جو امانت تھا، اس میں خیانت کرنا، ملازمین کو نمک حرامی کرنی مذہب کی رو سے درست نہ تھی۔ صریح ظاہر ہے کہ بے گناہوں کا قتل علی الخصوص عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کا مذہب کے بموجب گناہ عظیم تھا۔ پھر کیونکر یہ ہنگامۂ غدر جہاد ہوسکتا ہے۔ ہاں البتہ چند بدذاتوں (یہ مرزا غلام احمد قادیانی والا انداز تحریر ہے) نے دنیا کی طمع اور اپنی منفعت اور اپنے خیالات پورے کرنے اور جاہلوں کو بہکانے کو اور اپنے ساتھ جمعیت جمع کرنے کو جہاد کا نام دے دیا۔ پھر یہ بات بھی مفسدوں کی حرام زدگیوں میں سے ایک حرام زدگی تھی نہ واقع میں جہاد۔'' (زبان کی شستگی ملاحظہ فرمائیں)

پھر سید صاحب نے ارشاد فرمایا:

''دہلی میں جو فتویٰ جہاد کا چھپا وہ ایک عمدہ دلیل جہاد کی سمجھی جاتی ہے، مگر میں نے تحقیق سے سنا ہے اور اس کے اثبات پر بہت دلیلیں ہیں کہ وہ محض بے اصل ہے۔ میں نے سنا ہے کہ جب فوج نمک حرام میرٹھ سے دہلی میں گئی تو کسی نے جہاد کے باب میں فتویٰ چاہا۔ سب نے فتویٰ دیا کہ جہاد نہیں ہوسکتا، اگرچہ اس پہلے فتویٰ کی میں نے نقل دیکھی ہے مگر جب کہ وہ اصل فتویٰ معدوم ہے تو میں اس نقل کو نہیں کہہ سکتا کہ وہ کہاں تک لائق اعتماد ہے۔ مگر جب بریلی کی فوج دہلی میں پہنچی اور دوبارہ فتویٰ ہوا جو مشہور ہے اور جس میں جہاد کرنا واجب لکھا ہے، بلاشبہ اصلی نہیں۔ چھاپنے والے اس فتویٰ کے، نے جو ایک مفسد اور نہایت قدیمی

بدذات آدمی تھا، جاہلوں کو بہکانے اور ورغلانے کو لوگوں کے نام لکھ کر اور چھاپ کر اس کو رونق دی تھی بلکہ ایک آدھ مہر ایسے شخص کی چھاپ دی تھی جو قبل غدر مر چکا تھا، مگر مشہور ہے کہ چند آدمیوں نے فوج باغی بریلی اور اس کے مفسد ہمراہیوں کے جبر اور ظلم سے مہریں بھی کی تھیں۔"

"جن لوگوں کی مہر اس فتویٰ پر چھاپی گئی ہے ان میں سے بعضوں نے عیسائیوں کو پناہ دی (دشمن اگر پناہ مانگے تو پناہ دینا فتویٰ جہاد کے خلاف نہیں) اور ان کی جان و عزت کی حفاظت کی۔ ان میں سے کوئی شخص لڑائی پر نہیں چڑھا، مقابلے پر نہیں آیا۔ اگر واقع میں وہ ایسا ہی سمجھتے جیسا کہ مشہور ہے تو یہ باتیں کیوں کرتے۔"

سرسید کے اس طویل اقتباس سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں، اور سب سے بڑی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ سرسید کے دل میں جتنی محبت انگریزوں اور انگریزی حکومت کی ہے اتنی کسی اور کی نہیں۔ ان کے نزدیک انگریزوں کی حکومت اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت تھی جو ہندوستان کے رہنے والوں کو دی گئی، اگرچہ انگریز سات سمندر پار کے اجنبی زمین و زمان کے بادشاہ بن گئے اور سودا اور مال بیچنے والے زبردستی اور دھوکہ سے سلطنت کے مرتبہ پر پہنچ گئے۔

انگریزوں کے مجاہدین حریت کے خلاف بدگمانیاں اور لوگوں کے جذبات ان کے خلاف کرنے کے لیے اگر ان میں سے کسی ناتجربہ کار نوجوان سے تھوڑی سی بھی کوئی غیر اخلاقی حرکت ہوگئی تو سید صاحب نے ان کے بارے میں آوارہ منش، اوباش اور شراب پسند وغیرہ کے الفاظ استعمال کرنے شروع کر دیئے اور ان کو وہ باخلاص مجاہدین اور شریف الطبع محبانِ وطن اور وہ علمائے کرام نظر نہ آئے جنہوں نے انگریزوں سے مورچوں میں بیٹھ کر مقابلہ کیا۔

سید صاحب نے اس بارے میں دوسری بات یہ فرمائی کہ ابتداء میں جہاد کا فتویٰ نہیں تھا۔ جنرل بخت خان جب دہلی آئے تب فتویٰ مرتب کیا گیا۔ یہ بھی کوئی اتنی

اہم بات نہیں۔ مفتی تو فتویٰ اسی وقت دیتا ہے جب اس سے کوئی فتویٰ پوچھے۔ دیکھنا یہ تھا کہ فتویٰ صحیح تھا یا غلط؟ اگر غلط تھا کہ سید صاحب اس کی غلطیاں بتاتے۔ وہ تو بتائی نہیں، صرف یہ کہہ دینا کہ فتویٰ جہاد بخت خان کے آنے پر دیا گیا، یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں ہے۔

سر سید احمد نے جو انگریزوں کی مدح اور توصیف اور مجاہدین حریت اور محبان وطن کے خلاف جو راگ الاپا ہے، وہی کچھ ان کے ایک اور معاصر اور ہم نوا شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ خان نے کہا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''جب تک دہلی میں بخت خان نہیں آیا جہاد کے فتویٰ کا چرچا شہر میں بہت کم تھا۔ (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل بھی فتویٰ دیا جا چکا تھا کہ انگریزی حکومت کے خلاف لڑنا جہاد ہے، لیکن اس فتویٰ کا چرچا بہت کم تھا۔ ظفر) مساجد میں منبروں پر جہاد کا وعظ کم تر ہوتا تھا۔ دلی کے مولوی اور اکثر مسلمان خاندان تیموریہ کو ایسا خولہ خبطہ جانتے تھے کہ وہ ناممکن سمجھتے تھے کہ اس خاندان کی بادشاہی ہندوستان میں ہو، مگر اس کے ساتھ جاہل مسلمانوں کو یہ یقین تھا کہ انگریزی سلطنت کے بدن میں ایک ایسا پھوڑا نکلا کہ وہ جانبر نہیں ہوگی۔
>
> یہ کام لچے شہدے مسلمانوں کا تھا (یہاں بھی زبان شائستگی ملاحظہ فرمائیں۔ کہ مجاہدین حریت اور فتویٰ دینے والے اکابر علماء کو کس نام سے پکارا جارہا ہے۔) کہ وہ جہاد جہاد پکارتے پھرتے تھے، مگر جب ''بخت خان'' جس کا نام اہل شہر نے ''کم بخت خان'' رکھا تھا (یہ بھی شمس العلماء کی اہل شہر پر بہتان تراشی ہے) دلی میں آیا تو اس نے یہ فتویٰ لکھایا کہ مسلمانوں پر جہاد اس لیے فرض ہے کہ اگر کافروں کی فتح ہوگی تو وہ ان کے بیوی بچوں کو قتل کر ڈالیں گے۔ اس نے جامع مسجد میں مولویوں کو جمع کر کے جہاد کے فتویٰ پر

دستخط اور مہریں ان کی کرالیں اور مفتی صدر الدین نے بھی ان کے جبر سے اپنی جعلی مہر کر دی لیکن مولوی محبوب علی اور خواجہ ضیاء الدین نے فتویٰ پر مہر نہیں کیں اور بے باکانہ کہہ دیا کہ شرائط جہاد موافق مذہب اہل اسلام موجود نہیں۔ (یعنی سرسید کی طرح انگریزوں سے جہاد کو جائز نہیں کہا بلکہ یہ عذر کیا کہ جہاد کی شرطیں جیسے مقابلہ کی پوری قوت اور طاقت کا ہونا وغیرہ موجود نہیں)

اس فتویٰ کا اثر یہ ہوا کہ جاہل مسلمانوں کا جوش مذہبی زیادہ ہو گیا۔ جن مولویوں نے فتویٰ پر مہریں کی تھیں وہ کبھی پہاڑی پر انگریزوں سے لڑیں نہیں گئے۔ مولانا نظیر حسین جو وہابیوں کے مقتدا اور پیشوا تھے، ان کے گھر میں ایک میم چھپی بیٹھی تھی۔ اس فتویٰ پر کچھ مہریں اصلی اور کچھ جعلی تھیں۔" (تاریخ عروج عہد انگلیسیہ: ص ۶۷۵)

سرسید احمد خان اور مولوی ذکاء اللہ خان دونوں نے یہ لکھا ہے کہ فتویٰ پر کچھ دستخط اور مہریں جعلی تھیں اور بعض حضرات سے بالجبر دستخط کروائے گئے تھے لیکن ان بے کس اور بے بس لوگوں کے نام نہیں لکھے جنھوں نے بالجبر مہریں لگائیں یا جن کے دستخط اور مہریں جعلی تھیں۔ فتویٰ پر یہ دستخط کوئی مذاق نہیں تھے بلکہ یہ اپنی موت کی دستاویز پر دستخط تھے۔ پھر مولانا محبوب علی اور خواجہ ضیاء الدین صاحب نے بقول ان دونوں حضرات کے دستخط نہیں کیے۔ ان کو کسی نے کچھ نہیں کہا، لہٰذا بالجبر دستخط کروانے کی بات تو صرف زیب داستان کے لیے ہے۔ مختصر یہ کہ ان دونوں حضرات (سرسید احمد خان اور مولوی ذکاء اللہ خان) نے صرف انگریزوں کے قصیدہ خوانوں اور مدح سراؤں میں نام لکھوانے کے لیے یہ سب کچھ لکھا ہے وگرنہ حقیقت یہ ہے کہ فتویٰ جہاد بھی درست تھا اور اس پر علماء کی مہریں اور دستخط بھی درست اور صحیح تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس فتویٰ پر تمام جید علماء کا اتفاق رہا جو مفتی اعظم ہند حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے دیا تھا کہ

"ہم ہندوستانی ہیں۔ ہندوستان ہمارا وطن ہے۔ سات سمندر پار سے انگریز تجارت اور سوداگری کی غرض سے یہاں آئے۔ حکومت

ہند نے ان کو تجارت کی اجازت دی۔ ان غیر ملکیوں نے غیر ملکی رہتے ہوئے رفتہ رفتہ ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ یہ قبضہ بالجبر اور یہ تسلط غاصبانہ ہے۔ باشندگانِ وطن عزیز کا فرض ہے کہ اس بیرونی طاقت سے وطن عزیز کو آزاد کرائیں۔''

اس نظریہ کی بنیاد پر جب فوجیں برگشتہ ہوئی اور وطن کو آزاد کرانے کے لیے انہوں نے جان کی بازی لگا دی تو اب اس واضح مقصد کے لیے کسی فتوے کی ضرورت نہ تھی۔ مختصر یہ کہ فتوے پر دستخط کسی مرعوبیت کی وجہ سے نہ تھے بلکہ ہر ایک نے سوچ سمجھ کر بحث و تمحیص کے بعد دستخط کیے۔

جس فتویٰ کے بارے میں سرسید اور مولوی ذکاء اللہ نے اپنی پوری انگریز دوستی اور علماء دشمنی بلکہ ملک دشمنی کا مظاہرہ کیا ہے، وہ فتویٰ کیا تھا۔ سوال و جواب اور استفتاء اور فتویٰ میں اہل علم اور اصحاب فتویٰ کے سامنے یہ تصور بالکل نہ تھا کہ ہم انگریزوں کے مستامن ہیں، نہ بادشاہ اور خاندان تیموریہ کی اہلیت و نااہلیت کا مسئلہ پیش نظر تھا۔ یہ سب باتیں بعد کی تصنیف فرمودہ ہیں اور ان لوگوں کی تصنیف کردہ ہیں جو بارگاہ انگریزی سے سر اور شمس العلماء اور دیگر خطابات سے سرفراز ہوئے۔ اس وقت صرف ایک سوال تھا کہ آیا ہم میں انگریز کا مقابلہ کرنے کی طاقت ہے یا نہیں؟ چنانچہ سوال یہ تھا:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ اب جو انگریز دلی پر چڑھ آئے ہیں اور اہل اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں، اس صورت میں اب شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں؟ اگر فرض ہے تو وہ فرض عین ہے یا نہیں؟ اور لوگ جو اور شہروں اور بستیوں والے ہیں ان کو بھی جہاد کرنا چاہیے یا نہیں؟ بیان کرو، اللہ تم کو جزائے خیر دے۔

الجواب: درصورت مرقومہ فرض عین ہے اوپر تمام اس شہر کے لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے اس کی فرضیت کے واسطے، چنانچہ اب اس شہر والوں کو طاقت مقابلہ اور لڑائی کی ہے بسبب کثرت اجتماع افواج کے اور مہیا اور موجود ہونے آلات حرب کے۔ تو فرض عین ہونے میں کیا شک رہا۔ اور اطراف و احوال

کے لوگوں پر جو دور ہیں باوجود خبر کے فرض کفایہ ہے۔ ہاں اگر اس شہر کے لوگ باہر ہو جائیں مقابلے سے یا سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں ان پر بھی فرض ہو جائے گا، اور اسی طرح اور اسی ترتیب سے سارے اہل زمین پر شرقاً اور غرباً فرض عین ہو گا۔ او ر جو عدو اور بستیوں پر ہجوم اور قتل و غارت کا ارادہ کریں تو اس بستی والوں پر بھی فرض عین ہو جائے گا بشرط ان کی طاقت کے۔

العبد المجیب احقر: نور جمال عفی عنہ

اس فتویٰ پر 33 علماء کے دستخط اور مہریں بھی ہیں، جن کے نام حسب ذیل ہیں:

(1) سید محمد نذیر حسین (2) رحمت اللہ (3) مفتی محمد صدر الدین (4) مفتی اکرام الدین معروف سید رحمت علی (5) محمد ضیاء الدین (6) عبدالقادر (7) فقیر احمد سعید احمدی (8) محمد میر خان (9) محمد عبدالکریم (10) فقیر سکندر علی (11) محمد کریم اللہ (12) مولوی عبدالغنی (13) خادم العلماء محمد عبدالغنی (14) فریدالدین (15) محمد سرفراز علی (16) سید محبوب علی جعفری (17) ابو احمد محمد حامی الدین (18) سید احمد علی (19) الٰہی بخش (20) محمد مصطفےٰ خان ولد حیدر شاہ نقشبندی (21) محمد انصار علی (22) مولوی سعید الدین (23) حفیظ اللہ خان (24) محمد نور الحق عفی عنہ (25) سراج العلماء ضیاء الفقہاء مفتی عدالت العالیہ محمد رحمت علی خان (26) واللہ الغنی وانتم الفقراء (27) حیدر علی (28) سیف الرحمٰن (29) سید عبدالحمید عفی اللہ عنہ (30) محمد ہاشم (31) سید حافظ (32) محمد امداد علی عفی عنہ (33) خادم شرع شریف رسول الثقلین قاضی القضاۃ محمد علی حسین۔

(علماء ہند کا شاندار ماضی: جلد ۴ ص ۱۷۸۔۱۷۹)

اتنے بڑے بڑے علماء کے مقابلہ میں دہلی کے ان دو مصنفوں کی کیا حیثیت ہے؟

غلامی سے آزادی ہر قوم کا بنیادی حق ہے:

حقیقت یہ ہے کہ غلامی کی زندگی سے آزادی حاصل کرنا ہر قوم کا بنیادی حق ہے۔ اور جو قوم کسی دوسری قوم کو غلام بناتی ہے، قرآن نے اس کو طغیان اور سرکشی اور

بغاوت سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن حکیم میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم ملا۔

﴿اذهب الیٰ فرعون انه طغی﴾ (طٰہٰ:)

''فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت حد سے نکل گیا ہے۔''

اس آیت میں غلام سازی کو طغیان کہا گیا جو موردِ قہر و عذاب خداوندی ہے۔ ایک وقت وہ تھا جب یورپی اقوام نے دنیا بھر کی قوموں کو اپنا غلام بنایا اور اس استعماری جذبہ کے تحت ان سے وہی سلوک کیا جو ایک ظالم آقا اپنے مسکین و بے نوا غلاموں سے کرتا ہے۔

دوسری بات اس آیت سے یہ ثابت ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک غلامی بھی قابل نفرین شی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ غلامی قوموں کے لیے بے عزتی اور بے حمیتی کی جڑ ہے۔ کیونکہ اس دنیا میں ایک قوم کے لیے اسباب عزت چار ہیں:

1- اس کا اپنا اساسی علم جس سے اس قوم کی معنویت قائم ہوتی ہے۔
2- اس کی اقتصادی اور مالی حیثیت جس سے اس کی مادیت بنتی ہے۔
3- اس کی عرفی حیثیت جس سے اس کا وقار قائم ہوتا ہے۔
4- اس کے اندرونی اور بیرونی تعلقات کی نوعیت جس سے اس کے حلقہ اثر میں وسعت اور بنیادوں میں مضبوطی اور استحکام آتا ہے۔

ایک متسلط قوم جب کسی ملک یا قوم کو اپنا غلام بنا لیتی ہے تو پھر وہ غلام قوم کی عزت و آبرو کے یہ چاروں سوتے بند کر دیتی ہے جس سے اس قوم کی معنویت، مادیت، وقعت اور نیک شہرت سب ختم ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ محکوم قوم پھر پستی اخلاق کے قعر مذلت میں گر جاتی ہے اور نہ صرف مخلوق بلکہ خالق کی نگاہوں سے بھی گر جاتی ہے۔ اس کا ہر قدم پستی کی طرف اٹھتا ہے۔ اس کے اپنے قومی علم کا چشمہ خشک ہو جاتا ہے اور نہ ہی اس کا کوئی قومی مزاج باقی ہے۔ وہ سوچتی ہے تو پستی اور بداخلاقی کی باتیں، دیکھتی ہے تو پستی کی طرف اور سنتی ہے تو ذلت و خواری کی باتیں۔ اس کے نزدیک فاتح قوم کی برائیاں اپنا سب سے بڑا کمال ہے اور فاتح قوم کا علم سیکھ لینا ہی اس کے نزدیک سب سے بڑا فخر بن جاتا ہے۔ فاتح قوم کے علم وفن کو وہ اپنا علم وفن سمجھ کر اس

قوم کی ہم نوا بن جاتی ہے اور اس کی اپنی قومی انفرادیت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ اب فاتح اور متسلط قوم کے لباس میں وہ اپنی عزت سمجھتی ہے جو کہ درحقیقت اس کی عزت نہیں بلکہ متسلط قوم کی عزت ہے۔ اسی کے بارے میں اسد ملتانی مرحوم نے کہا تھا ؎

کی مسلمان نے ترقی جو فرنگی بن کر
یہ فرنگی کی ترقی ہے مسلماں کی نہیں

اس کے علم کی تباہی کے ساتھ ساتھ اس کی مالی حیثیت کو بھی تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے، اور ایسے قوانین بنائے جاتے ہیں جس سے وہ دن بدن افلاس کے گڑھے میں گرتی رہے، اور اس کی سیر چشمی، استغنا اور غیرت وحمیت کا خون اس گڑھے کے کناروں پر بہتا رہے۔ پھر اس افلاس اور بے مائیگی کی بے چارگیوں میں اس کا ایمان، اس کی دیانت، اس کی خودداری اور استغناء کو سستے داموں خرید لیا جاتا ہے۔ ملک کی اونچی سوسائٹی اور اونچے عہدوں پر نہ خود اس کی جگہ رہتی ہے اور نہ ہی اس کا اخلاقی، تہذیبی اور علمی سرمایہ کوئی اونچا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ ان جہالتوں اور بداخلاقیوں کے باعث اس قوم کے باہمی روابط اور بیرونی تعلقات نہ صرف مضمحل ہو جاتے ہیں بلکہ بالآخر منقطع ہو جاتے ہیں۔ اس کا دنیا میں کوئی ہم نوا باقی نہیں رہتا، کوئی اس کو سہارا دینے والا اور دست گیر نہیں رہتا یہاں تک کہ اس کی ساری زندگی حکمران اور متسلط قوم کے رحم و کرم پر دائر ہو جاتی ہے۔ چونکہ غلامی یہ چار مہلک اسباب اپنے ساتھ لاتی ہے جس سے قومیں نیست و نابود ہو جاتی ہیں کوئی ان کا نام لینے والا نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے قرآن حکیم نے غلامی کو بدترین عذاب کہا ہے "یسؤمونکم سوء العذاب" بنی اسرائیل کی اسی غلامی کے بارے قرآن نے یہ الفاظ استعمال کیے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو انگریزوں نے غلامی کے ان عناصر اربعہ کی چار میخیں ہمارے پاؤں میں ٹھونک دی ہیں۔ سب سے پہلے اس نے مسلمانوں کی روایتی تعلیم کو ختم کیا۔ کہا گیا کہ جب تک قرآن و حدیث مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے ان کا مذہبی جنون کم نہیں ہوگا اور جب تک اسلامی روایات ان کے ذہنوں میں زندہ ہیں یہ احساس خودداری سے بیگانہ نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ جدید طریقۂ تعلیم کو رائج کر کے

قدیم تعلیم کو ختم کر دیا اور یہ جو مدرسے آپ کو نظر آ رہے ہیں یہ علماء کی اپنی جدوجہد کا ثمر ہے اگر آج یہ بھی نہ ہوتے تو کسی کو نہ قرآن حکیم کے بارے میں کچھ پتہ ہوتا اور نہ ہی حدیث اور سیرت نبوی کے بارے میں کوئی جانتا۔ اب بھی امریکہ کی معرفت موجودہ حکومت کا سارا نزلہ مدرسوں ہی پر گر رہا ہے کیونکہ انگریز یہ سمجھ رہا ہے کہ جب تک یہ مدرسے موجود ہیں مسلمانوں کے دلوں سے جذبۂ جہاد کم نہیں ہوسکتا۔ اور جہاد ہی کو ختم کرنے کے لیے سرسید، مولوی ذکاء اللہ اور مرزا غلام احمد قادیانی جیسے لوگ پیدا کیے گئے۔ جب بھی یہ جذبۂ جہاد ختم نہ ہوا تو ایک یہودی سازش کے تحت امریکہ اور برطانیہ کی معرفت موجودہ حکومت کے ہاتھوں ان مدرسوں کی روح کا گلا گھونٹا جا رہا ہے۔ جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ انگریز جب ہندوستان میں وارد ہوا اور جہاں جہاں اس کو فتح حاصل ہوتی رہی وہیں اس نے مسلمانوں کے نظام تعلیم کو برباد کیا۔ چنانچہ ولیم ہنٹر نے 1871ء میں کتاب Our Indian Musalman (ہمارے ہندوستانی مسلمان) لکھ کر اس حقیقت کو آشکار کیا اور واشگاف الفاظ میں اس سرکاری سازش کو عیاں کیا۔ چنانچہ ہنٹر مسلمانوں کے تعلیمی سلسلہ میں ایک جگہ لکھتا ہے:

> ''ہم اپنے دور حکومت کے پچھلے 75 سالوں میں انتظام ملک کی خاطر اسی طریقۂ تعلیم (مسلمانوں کے طرز تعلیم) سے متواتر فائدہ اٹھاتے رہے۔ گو اس دوران ہم نے اپنا طریقۂ تعلیم بھی رائج کرنا شروع کر دیا تھا۔ پھر جونہی ایک نسل اس نئے طریقہ کے تحت پیدا ہوگئی ہم نے مسلمانوں کے پرانے طریقہ کو خیر باد کہہ دیا جس سے مسلمان نوجوانوں پر ہر قسم کی سرکاری (سیاسی) زندگی کا دروازہ بند ہوگیا۔'' (ہمارے ہندوستانی مسلمان: ص ۲۴۷)

ایک اور جگہ پر ہنٹر نے لکھا ہے:

> ''مسلمانوں کی قدیم تعلیم کا دارومدار معافیات اور اوقاف پر تھا جو اسی مقصد تعلیم کے لیے مسلمان امراء اور حکام وقف کر جاتے تھے۔ چنانچہ صوبۂ بنگال پر جب ہم نے قبضہ کیا تو اس وقت کے

قابل ترین افسر مال (جیمز گرانٹ) کا بیان ہے کہ اس وقت تخمیناً صوبہ کی آمدنی کا ایک چوتھائی حصہ (جو ان معافیات اور اوقاف کے سلسلہ میں تھا) حکومت کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ 1772ء میں وارن ہسٹنگز نے ان علاقوں کی واپسی کی مہم شروع کی مگر ناکام رہی۔ پھر 1773ء میں لارڈ کارنوالس نے پھر اس معاملہ کو اٹھایا مگر اس وقت کی طاقتور حکومت بھی اس پر قابو نہ پا سکی۔ 42 برس بعد 1815ء میں حکومت نے پھر اس معاملہ کو زور سے اٹھایا مگر عمل کی جرأت نہ ہوئی۔ آخر کار 1828ء میں آٹھ لاکھ پونڈ کے خرچ سے مقدمات چلا کر ان معافیات اور تعلیم کے اوقاف پر حکومت نے قبضہ حاصل کر لیا، اور صرف ان معافیات سے حکومت کی آمدنی میں تین لاکھ پونڈ قریباً 45 لاکھ روپے کا اضافہ ہو گیا۔'' (ص ۲۴۸)

جن پتوں پر آشیانہ بنایا گیا تھا وہ ہی جل گئے تو آشیانے کا قائم رہنا ناممکن ہو گیا۔ یہ آمدنی قدیم صیغۂ تعلیمات کے ہاتھ سے نکل گئی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا:

''سینکڑوں پرانے خاندان تباہ و برباد ہو گئے اور مسلمانوں کا تعلیمی نظام جس کا دارومدار انہی معافیات پر تھا، تہ و بالا ہو گیا۔ مسلمانوں کے تعلیمی ادارے اٹھارہ سال کی اس مسلسل لوٹ کھسوٹ کے بعد یک قلم مٹ گئے۔ (ہمارے ہندوستانی مسلمان: ص ۲۵۷)

''لیکن مسلمانوں کے اس الزام کا جواب نہیں دیا جا سکتا کہ ہم نے ان کے تعلیمی اوقاف کا ناجائز استعمال کیا۔ اس حقیقت کے چھپانے سے کیا فائدہ کہ مسلمانوں کے نزدیک اگر ہم اس جائداد کو جو اس مصرف کے لیے ہمارے قبضہ میں دی گئی تھی (دی نہیں گئی تھی بلکہ زبردستی چھینی گئی تھی) ٹھیک ٹھیک استعمال کرتے تو بنگال میں ان کے پاس آج بھی نہایت اعلیٰ اور شاندار تعلیمی ادارے موجود ہوتے۔'' (ہمارے ہندوستانی مسلمان: ص ۲۵۸)

ولیم ہنٹر کے ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دور حکومت میں جب ایک صوبہ میں 45لاکھ روپے صرف ہوتے تھے تو دوسرے صوبوں پر کیا کچھ خرچ ہوتا ہو گا۔ دوسرے صوبوں کی آمدن بھی اڑا کر جدید تعلیم کی ترویج میں خرچ ہوئی ہو گی۔ اس جدید طریقۂ تعلیم میں مسلمانوں کے رجحانات کی کوئی رعایت نہ کی گئی بلکہ انگریزوں نے مسلمانوں کے رجحانات کی پروانہ کرتے ہوئے اپنے رجحانات کو رائج کیا، اس جدید تعلیم میں مسلمانوں کی دینی تعلیم کا کوئی جزو نہ رکھا گیا۔ چنانچہ ہنٹر ایک جگہ اسکولوں اور کالجوں میں مسلمان طلبہ کی غیر معمولی قلت کی وجوہات گناتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''ہمارے طریقۂ تعلیم میں نوجوان مسلمانوں کے لیے مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔'' (ایضاً: ص۲۵۲)

آگے چل کر اس سے زیادہ صاف لفظوں میں ہنٹر لکھتا ہے:

> ''ایک اعلیٰ افسر لکھتا ہے: کیا اس کے بعد بھی یہ کوئی تعجب کی بات ہے کہ مسلمان اس طریقۂ تعلیم سے پرہیز کر رہے ہیں جو ان کے طبعی رجحانات کے لیے کوئی رعایت نہیں رکھتا، نہ اس تعلیم کا کوئی انتظام کرتا ہے جس کو وہ اپنے لیے نہایت ضروری سمجھتے ہوں بلکہ جو قطعی طور پر ان کے مفادات کے خلاف ہے اور ان کی جماعتی روایات کے بالکل برعکس ہے۔'' (ایضا: ص۲۵۳)

بہر حال علم تو مسلمانوں کا یوں تباہ و برباد کیا گیا۔ اب ان کی مالی حیثیت کو بھی ختم کیا گیا تا کہ وہ فارغ البال اور صاحب عزومال نہ ہو سکیں۔ ولیم ہنٹر نے ہی لکھا ہے کہ

> ''آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے بنگال کے خاندانی مسلمانوں کے لیے ناممکن تھا کہ وہ غریب ہوں لیکن آج کل یہ ناممکن ہے کہ وہ بدستور امیر رہیں۔'' (ہمارے ہندوستانی مسلمان: ص ۲۲۱)

آگے چل کر ہنٹر لکھتا ہے:

> ''گذشتہ 75 سال سے بنگال کے مسلمانوں کے گھرانے (وسائل دولت منقطع کر دیئے جانے کے باعث) یا تو صفحۂ ہستی سے بالکل

نابود ہو گئے یا ان لوگوں کے مقابلہ میں حقیر اور پست ہیں جن کو ہماری حکومت نے (وسائل دولت سے) سربلند کیا ہے۔"

اسی کتاب کے صفحہ 226 پر 1763ء کے دوامی بندوبست کے بارے میں جو اس وقت مسلمانوں کو کچلنے اور تباہ حال کرنے کے لیے حکومت کی ایک خاص پالیسی کے تحت کیا گیا تھا، ولیم ہنٹر لکھتا ہے:

"بایں ہمہ سب سے کاری ضرب جو ہم نے پرانے طریق پر لگائی وہ اس قدر پرفریب تھی کہ اس کا پیش از وقت اندازہ نہ مسلمانوں کو ہو سکا اور نہ انگریزوں کو۔"

اس خاص اور پرفریب پالیسی کا اثر کیا ہوا؟ ہنٹر لکھتا ہے:

"اس بندوبست نے ہندو کلکٹروں کو جو اس سے قبل معمولی عہدوں پر مامور تھے، ترقی دے کر زمیندار بنا دیا ہے۔ ان کو زمین کی ملکیت کا حق حاصل ہو گیا ہے اور اب وہ اس دولت کو سمیٹ رہے ہیں جو مسلمانوں کی حکومت کے تحت مسلمانوں کا حق تھا۔" (ایضاً: ص ۲۲۷)

جو اس تغیر و تبدل کا انتہائی مقصد تھا اس کے نتیجہ کے طور پر ہنٹر لکھتا ہے:

"مثلاً خود مختار تعلق داروں کی علیحدگی ہی سے بہت سے مسلمان خاندانوں کی عظمت خاک میں مل گئی۔" (ایضاً: ص ۲۲۷)

اس زمانہ میں مسلمانوں کی آمدنی کے دو ہی بڑے ذرائع تھے۔ محکمۂ فوج اور محکمۂ دیوانی۔ ان دونوں کے دروازے مسلمانوں پر بند کر دیئے گئے تاکہ وہ مالی حیثیت سے تباہ حال ہو کر سوسائٹی میں پست حال ہو جائیں۔ ہنٹر لکھتا ہے:

"ہم نے مسلمان امراء کو فوج میں داخل نہیں کیا کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ ہماری عافیت ان کو بے دخل کر دینے ہی میں ہے۔ ہم نے ان کو دیوانی کے منفعت بخش محکمہ سے اس لیے خارج کر دیا کہ ایسا کرنا حکومت اور عوام کی بہتری کے لیے ازحد ضروری تھا۔"

(ایضاً: ص ۲۳۰)

مختصر یہ کہ مسلمانوں کے علم کے دروازے بھی ان پر بند کر دیئے گئے اور مختلف طریقوں سے دولت بھی ان سے چھین لی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا وقار منصب اور حیثیت عرفی ختم ہوگئی۔ چنانچہ ہنٹر لکھتا ہے:

''دراصل کلکتہ کے سرکاری دفتر میں مسلمان اب اس سے بڑھ کر اور کوئی امید بھی نہیں رکھ سکتے کہ قلی اور چپڑاسی، دواتوں میں سیاہی ڈالنے والا یا قلموں کو ٹھیک کرنے والا کے سوا کوئی اور ملازمت حاصل کر سکیں۔''

ہنٹر نے اپنی کتاب میں زیادہ تر بنگال کا ذکر کیا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اولاً انگریزوں نے صوبہ بنگال ہی کو فتح کیا تھا اور وہیں ان کی حکومت قائم ہوئی تھی، اس لیے سب سے پہلے انہوں نے بنگال ہی کو تباہ و برباد کیا۔ یہی حال بعد میں دوسرے صوبوں کا بھی کیا گیا۔ چنانچہ ہنٹر ہی نے لکھا ہے کہ

''میں یہ بھی بتا دوں کہ میرے بیانات کا تعلق جنوبی بنگال سے ہے کیونکہ یہ وہ صوبہ ہے جسے میں اچھی طرح سے جانتا ہوں، اور جہاں تک مجھے علم ہے مسلمانوں نے برطانوی حکومت کے ماتحت سب سے زیادہ یہیں نقصان اٹھایا ہے۔ پھر میں اگر دوسروں کو یہ یقین دلاؤں اور خود میرا بھی یہی خیال ہے کہ یہ بیانات مسلمانان ہند پر راست آتے ہیں تو مجھے اس پر معاف کیا جائے۔''

(ہمارے ہندوستانی مسلمان: ص ۲۱۰)

اس سے معلوم ہوا کہ انگریزوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ بنگال میں کیا ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں بھی یہی کچھ کیا گیا۔ ان حالات میں اس وقت جن علماء کے انگریزوں کے خلاف جنگ جو جہاد کا فتویٰ دیا تھا وہ ہمارے خیال میں بالکل درست تھا اور جن لوگوں نے اس فتویٰ جہاد کی مخالفت کی وہ نہ صرف غدران وطن تھے بلکہ اسلام کے اصولوں سے بھی ناآشنا تھے۔

دہلی کی تباہی:

جنگ آزادی میں انقلابی فوجوں کو شکست ہوگئی اور انگریز غالب آ گئے۔ اب وہی کچھ ہوا جو خدا ناآشنا قومیں مفتوح قوم سے کرتی ہیں۔ عزت داروں کو ذلیل کیا گیا اور پورے شہر میں تباہی کا وہ کھیل کھیلا گیا کہ نادر شاہی بھی الامان الحفیظ پکارنے لگی۔ راقم الدولہ ظہیر دہلوی کا کہنا ہے کہ

> ''کابلی دروازے سے لے کر قلعہ تک، اور دریبہ سے لے کر قلعہ تک، اور جامع مسجد سے لے کر دلی دروازہ تک، بلاقی بیگم کا کوچہ، خانم بازار، خاص بازار، خان دوران خان کی حویلی سے دریا گنج تک ہزارہا مکانات منہدم اور مسمار کر کے دلی کا چبوترہ بنا دیا گیا اور چٹیل میدان کر دیا گیا۔'' (داستان غدر: ص ۳۷)

مکانات مسمار کرنے اور منہدم کرنے اور مسجدوں اور مندروں کو تباہ و برباد کرنے کا واقعہ طویل بھی ہے اور دردناک بھی لیکن اب اس کا ماتم کرنا لاحاصل ہے۔

دہلی کی تباہی اور مسجدوں کے انہدام کے بعد اب وہ فتویٰ حاصل کیا گیا جس کو سرسید نے فتویٰ جہاد کا نام دیا ہے۔ پھر ان علماء کو پکڑا گیا جن کے اس فتویٰ پر دستخط تھے یا جن علماء نے اس جنگ آزادی میں قولی یا عملی حصہ لیا تھا۔ چنانچہ مفتی صدرالدین خان آزردہؒ جو ایک جامع کمالات شخصیت تھے۔ سرسید نے ان کا ذکر کرتے ہوئے یہ شعر لکھا ہے ؎

ہزار بار بشویم دہن ز مشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی ست

دہلی کی جنگ آزادی میں آپ کو سخت زخم چشم پہنچا کہ تعلق روزگار بھی ہاتھ سے گیا اور تمام جائداد بھی جو تیس سال کی ملازمت میں پیدا کی ہوئی تھی بحق سرکار ضبط ہوگئی بلکہ فتویٰ جہاد کے باعث چند ماہ تک نظر بند رہے۔ آخر کو رہائی پا کر لاہور تشریف لے گئے اور اپنے کتب خانہ کے بارے میں جو تین لاکھ روپے مالیت کا تھا اور دہلی کی لوٹ میں نیلام ہوگیا تھا، لارڈ جان لارنس کے پاس آئے جو اس وقت پنجاب کا چیف کمشنر تھا

اور مفتی صاحب سے اس کے گہرے تعلق تھے۔ آپ نے اس جائداد اور کتب خانہ کی واپسی کا مطالبہ کیا لیکن چیف کمشنر صاحب کی طرف سے جواب یہ ملا کہ جائداد منقولہ کے نیلام کا واپس ہونا میرے بس میں نہیں۔ البتہ جائداد غیر منقولہ جو بحق سرکار ضبط ہو گئی تھی واگزار ہو گئی۔ مفتی صاحب لاہور سے واپس آ کر کچھ عرصہ بستی نظام الدین میں اور پھر اپنی حویلی میں خانہ نشین اور اپنی باقی زندگی ذکر وفکر اور تدریس علوم دینیہ میں بسر کر دی۔

اسی طرح نواب مصطفٰے خان شیفتہ اور مولانا امام بخش صہبائی وغیرہ کو بھی اذیتیں دی گئیں۔ بلکہ مولانا صہبائی کو تو شہید کر دیا گیا۔ اس بارے میں خواجہ حسن نظامی فرماتے ہیں کہ

> ''دہلی کے تمام محلوں سے زیادہ چیلوں کے کوچہ پر مصیبت آئی تھی۔ اس محلّہ میں بڑے بڑے شرفاء اور نامور علماء رہتے تھے۔ مولانا شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا گھرانا اسی محلّہ میں آباد تھا۔ سرسید خان کا گھر بھی اسی محلّہ کے ایک حصہ میں تھا۔ مولانا صہبائی بھی اسی محلّہ میں رہتے تھے۔ غرض یہ محلّہ بڑے بڑے صاحب کمال لوگوں کا مخزن تھا۔ منشی ذکاء اللہ خان بھی اسی محلّہ کے باشندہ تھے۔ (دہلی کی جان کنی: ص ۴۷)

منشی ذکاء اللہ خان لکھتے ہیں کہ

> ''اس مصیبت کا خاص سبب یہ ہوا کہ نواب شمشیر جنگ کے بیٹے محمد علی خان نے یا حکیم فتح اللہ خان نے کسی انگریزی سپاہی کو زخمی کر دیا تھا کیونکہ وہ ان کے زنانہ مکان میں برے ارادے سے جانا چاہتا تھا۔ اس کی خبر انگریزی کمان افسر کو پہنچی۔ اس نے حکم دیا کہ اس محلّہ کے تمام مردوں کو قتل کر دو یا گرفتار کر کے لے آؤ۔
>
> ''اس حکم کی تعمیل ایسی بے دردی سے ہوئی کہ محلّہ میں کوئی مرد زندہ نہ بچا۔ یا تو سپاہیوں نے گھروں میں گھس کر مار ڈالا یا گرفتار کر کے حاکم کے سامنے لے گئے۔ حاکم نے ان کو دیکھ کر حکم دیا کہ سب کو

دریا کے کنارے لے جاؤ اور گولی ماردو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

''ان لوگوں کو رسی سے باندھا گیا۔ دریا کی ریتی میں قطار بنا کر کھڑا کیا گیا اور گولیوں کی باڑھ ان پر چلائی گئی جس سے سب مر کر گر پڑے۔ صرف دو آدمی زندہ بچے جن کو گولی نہ لگی تھی۔ جب سپاہی گولیاں مار کر چلے گئے تو یہ دونوں اٹھ کر بھاگے۔ ان میں ایک مرزا مصطفیٰ بیگ تھے جو بعد میں رسالہ میں نوکر ہو گئے تھے اور دوسرے مولانا صہبائی کے داماد اور بھانجے وزیرالدین نامی تھے جو بعد میں کانپور میں ججی کے سرشتہ دار ہو گئے تھے۔''

علمائے مظفر نگر و سہارن پور:

دہلی کے شمال میں قریباً چالیس میل کے فاصلہ سے شروع ہونے والا وہ علاقہ جو جمنا کے پانی سے سیراب ہوتا ہے اور کہیں اس کی سرسبز و شاداب وادیاں دریائے گنگا کی فیاضیوں سے ہم کنار ہوتی ہیں۔ اس علاقہ کو آج کل ضلع مظفر نگر اور ضلع سہارن پور کہا جاتا ہے۔ یہ علاقہ جس طرح زرعی لحاظ سے زرخیز ہے ویسے ہی انسانیت کے نقطۂ نظر سے مردم خیز اور سیاست کے لحاظ سے انقلاب انگیز واقع ہوا ہے۔ اس علاقہ میں مسلمان اگرچہ تعداد میں کبھی بھی زیادہ نہیں ہوئے لیکن اخلاق، کردار اور ذہنی صلاحیتوں کے لحاظ سے ان کا درجہ ہمیشہ ممتاز رہا ہے۔ تھانہ بھون، کاندھلہ، کیرانہ، شاملی، جھنجھانہ، بڈھانہ، دیوبند، نانوتہ، گنگوہ، انبیٹھہ، رائے پور، منگلور، پھلت وغیرہ انہی اضلاع کے مشہور قصبے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے ددھیال اگرچہ سونی پت میں تھے لیکن آپ کے ننہیال اسی علاقہ پھلت سے تعلق رکھتے تھے۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں اس علاقے کا ایک اہم کردار رہا ہے۔

تذکرۃ الرشید کے واقعات کے مطابق اس علاقہ میں بغاوت کا اصل بانی اور علم بردار قاضی عنایت علی صاحبؒ رئیس تھانہ بھون کو قرار دیا گیا ہے، قاضی صاحب تھانہ بھون کے بااختیار قاضی تھے۔ ان کا خاندان شاہ جہانی عہد سے اسی عہدہ پر فائز تھا اور ان کو بائیس گاؤں جاگیر میں ملے ہوئے تھے۔ نہایت متبع سنت اور قول کے بڑے سچے

بزرگ تھے۔ فنون حرب اور شہ سواری میں بھی اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ اس وقت وہ تیس بتیس سال کے خوش رو جوان تھے۔ ضلع بجنور سے نکل کر میرٹھ ہوتے ہوئے وہ بندیل کھنڈ کے علاقہ میں گئے اور وہاں کے محبان حریت کو ساتھ لے کر انگریزی فوجوں پر حملے کرتے رہے۔ 1859ء تک انگریز فوجوں نے بہت سے محبان حریت کو گرفتار کر لیا یا شہید کر دیا۔ جب ان کو اپنے ہم خیال لوگ نہ مل سکے تو بالآخر انہوں نے جنگ سے دست کشی اختیار کر لی۔ جو چند جان نثار رہ گئے تھے ان کو رخصت کر کے خود اپنے اعزاء کے پاس بھوپال چلے گئے۔ وہاں وہ بالکل خاموش اور عزلت کی زندگی گذار رہے تھے کہ ایک روز شاہ راہ پر ہر ہائی نیس قدسیہ بیگم فرمان روائے بھوپال کی سواری آتی نظر آئی۔ یہ بھی گھوڑے پر سوار تھے۔ مردم شناس بیگم نے پہلی ہی نظر میں جوہر قابل کو پہچان لیا۔ مصاحب کی معرفت تحقیق حال کی گئی تو پتہ چلا کہ مسافر اور متلاشی روزگار ہیں۔ سواری ان کی شہ سواری کو عیاں کر رہی تھی۔ بیگم صاحبہ نے چند سوالات کے بعد معقول مشاہرے پر ان کو گھوڑوں کی تربیت کے لیے ملازم رکھ لیا اور ہفتہ میں صرف دو روز ان کی ڈیوٹی مقرر کی۔ پرانے ملازمین کو کچھ اچھا نہ لگا۔ چنانچہ وہ گاہ بگاہ بیگم صاحبہ سے ان کے خلاف شکایات کرنے لگے، لیکن بیگم صاحبہ نے ان کی شکایات کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ ریاست کی ایک سالانہ تقریب پر ملازمین میں سے ایک شہسوار کچھ خاص کرتب دکھاتا تھا۔ اور اس کا آخری کرتب ایک باؤلی کے اوپر سے گھوڑا گزارنا تھا جس پر صرف ایک بالشت چوڑا تختہ بچھا ہوا تھا۔ قاضی صاحب کے علم میں اس کا یہ کرتب آچکا تھا۔ جب یہ آخری کرتب دکھانے کے لیے باؤلی کے ایک طرف سے روانہ ہوا تو قاضی صاحب نے مخالف سمت سے اس تختہ پر اپنا گھوڑا بڑھایا۔ ریاستی شہسوار چلایا: ''یہ کیا کرتے ہو؟ دونوں باؤلی میں ڈوب مریں گے۔'' قاضی صاحب نے جواب دیا: ''ڈوب مرنے کی ضرورت نہیں۔ استادی کا دعویٰ ہے تو گھوڑا موڑ کر واپس ہو جاؤ، ورنہ شاگردی کا اقرار کر کے ہنر پیش کرو۔' اس شہسوار نے عاجزی کا اظہار کر کے شاگردی کا اقرار کیا۔ قاضی صاحب نے اپنے گھوڑے کو چمکار کر اس کی گردن پر تھپکی دی۔ باگ کے اشارے کے ساتھ ہی گھوڑا اپنی پچھلی ٹانگوں پر الف ہو کر مڑا اور پورا گھوم کر واپس ہو گیا۔ تماشائی عش عش کر اٹھے۔

ریاستی شہسوار پار ہو کر گھوڑے سے کودا اور رکاب بوس ہوا اور ہنر پیش کر کے شاگردی کا باضابطہ اعلان کیا۔ ان کی یہ شہرت اور مقبولیت ہی ان کے احوال کے تجسس کا ذریعہ اور باعث بنی، اور کچھ عرصہ کے بعد ان کو احساس ہوا کہ لوگ میرے متعلق مشکوک ہیں، لہٰذا وہ بھوپال کو چھوڑ کر جودھ پور چلے گئے۔ وہاں بھی ان کی شہسواری اور سپہ گری نے ان کو پوشیدہ نہ رہنے دیا اور بعض عمائدین ان پر شک کرنے لگے تو وہ ریاست الور میں قصبہ تجارہ کے قریب ایک موضع میں اپنے ایک شمشیر ساز دوست کے یہاں تشریف لے آئے اور دم واپسیں تک خاموشی سے وہیں مقیم رہے۔ پھر غالباً 1910ء میں تراسی یا پچاسی سال کی عمر میں اس شیر بیشۂ جرأت و بہادری نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اسی گاؤں میں مدفون ہوئے۔ انتقال کے بعد ان کے شمشیر ساز دوست کو پتہ چلا کہ مرحوم تھانہ بھون کے مشہور قاضی عنایت علی خان تھے ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو علمائے ہند کا شاندار ماضی)

اس قاضی عنایت علی خان کے ایک بھائی جن کا نام قاضی عبدالرحیم تھا اور اپنے بھائی قاضی عنایت علی کی طرح نہایت سعید، شریف الطبع اور پابند مذہب تھے۔ دونوں بھائیوں میں غیر معمولی محبت و الفت تھی۔ یہ قاضی عبدالرحیم ہاتھی خریدنے کے لیے سہارون پور گئے۔ کسی نے مخبری کر دی اور مسٹر سپنکی (Spankie) مجسٹریٹ ضلع سہارن پور نے ان کو گرفتار کر کے پھانسی پر لٹکوا دیا۔ اس پر قاضی صاحب نے علم بغاوت بلند کیا۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کی گئی اور ان کو باقاعدہ امیر بنایا گیا۔ چنانچہ تذکرۃ الرشید میں مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھیؒ کے بیان کے مطابق تھانہ بھون کو ایک مرکز بنایا گیا۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ اس کے امیر مقرر کیے گئے۔ ان کے ہاتھ پر بیعت کی گئی اور ایک نظام حکومت قائم کیا گیا۔ جس میں فصل خصومات یعنی عدالت جیسے محکمے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے سپرد کیے گئے۔ تشکیل حکومت کے بعد جہاد کا اعلان کیا گیا۔ یہ اعلان اس وقت کیا گیا جب دہلی میں ایک صالح نظام قائم ہو گیا اور علمائے کرام نے غور و خوض کے بعد جہاد کا

فتویٰ دیا۔ اب تھانہ بھون کی اس جماعت کے لیے بھی راستہ صاف ہو گیا اور ممکن ہو گیا کہ اس علاقہ کے امیر حاجی امداد اللہؒ اقدام کا فیصلہ صادر فرما دیں۔ پہلے ایک اجتماع ہوا جس میں راست اقدام کے بارے میں بحث مباحثہ ہوا آخر کار سب نے حضرت حاجی صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی۔ پہلی بیعت تشکیل حکومت کے لیے تھی اور یہ دوسری بیعت جہاد کے لیے۔ چنانچہ سرفروشانِ دین و وطن سر ہتھیلی پر لے کر ایک منظم طاقت سے ٹکرانے کے لیے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے اور تھانہ بھون سے سے شاملی کی طرف مارچ شروع کر دیا۔ جس کا نصب العین دہلی تھا۔ شاملی کی طرف اقدام کا ایک دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ مہار سنگھ رئیس شاملی نے جو علم بغاوت بلند کیا تھا اس کو کمک کی شدید ضرورت تھی۔ اب یہ معرکہ کہاں کہاں ہوا اور کس کس طرح ہوا اور اس میں کس کس نے کتنا کتنا حصہ لیا اس کا ذکر حضرت مولانا حسین احمد صاحب قدس اللہ سرہ نے اپنی سوانح حیات نقش حیات جلد اول میں کیا ہے۔ حضرت حافظ محمد ضامنؒ اسی ہنگامہ میں شہید ہو گئے۔ بس ان کا شہید ہونا تھا کہ معاملہ بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔ اب معاملہ برعکس ہو گیا۔ فتح شکست میں تبدیل ہو گئی۔ حضرت شیخ الہندؒ فرماتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ تمام معاملہ جوش وخروش اور جنگ و جدال کا حضرت حفاظ محمد ضامنؒ کی شہادت کے لیے کیا گیا تھا۔ بہر حال حضرت حافظ صاحبؒ کی شہادت اور دہلی کے سقوط کی خبر سے لوگوں کی ہمتیں جواب دے گئیں اور سب اپنے اپنے شہروں اور قصبوں کو واپس چلے گئے۔

اب انگریزی فوج نے تھانہ بھون پر گولہ باری شروع کر دی۔ فصیل توڑ دی گئی، مٹی کا تیل ڈال کر مکانوں کو آگ لگا دی گئی۔ جو ہاتھ آیا اس کو تہ تیغ کیا گیا یہاں تک کہ لوٹ مار کے بعد تھانہ بھون ایک اجڑا دیار بن گیا۔ قاضی عنایت علی خان اور دوسرے بزرگ باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ سرسید کی روایت کے مطابق قاضی عنایت علی اپنے بہت سے ساتھیوں کو لے کر نواب محمود علی خان کے پاس نجیب آباد چلے گئے۔ پھر نجیب آباد سے نکل کر دیوبند پہنچے۔ یہاں چند روز قیام کر کے بھوپال تشریف لے گئے اور آخر میں الور کے قصبہ تجارہ کے قریب ایک گاؤں میں قیام کیا اور وہیں راہی ملک عدم ہوئے۔

سقوط دہلی 19 ستمبر 1857ء کو ہوا اور اسی روز بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کیا گیا اور

یکم نومبر 1858ء کو ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے عام معافی کا اعلان کیا گیا، لیکن ان ساڑھے تیرہ ماہ میں انگریزوں کی پالیسی یہ رہی کہ ع

جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابل دار ہے

انگریزوں نے اس عام معافی کے بعد بھی کئی لوگوں کو گرفتار کیا۔ چنانچہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی گرفتاری بھی اس اعلان معافی کے قریباً سات ماہ بعد جولائی 1859ء میں ہوئی۔ اسی طرح حضرت مولانا فضل حق خیرآبادی بھی اس معافی عام کے بعد 1959ء میں گرفتار کیے گئے۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ قریباً ڈیڑھ سال مختلف علاقوں میں گزار کر بالآخر 1276ھ میں سندھ کے راستہ سے کراچی پہنچے اور وہاں سے مکہ مکرمہ کے لیے روانہ ہو گئے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ اور مولانا محمد منیر نانوتویؒ یہاں ہندوستان ہی میں رہے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ بھی ان مجاہدین میں سے تھے جنہوں نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ جہاد پر دستخط بھی کیے اور عملی طور پر بھی جہاد میں حصہ بھی لیا۔ اس کے علاوہ جنگ آزادی سے قریباً تین سال قبل انہوں نے پادری فنڈر سے آگرہ میں مناظرہ بھی کیا جس میں پادری فنڈر بھاگ گیا تھا۔ انگریزوں کو اس کا بھی بہت دکھ تھا۔ لہٰذا مولانا کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے۔ آپ کو مفرور باغی قرار دیا گیا، اور گرفتاری کے لیے ایک ہزار روپیہ کا اعلان بھی کیا گیا تھا، لیکن حضرت مولاناؒ کسی نہ کسی طریقہ سے ان سے بچتے بچاتے مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ انگریزوں کو جب پتہ چلا کہ حضرت مولانا مکہ مکرمہ چلے گئے ہیں تو انہوں نے آپ کی تمام جائداد نیلام کر دی۔ جائداد کے نیلام کا فیصلہ ڈپٹی کمشنر کرنال نے 30 جنوری 1864ء کو کیا۔ وہاں مکہ میں آپ نے ''مدرسہ صولتیہ'' قائم کر کے غیر فانی کارنامہ انجام دیا۔

انگریزوں کے موردِ عتاب ہونے والے علماء میں سے ایک حضرت مولانا فیض احمد بدایونیؒ بھی تھے۔ یہ نہایت وسیع اخلاق کے شخص تھے۔ ہر مدد کے خواستگار کی حتی المقدور مدد کرتے۔ بعض اوقات اس کے لیے قرض کی ضرورت پڑ جاتی۔ چنانچہ ان کے

بارے میں صاحب ''اکمل التاریخ'' نے لکھا ہے:

> ''باوجود ثروت ووقار کے دل فقیرانہ اور مزاج شاہانہ تھا۔ فقراء سے محبت اور غرباء سے الفت، طلبہ کے شائق اور علم کے شیدائی تھے۔ شاگردوں کی تمام ضروریات کے خود متکفل ہوتے تھے۔ سلسلۂ درس وتدریس اقامت آگرہ میں برابر جاری رہا۔''

ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے ہم دوش ہندوستان میں مذہب عیسوی نے بھی فروغ حاصل کیا اور انگریزوں نے ہر ممکن صورت سے اس مغلوب ملک کو مذہبی حیثیت سے بھی فتح کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ کمپنی کی تائید واعانت سے مذہب عیسوی کی تنظیم وترقی عمل میں آئی۔ عیسائیوں کی مختلف سوسائٹیاں بنائی گئیں۔ مذہبی کتابوں اور رسائل کی اشاعت کے ذریعہ ہندوستانیوں کے رجحانات اور عقائد سلب کرنے کی کوشش کی گئی۔ 1854ء میں پادری فنڈر یورپ سے ہندوستان درآمد کیا گیا۔ اس نے نہایت دل شکن تقریریں کیں جن سے مسلمانوں کے جذبات نہایت مجروح ہوئے۔ رہی سہی کسر اس کی کتاب ''میزان الحق'' کی اشاعت نے نکال دی۔ پادری فنڈر نے آگرہ کو مناظرہ کا گڑھ ٹھہرایا کیونکہ آگرہ ہی اس وقت علماء کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ پادری فنڈر نے مشاہیر علماء کو چیلنج کیا۔ مولانا فیض احمد کے دوست ڈاکٹر وزیر خان نے اس کو قبول کر لیا۔ اس مقصد کے لیے مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کو بھی بلا لیا گیا۔ 10 اپریل 1854ء بروز پیر کٹرہ عبدالمسیح آگرہ میں مناظرہ کا پہلا اجلاس ہوا۔ اہل اسلام کی طرف سے مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور ڈاکٹر وزیر خان اور مولانا فیض احمد بدایونی ان کے معاون مقرر ہوئے۔ مناظرہ میں حکومت اور عیسائیوں کے بڑے بڑے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ شرائط مناظرہ میں ایک شرط یہ تھی کہ مغلوب کو غالب کا مذہب اختیار کرنا ہوگا۔ تین روز تک مناظرہ ہوا اور پادری فنڈر کو انجیل کی تحریف کا اقرار کرنا پڑا اور وہ ہندوستان چھوڑ کر یورپ بھاگ گیا۔

دہلی میں ذی علم، سنجیدہ اور باخلاص اصحاب فکر کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر وزیر خان اور مولانا فیض احمد بدایوانی دونوں دہلی چلے گئے۔ ان دونوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا

گیا۔ ڈاکٹر وزیر خان جنرل بخت خان کے مشیر خاص مقرر ہوئے جب کہ مولانا فیض احمد صاحب مرزا مغل کے پیش کار متعین ہوئے۔ 19 ستمبر 1857ء کو جنرل بخت خان نے دہلی سے کوچ کیا تو مولانا فیض احمد اور ڈاکٹر وزیر خان دونوں اس کے ساتھ تھے۔ یہ دونوں مولانا شاہ احمد اللہ صاحبؒ کے پاس لکھنؤ پہنچے جو وہاں دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ مولانا شاہ احمد اللہ کی شہادت کے بعد یہ دونوں حضرات ایسے روپوش ہوئے کہ آپ کے ماموں مولانا فضل رسول نے آپ کی قسطنطنیہ تک تلاش کی لیکن ان کا کہیں سراغ نہ ملا۔ رحمہما اللہ

انہی جان نثارانِ دین و وطن میں ایک مولانا کفایت علی صاحب کافیؒ بھی تھے۔ عالم و فاضل، طبیب اور قادر الکلام شاعر۔ مراد آباد اصل وطن تھا۔ حدیث سے بے حد شغف تھا۔ عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کچھ ایسے مدہوش تھے کہ آپ کی شاعری میں زیادہ تر نعت رسول ﷺ ہیں۔ خود فرماتے ہیں ؎

ہے سعید دو جہان وہ جو کوئی لیل و نہار
نعت اوصاف رسول اللہ کا شاغل ہوا

جب 1857ء کی تحریک حریت وطن مراد آباد میں نمودار ہوئی تو آپ صف اول کے مجاہدین میں سے تھے۔ جب 25 اپریل 1858ء کو مراد آباد پر دوبارہ قبضہ ہوا تو مولانا کافی کچھ دنوں تک محفوظ رہے۔ 30 اپریل کو گرفتار ہوئے اور مختلف الزامات میں پھانسی کی سزا کا حکم صادر ہو گیا۔ مولانا کافیؒ نے جیسے ہی یہ حکم سنا تو نہایت خوشی کا اظہار فرمایا۔ اور جب مولانا کو پھانسی کے لیے لے جایا گیا تو آپ کی زبان پر ایک تازہ نظم تھی جو وجد آویز ترنم میں بلند آواز سے پڑھ رہے تھے۔ نظم یہ ہے ؎

کوئی گل باقی رہے گا، نہ چمن رہ جائے گا
پر رسول اللہ کا دین حسن رہ جائے گا

ہم صفیرو باغ میں ہے کوئی دم کا چہچہا
بلبلیں اڑ جائیں گی، سونا چمن رہ جائے گا

اطلس و کم خواب کی پوشاک پر نازاں نہ ہو

اس تن بے جان پر خالی کفن رہ جائے گا
جو پڑھے گا صاحب لولاک کے اوپر درود
آگ سے محفوظ اس کا تن بدن رہ جائے گا
سب فنا ہو جائیں گی کافی ولیکن حشر تک
نعتِ حضرت کا زبانوں پر سخن رہ جائے گا

آپ کو جیل مراد آباد کے پاس مجمع عام کے سامنے پھانسی دی گئی اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔ (رحمہ اللہ ورضی عنہ)

انہی علماء میں سے جن کو 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے اپنی سزا کا ہدف بنایا، مراد آباد کے ایک مشہور قادری بزرگ حضرت شاہ بلاقی الملقب بہ شاہ بولن کے پڑپوتے شاہ غلام بہولن سیوہارویؒ بھی تھے۔ آپ سے لوگ کثیر تعداد میں فیض روحانی حاصل کرتے تھے۔ آپ کی سیر چشمی، سخاوت اور مہمان نوازی زبان زد خاص و عام تھی۔ 1857ء کے انقلاب میں آپ کا لنگر خانہ تمام غریبوں اور مسافروں اور فقر وفاقہ کے ہاتھوں پریشان لوگوں کے لیے کھلا ہوا تھا۔

انگریز نے غلبہ پاکر جب داروگیر شروع کی تو آپ کو اس الزام میں گرفتار کیا گیا کہ آپ انگریز کے دشمنوں کی مدارات کرتے ہیں اور ان کو کھانا کھلاتے ہیں۔ اس گرفتاری کا باعث ان کا ایک چغل خور مرید تھا لیکن یہ باطن میں انگریزوں کا ایجنٹ تھا۔ آپ کو گرفتار کر کے جزیرہ انڈیمان (کالاپانی) بھیج دیا گیا جہاں وہ 2 ربیع الاول 1276ھ کو انتقال فرما گئے۔ **نور اللہ مرقدہ و برد اللہ مضجعہ**

انہی لوگوں میں سے جن کو انگریزوں نے موت کے گھاٹ اتارا ایک مولانا احمد اللہ شاہ صاحبؒ بھی تھے۔ آپ عزم و ہمت، حمیت ملی اور غیرت وطن کا شعلہ جوالہ تھے اپنے تو اپنے غیر بھی ان کے علم و عمل، قوت روحانی اور جرأت ایمانی کے معترف تھے۔ چنانچہ جی ڈبلیو فارسٹر نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ

"وہ عالم باعمل ہونے کی وجہ سے مولوی تھے۔ روحانی طاقت کی وجہ سے صوفی تھے اور جنگی مہارت کی وجہ سے سپاہی اور سپہ سالار تھے۔

احمد شاہ نام۔ظلم طبیعت میں نہیں تھا۔ ہر انگریز ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔''

قیاس یہ ہے کہ حضرت مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحبؒ 1846ء یا 1847ء میں دہلی تشریف لائے۔ کچھ دیر یہاں قیام کے بعد ارباب بصیرت نے بعض مصلحتوں کی وجہ سے ان کی عنان توجہ دہلی سے آگرہ کی طرف منعطف کی۔ لیکن آگرہ آپ کے لیے ایک اجنبی شہر تھا، مفتی صدرالدین آزردہ نے انہیں ایک خط دیا جو آگرہ کے بعض علماء کے نام تھا خصوصی طور پر اس میں مفتی انعام اللہ خان جو محکمۂ شریعت میں مفتی رہ چکے تھے، کو مخاطب کیا گیا تھا۔ مولانا احمد اللہ شاہ صاحب آگرہ آکر اس خط کی وجہ سے مفتی انعام اللہ خان کے گھر میں مقیم ہو گئے۔ ان کا گھر علماء کا مرکز بنا ہوا تھا۔ علماء اور فضلاء کرام کا یہ گلدستہ جس کی شیرازہ بندی علمی اور ادبی ذوق نے اب تک کر رکھی تھی، مولانا سید احمد شاہ صاحب کے پہنچنے کے بعد اس میں سیاسی رنگ پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ اس مجلس علماء میں بڑے بڑے جید علماء آیا کرتے تھے۔ یہ حضرات مختلف عہدوں پر فائز تھے یا وکلاء تھے۔ چنانچہ انہوں نے دامے، درمے اور قدمے حضرت شاہ صاحب کی تائید و اعانت شروع کر دی۔

آگرہ میں آپ کی روحانیت سے متاثر ہو کر آپ کا ایک حلقۂ ارادت قائم ہو گیا۔ پھر اس میں اتنی وسعت پیدا ہوئی کہ آپ جہاں کہیں تشریف لے جاتے مریدین کا ایک ہجوم ساتھ ساتھ رہتا۔ آپ کی وجہ سے ویران مسجدیں آباد ہو گئیں۔ آگرہ شہر جب اس طرح مسخر ہو گیا تو آپ نے مضافات کا قصد فرمایا۔ وہاں بھی آپ کے ایک ہی دورہ میں تمام گاؤں کا رنگ بدل جاتا، لیکن انگریز کو حضرت سید احمد شہیدؒ کا دور یاد تھا۔ سید احمد اللہ شاہ صاحبؒ کے اس دور میں بھی وہی رنگ غالب تھا۔ انگریز نے حضرت شاہ صاحبؒ پر ہاتھ نہیں ڈالا یا بقول سید مولوی طفیل احمد پولیس نے ان کو مجسٹریٹ کے حکم پر گرفتار کرنے سے انکار کر دیا۔ (مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۸۰) البتہ وہ جماعت جو انگریزوں کی ملازم اور نوکر تھی اور اب شاہ صاحب سے وابستہ ہو گئی تھی، اور انہی کے ذریعہ حضرت شاہ صاحب آگرہ میں قیام کر کے اپنا اثر جما سکے تھے، اس پر رشوت کا

مقدمہ چلا دیا، مراد آباد کا جج مسٹر ولسن مقدمہ کی سماعت کے لیے مقرر ہوا۔ حضرت شاہ صاحب اس زمانہ میں مضافات کے دورہ پر تشریف لے گئے تھے۔ آپ کو سفر میں اس مقدمہ کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا: "یہ امتحان کی پہلی منزل ہے۔ گھبرائیں نہیں، انشاء اللہ کامیاب ہوں گے۔ کسی پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔

جب مقدمہ شروع ہوا اور پولیس نے گواہ پیش کیے، مگر یہ بناوٹی گواہ بیکار ثابت ہوئے۔ کیونکہ جب وہ اجلاس میں یہ دیکھتے کہ جس کے برخلاف وہ گواہی دینا چاہتے ہیں وہ ایک باخدا عالم دین ہے تو گھبرا جاتے اور انہیں جھوٹی گواہی دینے کی جرأت نہ ہوتی۔ بہر حال لوئر کورٹ میں تو کچھ لوگوں کو سزائیں ہوئیں لیکن اپیل میں جا کر سب بری ہو گئے اور بقول حضرت شاہ صاحب کسی کا بھی بال بیکا نہ ہوا۔

حالات کی سنگینی کے باعث حضرت شاہ صاحب اپنے مریدین کے ایک جم غفیر کے ساتھ آگرہ سے کانپور کے لیے روانہ ہو گئے۔ پھر کانپور سے اُناؤ ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ وہیں مولانا فضل حق خیر آبادی سے ملاقات ہوئی۔ وہ ان دنوں لکھنؤ میں صدر الصدور تھے۔ جب مولانا خیر آبادی کی شاہ صاحب سے گفتگو ہوئی تو گھر پہنچ کر آپ نے صدر الصدور کے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا اور الور چلے گئے اور انگریزوں کے جتنے خیر خواہ تھے اتنے ہی دشمن ہو گئے۔

لکھنؤ کے قیام کے دوران ایسٹ انڈیا کمپنی کے عمال نے آپ کو گرفتار کرنا چاہا لیکن پولیس کو آپ کے عقیدت مندوں کے ہجوم کی وجہ سے آپ کو گرفتار کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ پھر فوج سامنے آ گئی۔ انہوں نے آپ کے ساتھیوں سے مقابلہ کے بعد آپ کو گرفتار کر کے فوراً جیل بھیج دیا اور آپ کے ساتھی بھی گرفتار کر لیے گئے۔ یہ شاید 1857ء کے شروع کا واقعہ ہے۔ جب 10 مئی 1857ء کے ہنگامے نے پورے شمالی ہندوستان کی زمین ہلا کر رکھ دی، حضرت شاہ صاحب اس وقت جیل میں تھے۔ اس وقت عنان قیادت ایک اور صاحب مولانا سید سکندر شاہ صاحب کے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے جیل پر دھاوا بول کر حضرت سید احمد اللہ شاہ صاحبؒ کو تو چھڑا لیا لیکن خود انگریزی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ حضرت احمد اللہ شاہ صاحب نے جھنڈے کو گرنے نہ دیا اور

اپنی رہائی کے بعد پورے ہندوستان کی رہائی کے لیے پرچم لہرایا اور انقلابی ساتھیوں کو لے کر لکھنؤ کا رخ کیا، لیکن لکھنؤ کے حالات آپ کو کچھ ٹھیک نظر نہ آئے لہٰذا آپ لکھنؤ سے ہٹ کر شاہ جہان پہنچے۔ شاہزادہ فیروز، جنرل بخت خان، تجمل حسین خان رئیس فرخ آباد، جنرل اسماعیل خان اور نانا راؤ پیشوا غرض کہ تمام وہ لوگ جنہوں نے بار بار شکست کھانے کے بعد بھی ہمت نہیں ہاری تھی، لیکن یہاں بھی غداروں کی وجہ سے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں سے شاہ صاحب نے پوائیں کا رخ کیا جو شاہ پور جہاں سے شمال مشرق میں 18 میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہاں راجہ پوائیں نے تعاون نہ کیا بلکہ غداری کی۔ اول تو وہ آپ سے گفتگو کے لیے آمادہ ہوا اور جب شاہ صاحب اس سے گفتگو کے لیے پہنچے تو اس نے اپنی گڈھی کا پھاٹک بند کرلیا اور اوپر سے گولیوں کی بوچھاڑ کر کے شاہ صاحب کو شہید کر دیا۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ

> ”راجہ بلد یو سنگھ نے سر مبارک جسم اطہر سے اتارا اور صاحب کلکٹر بہادر شاہ جہان پور کے سامنے پیش کر دیا جو عرصہ تک کوتوالی پر لٹکا رہا۔ نعش کو آگ میں پھونک دیا۔ اس پر سرکار برطانیہ نے پچاس ہزار روپیہ نقد اور خلعت فاخرہ راجہ پوائیں کو عطا کیا۔ یہ واقعۂ شہادت 5 جون 1858ء مطابق 13 ذی قعدہ 1275ھ کو پیش آیا۔ دریا پار محلّہ جہاں آباد متصل احمد پور مسجد کے پہلو میں سر کو دفن کر دیا گیا۔“ (ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء: ص ۴۹)

ان کے ساتھی اکثر انڈیمان بھیجے گئے۔ کچھ کو دار نصیب ہوئی اور کچھ گوشہ گیر ہو گئے ؎

نہ شیشہ، نہ مے، نہ ساقی رہا
فقط شکوۂ بخت باقی رہا

انہیں لوگوں میں جن پر انگریز کی نظر قہر آلود پڑی، ان میں ایک علامہ فضل حق خیر آبادیؒ بھی تھے۔ علامہ موصوف کو اللہ تعالیٰ نے بڑی خوبیوں سے نوازا تھا۔ علم میں یکتائے روزگار، شعر و سخن میں استاذ فن کار، محاضرہ اور مذاکرہ میں صدر مجلس، بساط شطرنج

پر رونق محفل۔ شان جامعیت کی یہ ندرت حیرت انگیز تھی۔ اگر آپ ایک وقت میں حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے مدّ مقابل تھے تو دوسرے وقت میں جہاد حریت کے علم بردار اور کٹہرۂ عدالت میں ایک سیاسی ملزم کی حیثیت سے حاضر، ایک طرف زندگی ہر ایک دور ناز و نعم اور عزت و عظمت سے ہم کنار ہے تو اسی زندگی کا ایک دور پابند سلاسل اور دیار غربت میں وحشت بداماں۔

علامہ فضل حق 1797ء میں اپنے آبائی وطن خیر آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولانا فضل امام دہلی میں صدر الصدور تھے۔ مولانا فضل حق کی تعلیم و تربیت انہی کے زیر سایہ دہلی میں ہوئی۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے بارگاہ فیض پناہ سے علم حدیث کی خوشہ چینی کی۔ تیرہ سال کی عمر میں تمام علوم عقلیہ اور نقلیہ کی تکمیل کر لی اور چار ماہ اور چند روز میں قرآن پاک حفظ کر لیا۔ اٹھائیس سال کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا تو دہلی میں اکبر شاہ ثانی کے زمانہ میں دہلی کے ریذیڈنٹ کے ہاں سرشتہ دار ہو گئے۔

علامہ فضل حق کا اس زمانہ کے تمام اہل علم سے تعلق تھا یہاں تک کہ بہادر شاہ ظفر بھی آپ کے علم و فن کا قدردان تھا۔ دہلی میں آپ ریذیڈنٹ کے ہاں سرشتہ دار تھے۔ جب آبگینۂ عزت میں بال آنے لگا تو نہ صرف ملازمت ترک کی بلکہ دہلی کی بود و باش کو بھی یک قلم چھوڑ دیا۔ نواب فیض محمد خان والی جھجھر کو جب آپ کے ملازمت چھوڑنے کا پتہ چلا تو اس نے پانچ سو روپیہ ماہانہ کی پیش کش کی جو علامہ نے منظور کر لی اور جھجھر تشریف لے گئے۔ پھر آپ کو کچھ عرصہ کے بعد مہاراجہ الور نے بلا لیا۔ الور سے آپ سہارن پور گئے۔ بعد ازاں آٹھ سال رام پور میں رہے۔ پھر لکھنؤ میں صدر الصدور بنائے گئے۔ اسی دوران ہنومان گڑھی میں فساد اور پھر مولانا امیر علی کی دعوت جہاد اور چھ سو مجاہدین کے ساتھ توپ دم کیے جانے کا خون چکاں اور دل فگار حادثہ پیش آیا۔ مولانا فضل حق اس زمانہ میں ایک ذمہ دار افسر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

1857ء کی جنگ آزادی کے موقع پر علامہ الور میں تھے۔ 2 جولائی کو جنرل بخت خان نے دہلی پہنچ کر نظم و ضبط قائم کر دیا تو علماء کو بھی اطمینان ہوا۔ اب ایک فتویٰ

بھی مرتب کیا گیا اور منبروں پر تذکرۂ جہاد ہونے لگا۔ جب فتویٰ کی اشاعت ہوئی تو علامہ نے دہلی کا قصد فرمایا۔ 19 ستمبر کو دہلی پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہو گیا۔ علامہ اور ان کے اہل وعیال پانچ روز تک کسی مکان میں بھوکے پیاسے بند رہے۔ پھر رات کی تاریکی میں اہل وعیال کو ساتھ لے کر نکلے اور سفر کی صعوبتیں جھیلتے ہوئے بھیکن پور ضلع علی گڑھ پہنچے۔ یہاں اٹھارہ روز چھپے رہے۔ اس عرصہ میں ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے عفو عام کا اعلان ہو گیا۔ مولانا انگریز کے اس اعلان پر بھروسہ کر کے اپنے وطن خیر آباد پہنچ گئے۔ فرماتے ہیں:

> ''مجھے اس کا بالکل خیال نہ رہا کہ بے ایمان کے عہد و پیان پر بھروسہ اور بے دین کی قسم پر اعتماد کسی بھی حالت میں درست نہیں ہے، خصوصاً جب کہ وہ بے دین اور جزا وسزاء آخرت کا بھی قائل نہ ہو۔'' (الشورۃ الہندیہ: ص ۴۱۶)

چند روز اطمینان سے گھر پر رہے۔ پھر دو آدمیوں نے آپ کی مخبری کر دی۔ گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا اور جزائر انڈیمان کی سزا تجویز ہوئی، اور تمام مال واسباب حتیٰ کہ کتابیں بھی ضبط کر لی گئیں۔ کچھ عرصہ ہندوستان کی جیل میں رہے۔ ہر ممکن اذیت پہنچائی گئی۔ قصور صرف یہ تھا کہ وہ ایمان و اسلام پر مضبوطی سے قائم رہے اور ان کا شمار علمائے اعلام میں ہوتا تھا۔ (الشورۃ الہندیہ: ص ۴۱۷)

علامہ نے اپنی تصنیف ''الشورۃ الہندیہ'' میں ہندوستان کے جیل خانوں اور جزیرہ انڈیمان کے مصائب وتکالیف کو بیان کیا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں:

> ''پھر مجھے دریائے شور کے کنارے ایک ایسے پہاڑ پر پہنچا دیا گیا جس کی آب و ہوا ناموافق، جہاں سورج ہمیشہ سر پر ہی رہتا ہے، اس کی گھاٹیاں دشوار گزار، پیچ در پیچ جنہیں دریائے شور کی موجیں ڈھانپ لیتی ہیں۔ اس کی نسیم صبح بھی سموم سے زیادہ گرم، غذا حنظل سے زیادہ کڑوی اور زہر ہلاہل سے زیادہ مضر، اس کا پانی سانپوں کے زہر سے زیادہ ضرر رساں۔ ہر کوٹھڑی پر چھپر تھا جس

میں رنج و مرض بھرا ہوا تھا۔ میری آنکھوں کی طرح ان کی چھتیں ٹپکتی رہتی تھیں اور ان سے بدبو مہکتی رہتی تھی۔ امراض کی کثرت، بیماری عام، دوا ناپید اور مشکل، خارش اور قوبا (ایک بیماری جس میں بدن کی کھال چھلنے اور پھٹنے لگتی ہے) کا رواج عام۔ بیمار کے علاج، تندرست کی بقاء صحت اور زخم کے اندمال کی کوئی صورت نہیں۔ دنیا کی کوئی مصیبت یہاں کی مصیبتوں پر قیاس نہیں کی جا سکتی۔ یہاں کی معمولی بیماری بھی خطرناک۔ بخار موت کا پیغام، مرض سرسام اور برسام (دماغ کے پردوں کا ورم) ہلاکت کی علت تام ہے، اور کتنی ہی بیماریاں ایسی ہیں کہ طب کی کتابوں میں ان کا نام و نشان نہیں۔ ڈاکٹروں کی یہ حالت کہ مرض کچھ اور دوا کچھ۔ مرنے والوں کے ساتھ یہ سلوک کہ مردہ خاکروب کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو اس کے کپڑے اتار کر ٹانگ پکڑ کر ریگ کے تودے میں دبا دیتا ہے۔ نہ غسل نہ کفن نہ دفن نہ نماز جنازہ۔ اگر میت کے ساتھ یہ سلوک نہ ہوتا تو یہاں کی مصیبتوں کے مقابلہ میں مر جانا سب سے بڑی آرزو ہوتی، اور اگر مذہباً خودکشی ممنوع نہ ہوتی تو قید و بند کی ان مصیبتوں سے نجات پا لینا بہت آسان تھا۔

''میں نہیں جانتا کہ ان مصیبتوں سے کس طرح چھٹکارا ہو سکے گا۔ خارش اور قوبا میں مبتلا ہو جانا مصیبت بالائے مصیبت ہے۔ صبح و شام اسی طرح بسر ہوتی ہے کہ تمام بدن زخموں سے چھلنی بن چکا ہے۔ روح کو تحلیل کر دینے والے درد اور تکلیف کے ساتھ زخموں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔'' (الشورۃ الہندیہ: ص ۴۲۱۔۴۲۴)

جزائر انڈیمان میں علامہ کو پہلے صفائی کے کام پر لگایا گیا تھا۔ برہنہ پا، صرف لنگی اور کمبل کا کرتہ، کوڑا کرکٹ صاف کرتے اور ٹوکرے میں اکٹھا کر کے پھینک دیتے۔ مگر کچھ روز کے بعد آپ کو محرری کے کام پر لگا دیا گیا۔ اس تبدیلی کا باعث آپ کا علمی

تحیر ہوا۔ صورت یہ ہوئی کہ سپرنٹنڈنٹ کے پاس علم ہیئت کی ایک قلمی کتاب تھی۔ سپرنٹنڈنٹ کے یہاں ایک مولوی صاحب کام کرتے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ نے وہ کتاب مولوی صاحب کو دی کہ اس کی غلطیاں درست کر دیں۔ مولوی صاحب یہ کتاب علامہ کے پاس لے آئے۔ علامہ نے نہ صرف عبارتیں درست کیں بلکہ جگہ جگہ مضمون کی بھی تصحیح اور توضیح کر دی اور کتابوں کے حوالے بھی درج کر دیئے۔ سپرنٹنڈنٹ کو جب علامہ کے علم وفضل کا پتہ چلا تو اس نے صفائی کی خدمت سے ہٹا کر محرری پر لگا دیا، اور حکومت سے رہائی کی سفارش بھی کر دی۔

حضرت علامہ کے صاحبزادے مولوی شمس الحق اور خواجہ غلام غوث بے خبر میر منشی لیفٹیننٹ گورنر کی کوششیں برابر جاری رہیں۔ ادھر انڈیمان کے سپرنٹنڈنٹ جیل نے بھی آپ کی سفارش بھیجی تھی۔ نتیجہ میں کامیابی ہوئی یعنی آپ کی رہائی کا حکم صادر ہو گیا، لیکن عجیب وغریب اور نہایت تکلیف دہ اور دل خراش صورت یہ پیدا ہوئی کہ مولانا شمس الحق صاحب پروانۂ رہائی حاصل کر کے انڈیمان پہنچے۔ جہاز سے اتر کر شہر میں گئے تو ایک جنازہ نظر پڑا۔ اس کے ساتھ بڑا اژدہام تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ 12 صفر 1278ھ مطابق 20 اگست 1861ء کو علامہ فضل الحق خیر آبادی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اب انہیں سپرد خاک کرنے جا رہے ہیں۔ یہ بھی بصد حسرت ویاس شریک دفن ہوئے ؏

دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے شہر میں

انا للہ وانا الیہ راجعون

انگریزوں کی درندگی:

یہ گوری چٹی چمڑی والے لوگ آج ہی درندہ صفت نہیں ہے بلکہ یہ صدیوں سے اس صفت سے موصوف ہیں۔ یہ انگلستان کے انگریز ہوں یا امریکہ کے، فرانس کے ہوں یا ہالینڈ کے۔ افغانستان اور عراق میں ان کے ظلم وتشدد اور جور واستبداد کی داستانیں آج بھی ان کی درندگی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ تہذیب واخلاق کے ان دعویداروں نے دنیا کے امن کو تہ وبالا کر رکھا ہے۔ دوسروں کو دہشت گرد کہنے والے خود سب سے بڑے

دہشت گرد ہیں۔ اس زمانہ میں بھی ان لوگوں نے ایک تو ہندوستان پر غاصبانہ قبضہ کر لیا اور دوسرے جن لوگوں نے اس پر مزاحمت کی ان کو اس طرح مارا گیا کہ ان کا نالہ وشیون سنا نہیں جا سکتا تھا۔ کسی نے سچ کہا

کلیجہ تھام لو گے جب سنو گے
نہ سنوائے خدا شیون کسی کا

اگر 1857ء کی یہ جنگ آزادی بغاوت تھی جیسا کہ سرسید اور منشی ذکاء اللہ خان لکھتے ہیں تو پھر یہ بالکل جائز بغاوت تھی۔ چنانچہ ایک انگریز دانشور اور مؤرخ مسٹر لیکی کا قول ہے:

''اگر دنیا میں کوئی بغاوت حق بجانب کہی جا سکتی ہے تو وہ ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کی بغاوت تھی۔''

یہ بغاوت حق بجانب تھی اور واقعی حق بجانب تھی تو پھر تہذیب و اخلاق کے دعویداروں نے اس بغاوت کا کیا علاج کیا؟ ان لوگوں نے جو علاج کیا اس کو لکھتے ہوئے قلم بھی رو پڑتا ہے۔ ان تہذیب و اخلاق کے مدعیوں کے اخلاق اور کردار کو دیکھ کر چنگیز خان اور ہلاکو خان کی روح بھی کانپ جاتی ہے۔ ایک عرصہ تک تو ظالم نے اپنے ظلم کا اعتراف ہی نہ کیا اور مظلوم اس قدر تباہ حال ہو چکا تھا کہ اس کو بھی چارو ناچار سکوت اور خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ لیکن دلوں کی وہ چنگاریاں جن کو ظالم کے دن کے نئے نئے ظلم ہوا دیتے ہیں، آخر کب تک دبی رہ سکتیں تھیں۔ انہوں نے اہل ہند کے قلب وجگر کو اندر ہی اندر جلانا شروع کیا۔ تب کچھ انگریزوں نے محسوس کیا کہ ان کو بھی ہندوستانیوں کا ہم آہنگ اور ہم نوا ہو کر ان چنگاریوں کو بجھانے کی کوشش کرنی چاہیے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ دبی ہوئی چنگاریاں برطانیہ کے خرمن شہنشاہیت کے لیے برق سوزاں بن جائیں۔ اس نظریہ کے بموجب ایڈورڈ ٹامسن نے ساٹھ سال گزارنے کے بعد اعتراف ظلم کرتے ہوئے جدید ڈپلومیسی سے ان چنگاریوں کو بجھانا چاہا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے ''اور سائڈ آف دی مڈل'' ہے۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ

''بندوقوں اور سنگینوں کے پہرہ میں 85 نوجوانوں کو ان کے اپنے

فوجی لباس میں سپاہیوں کی حیثیت میں فوجی عدالت کے سامنے پیش کیا گیا اور سزا کو بلند آواز سے سنایا گیا جس کا مقصد سپاہیوں کو بدکار مجرموں کی فہرست میں داخل کرنا تھا۔ فوجی نشانات ان سے چھین لیے گئے۔ وردیاں ان کی پشت کی طرف سے پھاڑ دی گئیں۔ پھر لوہار زنجیریں اور اوزار لے کر آگے بڑھے اور آناً فاناً میں وہ پچاسی جوان اپنے ساتھیوں کے اس عظیم الشان مجمع کے سامنے انتہائی بے عزتی کی تمام روشن اور ظاہر علامات کے ساتھ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنے ہوئے نظر آئے۔ یہ نہایت ہی دردناک اور ذلت آفرین نظارہ تھا۔ جس سے سپاہی بے حد متاثر ہوئے بالخصوص جب انہوں نے اپنے بدقسمت ساتھیوں کی اس ناگفتہ بہ حالت اور مایوسانہ انداز کو دیکھا، حالانکہ بعض ان میں سے اپنی پلٹن میں نہایت ہردل عزیز تھے، اور متعدد دفعہ انہوں نے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال کر برٹش حکومت کی ترقی اور وفاداری کا ثبوت بھی دیا تھا۔ قیدیوں نے ہاتھ اٹھا کر بآواز بلند جرنیل سے گڑگڑا کر رحم کی التجا کی کہ ان کو اس شدید مصیبت اور ہلاکت سے بچایا جائے، پھر یہ دیکھ کر کہ اس طریقہ سے کوئی فائدہ مرتب نہیں ہوسکتا وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور اس بے عزتی کو خاموشی سے برداشت کرنے پر انہیں شرمندہ کیا اور غیرت دلائی۔ اس وقت ایک بھی سپاہی اس میدان میں ایسا موجود نہ تھا جس نے اپنے سینہ میں اس واقعہ سے رنج اور نفرت کے جذبات اٹھے ہوئے محسوس نہ کیے ہوں، لیکن بھری ہوئی میدانی توپوں اور بندوقوں اور سواروں کے چمکتے ہوئے خنجروں کی موجودگی میں حملہ کرنے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ چنانچہ قیدیوں کو ان کی کوٹھڑیوں میں لے گئے جن پر پہرہ دینے کے لیے انہیں کے

ساتھیوں کو متعین کیا گیا تھا۔"

یہ تو صرف قید کی سزا تھی جوان بے گناہ لوگوں کو دی گئی۔ یہ داستان ظلم کا ایک نہایت ہلکا باب ہے۔ مسٹر مونٹگمری کے حکم سے پنجاب میں بھی جہاں عام طور پر لوگ ابھی تک وفادار تھے، ایک سکھ پلٹن کے صوبیدار، سوار پولیس کے رسالدار اور ایک داروغہ جیل کو فرض کی کوتاہی کے الزام میں پھانسی پر لٹکانا ضروری سمجھا گیا۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ یہاں کے لوگوں کو بخوبی ذہن نشین ہو جائے کہ پنجاب کے حکام ابتداء ہی میں بلا توقف متشددانہ اور جابرانہ کاروائی کرنے کی پالیسی سے لوگوں کے دلوں میں اپنا رعب قائم کرنا چاہتے ہیں۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے اس نیم وحشی ملک میں وقار قائم رکھا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف اس سخت پالیسی کا مقصد یہ بھی ظاہر کرنا تھا کہ حکومت رعایا سے غیر مشروط اور غیر مبہم وفاداری چاہتی ہے نہ کہ رعایا کی بردباری کے بھروسہ پر، جو ایک حد تک گورنمنٹ کے استقلال کی شکست کے مترادف ہے۔"

(تصویر کا دوسرا رخ: ص ۴۰)

مجینڈی لکھتا ہے کہ:

"وہ رات ہم نے جامع مسجد پر پہرہ دیتے ہوئے بسر کی اور ہمارا زیادہ تر وقت ان قیدیوں کو گولی سے اڑا دینے یا پھانسی پر لٹکا دینے میں گزرتا تھا جن کو ہم نے صبح کے وقت گرفتار کیا تھا۔ ان میں سے بہت سے بیچارے تو اسی جگہ ختم ہو گئے، لیکن آخر وقت تک ان کے چہروں سے شجاعت اور ضبط کے آثار ہویدا تھے جو اس سے کسی بڑے مقصد کے شایانِ شان علامات تھیں۔" (تصویر کا دوسرا رخ: ص ۴۶)

پلٹن نمبر 26 کا قصور اور اس کی سزا پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبار ٹائمز نے لکھا تھا:

''بغاوت کے اعلان سے 48 گھنٹے کے اندر پانچ سو آدمیوں کو پھانسی دی گئی۔ سوال ہوتا ہے کہ جرم کیا تھا؟ درآں حالیکہ خود ذمہ دار حکام کی رپورٹ سے تصدیق ہو چکی ہے کہ باغی بالکل نہتے تھے اور طوفان سے ڈر کر بھاگ نکلے تھے۔ نیز محاصرے کے وقت بھوک اور مسافت کی تکلیف اور صدمے سے ان کی حالت نیم مردہ انسانوں کی تھی۔'' (تصویر کا دوسرا رخ: ص ۵۹)

مختصر یہ کہ انگریزوں نے ہندوستانیوں کو اس کثرت سے پھانسیاں دیں جو بیان سے باہر ہے۔ الٰہ آباد سے کانپور آتے ہوئے دو دن کے اندر بیالیس آدمیوں کو سڑک کے کنارے پھانسی دی گئی، اور بارہ آدمیوں کو صرف اس جرم میں پھانسی دی گئی کہ جب فوج مارچ کرتی ہوئی ان کے سامنے سے گزری تو ان کے چہرے دوسری طرف کیوں تھے۔ (تصویر کا دوسرا رخ: ص ۶۰)

آج بھی پارلیمنٹ کے محفوظ ریکارڈ میں حکومت ہند کی وہ تمام یادداشتیں محفوظ ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ باغیوں کے علاوہ عام آبادی میں سے عورتوں، مردوں، بچوں اور بوڑھوں تک کو پھانسی کے تختوں پر لٹکایا گیا۔'' (تصویر کا دوسرا رخ: ص ۶۳)

دہلی میں خون ریزی کے عادی سپاہیوں نے جوش انتقام کو فرو کرنے کے لیے پھانسی دینے والے جلادوں کو رشوت دے کر اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ پھانسی کے تختہ پر زیادہ دیر تک لٹکتے رہنے دیں تاکہ لاش کے تڑپنے کی دردناک کیفیت دیکھ کر جسے وہ ناچ کہتے تھے، اپنی خون خوار طبائع کے لیے دلچسپی کا سامان بنا سکیں۔ جھجھر کے نواب صاحب عبدالرحمٰن خان شہید کو جان دینے میں بہت عرصہ لگا۔

دہلی اور دوسرے کئی شہروں میں ایک بلند مقام پر چوگوشہ سولی نصب کی گئی تھی۔ پانچ چھ اشخاص کو روزانہ پھانسی دی جاتی تھی جس کے قریب ہی انگریز افسران سگرٹوں کے کش پر کش لگاتے لاشوں کے تڑپنے کے نظارہ میں محو رہتے۔ (ایضاً: ۶۶)

ظلم کی کوئی شکل ایسی نہ تھی جس کو اختیار نہ کیا گیا۔ دہلی کے باشندوں کی عزت و آبرو اور مال و دولت کو ہر بھوکے فوجی بھیڑیے کے لیے کھول دیا گیا۔ بس پھر کیا تھا؟

فوج دندناتی پھرتی تھی۔ کوئی قانون نہ تھا۔ سکھوں اور انگریزوں نے مل کر وہ دہشت گردی مچائی کہ اللہ کی پناہ۔ ستائیس (27) ہزار مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ عورتوں کی عزتیں سر بازار لوٹی گئیں۔ مال و دولت چھین کر سمیٹ لی گئی اور آسمان بار بار حیرت سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا کیونکہ آج تک اس طرح کی سفاکی اور درندگی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ مسلمان ہونا جرم ہو گیا تھا۔ کسی بھی محلے میں انگریز فوج گھس جاتی۔ صحت مند اور جواں سال مسلمان نوجوانوں کو پکڑ لیتی۔ پچاس سو کا ایک جتھا بنا کر کوتوالی میں بھیج دیا جاتا اور شام کو ان کی لاشیں ان کے گھر والے اٹھا کر لے جاتے۔ چاندنی چوک دہلی میں سولی نصب کر دی گئی۔ فوج شہر میں گھوم پھر کر عورتوں اور بچوں کو لے آتی تھی۔ بچوں کے سامنے ماؤں کی عصمت دری کی جاتی تھی اور پھر ماؤں کے سامنے بچوں کو سولی پر چڑھا دیا جاتا تھا۔ بعد ازاں وہ عورتیں بھی قتل کر دی جاتی تھیں۔ ان میں سے اکثر عورتیں وہ ہوتی تھیں جن کو کبھی چشم آفتاب نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کا جرم صرف مسلمان ہونا تھا اور یہ کہ ان کے مردوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کیوں کیا؟ جن تقدس مآب اور باعصمت عورتوں کے بالوں پر سورج کی نگاہ نہ پڑی تھی وہ بغیر چادروں کے برہنہ سر گھروں سے نکال دی گئیں، جنہوں نے گھر سے باہر قدم تک نہ رکھا تھا آج بے آسرا اور بے سہارا پھر رہی تھیں۔ اپنے آپ کو مہذب اور متمدن کہلانے والی انگریز قوم نے ان جانوروں کو بھی ذبح کر دیا جو مسلمان خوش حال گھرانوں نے اپنے گھروں میں پال رکھے تھے۔

دہلی کی جامع مسجد جو شان و شکوہ میں اپنی مثال آپ تھی اس کو مسمار کرنے کا منصوبہ بنایا گیا، اور تجویز یہ ہوئی کہ مسجد کو ختم کر دیا جائے، لیکن پھر اسے سکھوں کی بیرک بنا دیا گیا۔ انگریز کتوں اور جوتوں سمیت مسجد میں گھس جاتے اور سکھ سور پکا کر انگریزوں کی دعوت مسجد میں کرتے تھے۔ جامع مسجد کی یہ بے حرمتی ایک عرصہ تک جاری رہی یہاں تک کہ 27 نومبر 1862ء کو اسے سخت جدوجہد کے بعد مسلمانوں کے حوالے کیا گیا۔ یوں یہ خانۂ خدا پانچ سال دو ماہ تک انگریزوں اور سکھوں کی عیاشیوں کا اڈا بنا رہا۔

دہلی کی ایک اور مسجد جو اکبری مسجد کے نام سے مشہور تھی۔ جہاں کبھی بیٹھ کر حضرت مولانا شاہ عبدالقادرؒ نے قرآن حکیم کا اردو ترجمہ کیا تھا، ان کے شب و روز کی

عبادت کا مرکز رہی تھی۔ جہاں سید احمد شہیدؒ نے اپنی روحانی تربیت کے دن گزارے تھے، اسے شہید کر دیا گیا اور وہ صفحۂ ہستی سے یوں مٹا دی گئی گویا کہ یہاں مسجد کا وجود ہی نہ تھا۔

عورتیں اپنی عزتیں بچانے کے لیے دہلی کے کنوؤں کا رخ کر رہی تھیں، اور کتنے ہی کنویں ایسے تھے جو عورتوں کی لاشوں سے بھر گئے تھے اور عورتیں پھر بھی کود جاتی تھیں شاید کہ بے عزتی کی زندگی سے بہتر موت میسر آ سکے۔ ایسے بھی ہوا کہ شوہروں نے اپنی بیویوں کو اور مردوں نے اپنے گھر کی عورتوں کو اس خوف سے قتل کر دیا کہ ان کی عزتیں محفوظ نہ رہ سکیں گی اور بعد ازاں خود بھی انگریزوں سے لڑ کر شہید ہو گئے۔ اس الم ناک داستان کو کہاں تک بیان کیا جائے ؎

زمین نے خون اگلا آسمان نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دن بدلے انسان پہ کیا گزری

بنارس اور الٰہ آباد میں کانپور کے واقعہ سے پہلے ایک موقع پر چند نوجوان لڑکوں کو صرف اس بنا پر پھانسی دی گئی کہ انہوں نے شوقیہ طور پر باغیوں کی جھنڈیاں اٹھا کر بازاروں میں منادی کی تھی، سزائے موت دینے والی عدالت کے ایک افسر نے پرنم آنکھوں سے کمانڈنگ افسر کے پاس جا کر درخواست کی کہ ان نابالغ مجرموں پر رحم کر کے پھانسی کی سزا کو تبدیل کر دیا جائے لیکن بے سود۔

اس سلسلہ میں بے شمار ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جن میں اس قسم کی نمائشی عدالتوں تک سے بھی گریز کیا گیا ہے اور بے شمار بے گناہ انسانوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ پھانسیاں دینے کے لیے رضا کارانہ ٹولیاں بنائی گئیں جنہوں نے اس مقصد کی تکمیل کے لیے دیہات کا دورہ کیا اس حالت میں کہ ان کے پاس پھانسی دینے کا سامان بھی مکمل نہیں تھا اور نہ ہی کسی کو پھانسی دینے کے طریقہ سے آشنائی تھی۔ بعض دفعہ وہ ایسا کرتے کہ ملزم کو ہاتھی پر بٹھا کر درخت کے نیچے لے جاتے تھے اور اوپر سے رسہ ڈال کر ہاتھی کو ہنکایا جاتا تھا یہاں تک کہ ملزم اس طرح تڑپنے اور جان کنی کی حالت میں اکثر اوقات انگریزی کے آٹھ (8) کے ہندسہ کی دلچسپ شکل بن کر رہ جاتا تھا۔

(تصویر کا دوسرا رخ: ص ۶۴)

نکلسن اپنے ایک دوست ایڈورڈز کو لکھتا ہے:

''دہلی میں انگریز عورتوں اور بچوں کے قاتلوں کے خلاف ہمیں ایک ایسا قانون پاس کرنا چاہیے جس کی رو سے ہم ان کو زندہ بھی جلا سکیں یا زندہ ان کی کھال اتار سکیں یا گرم سلاخوں سے اذیت دے کر ان کو فنا کے گھاٹ اتار سکیں۔ ایسے ظالموں کو محض پھانسی کی سزا سے ہلاک کر دینے کا خیال ہی مجھے دیوانہ کیے دیتا ہے۔ میری یہ دلی خواہش ہے کہ کاش میں دنیا کے کسی ایسے گمنام گوشے میں چلا جاؤں جہاں مجھے یہ حق حاصل ہو کہ میں سنگین انتقام لے کر دل کی بھڑاس نکال سکوں۔'' (تصویر کا دوسرا رخ: ص ۳۸)

نکلسن کو اپنی آرزو کو پورا ہونے میں کچھ زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ مسٹر موری تھامس نے اپنے بعض قیدیوں کی دردناک سرگزشت سر ہنری کاٹن کو مندرجہ ذیل الفاظ میں لکھی:

''شام کے وقت ایک سکھ اردلی میرے خیمے میں آیا اور سلام کر کے پوچھنے لگا۔ آپ غالباً یہ دیکھنا پسند کریں گے کہ قیدیوں کے ساتھ کیا کیا گیا۔ میں فوراً لپک کر قیدیوں کے کیمپ میں گیا جہاں ان بد بخت مسلمانوں کو عالم نزع میں بے حال دیکھا یعنی مشکیں ان کی بندھی ہوئی تھیں اور وہ برہنہ زمین پر پڑے ہوئے تھے اور سر سے لے کر پاؤں تک تمام جسم کو گرم تانبے سے داغ دیا تھا۔ اس روح فرسا نظارہ کو دیکھ کر میں نے اپنے پستول سے ان کا خاتمہ کر دینا ہی ان کے حق میں مناسب سمجھا۔'' (تصویر کا دوسرا رخ: ص ۴۰)

انیسویں صدی میں جب کہ تہذیب و شائستگی پر ناز کیا جاتا تھا ایک ایسا دردناک نظارہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک انسان وحشیانہ طریق سے زندہ آگ میں جلایا جا رہا ہے اور سکھ اور یورپین نہایت اطمینان اور متانت سے چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر اردگرد کھڑے دیکھ رہے تھے گویا کہ وہ ایک تفریح و راحت کا سامان تھا۔ (ایضا: ص ۴۱)

گورنمنٹ بنگال کے سرکاری کاغذات میں اب بھی ایک انگریز افسر کی چھٹی محفوظ ہے جن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انگریز نہایت کثرت سے اس ہولناک سزا کا استعمال کرتے تھے۔ اس خط میں اس نے اٹھارویں صدی کے آخری دور کے حالات پر بحث کرتے ہوئے اس دردناک طریق سزا کی ذیل کے الفاظ میں مذمت کی ہے:

''آخر کب تک بنی نوع انسان کو اس دل خراش طریق سے گرم سلاخوں پر سکڑتے، اور بھنتے دیکھنے کی اذیت برداشت کرتے رہیں گے۔'' (ایضاً: ص ۳۷)

''زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سینا یا پھانسی سے پہلے ان کے جسم پر سور کی چربی ملنا یا زندہ آگ میں جلانا یا ہندوستانیوں کو مجبور کرنا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلی کریں، ایسی مکروہ اور منتقمانہ حرکات کی دنیا کی کوئی تہذیب بھی کبھی اجازت نہیں دیتی۔ ہماری گردنیں شرم و ندامت سے جھک جاتی ہیں اور یقیناً ایسی حرکات عیسائیت کے نام پر ایک بدنما دھبہ ہیں جن کا کفارہ ہمیں بھی ایک روز ادا کرنا ہوگا۔''

لارڈ رابرٹس اپنی والدہ کو ایک چھٹی میں لکھتا ہے:

''ہم پشاور سے جہلم پا پیادہ سفر کرتے ہوئے پہنچے اور راستہ میں کچھ کام بھی کرتے آئے یعنی باغیوں سے اسلحہ چھیننا اور ان کو پھانسیوں پر لٹکانا۔ چنانچہ توپ سے باندھ کر اڑا دینے کا جو طریقہ ہم نے اکثر استعمال کیا ہے اس کا لوگوں پر خاص اثر ہوا یعنی ہماری ہیبت لوگوں کے دلوں پر بیٹھ گئی، اگرچہ یہ طریقۂ سزا نہایت دل خراش ہے۔'' (تصویر کا دوسرا رخ: ص ۳۴)

لڑائی کے اختتام پر بہت سے قیدیوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا، اور یہ معلوم ہونے پر کہ اس قسم کی موت کی وہ کوئی خاص پروا نہیں کرتے، تو ان میں سے چار آدمیوں کو فوجی عدالت کے حکم سے توپوں سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ ایک روز ایک توپ کے بہت بڑے

دھماکے کی آواز سے ہم چونک پڑے جس کے ساتھ ہی ایک ناقابل بیان دھیمی مگر وحشت ناک چیخ بھی سنائی دی۔ دریافت کرنے پر ہمیں ایک افسر نے بتایا کہ یہ نہایت ہی کرب انگیز نظارہ تھا یعنی ایک توپ میں اتفاق سے بارود زیادہ بھرا ہوا تھا جس کے چلائے جانے سے بدقسمت ملزم کا گوشت ریزہ ریزہ ہو کر فضائے آسمانی میں اڑا اور تماشائیوں پر خون کے چھینٹے اور گوشت کے ٹکڑے گرے اور اس کا سر ایک راہرو (مسافر) پر اس زور سے گرا کہ اس کو بھی چوٹ آ گئی۔" (ایضا: ص ۳۶)

اسی کتاب میں مسٹر کوپر کا بیان ہے کہ:

"پہلی اگست کو بقر عید کا دن تھا۔ اس لیے مسلمان سواروں کو وہاں سے علیحدہ کرنے کے لیے ایک مفید عذر تھا۔ چنانچہ ان کو تہوار منانے کے لیے امرتسر بھیج دیا گیا ورصرف ایک عیسائی افسر اور وفادار سکھوں کی امداد سے ایک مختلف قسم کی قربانی کے لیے وہاں پر اکیلا رہ گیا جو نہایت اطمینان سے اپنا کام کرتا رہا۔ اب مشکل یہ پیش آئی کہ لاشوں کو کس طرح دبایا جائے تا کہ تعفن نہ پھیلے، لیکن اتفاق سے قریب ہی ایک ویران کنواں مل گیا۔

جب دس دس کی ٹولی کو یکے بعد دیگرے گولی سے اڑاتے ہوئے ڈیڑھ سو سپاہی مارے گئے تو قتل کرنے والوں میں ایک شخص غش کھا کر گر پڑا جو ہلاک کرنے والوں میں سب سے بوڑھا سپاہی تھا۔ اس لیے آرام کرنے کے لیے تھوڑا سا وقفہ دیا۔ اس کے بعد پھر قتل کی کاروائی شروع کر دی گئی۔ جب تعداد 237 تک پہنچ گئی تو ایک افسر نے اطلاع دی کہ باقی باغی برج سے باہر آنے سے انکار کرتے ہیں جہاں وہ چند گھنٹے پیشتر عارضی طور پر بند کر دیئے گئے تھے۔ اس برج کے دروازے کھولے گئے تو معاً ایک درناک نظارا دکھنے میں آیا جس سے بلیک ہول کی یاد تازہ ہو گئی یعنی 45 آدمیوں کی مردہ لاشیں لائی گئیں جو خوف، گرمی، سفر کی

صعوبت اور دم گھٹنے کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہلاک ہو گئے تھے۔
ان مردہ اور نیم مردہ لاشوں کو گاؤں کے بھنگیوں کے ہاتھوں قریب
کے ویران کنویں میں پھنکوا دیا گیا۔ (تصویر کا دوسرا رخ: ص ۵۵)

ان بے تحاشا اور بلا جواز پھانسیوں سے کئی کارکنان حکومت بھی تنگ آ گئے کہ آخر یہ کیا بدتمیزی ہے کہ اس طرح عوام کو بغیر کسی قصور کے پھانسی دی جا رہی ہے۔ چنانچہ بہت سی عدالتوں سے موت اور عمر قید کے اختیارات واپس لے لیے گئے کیونکہ ان کا استعمال نہایت بے دردی سے کیا جا رہا تھا۔ مجسٹریٹوں کو حکم دیا گیا کہ وہ غیر مسلح آدمیوں کو فوج کے بھاگے ہوئے سپاہی سمجھ کر ہرگز کوئی سزا نہ دیں۔

28 اگست کو مسٹر جان گرانٹ کو وسط ہند کا گورنر اس لیے مقرر کیا گیا تاکہ الٰہ آباد اور دوسرے مقامات پر بے تحاشا پھانسیوں کے سلسلہ کو بند کیا جائے۔ باوجود اس بات کے ایک کثیر طبقہ کی طرف سے وائسرائے ہند اور مسٹر گرانٹ کی شدید مخالفت کی گئی یہاں تک کہ تعریض کے طور پر پھانسیوں کو روکنے والا گرانٹ اور رحم دل کیننگ وغیرہ نام دے کر ان کی ہنسی بھی اڑائی گئی۔ پھر بھی اس مخالفت کی کوئی پروا نہ کی گئی۔ جب اگست میں انگریزی فوج ہندوستانی دیہات جلانے کی مہم سے واپس آ رہی تھی تو راستہ میں انہوں نے وفادار سپاہیوں کی ایک جماعت کو بلاوجہ گولیوں اور سنگینوں کا نشانہ بنا دیا۔ چنانچہ انتقام کے اس خوفناک مظاہرے پر اظہار خیال کرتے ہوئے ٹائمز آف انڈیا نے اس واقعہ کو جنگلی یا وحشی انصاف سے تعبیر کیا لیکن جنرل آوٹریم کی رائے میں یہ واقعہ معصوم انسان کا سنگ دلانہ قتل تھا۔ (تصویر کا دوسرا رخ: ص ۴۴)

شمال مغربی سرحدی صوبہ اور پنجاب میں اندھا دھند پھانسیاں دی گئیں جن میں مرد عورتوں اور بچوں کی کوئی تمیز روا نہ رکھی گئی۔ نیز بے شمار دیہات جلانے کی وجہ سے آبادی کے اس حصہ میں بھی نفرت اور وحشت پھیل گئی جو حکومت کے خلاف نہ تھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فصلیں تباہ ہو گئیں۔ اس قسم کی وجوہات کی بنا پر یہ افواہ نہایت شہرت پکڑ گئی کہ حکومت کا منشاء تمام ہندوؤں اور مسلمانوں کو بے دریغ قتل کر دینے کا ہے۔
(رپورٹ گورنر جنرل با جلاس کونسل بحوالہ تصویر کا دوسرا رخ: ص ۶۷)

انگریزوں نے راستہ میں سینکڑوں میل تک سڑک کے دونوں طرف دیہاتیوں کو بے دریغ قتل و غارت اور تاخت و تاراج کر کے ملک کو صحرا کی طرح ویران اور سنسان کر دیا۔ دہلی سے باغیوں کے فرار ہو جانے کے بعد انگریز فاتحین نے باشندوں کا قتل عام کیا اور بے ضابطہ عدالتوں کے حکم سے ہزاروں شہری پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیئے گئے حالانکہ ان کا بغاوت سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ (تصویر کا دوسرا رخ: ص ۷۵)

مختصر یہ کہ بے شمار دیہات کو ایسے وقت میں جلا کر خاکستر کر دیا گیا جب کہ عورتیں، بوڑھے اور بچے گھروں کے اندر موجود تھے۔ (تصویر کا دوسرا رخ: ص ۷۸)

لکھنؤ پر قبضہ کرنے کے بعد قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا گیا۔ چنانچہ ہر ایسے ہندوستانی کو قطع نظر اس سے کہ وہ سپاہی ہے یا اودھ کا دیہاتی، بے دریغ تہ تیغ کیا گیا یہاں تک کہ نہ تو کوئی سوال ہی کیا جاتا تھا اور نہ ہی اس قسم کا تکلف روا رکھا جاتا بلکہ محض سیاہ رنگت ہی اس کے مجرم ہونے کے لیے کافی دلیل سمجھی جاتی تھی اور ہلاکت کے لیے ایک رسہ اور درخت کی شاخ کا استعمال کیا جاتا تھا، اگر چہ یہ اشیاء مہیا نہ ہوں تو بندوق کی ایک گولی بے گناہ انسان کے دماغ کو چیرتی ہوئی نکل جاتی تھی اور وہ وہیں ڈھیر ہو جاتا تھا۔ (تصویر کا دوسرا رخ: ص ۶۸)

"دہلی میں ہماری فوج کے شہر میں داخل ہونے پر تمام ایسے لوگ جو چلتے پھرتے نظر آئے وہ سنگینوں سے وہیں ختم کر دیئے گئے۔ ایسے بدقسمت انسانوں کی تعداد بہت کافی تھی۔ آپ اس ایک واقعہ سے کافی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک گھر میں چالیس یا پچاس ایسے اشخاص ہمارے خوف سے پناہ گزین ہو گئے جو اگر چہ باغی نہ تھے بلکہ غریب شہری تھے اور ہمارے عفو و کرم پر تکیہ لگائے ہوئے تھے جن کے متعلق میں خوشی سے ظاہر کرتا ہوں کہ وہ سخت مایوس ہوئے کیونکہ ہم نے اسی جگہ ان کو اپنی سنگینوں سے ڈھیر کر دیا۔

(تصویر کا دوسرا رخ: ص ۶۸)

بے گناہ شہریوں کو درآنحالیکہ وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر رحم کی درخواست کر رہے تھے، گولی کا نشانہ بنا دیا گیا بلکہ عمر رسیدہ لوگوں کو حالانکہ اس کے جسم رعشہ سے کانپ رہے تھے، کاٹ کر رکھ دیا گیا۔ (ایضاً: ص ۶۸)

''میں نے دہلی کے بازاروں میں سیر کرنا مطلقاً چھوڑ دیا ہے کیونکہ کل ایسا دردناک واقعہ دیکھنے میں آیا جس سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں یعنی جب ایک افسر بیس سپاہی لے کر شہر کی گشت کو جانے لگا تو میں بھی ان کے ہمراہ ہولیا اور راستہ میں ہم نے چودہ عورتوں کی لاشوں کو شالوں میں لپٹے ہوئے بازار میں پڑا پایا جن کے سر دھڑوں سے ان کے خاوندوں نے خود جدا کر دیئے تھے۔ چنانچہ عینی شاہد سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کے خاوندوں کو شبہ تھا کہ اگر وہ انگریز سپاہیوں کے قابو میں آ گئیں تو وہ عصمت دری کریں گے، لہٰذا تحفظ ناموس کا یہی طریقہ مناسب خیال کیا گیا جس کے بعد خاوندوں نے بھی خودکشی کر لی۔ چنانچہ ان کی لاشوں کو خود ہم نے دیکھا۔'' (تصویر کا دوسرا رخ: ص ۶۸)

یہ بیان ٹائمنر آف انڈیا کے نمائندہ کا ہے۔

اسپنر وال پول لکھتا ہے:

''وحشی نادر شاہ نے بھی وہ لوٹ نہیں مچائی تھی جو دہلی کی فتح کے بعد انگریزی فوج نے جائز رکھی۔ شارع عام پر پھانسی گھر بنائے گئے اور پانچ پانچ یا چھ چھ آدمیوں کو روزانہ سزا موت دی جاتی تھی۔ وال پول کا بیان ہے کہ تین ہزار آدمیوں کو پھانسی دی گئی جن میں سے انتیس شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مؤلف قیصر التواریخ لکھتا ہے کہ ستائیس ہزار مسلمان قتل کیے گئے اور سات روز تک برابر قتل عام جاری رہا۔'' (افسانۂ غم: ص ۲۸)

صفر 1275ھ کی پہلی یا دوسری تاریخ کو بادشاہ کے سمدھی مرزا الٰہی بخش کی جاسوسی سے مسٹر ہڈسن نے تین شہزادوں مرزا مغل، مرزا حضرت سلطان اور مرزا ابوبکر وغیرہ کو ہمایوں کے مقبرہ سے گرفتار کیا اور تینوں کے سر قلم کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کیے۔ بادشاہ نے ہنس کر فرمایا: ''تیموری خاندان کے بہادر فرزند اسی طرح سرخرو ہو کر

باپ کے سامنے آیا کرتے ہیں۔'' (پنڈت سندر لال)

یہ سارے واقعات ایڈورڈ ٹامسن کی کتاب ''دی اور سائڈ آف دی مڈل'' جس کا اردو ترجمہ ''1857ء کی تصویر کا دوسرا رخ'' شیخ حسام الدین مرحوم نے کیا ہے، میں سے نقل کیے گئے ہیں۔ ایڈورڈ ٹامسن کا دعویٰ ہے کہ اس کتاب میں جتنے واقعات قلم بند کیے گئے ہیں ان میں کا ہر واقعہ اینگلو انڈین اخبارات سے نقل کیا گیا ہے، کسی ہندوستانی قلم یا زبان سے یہ واقعہ نکلا ہوا نہیں ہے۔ ان میں سے میں نے بہت سے واقعات کو چھوڑ دیا ہے جن سے ان سے زیادہ سنگ دلی اور درندگی کا اظہار ہوتا ہے۔

لارڈ رابرٹس کے نزدیک اس قسم کی تمام درندگی کا مقصد یہ تھا کہ

''ان بدمعاش مسلمانوں کو بتا دیا جائے کہ خدا کے حکم سے صرف انگریز ہی ہندوستان پر حکومت کریں گے۔'' (تصویر کا دوسرا رخ: ص ۴۴)

دوسرا رخ:

ایک طرف علماء اور مشائخ، مجاہدین، جوان اور بوڑھے، بچے اور عورتیں دین اسلام اور حریت وطن کے لیے یہ سب مصائب برداشت کر رہے تھے۔ شہروں اور دیہات میں لوگ انگریزوں کے ظلم و جور کا نشانہ بن کر گاجر مولی کی طرح کٹ رہے تھے۔ سر عام پھانسیاں لگائی گئی تھیں، علماء اور عوام ان پر جھول رہے تھے، کئی لوگوں اور علماء کو کالے پانی کی سزائیں ہو رہی تھیں جن کا اجمالی ذکر گذشتہ صفحات میں کیا گیا ہے۔

یہ تو 1857ء کی جنگ آزادی کا ایک رخ تھا، لیکن دوسری طرف وفا شعاری، نیاز مندی اور وفاداری کے رخ پر ایک ہلکی سی نگاہ ڈال لیجئے جس سے آپ کو پتہ چل جائے گا کہ کیسے کیسے لوگ مسند اقتدار کے سامنے کس کس طرح سے جبین نیاز جھکاتے ہیں۔ اور کس طریقے سے کاسہ لیسی کر کے اپنا مطلب نکالتے ہیں۔ بقول شاعر

تو نے عصمت فروخت کی ہے فقط ایک فاقے کو ٹالنے کے لیے
لوگ یزداں کو بیچ دیتے ہیں اپنا مطلب نکالنے کے لیے

یعنی مطلب برآری کے لیے وطن تو کیا دین اور یزداں کو فروخت کر دیا جاتا

ہے۔ ان کاسہ لیسوں اور انگریز کے وفا شعاروں اور نیاز مندوں میں ایک سر سید احمد خان تھے جنہوں نے اپنی وفاداری اور وفا شعاری ثابت کرنے کے لیے اپنے تن من دھن کی بازی لگا دی۔ لیکن وہ وفا شعاری شاید ناکافی تھی، اس لیے اپنی کمال نیاز مندی اور برأت کے اظہار کے لیے وہ اندازِ تحریر اختیار کرنا پڑا جس کی تعبیر کے لیے وفاداری اور نیاز مندی جیسے الفاظ بھی ناکافی تھے۔ اب انہوں نے انگریز کے دشمنوں کے الٹے نام رکھنے شروع کیے جیسے قریش مکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ''مذمم'' کہتے تھے۔ چنانچہ نواب محمود خان کے نام کو ہر جگہ انہوں نے نامحمود خان لکھا ہے اور جنرل بخت خان کو جنرل بدبخت خان لکھا۔ گویا واجب الاحترام شخصیتوں کو جن کی تعظیم و تکریم کے لیے پورے ملک کی گردنیں جھک جاتی تھیں، مرزا غلام احمد کی طرح بدذات، نمک حرام، حرام زادہ وغیرہ کے نامہذب الفاظ سے یاد کیا ہے۔ یہ وہی سر سید ہیں جو ''تہذیب الاخلاق'' کے منصف بنے۔ خود اان کی اپنی ''تہذیب'' ان الفاظ سے جھلکتی ہے۔ اپنے بھائیوں اور بزرگوں کے لیے ادب و تہذیب کے یہ الفاظ استعمال کیے، وہ بھی صرف اس لیے کہ دربار انگریزی میں مقبولیت حاصل ہو جائے۔ لیکن انگریز پھر بھی کالے پر کبھی اعتبار نہیں کرتا۔ اتنی چاپلوسی، خوشامد اور کاسہ لیسی کرنے کے باوجود بھی انگریز کے ہاں وہ مقام حاصل نہ کر سکے جس کے حصول کی انہیں توقع تھی۔ چنانچہ اپنی فدائیت اور نیاز مندی کا اظہار کرتے ہوئے سر سید لکھتے ہیں:

> ''میں نہایت متأمل ہوتا ہوں اس اگلی بات بیان کرنے سے کہ میں اپنی نسبت آپ لکھتا ہوں۔ مجھ کو اس کے لکھنے پر اس لیے دلیری ہوتی ہے کہ درحقیقت میں خود نہیں لکھتا بلکہ اپنے آقا کی بات بیان کرتا ہوں اور پھر مجھ کو نہایت خوشی ہوتی ہے کہ میرے آقا نے میری نسبت بات کہی ہو، میں کیوں نہ اس کو کہوں اور کس لیے نہ کہوں کہ اپنے آقا کی بات سے خوش ہونا اور اس کو بیان کر کے اپنا فخر کرنا، نوکر کا کام ہے۔ یعنی جب میں میرٹھ آیا اور بیماری نے مجھ کو کمال ستایا تو میرے آقا مسٹر جان کری کرافٹ ولسن صاحب بہادر دام اقبالہ صاحب جج اور اسپیشل کمشنر میری عزت

بڑھانے کو مجھے دیکھنے آئے اور مجھ سے یہ بات کہی کہ تم ایسے نمک حلال نوکر ہو کہ تم نے اس نازک وقت میں بھی سرکار کا ساتھ نہیں چھوڑا، اور باوجودیکہ ضلع بجنور میں ہندو اور مسلمان میں کمال عداوت تھی، اور ہندوؤں نے مسلمانوں کی حکومت کو مقابلہ کر کے اٹھایا تھا، اور جب ہم نے تم کو اور محمد رحمت خان صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر کو ضلع سپرد کرنا چاہا تو تمہاری نیک خصلت اور اچھے چلن اور نہایت طرفداریٔ سرکار کے سبب تمام ہندو اور مسلمان تمہارے حاکم بنانے پر خوش ہوئے۔ سرکار نے بھی تم کو اپنا خیر خواہ اور نمک حلال جان کر کمال اعتماد سے سارے ضلع کی حکومت تم کو سپرد کی اور تم اس طرح وفادار نمک حلال سرکار کے رہے۔ اس کے صلہ میں اگر تمہاری ایک تصویر بنا کر بطور یادگار رکھی جائے تو یہ بھی کم ہے۔

''میں اپنے آقا کا کمال شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھ پر ایسی مہربانی کی اور میری قدردانی کی، خدا ان کو سلامت رکھے۔''

(سرکشی اہل بجنور: ص ۶۷)

نجیب الدولہ نجیب خان نے خاندان مغلیہ پر بیرونی حملوں، اندرونی کشمکش اور طوائف الملوکی کے اس نازک دور میں سلطنت مغلیہ کی گرتی ہوئی دیوار کو ایسا سہارا دیا کہ اس کی عمر میں کئی سال کی طویل مدت کا اضافہ ہو گیا۔ اس کی تعمیری صلاحیتیں دامن کوہ کے ایک ویران علاقہ کی طرف متوجہ ہوئیں تو ''نجیب آباد'' شہر بسایا اور اس کے قریب 1775ء میں ایک مضبوط قلعہ ''پتھر گڈھ'' تعمیر کیا۔ نجیب الدولہ کے جانشین فرزند کا نام ضابطہ خان تھا جو باپ کی جگہ کچھ عرصہ کے لیے مغل بادشاہ کا امیر الامراء رہا۔ نواب محمود خان اسی ضابطہ خان کے پوتے تھے۔ چونکہ یہ علاقہ اسی خاندان کا آباد کیا ہوا تھا لہٰذا یہاں کی آبادی انہی کی ہم خیال اور معتمد تھی، اس وجہ سے وہ نواب محمود خان پر جان چھڑکتے تھے۔ جب 1857ء کی جنگ آزادی کا ہنگامہ شروع ہوا اور بغاوت کی خبریں یہاں پہنچنے لگیں تو سرسید احمد خان نے لکھا ہے کہ

''مجھے یقین تھا کہ جب لوگوں کو یقین ہو جائے گا کہ فوج آتی ہے اور رستے میں ہے تو جتنے لوگ یہاں ہیں کوئی بھی ہمارا ساتھ نہیں دینے کا، اور ہم کو ایک ایسا چوہا تک بھی میسر نہیں آئے گا جو حکام انگریزی کی رفاقت کر کے گنگا پار کسی امن کی جگہ تک اس کو پہنچا دے، اور بلاشبہ میری رائے بہت صحیح اور نہایت پکی تھی۔''

(تاریخ سرکشی اہل بجنور: ص ۱۸)

اور ایک صفحہ پہلے لکھتے ہیں کہ

''اور ہم کو ہرگز توقع نہ تھی کہ برے وقت میں یہ لوگ ہمارا ساتھ دیں گے، بلکہ ہم یقین جانتے تھے کہ یہ سب نامحمود خان کے ساتھ ہو جائیں گے۔'' (ایضاً: ص ۱۷)

پھر چند صفحوں کے بعد لکھتے ہیں کہ

''اور حقیقت میں یہ ممکن نہ تھا کہ ضلع بجنور کے آدمی نامحمود خان کو چھوڑ کر کسی اور کی حکومت قبول کریں۔'' (سرکشی ضلع بجنور: ص ۲۱)

اس خاندان کا تذکرہ کرتے ہوئے سرسید احمد نے لکھا ہے:

''مسٹر کولبرک صاحب بہادر 1812ء میں ایک بہت بڑا کانٹوں دار درخت بو گئے یعنی بسا گئے تھے۔ اجڑے ہوئے، جلا وطن ہوئے ہوئے، نامحمود خان کے باپ بھنبو خان کو نجیب آباد میں جس کے سبب گویا یہ برباد ہوا ہوا خاندان پھر لوگوں کی نظروں میں سما گیا تھا اور اسی سبب سے ہر ایک شخص ضلع کا اپنے تئیں قدیم متوسل اور پرانا نمک خوار اور پشتینی تابعدار نامحمود خان کا سمجھتا تھا، اور ایسے تزلزل کے وقت میں ہر ایک کی نگاہ اسی پر پڑتی تھی۔''

(ایضا: ص ١٦)

تہذیب اخلاق کے مصنف کے اخلاق ملاحظہ فرمائیں کہ نواب محمود خان کو ہر جگہ نامحمود خان لکھا ہے اور صرف اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ خاتمہ کتاب میں مسلمانوں کو

انگریز کی وفاداری کا سبق دیتے ہوئے اس غریب نواب محمود خان کو بدذات بھی لکھ دیا، تاہم غنیمت ہے کہ جس طرح امام بخش عرف ماڑے خان شیر کوٹی اور عنایت رسول وغیرہ کوحرام زادہ کہا ہے نواب محمود خان کو اس خطاب سے معاف رکھا۔ یہ ان کی بڑی نوازش اور مہربانی ہے۔ یہی حال مرزا غلام احمد قادیانی کا ہے کہ اس نے اپنے اور انگریز کے مخالفین کو اتنی گالیاں دی ہیں کہ قلم کو لکھتے ہوئے حیا آتی ہے۔ یہی کردار منشی ذکاء اللہ خان کا ہے، لیکن ان جیسے خوشامدیوں اور غداران وطن کی پروا نہ کرتے ہوئے علمائے کرام میدان عمل میں کودے۔ انگریزوں کے خلاف باقاعدہ جنگ کی۔ جہاد کیا، جہاد کا فتویٰ دیا یہاں تک کہ انگریزوں کو ملک سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ اگر ملک وملت میں غدار اور جاسوس پیدا نہ ہوتے تو ہندوستان کا نقشہ یہ نہ ہوتا اور انگریزوں پر زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہو جاتی، اقبالؒ نے انہی لوگوں کے بارے میں کہا ہے ؎

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

دو عالم سے بیگانہ کرتی ہے دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت، نہ کشور کشائی

☆ ☆ ☆

ہندوستان میں عیسائیت کی یلغار

1857ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کی وجہ سے دہلی تاخت و تاراج ہوئی۔ اس کا سہاگ اجڑا، اس کے علمی غازہ کو نوچا گیا، اس کی سیاسی بساط الٹ گئی اور علم و دانش کا کارواں یہاں سے رخت سفر باندھنے پر مجبور ہو گیا۔ دہلی کی مرکزیت بھی ختم ہو گئی۔ سمندر پار کی ایک سفید فام قوم نے جس کا ہندوستان سے لسانی، معاشرتی اور ثقافتی کوئی تعلق نہیں تھا، پورے ہندوستان پر قابض ہو گئی۔ اب اس قوم کا سارا زور اس بات پر تھا کہ پورے ہندوستان کو اندلس (اسپین) کی طرح عیسائی بنا دیا جائے تاکہ ہمارے کسی کام میں کوئی مزاحمت نہ کر سکے۔ انگریزوں کی ہندوستان کو عیسائی بنانے کی یہ خواہش پرانی تھی اور وہ 1857ء کے بعد جب قتل عام اور جبر و تشدد کے باعث انہوں نے دیکھا کہ لوگوں کے حوصلے پست ہو گئے ہیں، ان کی ہمتیں جواب دے گئی ہیں اور ان کو کوئی جائے پناہ نہیں مل رہی، ان کی آخری امید اب ہم ہی ہیں۔ دوسری طرف سرسید، منشی ذکاء اللہ خان اور مرزا غلام احمد قادیانی جیسے ہزاروں لوگ پیدا ہو گئے جنہوں نے جہاد کے حرام ہونے اور انگریزوں کی اطاعت اور وفا شعاری پر فتوے دیئے اور کتابیں لکھیں تو انہوں نے اس مہم کو اور تیز کر دیا۔ پادریوں کو تبلیغ عیسائیت کی کھلی چھٹی دے دی گئی۔ باہر سے پادری درآمد کیے گئے۔ عیسائی ہونے والوں کو بہت مراعات سے نوازا گیا۔

انگریزوں سے قبل پرتگیزی اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ ہندوستانیوں خصوصی طور پر مسلمانوں کو عیسائی بنایا جا سکے لیکن ان کی یہ ساری کوششیں صرف گوا تک محدود رہیں اور علماء ربانی نے ان کو ہندوستان کے دوسرے شہروں میں گھسنے نہ دیا، اور گوا

میں بھی یہ کوئی زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔ پرتگالیوں کی ان کوششوں کے بعد انگریزوں نے بھی اس بارے میں پوری پوری کوشش کی اور باہر سے پادری فنڈر اور اس جیسے کئی اور پادری مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لیے درآمد کیے لیکن حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، ڈاکٹر وزیر خانؒ اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ جیسے علماء نے ان کو اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیا۔

یورپ کی صلیبی طاقتوں کو جب شام، فلسطین اور مصر وغیرہ میں اہل اسلام کے ہاتھوں شکست فاش ہوئی تو انہوں نے اب یہ پلان بنایا کہ مشرقی ممالک میں ایک ایسی عیسائی حکومت قائم کی جائے جو طاقت کے بل پر مسلمانوں سے مقامات مقدسہ چھین لے۔ دوسری طرف پرتگالی حکمران ہنری (1460-1349ء) نے عیسائی مبلغین کو ایک پیغام بھیجا جس میں ایک چیز یہ بھی تھی کہ غیر مسلم ملکوں پر اسلامی فوجوں کی یورش پر پابندی لگا دی جائے۔ یہ ہنری وہی حکمران ہے جس کے باپ یوحنا نے مسلمانوں کو اندلس سے نکالنے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ اس شخص کے دل میں مسلمانوں کے خلاف ایک خاص نفرت بھری ہوئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ دین اسلام کو تباہ و برباد کر کے مسلمانوں کا صفحۂ ہستی سے نام و نشان مٹا دیا جائے اور پوری دنیا میں مسیحی مذہب کا پھریرا لہرایا جائے۔

اس شخص کے عزائم یہ تھے کہ اسپین سے مسلمانوں کے اخراج کے بعد اب ہندوستان کا رخ کیا جائے اور اس وسیع و عریض ملک کو بھی سرزمین اندلس کی طرح مسیحیت کے دائرہ میں داخل کر لیا جائے۔ اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لیے اس نے 1417ء میں ''یسوع مسیح کے مجاہدین'' کے نام سے ایک تبلیغی دستے کی تشکیل کی اور انہیں خطیر رقم دے کر افریقہ اور ایشیاء کے ملکوں کو روانہ کیا تا کہ ان ملکوں میں عیسائیت کے تبلیغ کے میدان کو وسیع کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو دین مسیحی میں داخل کیا جائے۔

(عبدالمنعم نمر: تاریخ الاسلام فی الہند: ص ۳۳۳، بانیکار: آسیا والسیطرۃ الغربیہ: ص ۴۷۔۷۶)

پاپائے روم نیکولس پنجم نے 1454ء میں اپنے پیغام میں کہا کہ ''ہمیں اس بات کی انتہائی خوشی ہے کہ ہمارے بیٹے ہنری بادشاہ پرتگال نے اپنے والد کے نقش قدم پر چل کر وہ کام کرنا شروع کیا ہے جو اس کے والد نے مسلمانوں کو سرزمین اندلس سے نکال کر کیا

تھا۔ یہ سب کچھ وہ اس غیرت اور بہادری کے باعث کر رہا ہے جو مسیح کے ایک سپاہی کے اندر ہونی چاہیے۔ اس نے اللہ کے نام کے ساتھ دور و نزدیک شہروں میں اپنے لوگوں کو بھیجنا شروع کیا ہے جو مسیح کے دشمنوں کو سبق سکھائیں گے۔" (بانیکار: آسیا والسیطرۃ الغربیہ: ص ۳۷)

اس سلسلہ میں ایک وفد ہندوستان بھی آیا۔ اس نے مختلف مقامات کا دورہ کر کے واپسی پر شاہ پرتگال کو یہ رپورٹ دی کہ فوجی، سیاسی، تجارتی اور دینی میدانوں میں وہاں کامیابی کے غیر معمولی امکانات ہیں۔ اس رپورٹ کا جائزہ لینے کے بعد ہندوستان کے ساحلی علاقوں، گوا، دمن، کلکتہ اور مالابار میں پرتگالیوں نے سب سے پہلے تجارتی دفاتر قائم کیے۔ اس کے بعد ان لوگوں نے تجارت کے پردہ میں اپنے اصلی مشن کا آغاز کر دیا۔ چنانچہ ان ساحلی علاقوں میں لبنان اور شام کے عیسائیوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو لا کر آباد کیا گیا جو تجارت کے پردہ میں عیسائی دعوت کے کاموں میں بڑی مہارت اور تجربہ رکھتے تھے۔

ان لوگوں نے وہاں آباد ہوتے ہی وہاں کی غیر مسلم آبادی پر اپنا حربہ آزمایا جو غیر معمولی طور پر کامیاب رہا۔ ایک طرف تو ان لوگوں نے وہاں کی غیر مسلم آبادی کو عیسائی بنانا شروع کر دیا اور دوسری طرف ان ساحلی علاقوں پر انہوں نے قبضہ کر کے پرتگال کے ساتھ تجارتی تعلقات کو مزید مستحکم اور مضبوط کر لیا جو آگے چل کر عیسائیوں کے لیے فوجی اور اقتصادی لحاظ سے بڑا مفید ثابت ہوا۔ تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ عیسائی پادریوں نے کافی زمانے تک اس بات کی کوشش کی کہ مغل عیسائیت قبول کر لیں لیکن جب وہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اور اسلام کے شیدائی بن گئے تو پادریوں کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ اب مغربی استعمار نے مشرق میں لوگوں کو عیسائیت قبول کرنے کی ترغیب دینی شروع کر دی اور دین کے ذریعہ مشرقی ممالک میں اپنا اثر و نفوذ شروع کر دیا۔ اسی مقصد کے لیے وہ ساری صلیبی جنگیں لڑی گئیں۔ (التبشیر والاستعمار فی البلاد العربیہ: ص ۱۱۵)

پرتگالیوں نے مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے دربار میں مختلف اوقات میں تین وفود بھیجے۔ اکبر نے ان وفود کا نہایت گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ پہلے وفد کے ارکان نے اکبر سے آگرہ میں ایک گرجا گھر کے قیام کی درخواست کی۔ بادشاہ نے عواقب سے نا آشنا ہونے کی وجہ سے انہیں آگرہ میں گرجا گھر تعمیر کرنے کی اجازت دے دی، نہ

صرف اجازت دی بلکہ اس کے ساتھ شہزادہ سلیم کو تربیت کے لیے ان عیسائی پادریوں کے حوالے کر دیا۔ تین سال تک یہ عیسائی وفد اکبر اعظم کے پاس اس امید پر مقیم رہا کہ شاید بادشاہ عیسائی مذہب اختیار کر لے کیونکہ وہ اندر ہی اندر کچھ ایسے حربے اختیار کر رہے تھے جن کی وجہ سے انہیں قوی امید تھی کہ جلد ہی شہنشاہ اکبر دین عیسوی قبول کر لے گا لیکن 1583ء میں یہ وفد ناکام ونامراد واپس آ گیا۔

شہنشاہ اکبر ہو یا کوئی اور مغل بادشاہ، یہ حضرات اپنی شاہ خرچیوں اور غیر ضروری سخاوتوں اور داد و دہش کی وجہ سے ملت اسلامیہ کو بعض مرتبہ ایسی مشکلات میں ڈال کر گئے جن کا خمیازہ اہل اسلام آج تک بھگت رہے ہیں۔ ان سخاوتوں اور نوازشوں میں اکبر کی ایک یہ نوازش بھی تھی کہ پرتگالیوں نے تجارت کے نام پر گوا اور دوسرے ساحلی علاقوں میں اپنے سیاسی و تبلیغی اڈے قائم کر لیے جن میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو عیسائی بنانے کی کوششیں کی جاتیں تاکہ عیسائیوں کی آبادیوں میں اضافہ کیا جائے۔ چنانچہ پرتگالیوں نے بہت سی جگہوں پر اسلامی سرحدوں میں مداخلت شروع کر دی اور حکومت کے داخلی معاملات میں بھی دخل اندازی شروع کر دی۔ تجارت کے پردے میں وہاں کے لوگوں کو قید کر کے یورپ کی منڈیوں میں فروخت کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے تنگ آ کر انہیں تکلیف دینا شروع کر دی۔ اور حکومت کی آنکھیں بھی ان کے ظلم وستم کو دیکھ کر کھل گئیں۔ چنانچہ گوا کے بڑے پادری نے پرتگال کے بادشاہ سے اس بارے میں شکایت کی۔

(الشرقاوی والصیاد: ملامح الہند والباکستان: ص ۶۳، الشبال: تاریخ دولۃ اباطرۃ المغول الاسلامیہ فی الہند: ص ۹۴، ص ۱۳۸)

پرتگالیوں نے 1530ء میں گوا پر قبضہ کیا۔ قبضہ کرتے ہی انہوں نے گوا میں اسپین کی طرز پر ایک ایسی عدالت قائم کر دی جو لوگوں کے عقائد وخیالات کی چھان بین کر کے زبردستی ان کو عیسائیت کے دائرہ میں داخل کرتی۔ جو لوگ عیسائیت میں داخل ہونے سے انکار کرتے ان کے ساتھ انتہائی وحشیانہ سلوک کیا جاتا۔ کسی غیر مسیحی کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ کوچین اور گوا کے علاقوں میں رہ سکے۔ کم سن بچے اور بچیاں بھی ان کے

ظلم وستم سے محفوظ نہ تھیں۔ چنانچہ کم سن بچوں، بچیوں اور یتیم بچوں کو اغوا کر کے عیسائی مراکز میں رکھا جاتا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد انہیں پرتگال کی راجدھانی لشبونہ (لزبن) بھیج دیا جاتا جہاں انہیں باقاعدہ عیسائی بنانے کا کام شروع کر دیا جاتا۔ اگر وہ نرم طریقہ سے عیسائی نہ ہوتے تو پھر ہر سخت سے سخت طریقہ انہیں عیسائی بنانے کے لیے آزمایا جاتا۔ چنانچہ ان صغیر السن اور یتیم بچوں کو عیسائی بنانے کے لیے بڑے بڑے بھیانک طریقے اختیار کیے گئے۔ (السادتی: تاریخ المسلمین فی شبہ القارۃ الہندیہ: جلد۲ ص ۱۹۱)

چنانچہ تین سال کے قلیل عرصہ میں چھ ہزار ایسے بچے اغوا کر کے لزبن بھیجے گئے۔ ان لوگوں نے ممتاز محل کی دو خادماؤں کو بھی اغواء کیا اور کچھ عرصہ پاس رکھنے کے بعد انہیں بھی لزبن بھیج دیا۔ (السادتی: تاریخ المسلمین فی شبہ القارۃ الہندیہ: جلد۲ ص ۱۹۱)

پرتگالیوں نے لوگوں کو عیسائی بنانے کے لیے کیا کیا مظالم کیے اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہماری کتاب "اسلام کی دعوتی قوت۔" یہ سب مظالم اور جبر وتشدد اس زمانہ میں ہوا جب ہندوستان پر مغلیہ خاندان کی حکومت تھی اور وہ اپنے کو مسلمان کہتے تھے۔ ان کی حکومت میں مسلمانوں پر یہ تمام ظلم توڑے گئے۔ آنے والی نسلوں نے انہیں بہت بدنام کیا کہ وہ بہت متعصب مسلمان تھے لیکن یہ سب واقعات ان کی غفلت اور بے حمیتی کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اسلام کو بدنام کیا گیا کہ یہ تلوار سے پھیلا ہے لیکن عیسائیت کو توپ سے پھیلایا گیا پھر بھی اس پر خاموشی ہے۔ انگریزوں نے بھی پرتگالیوں کی طرح برصغیر پاک وہند میں مسلمانوں ہی کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا اور ہندوؤں کے بجائے انہیں اسلام ہی سے زیادہ دشمنی رہی۔ چنانچہ ولیم ہوارڈ سل کے ان الفاظ سے انگریزوں کی اسلام دشمنی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

> "ہماری مخالفت اور عناد پیروان محمدؐ سے کہیں زیادہ شدید ہے بمقابلہ اس اختلاف کے جو ہمارے اور سیوا اور وشنو کے پجاریوں کے درمیان ہے۔ یہ لوگ (مسلمان) ہماری حکومت کے لیے زیادہ خطرناک ہیں۔ اگر ہم ان روایات کو اکھاڑ پھینکتے اور اپنی طاقت اور کوشش سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مسجد کو مسمار کر

دیتے تو یہ مسیحی عقیدہ اور ہماری برطانوی حکومت کے حق میں یقیناً بڑا اچھا ہوتا۔'' (فکر ونظر 16 جون 1988ء مضمون مولانا حسن مثنیٰ ندوی)

انگریزوں کی داستانِ ظلم:

یہ تو پرتگالیوں کی داستان ظلم کی چند جھلکیاں تھیں جو انہوں نے عیسائیت کے فروغ اور پرچار کے لیے کیے۔ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے دین کی نشر واشاعت اور لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے جو کچھ کیا، وہ داستان ظلم بھی اس سے مختلف نہیں بلکہ کچھ بھیانک ہی ہے۔ انگریزوں کے ہندوستان میں وارد ہونے پر اگرچہ بہت سے غدارانِ وطن نے جو بعد میں جاگیردار اور بڑے بڑے زمیندار کہلائے، ان کا ساتھ دیا، اور پوری ہندوستانی قوم کو انگریز کے پنجۂ استبداد میں پھانسنے کی سر توڑ کوشش کی لیکن جب قفس کی تیلیاں ٹوٹیں تو بہاران سے روٹھ چکی تھی اور شبنم کے آنسو ہچکیاں لے رہے تھے۔ بادنسیم موت کی مضراب لے کر ان کے استقبال کو آئی اور ان لوگوں نے قوم سے غداری کر کے اور غیر ملکی حکمرانوں کا ساتھ دے کر غیر معینہ وقت تک کے لیے اہل وطن کو غلامی کے لیے پابند سلاسل کر دیا۔

پرتگالیوں نے یورپ میں ہندوستان کی زرخیزی و شادابی اور خوش حالی کا زبردست پراپیگنڈہ کیا تھا جس کی وجہ سے کئی ملکوں اور کئی لوگوں کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ پرتگالیوں نے یہ خوشخبری بھی عیسائی دنیا کو دی تھی کہ وہاں عیسائیت کے فروغ اور اس کی نشر واشاعت کے سنہرے مواقع ہیں۔ ان خبروں کے سننے کے بعد یورپی قزاقوں نے بڑی تعداد میں ہندوستان کا رخ کیا تاکہ اس سونے کی چڑیا پر جلد از جلد قبضہ کر سکیں۔ سترھویں صدی میں فرانسیسی اور ولندیزی تاجروں نے سورت اور گجرات میں اپنے تجارتی مراکز قائم کیے۔ ان کی تجارتی سرگرمیاں اس حد تک بڑھ گئیں کہ انہوں نے مالابار کے ساحل پر واقع تمام پرتگالی مراکز پر قبضہ کر لیا۔ اس سے قبل فرانسیسیوں نے ان کے مراکز پر قبضہ کیا تھا، لیکن آخر میں انگریزوں نے پرتگالیوں، ولندیزیوں اور فرانسیسیوں کا پتا ہندوستان سے کاٹ دیا اور خود بلاشرکت غیرے ہندوستان کے مالک بن گئے۔

سب سے پہلا انگریز جس نے سرزمین پاک و ہند پر قدم رکھا تھا وہ پادری تھامس سٹیفنز (Thomas Stephenes) تھا جو 1579ء میں گوا آیا تھا۔ تین اور انگریز ہندوستان آئے اور انہوں نے 1599ء میں شہنشاہ اکبر کے عہد حکومت میں ہندوستان کے تعاون و اشتراک سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد رکھی۔ 1610ء میں ملکہ الزبتھ اول نے یہ فرمان جاری کیا کہ "لندنی تاجروں کی کمپنی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ معاملہ کرے گی۔" اس کمپنی کو یہ حق دیا گیا کہ وہ جس مسیحی کے ساتھ چاہے صلح یا جنگ کرے۔

1608ء میں ولیم ہاکنز برطانوی سفیر بن کر ہندوستان آیا۔ اس نے برطانوی سفیر کی حیثیت سے بادشاہ جیمز اول کا خط بادشاہ جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا۔ اس خط میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ ہندوستان میں انگریزوں کو تجارتی سہولتیں مہیا کی جائیں لیکن شہنشاہ جہانگیر نے ان کی یہ درخواست مسترد کر دی۔ بعد میں تھامس رو 1612ء میں انگلستان کے بادشاہ کا پیغام دوبارہ لے کر آیا تو انہیں یہاں فیکٹری لگانے اور تجارت کرنے کی اجازت مل گئی۔ اس کے بعد ان کے کارخانے اور فیکٹریاں پورے ہندوستان میں پھیلتی گئیں، اور غدر و خیانت اور مکر و خباثت سے انگریزوں نے آہستہ آہستہ سارے ہندوستان پر اپنے قدم جما لیے اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں انہیں ایک خاص مقام حاصل ہو گیا۔ بنگال اور بعض دوسرے ساحلی علاقوں میں انہوں نے بڑی بڑی فیکٹریاں اور تجارتی مراکز قائم کر لیے۔

انگریزوں کی سیاست یہ تھی کہ جس جگہ یہ رہے انہوں نے وہاں رہائش کے لیے مخصوص جگہ کا انتخاب کیا۔ اس طرح تجارتی قافلوں اور کاروبار کی حفاظت کا بہانہ بنا کر انہوں نے اپنی مخصوص فوج بھی تیار کر لی۔ مغل فوجوں اور حکام نے اپنی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے انگریزوں کی اس فوجی تیاری کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا کہ یہ لوگ تجارت پیشہ ہیں اور مغلیہ حکومت ایک طاقتور اور مستحکم حکومت کے لیے یہ کسی طرح خطرہ نہیں بن سکتے۔ اس چیز کو اس بات سے بھی تقویت ملی کہ ابتدائی مراحل میں انگریزوں اور مغل فوجوں کے مابین ایک معرکہ ہوا جس میں انگریزی فوجوں کو ناکامی اور شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ مغل حکام اس چھوٹے سے واقعہ سے انگریزوں کے خطرات سے اپنے کو

بالکل محفوظ سمجھنے لگے۔ یہ ان کی حماقت تھی کیونکہ عقل مندوں کا مقولہ ہے کہ کمزور دشمن کو بھی کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیے لیکن انگریزوں نے اپنے ان فوجیوں کی ناکامی سے یہ سبق سیکھا کہ انہوں نے اپنے کو مزید طاقتور بنانا شروع کر دیا تاکہ آئندہ کے معرکوں میں ان کی فوج کو ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔

دوسرے یہ کہ اس زمانہ میں عیسائیوں کی تعداد بہت کم تھی اور عیسائی مبلغین نے بھی اپنا تبلیغی کام اس زور شور سے شروع نہیں کیا تھا، اس لیے انگریزوں کے ساتھ بدگمانی کے بجائے حسن ظن سے کام لیتے ہوئے اس بات کی اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنی کمپنیوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ مدغم کر دیں، لیکن انگریزوں نے اس رعایت سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اس وجہ سے سلطان اورنگ زیب ہوگلی اور دوسرے علاقوں میں انگریزوں کے مضبوط ٹھکانوں کو تباہ و برباد کرنے پر مجبور ہو گئے۔ انگریزوں نے بادشاہ سے اپنی غلطی کی معذرت چاہی جو قبول کر لی گئی اور دوبارہ اپنے کارخانوں، فیکٹریوں اور کمپنیوں کے قیام کی اجازت مل گئی جس کے بعد ہی کلکتہ شہر کی داغ بیل پڑی۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو جنّۃ الاستعمار: ص ۲۱۲، نشأۃ پاکستان: ص ۳۰، تاریخ المسلمین فی شبہ القارۃ الہندیہ: جلد ۲ ص ۱۸۱، ص ۱۸۴، ص ۲۳۵، ص ۲۴۸، حقائق عن باکستان: ص ۲۷)

انگریزوں نے مسلمانوں کی قوت و شوکت کا اندازہ کر کے دو باتوں کو اپنی گرہ میں باندھ لیا۔

1- کل ہند پیمانے پر تجارتی سرگرمیوں کی وسیع تنظیم و تربیت ضروری ہے تاکہ برطانوی مفادات کا تحفظ ہو سکے، لیکن اس کے ساتھ خود اس ملک کی تجارتی سرگرمیوں کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا ضروری ہے۔

2- اس بات کا پورا اہتمام کیا جائے اور مظاہرہ بھی کہ انگریزوں کو برصغیر پاک و ہند کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی سے کوئی مطلب نہیں تاکہ اس بہانے پورے ملک میں قدم مضبوط کیے جائیں۔ اسی طرح ساحلی علاقوں کو اپنے تصرف میں لا کر باہر سے ایسے جدید ترین اسلحے درآمد کیے جائیں جو مغل فوجوں کے پاس نہیں ہیں۔

ان دونوں اصولوں پر عمل کر کے انگریزوں نے پورے ملک میں اپنے قدم جما لیے۔ انہوں نے نوابوں اور صوبائی اور مرکزی حکام کے درمیان غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پیدا کر کے اس ملک کے شیرازے کو پراگندہ کر کے رکھ دیا۔

(السادتی: تاریخ المسلمین فی شبہ القارۃ الہندیہ: جلد۲ص ۲۴۸)

انگریزوں سے پہلے پرتگالیوں نے تجارتی کمپنیوں کی اوٹ میں دعوتی جدوجہد شروع کی تھی لیکن انہوں نے اس میں بہت سی غلطیاں کی تھیں۔ انگریزوں نے پرتگالیوں کی دعوتی جدوجہد اور ان کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس بات کا بڑا اہتمام کیا کہ اپنی تجارتی کمپنیوں کو صرف تجارتی مقاصد کے فروغ کے لیے مصروف کر دیا اور عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کی سرگرمیوں سے ان کو دور رکھا۔ ظاہر طور پر تو ان دونوں شعبوں کو الگ الگ رکھا لیکن خفیہ طور پر عیسائی مبلغین کی ان تجارتی کمپنیوں نے بھرپور مدد کی اور اسی کے ساتھ ان مبلغین کو ہدایت کی کہ وہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جس سے کمپنی کے مفادات کو نقصان پہنچے یا ہندوستانیوں کو دینی حیثیت سے انگریزوں کے خلاف فتنہ وفساد کا موقع فراہم ہو۔ جنگ آزادی 1857ء تک اس پالیسی پر عمل ہوتا رہا لیکن جوں جوں انگریز کمپنیوں کی طاقت اور اثر ونفوذ میں اضافہ ہوتا گیا انگریزوں کی اس پالیسی میں تبدیلی آتی گئی اور عیسائی مبلغین کو بھی آہستہ آہستہ ڈھیل دی جاتی رہی۔ ڈھیل دینے اور پالیسی میں تبدیلی کی وجہ یہ تھی کہ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد پورا ہندوستان کلی طور پر انگریزوں کا محکوم ہو گیا۔ اور غلامی میں صرف آزادی ہی سلب نہیں ہوتی بلکہ عقل انسانی بھی اپنی صلاحیتوں سے محروم ہو جاتی ہے، اور مذہب کی پاکیزگی غلامی کے گناہوں سے آلودہ ہو کر اپنا دامن داغدار کر لیتی ہے۔ غلام قوم اپنا وقار کھو چکتی ہے۔ حکمران قوم کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے اور نسیم سحر گاہی کا ہر جھونکا بادِ سموم بن جاتا ہے، اور چمن کا ایک ایک پتا صیاد کا معاون بن کر لالہ وگل کی پتیاں بکھیرنے لگتا ہے۔ اس وجہ سے غلام قوم سے حکمران قوم کو کسی قسم کا نقصان پہنچنے کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ اس لیے انگریزوں نے اب اپنی پالیسیاں تبدیل کر دیں اور یہ ہدایات جاری کی گئیں کہ اب دعوتی جدوجہد ان علاقوں میں انجام دی جائے جہاں غیر مسلموں کی آبادی ہے۔ مسلم آبادی

میں تبلیغی کام قطعاً نہ کیا جائے کیونکہ مسلمان حکمران قوم سے انگریزوں نے حکومت چھینی تھی، لہٰذا ابھی انگریز کی سیاسی قوت شامہ مسلمان قوم سے اس کے محکوم ہونے کے باوجود مزاحمت کی بو سونگھ رہی تھی۔

انگریزوں نے اپنی اس پالیسی کے تحت نہایت خاموشی کے ساتھ پورے ملک میں گرجا گھر، تعلیمی ادارے، ہسپتال اور شفا خانے بڑی تعداد میں قائم کر دیئے۔ 1792ء، 1795ء اور 1799 عیسوی میں مختلف ناموں سے عیسائیت کی تبلیغ کی انجمنیں قائم کی گئیں۔ اس کے بعد ہی یورپ، امریکہ اور دوسرے یورپی ملکوں سے عیسائی مشنریز نے ہندوستان پر یورش کر دی، لیکن ان سب کے سامنے یہ اہم سوال تھا کہ کن لوگوں سے کام کا آغاز کیا جائے۔ آیا عام لوگوں میں تبلیغ کی جائے یا روشن خیال، مہذب اور تعلیم یافتہ لوگوں کو عیسائیت کی دعوت دی جائے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہماری کتاب اسلام کی دعوتی قوت)

شروع شروع میں عیسائی مشنریز کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی زبردست تائید اور حمایت حاصل رہی۔ 1857ء کے انقلاب کے بعد حکومت نے سرکاری سطح پر یہ کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ انگریز حاکم فوجیوں اور سرکاری عہدے داروں کو گاہے گاہے یہ حکم دیتے رہتے تھے کہ عیسائی مشنریز کی تائید و حمایت جاری رکھی جائے۔

لارڈ منٹو کے عہد میں عیسائی مشنریز کے خلاف فساد میں تیس انگریز مارے گئے۔ اس پر حکومت برطانیہ نے عیسائی مشنریز کی جدوجہد اور سرگرمیوں کو مزید تیز تر کرنے اور ان میں تنظیم اور نظم و نسق پیدا کرنے کے لیے یہ حکم جاری کیا کہ ہندوستان تبلیغ کے لیے وہی مبلغ جا سکتا ہے جس کے پاس حکومت کا اجازت نامہ ہو۔ حکومت نے اس مقصد کے لیے ایک بڑے پادری کو متعین بھی کر دیا تاکہ وہ تبلیغی سرگرمیوں میں مشورے دے سکے۔

اب چونکہ پورے ہندوستان میں انگریزوں کا سیاسی کردار تھا اور انگریز 1857ء کی جنگ آزادی کو مکمل طور پر کچل چکا تھا، اس لیے ان کی دلی خواہش تھی کہ سرزمین اندلس کی طرح یہ خطہ بھی عیسائیت کی اکثریت والا علاقہ بن جائے۔ ہندوستان کی سرزمین میں انہیں اندلس سے زیادہ دلچسپی اور چارم (Charm) نظر آتا تھا۔ لہٰذا وائسرائے ہند لارڈ کیننگ نے اس بات کا عہد کیا کہ تین سال کے اندر پورے

ہندوستان کو عیسائی اکثریت میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ ادھر انگلستان میں ایک برطانوی ممبر پارلیمنٹ نے 1857ء میں اس بات کا اظہار کیا تھا کہ

> ”آج سے پورا ہندوستان انگریزوں کے زیر نگین ہے۔ اب پورے ملک میں مسیح کا پرچم لہرایا جائے گا۔ اب ہم تمام عیسائیوں کا یہ بنیادی فریضہ ہے کہ ہندوستان کو عیسائی بنانے کے لیے سرگرم عمل ہو جائیں۔“

ایک اور رپورٹ میں اس بات کا اشارہ کیا گیا ہے کہ ہندوستان کے عیسائی مبلغین بڑے امن وسکون سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں، اس لیے کہ وہ حکومت برطانیہ کی سرپرستی اور حمایت میں یہ کام انجام دے رہے ہیں۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ دولۃ الاباطرہ المغول الاسلامیہ: ص۱۶۲، نورالدین داؤد: محنۃ فی الفردوس: ص۱۸۶، عبدالمنعم نمر: تاریخ الاسلام فی الہند: ص۳۰۴، السادتی: تاریخ المسلمین فی شبہ القارۃ الہندیہ: جلد۲ ص۲۷۱، ص۲۸۱، انور الجندی: العالم الاسلامی والاستعمار: ص۱۵۳، عبدالعزیز نوار: الشعوب الاسلامیہ: ص۴۵۸۔۵۵۵، عبداللہ حسین: المسالۃ الہندیہ: ص۲۰۵۔۲۰۷ وغیرہم)

انگریزوں کی لسانی اور تعلیمی پالیسی کے عوامل:

صلیبی جنگوں کی ناکامی کے بعد مسیحی دنیا نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف انتقام کے لیے جو منصوبہ بندی کی تھی اس کا کرتا دھرتا اسپینی پادری ریمون للّی (Raymn Lilly) تھا جس نے اسپین میں نہ صرف مسلمانوں کو نیست و نابود کیا بلکہ ان کے جود ہی کو تحلیل کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ ریمون للّی نے پاپائے روم کے سامنے جو منصوبہ پیش کیا اس میں گرجا گھروں سے اس بات کا مطالبہ کیا گیا تھا کہ تعلیمی اور ثقافتی مراکز کو عیسائی دعوت کی نشرواشاعت اور تبلیغ مذہب کے لیے استعمال کیا جائے۔ اگر تعلیم وتربیت کے تمام وسائل استعمال کرنے کے بعد بھی مسلمان عیسائی نہ بنیں تو بجبر واکراہ یعنی جس طریقے سے بھی ہو سکے انہیں عیسائی بنایا جائے۔

یہ منصوبہ عیسائی مبلغین کے ذہنوں پر ایک عرصہ تک چھایا رہا۔ بالآخر گریگورس

شاہ نہم نے 1831ء میں تعلیمی مشنریز کی تشکیل کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ پھر 1881ء میں پادری لیون نے عیسائی مبلغین کو اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ ہر قسم کی علمی سندیں حاصل کر سکتے ہیں تاکہ مسیحی عقائد کی ترویج واشاعت کا کام وسیع پیمانہ پر کر سکیں۔ اس کے بعد تجربات سے اس بات پر قریباً تمام مبلغین کا اتفاق ہو گیا کہ تعلیمی اداروں کے ذریعہ ذہین مسلمان نوجوانوں کو متاثر کیا جا سکتا ہے اور شہروں اور دیہاتوں میں نہایت آسانی، آزادی اور بڑے اطمینان کے ساتھ یہ کام انجام دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ بڑے پیمانے پر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں تعلیم وتربیت کے ادارے قائم کیے گئے۔

1900ء میں سرزمین پاک وہند میں عیسائی مشنریز کے زیراہتمام چلنے والے تعلیمی اداروں کی تعداد ایک ہزار تھی جب کہ ان میں تعلیم حاصل کرنے والے طلباء اور طالبات کی تعداد 65 ہزار سے تجاوز کر چکی تھی۔ آگرہ، اودھ، الہ آباد، حیدرآباد اور مدراس وغیرہ میں ایسے معیاری تعلیمی ادارے تھے جہاں عیسائی مبلغین کو مسلمانوں کے درمیان دین مسیحی کی تبلیغ واشاعت کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔

عیسائیت کو تعلیمی اداروں کے علاوہ ہسپتالوں کے ذریعہ لانے کی کوشش کی گئی، کیونکہ دانشوروں نے اس طریقے کو بڑا مؤثر بتایا۔ اس طریقے سے مریض اور اس کے گھر والوں کے جذبات سے کھیلا جاتا ہے۔ اس سے قبل فرانس زیور بھی اس طریقے کے مؤثر ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر چکا تھا۔ چنانچہ اب حکومت برطانیہ نے ان تعلیمی اداروں کے پہلو بہ پہلو عیسائی مشنریز کے زیراہتمام ہسپتال اور شفاخانے بھی قائم کیے۔ ان سب کا مجموعی بجٹ بیس لاکھ ڈالر سالانہ تھا۔ ان مسیحی ہسپتالوں میں کام کرنے والی نرسوں کے فرائض میں یہ بھی شامل تھا کہ سال میں کم از کم چھ ہزار خاندانوں سے ذاتی روابط کریں، خصوصی طور پر خواتین کو مختلف عیسائی تقریبات میں مدعو کر کے ان کے ذہنوں کو عیسائیت کے لیے ہموار کریں۔ سالانہ تیس ہزار خواتین کے مفت علاج کی سہولت بھی ان ہسپتالوں میں مہیا کی گئی تھی۔

انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے اور نئے نصاب تعلیم کے نافذ ہونے کے

بعد انگریزی حکومت کو ایسے افراد ملنے شروع ہو گئے جو ذہن وفکر اور ذوق و مزاج کے اعتبار سے نیم گرم تھے اور جو دین اور اخلاقی قدروں کو مذاق اڑانے کو فیشن سمجھتے تھے۔ ان لوگوں کے ذریعہ اسلامی عقائد اور اسلامی تاریخ وتہذیب کو بے اعتبار ثابت کرنے کی ایک خاص مہم چلائی گئی تاکہ اسلامی عقائد کی عمارت میں دراڑیں بھی پڑ جائیں اور ہم پر کوئی حرف بھی نہ آئے۔ چنانچہ یہ مہم کامیاب رہی۔ ایک پادری نے ایک خط میں لکھا ہے:

> ''ہم ہندوستان اس لیے نہیں آئے کہ یہاں کے باشندوں کے ساتھ کوئی بھلائی کریں بلکہ ہم نے ان پر ایسا تعلیمی نظام مسلط کر دیا ہے جو رفتہ رفتہ ان کی دینی اور اخلاقی اقدار کو ختم کر کے زوال کے آخری درجہ تک انہیں پہنچا دے گا۔''

یہ تعلیمی ادارے اور مشنری سکول حکومت نے اس لیے کھولے تھے تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں ایک ایسا نظام تعلیم ٹھونس دیا جائے جس کو پڑھ کر لوگ دیکھنے میں تو مسلمان نظر آئیں لیکن ذہنی طور پر وہ انگریز ہوں۔ ان کے چلانے کے لیے انگریزی حکومت نے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا تھا بلکہ مسلمانوں کے مدارس اور مساجد کے اوقاف کو بحق سرکار ضبط کر کے ان کی ساری آمدنی بلکہ ان اوقاف کی عمارتوں کو بھی عیسائیت کی تبلیغ اور اشاعت کے لیے وقف کر دیا۔ گویا ہمارے ہی جوتے اور ہمارا ہی سر۔ علاوہ ازیں جو مسلمان امراء اور نواب اسلامی مدارس کی امداد اور اعانت کرتے ان کو سخت دھمکیاں دی جاتیں۔ اس طرح بڑی تعداد میں مسلمان اپنے تعلیمی مراکز سے محروم ہو گئے۔ یہ بھی ایک طریقہ تھا مسلمانوں کو اسلامی تعلیم سے دور رکھنے اور انگریزی تعلیم کے نزدیک لانے کا۔ اس سے انگریزوں کو یہ فائدہ ہوا کہ اسلامی تعلیمی مراکز بند کرنے یا بند ہونے سے نہ صرف موجودہ نسل اسلامی تعلیم سے محروم ہو گئی بلکہ مستقبل کی مسلمان نسلیں بھی اسلامی تعلیم سے یک قلم دور ہوتی چلی گئیں۔

یہ وقت مسلمانوں کے لیے بہت نازک تھا کیونکہ ان کی حکومت تو چھینی جا چکی تھی، اب دین بھی چھینا جا رہا تھا۔ چنانچہ مولانا الطاف حسین حالی نے اس وقت کی نزاکت کو یوں بیان کیا ہے:

''ہندوستان میں اسلام خطروں میں گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف مشنری گھات میں لگے ہوئے تھے، اگرچہ قحط کے دوران میں ان کو دبلا پتلا شکار پیٹ بھراؤ مل جاتا تھا وہ اس پر قانع نہ تھے اور ہمیشہ صید فربہ کی تلاش میں رہتے تھے۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ زور ان کا مسلمانوں پر تھا اس لیے ان کی منادیوں میں، ان کے اخباروں میں اور ان کے رسالوں میں زیادہ تر بوچھاڑ اسلام ہی پر ہوتی تھی۔ اسلام کی تعلیم کی طرح طرح سے برائیاں ظاہر کرتے تھے۔ بانی اسلام کے اخلاق و عادات پر انواع و اقسام کی نکتہ چینیاں کرتے تھے۔ بہت سے مسلمان کچھ ناواقفیت اور بے علمی کے سبب اور اکثر افلاس کے سبب ان کے دام میں آ گئے۔ اس خطرہ سے بلاشبہ علمائے اسلام جیسے مولانا آل حسن، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور ڈاکٹر وزیر خان وغیرہ متنبہ ہوئے۔ انہوں نے متعدد کتابیں عیسائیوں کے مقابلہ میں لکھیں اور ان سے بالمشافہ مناظرے کیے جس سے یقیناً مسلمانوں کو فائدہ پہنچا۔ ردّ نصاریٰ میں تصنیف و تالیف اور پادریوں سے مقابلہ و مناظرہ کا سلسلہ ایک جماعتی نہ سہی لیکن انتظامی شکل میں شروع ہو گیا تھا۔ قدرتی طور پر ہر جگہ مسجدیں تھیں۔ علمائے کے وہ گڑھ تھے۔ اس انقلابی تحریک کے چلنے میں کوئی دشواری پیدا نہیں ہوئی۔ راہ نما کی ضرورت تھی۔ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ سے بہتر کون ثابت ہو سکتا تھا۔ انہوں نے اس کی بنیاد ڈالی اور اس کام کے لیے دہلی اور آگرہ کو مرکز قرار دیا۔ یہاں بھی مولاناؒ نے تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ ان کی جماعت میں ہندوستان کے انتہاء پسند اور حضرت مولانا اسماعیل شہید کے فدائی مسلمان تھے جن کی تعداد کافی تھی۔''

(حیات جاوید: ص ۱۱۹)

اسی طرح حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بھی اس زمانہ کے حالات کا ایک نقشہ حیات شبلی کے دیباچہ میں پیش کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں پر فتنوں کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ سید صاحبؒ لکھتے ہیں:

> ''انگریزوں کے برسر عروج آتے ہی تین اطراف سے حملوں کا آغاز ہوا۔ چنانچہ مشنریوں نے اپنی نئی سیاسی طاقت کے بل بوتے پر اسلام کے قلعہ روئیں پر حملے شروع کر دیئے۔ دوسری طرف ہندوؤں میں آریہ تحریک نے اپنے سابق مسلمان حکمرانوں سے نجات پاکران پر حملہ کی جرأت پائی اور سب سے آخر میں یورپین علوم وفنون اور تمدن کی ظاہری چمک دمک مسلمانوں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی۔ خدانے عیسائیوں کے مقابلہ میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، ڈاکٹر وزیر خان صاحب (آگرہ) اور اس کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ مولانا رحم علی منگلوری، مولانا عنایت رسول چڑیا کوئی، اور مولانا محمد علی مونگیریؒ وغیرہ اشخاص پیدا کیے جنہوں نے عیسائیوں کے تمام اعتراضات کے پرزے اڑا دیئے۔ خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خان صاحب اور مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کا وجود تو ردّ عیسائیت کے باب میں تائید غیبی سے کم نہیں۔ اور کون باور کرسکتا ہے کہ اس وقت میں پادری فنڈر کے مقابلہ میں ڈاکٹر وزیر خان جیسا آدمی پیدا ہوگا جو عیسائیوں کے تمام اسرار کا واقف اور ان کی مذہبی تصنیفات کا ماہر کامل اور عبرانی و یونانی کا ایسا واقف ہوگا جو عیسائیوں کو خود انہی کی تصنیفات سے ملزم ٹھہرائے گا اور مولانا رحمت اللہ کے ساتھ مل کر اسلام کی حفاظت کا ناقابل شکست قلعہ دم کے دم میں کھڑا کر دے گا۔'' (دیباچہ حیات شبلی)

ان دونوں اقتباسات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے نازک موقع پر علمائے اسلام نے مسلمانوں کو ان فتنوں سے بچانے کی پوری پوری کوشش کی خصوصی طور پر

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے تو عیسائیت کے مقابلہ میں اپنا تن، من اور دھن سب کچھ تج دیا۔ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ تو جلا وطن ہوئے۔ ساری جائداد بحق سرکار انگریزی ضبط کروائی، لیکن عیسائیت کا مقابلہ اس سختی کے ساتھ کیا کہ آج تک عیسائی پادری ان کے دلائل و براہین سے منقار زیر پر ہیں۔

کسی قوم کی زبان اس کے افکار، فلسفۂ حیات اور تاریخی و ثقافتی اقدار کا آئینہ ہوتی ہے جس کے ذریعہ اس کی روایات، نفسیات اور اجتماعی خصوصیات کا عکس اور نقش حیات دیکھا جا سکتا ہے۔ کسی قوم کا تعلق اپنے ماضی اور علمی، فکری اور دینی سرمایہ سے منقطع کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہو سکتی ہے کہ زبان کو یا صرف اس کے رسم الخط کو تبدیل کر دیا جائے۔ ماضی قریب میں ترکی اور ایشاء میں آپ کو ایسی مثالیں مل جائیں گی جو اس دعویٰ کی صداقت کی شاہد عدل ہیں۔ بلکہ ترکی کی مثال تو بین طور پر ہمارے سامنے ہے۔

فرانسیسی پادری A.Le Chatlier نے اپنی کتاب La Conqrute du Mond Musulman میں اس زمانہ کی مشنری سرگرمیوں کا جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کس حکمت عملی سے مشنریاں اس وقت عالم اسلام میں سرگرم عمل تھیں۔ یہ کتاب فرانس سے شائع ہونے والے مجلّہ Le Revue Du Mond Musulman کا ایک خاص نمبر ہے۔ یہ ایک مشنری پرچہ تھا اور اس کا مقصد اسلامی ممالک میں پراٹسسٹنٹ مشنریز کی سرگرمیوں کو منظر عام پر لانے اور کیتھولک مشنریز کی غیرت کو بھڑکانے اور ان کے خوابیدہ عزائم کو بیدار کرنے کے لیے اسی نوے سال قبل یہ پرچہ نکلتا تھا۔ شاتلیہ نامی شخصیت اس وقت اس کا مدیر تھا۔ اس شمارہ میں شامل طویل مقدمہ اسی کے قلم سے ہے۔ مصر کے مسائد الیافی اور شیخ محبّ الدین الخطیب نے اس کا عربی ترجمہ کر کے اپنے مجلّہ ''المؤید'' میں اس کو شائع کیا تھا جو بعد میں 1305ء میں ''الغارۃ علی العالم الاسلامی'' کے نام سے کتابی شکل میں منظر عام پر آیا تھا۔

(محمد قطب: ہل نحن المسلمون؟ ص ۱۴۵)

عیسائی مشنریز کی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے لیے ساتھ ساتھ اس کتاب میں اہم مشنری کانفرنسوں کی تجاویز اور قرار دادوں کی تفصیلات بھی درج ہیں جو 1902ء

میں قاہرہ میں 1910ء میں ایڈنبرا اور 1911ء میں بھارت کے شہر لکھنؤ میں منعقد کی گئی تھیں۔ یہ کتاب اس بارے میں نہایت معلومات افزا ہے اور اس کو پڑھنے سے مشنریوں کی عجیب وغریب سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے۔

اس کے مقدمہ میں شاتیلہ ایک جگہ پر لکھتا ہے کہ

''اس بات میں ذرہ برابر شک نہیں کہ صرف پراٹسٹنٹ اور کیتھولک مشنریز کی سرگرمیوں میں اگر ہم چاہیں کہ اہل اسلام کے دل اسلامی عقائد سے خالی ہو جائیں تو یہ بات محالات میں سے ہے۔ اس کی صرف ایک صورت ہے کہ یورپی افکار پھیلائے جائیں۔ انگریزی، جرمن، ولندیزی اور فرانسیسی زبانوں کے پھیلانے سے اسلام یورپ کے پرچوں میں کسی طرح جگہ پا سکتا ہے اور ایک مادی اسلام کے لیے راہ ہموار ہو گی۔ اسی طرح مشنریاں اسلامی عقائد اور افکار کو ناپید کرنے میں مصروف عمل رہیں گی جن کی وجود ونمود کی بقا اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ دنیا سے کٹ کر ہی رہیں۔''

ایک اور موقع پر شاتلیہ لکھتا ہے:

''عیسائی مشنریوں کی جدوجہد کا پہلا ثمرہ یہ ہے کہ نوجوان مردوں اور عورتوں کی اگرچہ ایک تھوڑی سی تعداد عیسائی بن سکی ہے لیکن دوسرا اہم ثمرہ اور نتیجہ یہ ہے کہ ہر طبقہ کے مسلمان بتدریج مسیحی افکار اخذ کرنے کے عادی بنتے جا رہے ہیں۔''

پھر اسی صفحہ پر شاتلیہ لکھتا ہے:

''عیسائی مشنریاں اگر یہ دیکھیں کہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی جدوجہد کے نتائج سست ہیں تو اس سے ان کو مایوس نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ اب ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے دلوں پر یورپ کے علوم وفنون اور آزادیٔ نسواں کی طرف شدید میلان بڑھتا جا رہا ہے۔'' (الغارة علی العالم الاسلامی: ص ۴۸)

یہ وہ مسیحی لائحہ عمل تھا جو عیسائی مشنریز نے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لیے تیار کیا تھا جس کا خلاصہ ہم نے یہاں شاتلیہ کے الفاظ میں بیان کیا ہے:

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ 1911ء میں ہندوستان کے شہر لکھنؤ میں مشنریوں کی ایک بین الاقوامی کانفرس منعقد ہوئی۔ شاتلیہ نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

''اسلامی حکومتوں کے زیر اقتدار رہنے والے مسلمانوں کی تعداد اب 37128800 سے زیادہ نہیں ہے۔ خود مسلمانوں کی اکثریت کے ذریعہ ہی سیاسی اقتدار اسلامی خلافت سے منتقل ہو کر انگلینڈ، فرانس، روس اور ہالینڈ کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ مسلمانوں کی جو تعداد ان ممالک کے زیر اقتدار زندگی بسر کر رہی ہے، وہ خلافت اسلامیہ کے تحت رہنے والے لوگوں سے زیادہ ہے۔ پھر مسلمانوں کی جو تعداد مسیحی ممالک کے زیر اقتدار زندگی بسر کر رہی ہے وہ خلافت اسلامیہ کے تحت رہنے والے لوگوں سے زیادہ ہے۔ پھر مسلمان کی جو تعداد مسیحی حکومتوں کے زیر اقتدار زندگی بسر کر رہی ہے اس میں مستقبل قریب میں آنے والے انقلابات سے ضرور اضافہ ہوگا۔ اس طرح اسلامی ممالک میں مشنری مہم سرگرم رکھنے کے سلسلہ میں عیسائی حکمرانوں کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔''

(الغارۃ علی العالم الاسلامی: ص ۹۴)

قاہرہ اور لکھنؤ میں منعقد ہونے والے کانفرنسوں میں جو قرار دادیں اور تجاویز بھی منظور کی گئی تھیں اور کچھ اختیارات بھی دیئے گئے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں:

یہ اختیارات اس بات کے اندازے کے لیے کافی ہیں کہ انگریزوں کی لسانی اور تعلیمی پالیسی کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما تھے۔ ان کی یہ سب پالیساں مسلمانوں کو عیسائیت میں داخل کرنے کے لیے تھیں لیکن وہ علماء کی مزاحمتی کوششوں کے باعث اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے اور ہندوستان کو اندلس بنانے کا جواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔

☆ ☆ ☆

جنگ آزادی کے بعد انگریزی پالیسیاں

جنگ آزادی 1857ء سے قبل انگریزوں کی پالیسی اور تھی اور جنگ آزادی میں مسلمانوں کی ناکامی کے بعد اس سے مختلف تھی۔ چنانچہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے اپنی کتاب ''اظہار الحق'' کے پہلے صفحہ ہی پر لکھا ہے کہ

> ''انگریزوں نے جب ہندوستان پر مکمل قبضہ کر لیا اور صحیح طریقہ سے امن و امان بحال ہو گیا تو اپنی حکومت کے آغاز سے 34 سال تک ان کے علماء نے عیسائی مذہب کی دعوت کی طرف اس قدر دھیان نہ دیا، لیکن اس کے بعد انہوں نے بڑے زور شور سے دعوت کا کام شروع کیا۔ پھر اس کی درجہ بندی کی یہاں تک کہ بے شمار رسائل اور کتابیں مسلمانوں کے ردّ میں شائع کر کے مختلف شہروں کے عوام میں تقسیم کیں۔''

رسائل اور کتابیں لکھ کر مسلمانوں میں تقسیم کرنے کے علاوہ حکومت کی بنیادوں پر عیسائیت کے فروغ کے لیے جو کام کیا وہ زود اثر بھی تھا اور دیرپا بھی، اور اس کے نتائج بھی بڑے دور رس تھے۔ عیسائیت کی نشر و اشاعت اور مسلمانوں کو دین اسلام سے دور رکھنے کے لیے جو اقدامات کیے گئے وہ حسب ذیل تھے:

1-انگریزی زبان کی ترویج:

انگریزوں نے جب ہندوستان پر قبضہ کیا اس وقت سرزمین پاک و ہند میں

اردو اور فارسی اسلامی زبانیں تھیں جو علماء، مفکرین اور دانشور حضرات کا ذریعہ اظہار تھیں۔ اس زمانہ کے تمام علوم وفنون کی تدوین ان ہی دو زبانوں میں ہوئی تھی۔ عہد مغلیہ میں اور اس وقت سے جب خاندان مغلیہ کی حکومت چراغ سحری کی طرح دم آخریں تھی، ملک کی سرکاری زبان ہونے کا شرف فارسی کو حاصل تھا، اور اردو اگرچہ اپنے ابتدائی ادوار میں تھی، لیکن عوام میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ شاید اسی وجہ سے حضرت شاہ رفیع الدینؒ اور حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے اردو زبان میں قرآن حکیم کا ترجمہ کیا تھا۔ پھر دین کے علوم کا ایک بہت بڑا ذخیرہ بھی اس زبان میں تھا۔ اس عہد کے علماء اور مفکرین اسلام نے انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے اور بغاوت کا سلسلہ جاری کرنے کے لیے ان ہی دو زبانوں کو تقریر وتحریر کا ذریعہ بنایا تھا۔

ان دونوں زبانوں کے علاوہ اس زمانہ میں ایک اور زبان کا بھی کافی چلن تھا اور وہ عربی زبان تھی یہ زبان چونکہ قرآن و حدیث کی زبان ہے، لہٰذا غیر مسلم ہندوستانیوں کے درمیان یہ زبان اسلام کی اشاعت کے سلسلہ میں اس کا کردار معاون رہا۔ عیسائیت کی تبلیغ میں اس سے رکاوٹیں پیدا ہوئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان کو قرآن وحدیث سے الگ کرنے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان میں ایک اچھی خاصی تعداد ایسے مسلمانوں کی بھی تھی جن کی تقریر وتحریر کا ذریعہ عربی زبان تھی۔

(انوار الجندی: العالم الاسلامی والاستعمار: ص ۳۵۹، ص ۳۶۳، ساداتی: تاریخ المسلمین فی شبہ القارہ الہندیہ: جلد ۱ ص ۲۵، جلد ۲ ص ۲۲۴۔۲۲۵، ابوالحسن علی الندوی: المسلمون فی الہند: ص ۳۶)

کسی قوم کے افکار اور تہذیب وتمدن کی نشوونما میں ان کی زبان کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ زبان ایک قوم کے جذبات اور افکار کا آئینہ ہوتی ہے۔ چنانچہ جن ماہرین تعلیم کو اندازہ تھا کہ مشرقی اقوام میں یورپی افکار اور تمدن کی اشاعت میں خود یورپی زبان بڑا اہم کردار ادا کر سکتی ہے، انہوں نے انگریزوں کو مشورہ دیا کہ ان اسلامی زبانوں کو ختم کرنے کی مہم چلائی جائے اور انگریزی زبان کو اس کا قائم مقام بنا دیا جائے۔

انگریزوں نے اپنی حکومت کے خیر خواہوں اور ان ماہرین تعلیم کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے عملاً اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور دیگر سرکاری اداروں میں

انگریزی زبان کو لازمی زبان قرار دے دیا۔ تورات اور انجیل کے مخصوص اور منتخب حصوں کے پڑھنے کے لیے انگریزی زبان کا ناجائز استعمال کیا گیا، اور اسلامی زبانوں کی تعلیم و تدریس کی راہ میں ہر قسم کی رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ ان زبانوں کے سیکھنے سکھانے والوں کو ملازمت کے بہت سے مواقع سے محروم رکھا گیا کیونکہ وہ مشنری اسکولوں میں اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے قائل نہ تھے۔

گورنر جنرل ہند لارڈ ولیم بینٹنگ نے انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اپنے مشیر خاص مؤرخ ماکولی کے مشورہ پر یہ قانون بنایا کہ انگریزی زبان کی تعلیم و تدریس کا اعلیٰ انتظام کرنا حکومت کی اولین ذمہ داری ہے۔ چنانچہ انگریزوں نے ملک کے مختلف حصوں میں اس نہج پر چلنے والے اسکول اور کالج قائم کیے۔

(اتول ترجی: الہند الجدیدۃ: ص ۱۳۵، شاتلیہ: الغارۃ علی العالم الاسلامی: ص ۸، نورالدین داؤد: محنۃ فی الفردوس: ص ۱۸۸)

1835ء میں لارڈ میکالے نے ماہر تعلیم ہونے کے ناطے حکومت برطانیہ کو ایک ایسا نظام تعلیم مرتب کرنے کی ضرورت پر زور دیا جو انگریزی حکومت کی مصلحتوں کو ملحوظ خاطر رکھے، اور اس بات پر بھی زور دیا کہ مشرقی زبانوں کے بجائے انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے۔ اس نے کہا کہ ہمیں ایسے لوگ چاہئیں جو ہمارے اور ہماری رعیت کے درمیان ترجمان کا کام دیں، اور یہ لوگ ایسے ہونے چاہئیں جو رنگ و خون کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہوں لیکن ذوق و رائے اور زبان و فکر کے لحاظ سے انگریز ہوں۔

(الصراع بین الفکرۃ الاسلامیہ والفکرۃ الغربیۃ لابی الحسن علی الندویؒ: ص ۱۶۷)

انگریزوں کی اسلامی زبانوں سے دشمنی کا دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ ہندوستان کی قدیم زبانوں کے احیاء کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ ہندوؤں کی تاریخ اور ان کا تمدن سامنے آسکے اور ان کے اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ واریت کو ہوا دی جائے۔ چنانچہ انگریزوں نے کلکتہ میں 1800ء میں ''وان جیکرسٹ'' نامی ایک مستشرق کے زیر اہتمام ''فورٹ ولیم کالج'' قائم کیا۔ اس کے علاوہ انگریزی، لاطینی اور سنسکرت کی تعلیم دینے کے لیے بہت سے کالج قائم کیے۔ اس کا نتیجہ یہی نکلتا تھا کہ زبان، ثقافت اور تہذیبی

روایات کے تضاد کی بنا پر مسلمان اور ہندو طلبہ کے مسائل بڑھ گئے۔

سنسکرت کو سبھوں کے لیے لازمی قرار دیا گیا۔ مہاتما گاندھی نے ایک مرتبہ اعلان کیا تھا کہ ہندوؤں کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اردو زبان کا مطلق سہارا نہ لیں کیونکہ یہ صرف مسلمانوں کی کتابوں کی زبان ہے، لیکن جہاں تک سنسکرت کا معاملہ ہے تو یہ ہندوستان کی مذہبی امہات کتب کی زبان ہے۔

(السید ابوالحسن علی الندوی: المسلمون فی الہند: ص ۱۱۲، انور الجندی: العالم الاسلامی والاستعمار: ص ۳۶۳۔۳۶۵، ساداتی: تاریخ المسلمین فی شبہ القارۃ الہندیہ: جلد ۲ ص ۳۲۵)

ماہرین تعلیم نے انگریزوں کو جو تعلیمی پالیسی اختیار کرنے کا مشورہ دیا اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے، اس کو بھی ایک انگریز مونیہ ولیمس کی زبان سے سنیئے:

''وہ (مسلمان) اپنی زبان کو خیر باد کہتے ہوئے اپنی ادبیات، فلسفہ اور دین کو حقیر سمجھتے ہیں اور ہماری تربیت سے جو انحطاط ہوتا ہے اس کا آخر ہم سے بدلہ لیتے ہیں۔''

(میجر بالو: ہسٹری آف ایجوکیشن: ص ۷۰، ابوالحسن علی الندوی: الصراع بین الفکرۃ الاسلامیہ والفکرۃ الغربیہ: ص ۷۵)

گستاف لیبان نے مونیہ کے کلام پر یہ حاشیہ چڑھایا ہے کہ

''اس پر مستزاد وہ زبردست فکری شکوک وشبہات تھے جو خالص مغربی تعلیم وتربیت کی بنا پر ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہو گئے تھے، کیونکہ وہ تربیت اخلاق سے عاری ہوتے تھے۔ چنانچہ ان کے عادات و اطوار میں ان پختہ دینی بنیادوں کا فقدان ہوتا جو ہمیشہ کے لیے ان سے جدا ہوئی تھیں۔''

(حضارۃ الہند: ص ۶۹۳)

یہ درست ہے کہ انگریزی تعلیم نے نہ تو ہندو کو ہندو رہنے دیا اور نہ ہی مسلمان کو مسلمان، نہ سکھ کو سکھ اور نہ عیسائی کو عیسائی رہنے دیا، لیکن اس سے سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو پہنچا کیونکہ دیگر تمام مذاہب کا کوئی پس منظر نہیں تھا جب کہ اسلام کی

روحانی اور تاریخی طاقت کا کوئی مدّ مقابل نہیں۔ یہ سارے مدارس وکلیات مسلمانوں کی قومیت کو نیست و نابود کرنے کے لیے کھولے گئے تھے تاکہ ان کے تاریخی اور روحانی ورثہ کو تباہ و برباد کر کے انگریزی تہذیب وثقافت میں رنگ دیا جائے بلکہ مدغم کردیا جائے اور ان کے اجتماعی نظم کو غارت کر کے ان کی اجتماعی قوت کو تباہ و برباد کردیا جائے چنانچہ اس بات کا اعتراف ایک انگریز دانشور ماکولی نے اپنے باپ کے نام ایک خط میں یوں کیا ہے کہ

> ''اس تعلیم نے ہندوستان میں وہ اثر دکھایا ہے کہ انگریزی جاننے والا ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جو انگریزی جاننے کے بعد اپنے دین کی صداقت پر قائم رہا ہو۔'' (عبدالمنعم نمر: تاریخ الاسلام فی الہند: ص ۴۰۱)

مسٹر ہابسن (Hobson) ایک انگریزی ماہر تعلیم نے ان الفاظ میں اس تعلیم کے اثرات کا اعتراف کیا ہے:

> ''ہم (انگریز) ہندوستان میں ہندوستانیوں کی خیریت اور بہبودی کے لیے نہیں آئے بلکہ ہم نے یہاں مدارس وکلیات میں ایک ایسا نظام رائج کر دیا ہے جس کا بتدریج یہ تقاضا ہے کہ وہ ان کی دینی اجتماعی زندگی کو خرافات کے طور پر ان کے سامنے پیش کرے اور انسانی حقوق کی پامالی کا باعث بنے۔'' (ہوبسون: الامیریالیہ: ص ۳۰۶)

چنانچہ اس طرح ان مدارس وکلیات کی تعلیم وتربیت کے ذریعہ سے مسلمانوں کے قلوب واذہان سے دینی اقدار کو نکال کر ان کو عیسائیت سے قریب تر کر دیا گیا۔ آج بھی امریکہ اور یوری یونین کے کہنے پر مدارس میں اسلامی علوم وفنون اور قرآن اور حدیث کو ختم کر کے انگریزی اور دوسرے علوم وفنون پڑھانے پر زور دینے کا مقصد یہی ہے کہ مدارس سے بھی اسلام کی روح کو نکال دیا جائے۔

2- مسلم اوقاف پر قبضہ:

مسلمان امراء اور حکام نے مدارس، مساجد اور دوسرے دینی احکام کے

سرانجام دینے کے لیے بڑے بڑے اوقاف قائم کیے ہوئے تھے جن کی آمدنی سے یہ ادارے چلتے تھے۔ انگریزوں نے جونہی انگریزی نظام تعلیم رائج کیا اور اس کی ترویج کے لیے بڑے بڑے اسکول اور کالج قائم کیے، اپنے ان مدارس اور یونیورسٹیوں کو چلانے کے لیے انگریزوں نے اوقاف پر قبضہ کرلیا اور اس آمدنی پر بھی قبضہ کرلیا جو ان اوقاف سے حاصل ہوتی تھی اور ان تمام ذرائع آمدنی پر بھی قبضہ کرلیا جن سے مساجد اور مسلمان بچوں کے اخراجات پورے ہوتے تھے۔ بعض مساجد کو گرجا گھروں میں تبدیل کردیا گیا ان میں دہلی کی بھی ایک مسجد شامل تھی جس پر انگریزوں نے 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد قبضہ کرلیا تھا۔ وائسرائے ہند نے بعد میں دہلی کے لیے جب ایک خاص پادری کا تقرر کیا تو اس مسجد کو گرجا گھر میں تبدیل کردیا گیا۔

(مسعود عالم الندوی: المسلمون فی الہند: ص ۴۵، جمال الدین افغانی: العروۃ الوثقیٰ: ص ۴۱۳، عبدالمنعم نمر: تاریخ الاسلام فی الہند: ص ۲۵، عبدالعزیز نوار: الشعوب الاسلامیہ: ص ۵۵۶)

لارڈ ہیسٹنگز نے 1772ء میں مساجد کے اوقاف پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن وہ ناکام رہا۔ اس کے بعد لارڈ کارنوالس گورنر جنرل ہند نے 1793ء میں پھر اوقاف کو سرکاری تحویل میں لینے کی طرف توجہ کی لیکن اس کو بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ پھر 1815ء میں انگریزی عدالت نے اپنے ایک انگریز جسٹس کو حکم دیا کہ مسلمانوں کے اوقاف کو چھین لیا جائے کیونکہ ایسا کرنے سے انگریزی حکومت کی آمدنی میں تین لاکھ پونڈ سالانہ کا اضافہ متوقع ہے۔ بنگال کے صوبہ کے ٹیکس کی آمدنی کی ایک چوتھائی انگریزوں تک نہیں پہنچ پاتی تھی کیونکہ مدارس اور مساجد کے اوقاف میں شامل اراضی ٹیکس سے مستثنیٰ تھی، اور اوقاف زیادہ تر بنگال ہی میں تھے۔

انگریزی زبان کی ترویج اس وقت تک نہیں ہوسکتی تھی جب تک دینی اور تعلیمی ادارے بند نہ ہوں، اور ان کو بند کرنے کا نہایت مؤثر طریقہ صرف یہی تھا کہ جن اوقاف کی آمدنی پر وہ ادارے چل رہے ہیں ان اوقاف پر قبضہ کرلیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اسلامی اوقاف پر قبضہ کرنے سے مسلمان اپنے بہت سے اداروں سے محروم ہو گئے۔ اوقاف کے چھن جانے کے بعد مساجد، بڑے بڑے تالاب، پارک اور دوسری کئی

جگہیں بالکل ویران ہو گئیں۔ مساجد یا تو گرجا گھروں میں تبدیل کر دی گئیں یا پھر انگریزی حکومت کے پارکوں اور چھاؤنیوں میں بدل دی گئیں۔ انگریزوں کو اس بات کا خود اعتراف ہے کہ انہوں نے مسلمانوں پر عیدین کی نماز ادا کرنے اور دیگر دینی رسوم پر پابندی عائد کر دی تھی۔ عیسائی مشنریوں نے حکومت سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ جمعہ کو سرکاری چھٹی کا دن منسوخ کر کے اتوار کو سرکاری چھٹی کا دن مقرر کیا جائے تا کہ کسی حال میں بھی سرکاری اداروں میں ملازمین کو اسلامی آداب اور روایات کے سامنے جھکنا نہ پڑے۔

(شاتلیہ: الغارۃ علی العالم الاسلامی: ص ۴۷)

ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب Our Indian Musalman میں لکھا ہے کہ

''مسلمان ہم پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ ہم نے ان کو دینی امور کے انجام دینے سے روکا ہے۔ ان کے نزدیک ہمارا یہ سب سے بڑا جرم ہے کہ ہم نے ان اوقاف کو چھین لیا جو مسلمان سربراہوں نے مساجد اور تعلیم کے لیے وقف کیے تھے، اور ہم نے ان کا دوسرا مصرف نکالا۔ عیدین اور نکاح و ازدواج کے قواعد و ضوابط بدل ڈالے۔''

ہنٹر نے مزید لکھا ہے کہ

''ہم نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ذلیل کیا اور ان کے قانون وراثت کو مسخ کر دیا۔ ان کے دینی شعائر کو مضحکہ خیز بناتے تھے۔ ان کی مساجد کے اوقاف اور سارے صوبے ہمارے قبضہ میں آ گئے۔''

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہمارے ہندوستانی مسلمان، ولیم ہنٹر: ص ۲۰۸، عبدالمنعم نمر: تاریخ الاسلام فی الہند: ص ۴۰۹ وغیرہ)

انگریزوں نے صرف مسلم اوقاف ہی پر قبضہ نہ کیا بلکہ جن علماء نے انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا ان کی ذاتی جائدادوں کو بھی غصب کر لیا جیسا کہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور حضرت مولانا مفتی صدرالدین آزردہؒ کے ساتھ کیا گیا۔ حضرت مولانا رحمت اللہؒ نے جب زبان و قلم کے ساتھ ساتھ اپنی فوج کے ہمراہ تیغ

وتفنگ سے بھی انگریزوں کے خلاف عملاً جہاد کیا اور بعض محاذوں پر انگریزوں کو شکست بھی دی تو تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ اس جرم کی پاداش میں انگریزوں نے آپ کی تمام جائداد بحق سرکار ضبط کر لی اور بعد میں اپنے چند حاشیہ نشینوں بلکہ غدارانِ قوم و وطن کے ہاتھ اونے پونے میں نیلام کر دی، لیکن حضرت مولاناؒ نے اپنی جائداد کے اس نیلام کو پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہ دی۔ اسی طرح اور کئی دوسرے علماء کے ساتھ بھی یہی کچھ کیا گیا، لیکن یہ حضرات اپنے موقف اور مشن سے ایک بالشت بھی ادھر ادھر نہ ہوئے ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طنیت را

3- علماء پر سختی:

ہندوستان میں مشنریوں نے لوگوں کو عیسائی بنانے کے لیے جو یلغار کی اور ہر طریقے سے لوگوں کو انگریزی مذہب اور انگریزی تہذیب وتمدن میں رنگنے کی کوشش کی تو مشنریوں کی یلغار اور انگریزی سامراج سے ان کی ملی بھگت سے پیدا ہونے والے خطرات علماء کی نظروں سے مستور نہیں رہ سکتے تھے۔ علماء کی بصیرت اور ان کی دوررس اور دوربین نگاہوں نے فوراً اس فتنہ کو بھانپ لیا اور نہ صرف زبان وقلم سے بلکہ عملاً تیغ وتفنگ سے ان کے خلاف جہاد پر کمربستہ ہو گئے۔ علماء اگرچہ بے سروسامان تھے، نہ قالین ان کے پاؤں تلے تھے اور نہ چترِ شاہی سر پر تھا، لیکن درویش جب تاج شاہی سے ٹکراتا ہے تو عباؤں کے پیوند ہی اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ جنون شوق سے جب دیوانے بادہ پیمائی کو نکلتے ہیں تو بادِ سحر گاہی بادِ سموم سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے کہ ریت کے ذرات دیوانوں کی پیشوائی نہ کرسکیں، لیکن جن کے سامنے منزل ہوتی ہے وہ آبلہ پائی کے نشانوں پر سفر کرتے ہیں۔ زمانہ کی کوئی رکاوٹ ان کا راستہ نہیں روک سکتی اور نہ وقت کا کوئی فیصلہ ان سے متصادم ہوتا ہے۔ وہ راستہ کے ہر سنگ گراں سے بچتے اور کبھی اسے پائے استحقار سے ٹھکراتے ہوئے اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہو جاتے ہیں۔ آبلہ پائی بھی انہیں سفر سے باز نہیں رکھ سکتی کیونکہ ان کی نگاہ نشان منزل پر ہوتی ہے۔ وہ یہ کہہ کر گزر جاتے ہیں کہ ؎

پاؤں کے چھالوں سے کانٹوں کی بجھائی میں نے پیاس
جس طرف کو میں چلا گویا کہ مے خانہ چلا

بجلیاں اس کو راستہ دکھاتی ہیں۔ آسمان کے فرشتوں کو اس کی مدد کے لیے بھیجا جاتا ہے اور ہر ظلم و تشدد کو وہ خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے۔

انگریزوں کی اس پالیسی کے خلاف علماء نے بغیر کسی خوف و خطر کے فتویٰ دیا کہ انگریزوں کے ساتھ مسلمانوں کے دوستانہ مراسم، تعاون اور مشنری اسکولوں اور کالجوں میں مسلمان بچوں کو بھیجنا ناجائز اور حرام ہے۔ علماء نے مساجد کے منبر اور مدارس کے پلیٹ فارم سے خطاب کر کے مسلمانوں کو اس مسئلہ کی سنگینی سے آگاہ کیا اور سامراجیت کے ساتھ ساتھ عیسائیت سے بھی سخت مقابلہ کی دعوت دی۔ اس معاملہ میں انگریزوں سے ٹکر لینے میں پیش پیش وہی علاقے رہے جن میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی۔ عقیدۂ جہاد کے سرچشمہ سے پھوٹنے والی قوت کا مقابلہ کرنے میں انگریزوں کو سخت مشقت کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی وجہ سے انگریزوں نے بعد میں مرزا غلام احمد قادیانی سے دعویٔ نبوت کروا کر مسئلہ جہاد کو حرام قرار دلوانے کی پوری پوری کوشش کی۔ چنانچہ ولیم ہنٹر نے اعتراف کیا ہے کہ انگریزوں کا اولین اور سخت مقابلہ کرنے والے علاقوں میں سرفہرست ہندوستان کے شمالی اور مغربی حصے آتے ہیں کیونکہ ان ہی علاقوں میں علماء نے سب سے زیادہ جہاد کے واجب ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔ بنگال کے مسلمانوں کا اس کے بعد نمبر آتا ہے۔[1]

(عبدالعزیز نوار: الشعوب الاسلامیہ: ص ۵۵۹، عبدالمنعم نمر: تاریخ الاسلام فی الہند: ص ۲۴۸، ص ۴۴۲)

انگریزوں نے علماء کو بڑی آزمائشوں اور امتحانات میں ڈالا، لیکن علماء بھی بڑے سخت جان نکلے۔ بڑی سختیاں برداشت کیں۔ تختۂ دار پر کھینچے گئے، کالے پانی بھیجے

---

1. آج امریکہ بھی جہاد کو ختم کرنے کے بارے میں وہی کچھ کر رہا ہے جو اس زمانہ میں انگریزوں نے کیا تھا، اور جہاد سے آج وہ بھی اتنا ہی خائف ہے جتنا 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد برصغیر پاک و ہند میں انگریز تھے۔

گئے، جیلوں کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں ظلم و تشدد کا کوئی حربہ ایسا نہ تھا جو ان پر آزمایا نہ گیا۔ انہوں نے یہ سب کچھ برداشت کیا، کس کے لیے؟ اسلام کے لیے، مسلمانوں کے لیے۔ اپنا سارا جسم سختیوں سے داغدار کروالیا لیکن اسلام کے پاکیزہ اور شفاف دامن کو داغدار نہ ہونے دیا اور مسلمانوں کے ایمانوں کو بچانے کے لیے ہندوستان کو اسپین نہ بننے دیا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے حکومت وقت سے فائدہ اٹھانے کی خاطر حقیقی اسلام کے دامن تک کو چھوڑ دیا۔ انگریزوں نے دیکھا کہ مساجد اور مدارس کے اوقاف چھین لینے اور انہیں برباد کر دینے کے بعد بھی علماء کی دعوتی جدوجہد، اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت، انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کو صف آرا کرنے کی دعوت اور نور قرآن سے مستیز ہونے میں، کچھ بھی فرق نہیں آیا تو انہوں نے علماء پر عرصۂ حیات مزید تنگ کرنے کی پالیسی پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ ان کو بدنام کرنے کے لیے ہر قسم کے حربے اختیار کیے گئے۔ خود علماء میں سے ایک گروہ ایسا پیدا کیا گیا جنہوں نے علمائے ربانی پر کفر اور وہابی ہونے کے فتوے دیئے اور انہیں عوام میں بدنام کرنے کے لیے ہر قسم کے حربے اختیار کیے گئے۔ ان کے وقار کو مجروح کیا گیا، ان کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پیدا کرنے کے لیے ان پر ''وہابی'' ہونے کے الفاظ استعمال کیے گئے تاکہ ان کی عزت و ناموس کو عوام میں داغدار کر دیا جائے اور لوگ ان کی بات پر عمل نہ کریں، اور ہمارے آقا انگریز کو اس سے گزند نہ پہنچے اور ان کی حکومت میں مضبوطی اور استحکام پیدا ہو۔

انگریزوں کی طرف سے علماء کو حکومت کی مخالفت سے باز رکھنے کے لیے دردناک سزائیں دی گئیں جن میں کسی قسم کے مقدمہ کی سماعت کے بغیر قید دوامی، جلا وطنی اور پھانسی جیسی سزائیں بھی شامل تھیں۔ جب کسی عالم دین سے جواب طلب کرنا ہوتا تو عدالت میں اس کو حاضر کیا جاتا۔ کوئی افسر قرآن حکیم اور حدیث کی کوئی کتاب لاتا۔ جہاد کے بارے میں آیات اور احادیث نکالی جاتیں۔ پھر وہ افسر اس عالم دین سے پوچھتا کہ ان آیات و احادیث کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ اگر وہ عالم یہ جواب دیتا کہ یہ سب صحیح اور درست ہیں تو وہ افسر کہتا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ہمارے خلاف جہاد کرنے کو ضروری اور واجب سمجھتے ہو۔ اس پر اس عالم دین کا موقف

اگر یہ ہوتا کہ میں ایک گوشہ نشین انسان ہوں۔ ان آیات و احادیث کی صحت کا عقیدہ صرف اس لیے ہے کہ یہ قرآن اور احادیث میں وارد ہوئی ہیں تو اس کو چار روز کی مہلت دی جاتی۔ اس دوران میں اگر وہ اپنا موقف بدل لیتا اور کسی اخبار میں اپنے موقف کی تبدیلی کا اعلان کر دیتا تو اسے چھوڑ دیا جاتا، وگرنہ اسے تختہ دار پر چڑھا دیا جاتا، یا پھر دائمی جلاوطنی اس کا مقدر ہوتی۔ اس سے کم اس کے لیے اور کوئی سزا نہ ہوتی۔ اس طریقہ سے لنکا اور انڈیمان کے جزائر ایسے ہی بے گناہ ''مجرم'' علماء سے بھر گئے تھے۔ سی یون نے اپنی کتاب Muhammadenism in India میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ایک انگریز مصنف ''بلنٹ'' نے لکھا ہے کہ

> ''شہرت پانے والے ہر مولوی پر حکومت کی سخت نگاہ ہوتی تھی۔ ہر طرح سے اس پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جاتا تھا۔ اس پر بھی اگر وہ اپنے موقف پر قائم رہتا تو اسے جزائر انڈیمان میں جلاوطن کر دیا جاتا تھا۔''
>
> (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مسعود عالم الندوی: تاریخ الدعوۃ الاسلامیہ فی الہند: ص ۱۸۵، جمال الدین الافغانی: العروۃ الوثقیٰ: ص ۳۲۲، ص ۴۱۳، ابوالحسن علی الندوی: ربانیۃ ولارھبانیۃ : ص ۱۲۱، نورالدین داؤد: محنۃ فی الفردوس: ص ۱۸۸)

علماء کے شوق شہادت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب ایک بار انگریز جج نے علماء کی ایک جماعت کو پھانسی دینے کا فیصلہ سنایا تو وہ علماء شہادت کے تصور سے بے انتہاء خوش ہوئے۔ انگریز جج کو یہ بات پسند نہ تھی کہ اس کا کوئی فیصلہ ان کے لیے مسرور کن ہو۔ چنانچہ اس نے فوری پر اپنا فیصلہ بدل دیا اور کہا:

> ''اے باغیو! پھانسی تم کو بہت عزیز ہے۔ اللہ کی راہ میں تم اس کو شہادت تصور کرتے ہو۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے ذریعہ تمہاری کوئی امید بر آئے، یا ہم تمہارے لیے کسی خوشی اور مسرت کا باعث بنیں، لہٰذا ہم پھانسی کے حکم کو فوری طور پر منسوخ کرتے ہیں

اور تمہیں جزائر لنکا میں دائمی جلا وطنی کا فیصلہ سناتے ہیں۔''

(عبدالمنعم نمر: کفاح المسلمین فی تحریر الہند: ص ۳۲۔۳۴، تاریخ الاسلام فی الہند: ص ۴۲۶، سید ابوالحسن علی الندوی: اذاھبت ریح الایمان: ص ۱۹۴۔۲۰۰)

اندازہ فرمائیں کہ علماء نے یہ ساری سختیاں صرف اپنی ذات کے لیے برداشت نہیں کی تھیں بلکہ لوگوں کے لیے برداشت کیں تا کہ ان کے ایمان محفوظ ہو جائیں۔ دین کے لیے برداشت کیں تا کہ دین کے دامن پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔ اگر وہ لوگ بھی انگریزوں کی حکومت کو، ان کی تہذیب کو، ان کے تمدن اور معاشرت کو یا دوسرے لفظوں میں مغربیت کے الحاد کو برداشت کر لیتے تو انگریز ان کے لیے ہر خوشی کے دروازے کھول دیتا، لیکن تاریخ کے اوراق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ان لوگوں نے پھانسی کے پھندوں کو خوشی سے چوما لیکن حق بات کہنے سے پیچھے نہ ہٹے اور ظالم انگریز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے بات کی اور اپنی جان کی پروا نہ کی لیکن لوگوں کے ایمانوں کو محفوظ کر لیا۔ اس سلسلہ حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی اور دوسرے علماء کے واقعات گذشتہ صفحات میں بیان کیے جا چکے ہیں۔ مولانا خیر آبادیؒ کو یہ سزا کیوں دی گئی، خود مولاناؒ فرماتے ہیں:

''ہر ممکن اذیت پہنچائی گئی اور قصور صرف یہ تھا کہ وہ ایمان و اسلام پر مضبوطی سے قائم رہے۔ (الثورۃ الہندیہ: ص ۴۱۷)

ان لوگوں نے مسلمانوں کے کل کو بچانے کے لیے اپنا آج برباد کر دیا۔ دین اور مسلمانوں کے لیے ہنس کر مصائب کو گلے لگایا، دار و رسن کو چوما، تختۂ دار پر جھول گئے، تا کہ ہمارا ایمان محفوظ رہے، لیکن آج ہم نے ان کے تمام مصائب کو گلدستہ طاق نسیان بنا دیا ہے اور ہمیں ان کے نام تک یاد نہیں۔

ان کٹھن حالات میں علماء نے اسلامی علوم و فنون اور اسلامی سیاست و معاشرت کو بچانے کے لیے مختلف مدارس قائم کیے جب کہ انگریزوں کی پالیسیوں کے تحت پہلے قائم شدہ مدارس بھی بند ہو رہے تھے۔ انہی نو قائم شدہ مدارس میں سے ایک مدرسہ دارالعلوم دیو بند تھا جنہیں چھ بزرگوں نے چندہ اکٹھا کر کے قائم کیا، اور آج یہ

دارالعلوم ایک یونیورسٹی کی حیثیت رکھتا ہے اور چار دانگ عالم میں اس کا شہرہ ہے۔ یہ چھ بزرگ کون تھے؟ وہ حسب ذیل تھے:

-1	حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ والد حضرت شیخ الہندؒ	عمر 45 سال
-2	حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ والد علامہ شبیر احمد عثمانیؒ	عمر 35 سال
-3	حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ صاحب	عمر 33 سال
-4	حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ صاحب	عمر 34 سال
-5	حضرت حاجی محمد عابدؒ صاحب	عمر 32 سال
-6	حضرت مولانا رفیع الدینؒ صاحب	عمر 30 سال

ان حضرات کی عمروں کو ملاحظہ فرمائیں اور پھر ان کے اس کام پر غور فرمائیں جوانہوں نے انجام دیا۔ یہ اکابر ستہ وہ تھے جن کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزادؒ نے لکھا ہے کہ

> ”بڑوں بڑوں کا عذر یہ ہوتا ہے کہ وقت ساتھ نہیں دیتا اور سروسامان اور اسباب کار فراہم نہیں، لیکن وقت کا عازم و فاتح اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وقت ساتھ نہیں دیتا تو میں اس کو ساتھ لوں گا۔ اگر سروسامان نہیں تو اپنے ہاتھوں سے تیار کرلوں گا۔ اگر زمین موافق نہیں تو آسمان کو اترنا چاہیے۔ اگر آدمی نہیں ملتے تو فرشتوں کو ساتھ دینا چاہیے۔ وہ دنیا پر اس لیے نظر نہیں ڈالتا کہ کیا کیا ہے جس سے دامن بھرلوں، وہ یہ دیکھنے کے لیے آتا ہے کہ کیا کیا نہیں۔ اس کی نظریں تاک کی بلندی نہیں ناپتیں، ہمیشہ ہاتھ کی رسائی اور قد کی بلندی دیکھتی رہتی ہیں۔“ (تذکرہ: ص ۲۶۲)

قیام دارالعلوم دیوبند کی تفصیل اگلے صفحات میں آرہی ہے۔

☆ ☆ ☆

انگریزوں کا مسلمانوں کو ذلیل و خوار کرنا

1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد سارے ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ اور اب وہ اس ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بن گئے۔ کوئی انہیں روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ اب انہوں نے نفرت انگیز اور انسانیت سوز مظالم اور وحشت و بربریت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ بڑے بڑے جاگیرداروں اور نوابوں کی جاگیروں اور جائدادوں کو ضبط کر کے ان کو نان شبینہ کا محتاج کر دیا۔ گاؤں کے گاؤں تباہ کر دیئے، شہروں میں وہ اودھم مچایا کہ شریف آدمی زندگی پر موت کو ترجیح دینے لگا۔ ہندوستانیوں اور خصوصی طور پر مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی پوری پوری کوشش کی گئی۔ مسلمان ایک حکمران قوم ہونے کے ناطے اپنی شوکت اور عزت رکھتی تھی اور اپنے علوم و فنون اور حکمت و فلسفہ وغیرہ کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ ایشیا اور افریقہ کے دوسرے ممالک میں بھی اس کو احترام اور عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اگر چہ حکومت اور سلطنت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی لیکن پورے ملک میں فرقہ واریت کا نام نہ تھا۔ اگر چہ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے بعد مسلمانوں کی شہنشاہیت قائم ہو گئی تھی، لیکن مسلمان بادشاہ یہیں کے باشندے تھے۔ انہوں نے اپنے علائق اور تعلقات اپنے اصلی اوطان اور اقوام سے قریباً منقطع کر لیے تھے اور ہندوستانی قومیت کا جزو ولاینفک بن گئے تھے۔ امور حکومت میں یہاں کے اصلی باشندوں کو اس طرح شریک کر لیا تھا جیسے ایک قوم اور ایک خاندان کے لوگ شریک ہوتے ہیں شخصی حکومت کا دارومدار رعایا کی خوشنودی پر تھا۔ بادشاہ کے دربار میں ہر

شخص کو اظہار رائے کا موقع ملتا تھا لہٰذا عوام الناس کو خود اختیاری حاصل تھی۔ چنانچہ سر بارٹل فریر نے لکھا ہے: ''ایک دیسی شاہزادہ کا دربار بھی کونسل کے بالکل مشابہ ہوتا ہے۔ ایک اچھے حکمران کے زیر اثر اس دربار میں سب کی رسائی ہوتی ہے اور ہر ایک کو تقریر کرنے کی بڑی آزادی حاصل ہوتی ہے، اور یہی ذریعہ ہے جس سے وہ رعایا پر کسی قانون کے اثر کو محسوس کرسکتا ہے اور وہ اس طرح بے چینی کو پہلے ہی معلوم کر لیتا ہے۔''

(رپورٹ آئینہ اصلاحات مانٹیگو چمسفورڈ: ص ۳۸)

شہنشاہی درباروں سے لے کر عام سوسائٹیوں تک میں سب آپس میں ملے جلے تھے، اس لیے تمام ہندوستانی دنیا کی نظروں میں بھی اور آپس میں بھی عزت و شوکت کے حامل تھے۔ یہی نہیں بلکہ اپنی بے مثل ثروت، بے مثل تجارت، بے مثل دستکاری، بے مثل تمدن اور بے مثل طاقت کی بنا پر اقوام عالم میں برتری اور فوقیت کا درجہ رکھتے تھے۔ کوئی ہندوستانی غیر ممالک میں حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ ہندوستان کے لوگوں خصوصی طور پر مسلمانوں میں ہر اچھی صفت پائی جاتی۔ ایسی صفات کی موجودگی میں ہندوستان کو یورپی اقوام سے کسی طرح کم تر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر انگلستان اور ہندوستان کے درمیان تہذیب و تمدن کی تجارت کی جائے تو اس بات کا پورا پورا یقین ہے کہ ہندوستان سے تمدن کی جو کچھ درآمد انگلستان میں ہوگی اس سے انگریزوں کو بہت فائدہ ہوگا۔ لارڈ ولیم بینٹنگ (مشہور وائسرائے ہند) 1882ء میں ایک کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہتا ہے:

> ''بہت سی باتوں میں اسلامی حکومتیں انگریزی راج سے کہیں بہتر تھیں، مسلمان اس ملک میں آباد ہو گئے جسے انہوں نے فتح کیا تھا۔ وہ ہندوستانی باشندوں میں گھل مل گئے۔ ان میں بیاہ شادی کرنے لگے۔ مسلمانوں نے ہندوستانی قوموں کو ہر قسم کے حقوق دیئے۔ فاتح اور مفتوح کے مذاق، دلچسپی اور ہمدردی میں یکسانیت تھی۔ کوئی فرقہ نہ تھا۔ بخلاف اس کے انگریزی پالیسی اس کے برعکس ہے۔ اب سرد مہری، خود غرضی، بے پروائی ہے جس میں

ایک طرف حکومت کا آہنی پنجہ حکمران ہے اور دوسری طرف ہر چیز پر اپنا قبضہ ہے اور ہندوستانیوں کو کوئی دخل نہیں ہے۔''

(روشن مستقبل: ص ۲۵۔۲۶)

پنڈت سندرلال اپنی کتاب ''بھارت میں انگریزی رواج'' میں لکھتے ہیں کہ

''اکبر، جہانگیر، شاہ جہان اور ان کے بعد اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے زمانہ میں ہندو اور مسلمان یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ دونوں مذاہب کی مساویانہ توقیر کی جاتی تھی اور مذہب کے لیے کسی کے ساتھ کسی قسم کی جانب داری نہ کی جاتی تھی، ہر بادشاہ کی طرف سے بے شمار ہندو مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئیں تھیں۔''

لیکن انگریزی حکومت نے ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کی قومی توہین اور تذلیل کرنی شروع کر دی۔ انہوں نے آہستہ آہستہ مسلمانوں کو عہدوں سے نکالنا شروع کر دیا۔ چنانچہ سرجان شور 1833ء میں انگریزی قانون اور نظام پر بحث کرتے ہوئے کہتا ہے:

''ہر وہ عہدہ، عزت اور منصب جس کو قبول کرنے کے لیے ادنیٰ سے ادنیٰ انگریز کو آمادہ کیا جاسکتا ہے، ہندوستانیوں کے لیے بند کر دیا گیا ہے۔'' (حکومت خود اختیاری: ص ۲۷)

اور جو چھوٹے عہدے تھے اور وہاں بہت کم تنخواہ تھی، ان سے بھی مسلمانوں کو نکال کر ہندوؤں کو مقرر کر دیا گیا۔ یورپی گوروں اور اینگلو انڈین کو ان کے عہدوں پر بہت زیادہ تنخواہوں سے نوازا گیا۔ فوجی عہدوں کے ذمہ دار مناصب سے ہندوستانیوں کو بالکل خارج کر دیا گیا۔ اس طرح تمام فوجی قوت پر قبضہ کر لیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی لوگ نان شبینہ کے محتاج ہو کر رہ گئے اور ساری طاقت انگریزوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ جو مسلمان تجارت اور دست کاری سے بسر اوقات کرتے تھے وہ فاقوں

مرنے لگے اور جو کاشتکاری کرتے تھے ان کے لگان اور مال گزاری میں بے پناہ اضافہ کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کاشت کار اور زمین دار اپنے گھروں، زیورات، کاشتکاری کے آلات اور جانوروں تک کو رہن رکھنے اور فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ مختصر یہ کہ مسلمانوں کو ذلیل وخوار کرنے کا کوئی طریقہ باقی نہ چھوڑا گیا۔ چنانچہ سر میلکم لوئس، جج عدالت عالیہ، مدراس نے اپنے ایک رسالہ میں لندن سے لکھا تھا:

''ہم نے ہندوستانیوں کی ذاتوں کو ذلیل کیا۔ ان کے قانون وراثت کو منسوخ کیا، بیاہ شادی کے قاعدوں کو بدل دیا، مذہبی رسوم و رواج کی توہین کی، عبادت خانوں کی جاگیریں (اوقاف) ضبط کر لیں۔ سرکاری کاغذات میں انہیں کافر لکھا۔ امراء کی ریاستیں ضبط کر لیں، لوٹ کھسوٹ سے ملک کو تباہ کیا، انہیں تکلیف دے کر مال گذاری وصول کی، سب اونچے خاندانوں کو برباد کر کے انہیں آوارہ بنا دینے والے بندوبست قائم کیے۔'' (روشن مستقبل: ص ۷۶)

لارڈ میکالے نے اپنے ایک مضمون میں جو کورٹ کے قوانین کے بارے میں ہے، لکھا:

''بات بات پر حلف لیے جاتے تھے جب کہ قسم کھانا ایک عزت دار ہندوستانی کے لیے بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں مشرق میں کسی شریف آدمی کے زنانہ مکان میں غیر مرد کا گھس جانا یا کسی عورت کو بے پردہ دیکھ لینا ناقابل برداشت ظلم سمجھا جاتا ہے۔ جس کا بدلہ صرف خون سے لیا جا سکتا ہے، لیکن یہی مصیبتیں تھیں جن کا نشانہ بنگال اور بہار کے شریف گھرانے بنائے جا رہے تھے۔ ہندوستانی شرفاء جو بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، گرفتار کر کے کلکتہ بھیجے گئے اور جیل میں بند کر دیئے گئے۔''

(روشن مستقبل: ص ۲۶)

انہی چیزوں کو دیکھ کر سر سید احمد نے اپنی کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' میں لکھا ہے:

''بے عزتی ایسی چیز ہے کہ اس سے دل پر زخم ہو جاتا ہے اور جو اچھا نہیں ہوتا گورنمنٹ نے ہندوستانیوں (ہندوستانیوں سے اکثر و بیشتر مراد مسلمان ہیں) کو نہایت بے وقار کر دیا ہے۔ صاحب کا پیش کار صاحب کی مزاجی اور سخت کلامی بلکہ دشنام دہی سے دل میں روتا جاتا ہے اور کہتا جاتا ہے کہ اس نوکری سے تو گھاس کھودنی بہتر ہے۔ دراصل انگریزی اور ہندوستانی مثل آگ اور سوکھی گھاس کے ہیں یا مثل پتھر کے دو ٹکڑوں کے ہیں۔ سفید اور کالے جن میں فاصلہ دن بدن زیادہ ہوتا جاتا ہے اور یوں تصور کیا جاتا ہے کہ گویا ہندوستانیوں میں کوئی جینٹلمین (شریف آدمی) نہیں ہے۔''

(روشن مستقبل: ص ۸۸)

مختصر یہ کہ یہ بات روز روشن کی طرح ثابت اور عیاں ہے کہ انگریزوں نے مسلمانوں کی اس قدر تذلیل و توہین کی جس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ انہوں نے عدالتوں میں توہین کی، فیصلوں میں توہین کی، سول اور فوجی گوروں سے ذلیل کروایا گیا، گوروں کا جب بھی جی چاہتا اپنے ٹھڈوں اور ہنٹروں سے مسلمانوں کو اتنا مارتے کہ وہ بیچارا مر جاتا، اور یہ کہہ کر یا فیصلہ کر کے ٹال دیا جاتا کہ مقتول کی تلی بڑھ گئی تھی یا خراب ہو گئی تھی۔ پھر یہ بھی کیا جاتا کہ گوروں کے مقدمات ہندوستانی ججوں کے ہاں فیصل نہ ہو سکتے تھے۔ شہروں اور عام گذرگاہوں پر ایسے ایسے کتبے اور سائن بورڈ اور مجسمے نصب کیے گئے جن پر توہین آمیز عبارتیں لکھی گئیں۔ مختلف مجلسوں میں کالے اور گوروں کی نشستوں میں فرق کیا گیا۔ 1857ء میں وہ وہ مظالم مسلمانوں پر کیے گئے کہ قلم کو تاب نگارش نہیں۔ مسلمانوں کی توہین و تذلیل، قتل و غارت، بربادی اور ہلاکت میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا گیا۔ بیرون ہند مسلمانوں کو وحشی، نیم تعلیم یافتہ، جاہل، غیر مہذب، دقیانوس وغیرہ مشہور کیا گیا۔ ان کو مذہبی دیوانے، کنگال اور لڑاکو کہا گیا۔ غرضیکہ مسلمانوں کے خلاف بے شمار توہین و تذلیل کی ایسی کاروائیاں عمل میں لائی گئیں جن کو معمولی غیرت اور شرافت والا انسان بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

ہندوستانی مسلمانوں کی بربادی:

انگریز ایشیا اور افریقہ کے باشندوں کے ہمیشہ سے دشمن رہے ہیں اور ان کو وحشی، غیر متمدن، غیر مہذب بلکہ خارج از انسانیت وغیرہ کہتے ہوئے ان کی عزت و آبرو، مال اور ذرائع دولت وغیرہ پر نہایت بربریت سے حملہ آور ہوتے رہے ہیں۔ خصوصی طور پر مسلمانوں پر ان کی سیاسی رقابت کا بھی ہمیشہ سے خیال قائم رہا، اور ان کو سخت ترین دشمنی کی آگ میں ڈالا گیا۔ چنانچہ مسلمانوں کو برباد کرنے اور ان کو فنا کے گھاٹ اتارنے کا عمل جاری کیا گیا، بالخصوص اس وقت سے جب کہ ان کو بادشاہ دہلی سے دیوانی کا صیغہ دربارہ بنگال، بہار، آسام اور اڑیسہ دے دیا گیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اپنے ولی نعمت کو پہچانتے اور اس کے ساتھ وفاداری اور نیک حلالی کو عمل میں لاتے، لیکن رذیلوں کے ساتھ احسان کرنا ہی ان کی غلطی تھا۔ مغلیہ بادشاہوں نے یہ انتہائی غلطی کی تھی کہ ان رذیل لوگوں کو اپنے ملک میں اقامت اور حقوق شہریت اور تجارت کی اجازت دے دی، اور بار باران کی نالائقی کو دیکھتے اور تجربہ کرتے ہوئے انہوں نے ہوش کے ناخن نہ لیے۔ چنانچہ جب ہندوستان کی حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں آئی تو انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ نہایت برا سلوک کرنا شروع کر دیا اور ہر صیغۂ حکومت سے مسلمانوں کو چھانٹنا اور اپنوں سے یا مسلمانوں کے دشمنوں سے ان خالی آسامیوں کو بھرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ولیم ہنٹر نے لکھا ہے:

> ”حقیقت یہ ہے کہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو مسلمان ہی سب سے اعلیٰ قوم تھی۔ وہ صرف دل کی مضبوطی اور بازوؤں کی توانائی ہی میں برتر نہ تھے بلکہ سیاسیات اور حکمت عملی کے علم میں بھی سب سے افضل تھے، لیکن اس کے باوجود مسلمانوں پر حکومت کی ملازمتوں کا دروازہ بند ہے۔ غیر سرکاری ذرائع زندگی میں بھی انہیں کوئی نمایاں جگہ حاصل نہیں۔“ (ہمارے ہندوستانی مسلمان: ص ۲۳۷)

ایک اور جگہ پر ولیم ہنٹر لکھتا ہے:

''ایک صدی قبل حکومت کے تمام ذمہ دار عہدوں پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ تھا۔ ہندو محض شکریہ کے ساتھ ان چند ٹکڑوں کو قبول کر لیتے تھے جو ان کو سابق فاتح اپنے دسترخوان سے ان کی طرف پھینک دیتے تھے، اور انگریزوں کی حیثیت چند ایک گماشتوں اور کلرکوں کی تھی۔'' (ہمارے ہندوستانی مسلمان: ص ۲۳۶)

اسی کتاب میں ایک اور جگہ پر ہنٹر لکھتا ہے:

''لیکن پھر بھی سوچنا چاہیے کہ جتنے ہندوستانی سول سروس میں داخل ہوتے یا ہائی کورٹ کے جج بنتے ہیں، ان میں ایک بھی مسلمان نہیں حالانکہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو اس سے کچھ عرصہ بعد تک بھی حکومت کے تمام کام مسلمانوں ہی کے ہاتھوں انجام پاتے تھے۔'' (ہمارے ہندوستانی مسلمان: ص ۲۳۱)

ایسٹ انڈیا کمپنی کے پہلے پچاس سالوں میں حکومت کی ملازمتوں میں سب سے بڑا حصہ مسلمانوں ہی کا تھا لیکن دوسرے پچاس سالوں میں ہوا کا رخ بدل گیا۔ چنانچہ ہنٹر نے لکھا ہے کہ

''انگریزوں کے ہندوستان پر قابض ہونے سے پہلے مسلمان ملک کی سیاسی ہی نہیں بلکہ دماغی قوت بھی تسلیم کیے جاتے تھے۔''

(ہمارے ہندوستانی مسلمان: ص ۲۴۶)

ولیم ہنٹر نے ایک اور مقام پر لکھا ہے کہ

''لیکن ان بے انصافیوں کی فہرست ابھی مکمل نہیں ہوئی جن کا مسلمان اپنے انگریز حاکموں کو ملزم ٹھہراتے ہیں۔ وہ ہمیں صرف اس بات کا ملزم قرار نہیں دیتے کہ ہم نے کامیاب زندگی کی تمام راہیں ان پر مسدود کر دی ہیں بلکہ یہ بھی کہ ہم نے ان کی عاقبت کو خطرہ میں ڈال دیا ہے۔ دنیا کے ہر اچھے مذہب نے روحانی فرائض کی انجام دہی کے خاص دن مقرر کر رکھے ہیں۔ ہم اس غم و

غصہ کا اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں جو انگریزوں کو اس وقت ہوگا جب کہ کوئی غیر ملکی فاتح خود بخود اپنی مرضی سے اس بات کا اعلان کردے کہ آئندہ اتوار کو چھٹی نہیں ہوا کرے گی................ اگر ہندوؤں اور عیسائیوں کو ان کے مذہب کے مطابق چھٹیاں دی جا سکتی ہیں تو مسلمانوں کو بھی مذہبی فرائض کی بجا آوری اور تہواروں کو منانے کی چھٹی کیوں نہیں مل سکتی۔" گویا وہ قوم جو کبھی ہندوستان کے تمام عدالتی عہدوں پر فائز تھی، اب اس حد تک ذلیل ہوچکی ہے۔" (ہمارے ہندوستانی مسلمان: ص۲۶۲)



تحریک آزادی ہند کی ابتدا

انگریزوں نے 1857ء میں برصغیر پاک و ہند پر قبضہ کرنے کے بعد جو نفرت انگیز اور انسانیت سوز مظالم مسلمانوں اور اہل ہند پر کرنے شروع کیے۔ اس وحشت و بربریت اور سفاکانہ مظالم اور مسلمانوں کی توہین و تذلیل کا سلسلہ برابر جاری رہا بلکہ اس میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا تو مسلمانوں کے علمی طبقہ اور علمائے اسلام میں وطن کی آزادی کی تڑپ انگرائیاں لینے لگی۔ پہلے تو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اب مسلمانوں کو اپنے احوال پر غور و فکر کرنا چاہیے اور آزادی کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا چاہیے جو کہ ہر دارالحرب کے باشندوں پر لازم ہے۔ چنانچہ اس فتویٰ کے بعد آزادی کی جدوجہد شروع ہوئی۔ آزادی کی اس تحریک کو سکھوں کے مقابلہ کے نام سے مشہور کیا گیا کیونکہ اس زمانہ میں مغربی پنجاب میں سکھوں کی حکومت تھی جو انگریزوں کے حلیف تھے اور انہوں نے آپس میں بڑے مضبوط معاہدے کیے ہوئے تھے، لیکن درحقیقت سکھوں سے لڑنے کا مقصد اصلی ان انگریزوں اور ان کے حلیفوں اور معاونین سے جنگ کر کے ملک کو اس مصیبت سے بچانا اور اس کو آزاد کرانا تھا۔ چنانچہ اس تحریک کے بانی اور امیر حضرت سید احمد شہید بریلویؒ نے جو خط وزیر گوالیار کے نام مدد طلب کرنے کے لیے لکھا گیا تھا اس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارا مقصد ہندوستان کو اس بدیشی قوم یعنی انگریزوں کے مظالم سے پاک کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجاہدین کی جماعت جو کہ یاغستان میں 1947ء تک بلکہ اس کے بعد تک بھی رہی اور جس کو انگریز باغی کیمپ کے ساتھ تعبیر کرتے تھے، سکھوں کی

حکومت کا خاتمہ ہو جانے کے بعد بھی وہاں مقیم رہے۔

ہندوستان کی یہ بہت بڑی بدقسمتی تھی کہ حضرت سید احمد بریلویؒ کو معرکہٴ بالاکوٹ میں جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ انگریز سید صاحبؒ کی تحریک سے بڑے خوف زدہ تھے۔ سید احمد کا اصل مقصد ہندوستان کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرانا تھا جس سے ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشان تھے اگرچہ مسلمان زیادہ پریشان تھے۔ اسی وجہ سے آپ نے اپنے ساتھ ہندوؤں کو بھی شرکت کی دعوت دی اور انہیں صاف صاف بتا دیا کہ آپ کا واحد مقصد ملک سے بدیشی لوگوں (انگریزوں) کا اقتدار ختم کرنا ہے۔ سید صاحبؒ نے اپنے خطوط میں انگریزوں کو ''بیگانگاں بعید الوطن'' اور پردیسی سمجھتے تھے اور اس کے استیلا اور تغلب کو ختم کرنا چاہتے تھے۔

ولیم ہنٹر سید صاحبؒ کے سخت مخالف ہے۔ وہ انہیں لٹیرا اور جعل ساز کہتا ہے اور ان کے حواریوں کے لیے بھی اسی قسم کے الفاظ استعمال کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالتا ہے۔ لیکن سید صاحبؒ کا تقویٰ اور ان کی روحانیت اسے یہ الفاظ لکھنے پر مجبور کرتی ہے

> ''سید احمدؒ کی زندگی کا ایک درمیانی حصہ ایسا بھی تھا جس میں ان کا دل و دماغ اپنے برادرانِ وطن کی نجات کے لیے ہر وقت بے قرار رہتا تھا اور ان کا دھیان ہر وقت خدا کی طرف لگا رہتا تھا۔ وہ بہت ہی بے قرار، جوشیلے اور اعصابی مزاج کے آدمی تھے اگرچہ ان کا ظاہری اطمینان ان کی قلبی کیفیت کو ظاہر نہ ہونے دیتا تھا۔''
>
> (ہمارے ہندوستانی مسلمان: ص ۷٦)

پھر اسی کتاب میں ایک اور مقام پر لکھتا ہے کہ

> ''سید احمد نے نہایت دانشمندی سے اپنے آپ کو زمانہ کے مطابق بدل دیا چنانچہ انہوں نے قزاقی کا پیشہ ترک کر کے 1816ء میں احکام شرعیہ پڑھنے کے لیے دہلی جا کر ایک جید عالم کی شاگردی اختیار کی، اور پھر تین سال کی اس طالب علمانہ زندگی کے بعد ایک مبلغ کی زندگی اختیار کی۔ انہوں نے پرزور طریقہ پر ان بدعات

کے خلاف جہاد شروع کیا جو مسلمانانِ ہند کے اسلامی عقائد میں داخل ہو چکی تھیں۔ اور اس طرح سے انہوں نے پر جوش اور حوصلہ مند لوگوں کو اپنا مرید بنا لیا۔'' (ہمارے ہندوستانی مسلمان: ص ۶۲)

اندازہ فرمائیں کہ ولیم ہنٹر جیسا آدمی سید صاحبؒ کو قزاق اور لٹیرا کہتا ہے۔ اس نے ایسا کیوں کہا؟ یہ ان لوگوں کا پرانا شیوہ اور دستور ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر صادق حسین جنہوں نے ہنٹر کی کتاب کا اردو میں ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' کے نام سے ترجمہ کیا ہے، وہ اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''مغربی تاریخ نگاروں کا یہ ہمیشہ اصول رہا ہے کہ ملت کے یہ وفادار سرفروش اگر یورپ میں ہوں تو انہیں قومی اور مذہبی زندگی میں بلند ترین مقام پر جگہ دی جاتی ہے، اور بدقسمتی سے اگر ان کا تعلق سرزمین ایشیا اور بالخصوص اسلام سے ہو اور وہ کسی مغربی سے برسرِ پیکار ہوں تو اس سے زیادہ ذلیل، انسانیت کا خون کرنے والا اور امن پسند شہریوں کی جائداد و املاک لوٹنے والا اس دنیا میں کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ چاہے کہ اس کی لاش بھی قبر سے کھدوا کر جلا دی جائے (جیسا کہ لارڈ کچنر نے مہدی سوڈانی مرحوم کے ساتھ کیا) مجاہدین کے لیے باغی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے (جیسا کہ آج کل طالبان کے لیے دہشت گردی کا لفظ امریکہ اور پاکستان سمیت اس کے حلیف استعمال کرتے ہیں) اور ظاہر ہے کہ دو متضاد قوانین میں سے ایک کی پرجوش حمایت دوسرے سے بغاوت کے مترادف ہے۔''

جنگ آزادی کے ناکام ہونے کے بعد انگریزوں نے علماء کو جہاں مختلف قسم کی سزائیں دیں وہاں علماء کو بدنام کرنا بھی شروع کر دیا جیسے حضرت سید صاحبؒ اور ان کے ماننے والوں اور پیروکاروں کو قزاق اور لٹیرا کہہ کر بدنام کیا گیا۔ ایسے ہی تھانہ بھون کے مجاہدین کو بھی مختلف طریقوں سے قوم کی نگاہ میں مجروح کرنا چاہا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ تھانہ بھون کی آبادی اس زمانہ میں 35 ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ اس آبادی

میں سے قریباً سات ہزار نفوس انگریزی افواج میں ملازم تھے۔محکمۂ فوج سے ایک لاکھ چوراسی ہزار روپے تنخواہوں اور پنشنوں کی صورت میں اہالیان قصبہ وصول کرتے تھے۔ قرب و جوار میں لوگوں کی زبانوں پر یہ تھا کہ تھانہ بھون والوں کی کمائی خون کی کمائی ہے۔

جونہی مئی 1857ء میں انگریزوں کے خلاف ہندوستانی افواج بگڑیں تو تھانہ بھون کے وہ تمام افراد جو فوج میں ملازم تھے، اپنی ڈیوٹیاں چھوڑ کر تھانہ بھون آ گئے۔ چونکہ یہاں انگریزی حکومت کا تھانہ (پولیس اسٹیشن) موجود تھا، لہٰذا یہ سپاہی شروع میں تو روپوش ہو گئے اور اندر ہی اندر اہالیان قصبہ کو جنگ آزادی میں حصہ لینے کے لیے ترغیب دیتے رہے۔ اسی دوران قاضی عنایت علی صاحب کے بھائی قاضی عبدالرحیم کا واقعہ پیش آ گیا جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا گیا ہے۔ قاضی عبدالرحیم جو سہارنپور ہاتھی خریدنے کے لیے گئے تھے، ان کو اور ان کے ساتھیوں کو انگریزوں نے گرفتار کر کے بغیر تفتیش کیے گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔ یہ خبر راتوں رات تھانہ بھون پہنچی۔ قاضی عنایت علی صاحب کے ہاں صف ماتم بچھ گئی۔ شیدائیان آزادی کے لیے یہ واقعہ ''سمند ناز پہ ایک تازیانہ اور ہوا'' کے مترادف تھا۔ قاضی عنایت علی خان مجاہدین حریت کے ہم نوا بن گئے۔

پورے قصبہ اور اس کے مضافات میں اعلان جہاد ہو گیا۔ اعلان جہاد کے ساتھ انگریزی عملہ جو پولیس اسٹیشن پر متعین تھا، وہاں سے بھاگ گیا۔ مجاہدین جنگ آزادی نے اپنی خدمات باشندگانِ قصبہ کے لیے وقف کر دیں۔ ایس پنکھی کلکٹر سہارن پور، اس وقت فوجی کمانڈر کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا، لیکن مجاہدین حریت کے سامنے وہ بے بس ہو گیا اور انگریزوں کا سارا اسلحہ مجاہدین کے ہاتھ آ گیا۔ مجاہدین کو پتہ چلا ایس پنکھی حفاظتی انتظام کے معائنہ کے لیے شاملی میں موجود ہے۔ یہی وہ شخص تھا جس نے قاضی عبدالرحیم اور ان کے ساتھیوں کو گولی کا نشانہ بنایا تھا، لہٰذا مجاہدین کا ایک دستہ شاملی پر چڑھ دوڑا۔ اس لشکر کی قیادت حضرت حافظ محمد ضامن شہید، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت محمد زبیر نانوتویؒ فرما رہے تھے۔ ایک دستہ قاضی عنایت علیؒ کی کمان میں بھی تھا۔ حضرت حافظ محمد ضامنؒ تو انگریزی فوج کی گولیوں سے شہید ہو گئے لیکن تحصیل شاملی پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا۔ اسلحہ کی کمی اور

اپنوں کی بے حسی اور غداری کے باعث مجاہدین کو شکست ہو گئی۔ کئی لوگوں کو شہید کیا گیا اور ایک سو بتیس لوگوں کو گرفتار کر کے مہاجنوں والی باغیچی میں پھانسی دے دی گئی۔

علماء کرام کے ساتھ انگریزوں کے خوف سے پھر کوئی نئی جمعیت نہ بن سکی۔ حکومت نے علماء کی گرفتاری کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، لیکن وہ ہر مرتبہ محیر العقول طریقوں سے بچتے رہے اور گرفتار نہ ہو سکے۔ حضرت حاجی امداد اللہؒ اور حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ دو سال تک ہندوستان کے مختلف مقامات پر چھپتے چھپاتے بالآخر مکہ معظّمہ ہجرت فرما گئے۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ گرفتار ہو گئے اور چھ ماہ تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے عام معافی کے تحت رہا ہوئے۔ دوسرے علمائے کرام سے بھی عام معافی کے بعد کوئی تعرض نہ کیا گیا۔

انگریزوں پر اہالیان تھانہ بھون کی حریت پسندی کی ہیبت مدت تک طاری رہی۔ عرصہ تک یہاں کے باشندوں کو کوئی سرکاری ملازمت نہ دی گئی۔ فوج میں تو پہلی جنگ عظیم تک یہاں کا کوئی آدمی نہیں لیا جاتا تھا۔ 1912ء میں ایک انگریز پلٹن تھانہ بھون سے گذر رہی تھی۔ اس کے انگریز کمانڈر کے دریافت کرنے پر لوگوں نے بتایا کہ یہ تھانہ بھون ہے، تو وہ حیرت زدہ ہو کر کہنے لگا: ''اوہ! تھانہ بھون ابھی تک آباد ہے؟'' 1917ء میں سی مور، کلکٹر ضلع مظفر نگر نے تھانہ بھون دیکھنے کے بعد کہا: ''اس قصبہ سے اب بھی بوئے بغاوت آتی ہے۔'' حکومت کی اس معاندانہ ذہنیت نے قصبہ کی معاشی اور اقتصادی حالت پر بہت برا اثر ڈالا۔ 35 ہزار افراد پر مشتمل آبادی صرف پندرہ ہزار نفوس پر مشتمل رہ گئی، وہ بھی اقتصادی حالات کی ابتری کے باعث روز بروز کم ہوتی گئی یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے صرف ساڑھے چھ ہزار رہ گئی تھی۔

1857ء کی جنگ آزادی سے قبل 1841ء میں حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب دہلویؒ ہندوستان چھوڑ کر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور وہاں سے اپنی تحریک کو جاری و ساری رکھنے کے احکام بھیجتے رہے۔ مکہ جانے سے قبل انہوں نے مولانا مملوک علی نانوتویؒ کی زیر قیادت ایک کمیٹی بنائی جس کے ارکان مولانا قطب الدین دہلویؒ، مولانا مظفر حسین کاندھلویؒ اور مولانا عبد الغنی دہلویؒ تھے۔ شاہ محمد اسحاق دہلویؒ حجاز میں اپنی اس

تحریک کے لیے چندہ اکٹھا کر رہے تھے جس کی وجہ سے عثمانی حکومت کے ذہن میں کچھ غلط فہمیاں سی پیدا ہو گئیں اور وہ انہیں حجاز سے نکالنے کا پروگرام بنانے لگے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ انگریزوں نے خلافت عثمانیہ سے کہا تھا کہ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحبؒ کو مکہ مکرمہ سے نکال دیں جس کی وجہ سے عثمانی حکومت نے ان کو حجاز سے نکالنے کا ارادہ کیا لیکن شیخ حرم کی مداخلت سے ان کو نہ نکالا گیا لیکن ان کی سیاسی کاروائیوں پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس وجہ سے شاہ صاحبؒ نے دہلی میں جو کمیٹی بنائی تھی اس کی کاروائیاں بھی سست ہو گئیں۔

مولانا مملوک علی نانوتویؒ عربی اور اسلامی علوم وفنون کے بہترین عالم اور فاضل تھے۔ وہ دہلی کالج کے مشہور پروفیسر تھے۔ تعلیم و تدریس کے دوران وہ اپنے تلامذہ پر بڑے اثر انداز ہوتے تھے۔ آپ کے تلامذہ میں سے ایک سرسید احمد خان بھی تھے جو بعد میں علی گڑھ کے بانی ہوئے۔ سرسید نے مولانا مملوک علیؒ کو بڑا خراج تحسین پیش کیا ہے اور ان کے علم اور حافظہ کی بڑی تعریف کی ہے۔ آپ نے اپنے شاگردوں کو نہ صرف عربی اور دینی تعلیم دی بلکہ ان کے دلوں میں اسلام کی محبت کے دیئے بھی روشن کیے اور انہیں اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ اسلام کی عظمت وشوکت کا سماں واپس لانے کی کوشش کریں۔ کچھ عرصہ کے بعد مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے بجائے حضرت مولانا حاجی امداد اللہ تھانوی قدس سرہ کو ان کی جگہ تحریک آزادی کی باگ ڈور سپرد کر دی گئی۔ لیکن 1857ء کی جنگ آزادی میں حصہ لینے کی وجہ سے حاجی امداد اللہ صاحبؒ بھی ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔

حضرت حاجی صاحبؒ کے مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد ہندوستان میں آزادی کی تحریک کی آبیاری کے لیے صلاح ومشورہ ہونے لگے لیکن ہندوستان کے حالات اب پہلے سے بہت مختلف ہو چکے تھے، لہٰذا فیصلہ یہ ہوا کہ آزادی کی اس تحریک کو کسی نہ کسی طریقہ سے زندہ رکھا جائے۔ اس کے لیے فیصلہ یہ ہوا کہ مدرسہ رحیمیہ (یہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کا مدرسہ تھا۔ اسی مدرسہ میں شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ محمد اسحاقؒ وغیرہم نے تعلیم حاصل کی تھی۔ اس مدرسہ نے بڑے بڑے علماء اور فضلاء کو جنم دیا تھا جنہوں نے نہ صرف برصغیر

پاک و ہند میں دینی علوم کی تشہیر کی بلکہ بیرون ہند بھی قرآن و حدیث کے علوم کو پہنچایا۔ 1858ء میں جب انگریزوں نے جنگ آزادی کو کچل کر دہلی پر قبضہ کیا انگریزی حکومت نے اس مدرسہ کی عمارت کو مسمار کر دیا۔ (محمد سرور، مولانا عبید اللہ سندھی ۱۸۲) جو اس جگہ تھا جہاں آج ایڈورڈ پارک ہے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ اس مدرسہ کا قیام دہلی میں نہ ہو بلکہ اس کو کسی اور جگہ قائم کیا جائے۔ اور وہ جگہ دیوبند ضلع سہارنپور تھی۔

دیوبند ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ بڑی سڑکوں سے دور، اس زمانہ کے مواصلاتی نظام سے وہاں پہنچنا دشوار۔ اس وجہ سے مدرسہ کے لیے رہائشی ہونا ضروری تھا۔ طالب علموں کی رہائش کے لیے اقامت گاہ اور استادوں کی رہائش کے لیے بھی کوارٹروں کی ضرورت تھی۔ لیکن اس کے لیے روپوں کی ضرورت تھی جو اس زمانہ میں اکٹھے کرنے نہایت مشکل تھے۔ لیکن حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے حوصلہ نہ ہارا اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے نہایت چھوٹے پیمانے پر اس مدرسہ کو شروع کیا۔ سب سے پہلا استاذ بھی محمود اور سب سے پہلا شاگرد بھی محمود۔ چھتہ کی مسجد میں ایک انار کے درخت کے نیچے (جو اب تک وہاں موجود ہے) دونوں استاذ اور شاگرد بیٹھ گئے۔ اور اللہ کا نام لے کر اور اللہ کے دین کی خاطر اس مدرسہ کو شروع کیا۔ بس مدرسہ کا شروع ہونا اور مولانا نانوتویؒ اور دیگر بزرگوں کا اخلاص تھا کہ مدرسہ میں چندہ آنا شروع ہو گیا اور سات سال کے قلیل عرصہ میں، 1866ء میں، اس مدرسہ کو ایک دارالعلوم کی شکل دے دی گئی اور پھر مولانا نانوتویؒ نے اپنی باقی ماندہ عمر اسی مدرسہ کی تعمیر اور خدمت میں گزار دی۔ مدرسہ میں فقہ حنفی کے مطابق قرآن و حدیث کی اسی طرز پر تعلیم و تدریس ہوتی تھی جس طرز پر شاہ ولی اللہ محدثؒ کے مدرسہ رحیمیہ میں ہوتی تھی۔ اس مدرسہ کے ذریعہ برصغیر پاک و ہند میں ہر مسجد کو امام اور بعد میں قائم ہونے والے ہر مدرسہ کو مدرس مہیا کیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تحریک آزادی کا یہ پیغام جو مدرسہ کے بزرگ لوگوں تک پہنچانا چاہتے تھے اور آزادی کی اس تحریک کو جو حضرت سید احمد شہید بریلویؒ اور حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ نے چلائی تھی، اس طریقہ سے زندہ رکھا گیا۔ دوسرے لفظوں میں دارالعلوم دیوبند تحریک ولی اللہی کا مینار اور سمبل (Symbol) تھا۔ آہستہ آہستہ دارالعلوم کے فاضل علماء افغانستان اور

دوسرے علاقوں تک بھی پھیل گئے۔ اور پورے برصغیر پاک و ہند اور افغانستان میں دارالعلوم دیوبند کا وہ پیغام جس کو بانیان مدرسہ لوگوں تک پہنچانا چاہتے تھے، پہنچ گیا۔ اور وہ پیغام تھا انگریزوں سے آزادی۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی یہ وصیت تھی کہ کسی بھی حکومت سے کوئی مالی مدد قبول نہ کی جائے کیونکہ حکومتوں کی مالی مدد مدرسوں کی آزادی میں ایک بہت بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ مدرسہ کی انتظامیہ نے اس پر نہایت سختی سے عمل کیا۔ چنانچہ یو۔پی کے گورنر سر جیمز میسٹن (James Meston) جس کے ضلع میں دیوبند کا قصبہ واقع تھا، نے مدرسہ کی مالی اعانت کرنا چاہی لیکن اس اعانت کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا گیا۔ دارالعلوم دیوبند کی عوام و خواص کے درمیان خاصی شہرت ہو چکی تھی، اس کی شہرت میں کچھ کمی کی خاطر سر جیمز نے دیوبند آنے کا پروگرام ترتیب دیا اور یہاں مدرسہ کی امداد کا اعلان کرنا چاہا لیکن مدرسہ کی انتظامیہ نے اس امداد کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا، اور گورنر صاحب سے کہا کہ اس امداد کا قبول کرنا ہمارے دارالعلوم کے اصول کے خلاف ہے لہٰذا ہم آپ کی اس امداد کو قبول کرنے سے معذرت چاہتے ہیں۔ (یاد ایام: ص ۶۳۔۶۵) یہاں تک کہ گورنر صاحب کو مدرسہ میں دعوت دینے اور مدرسہ کے مہتمم صاحب کو شمس العلماء کا خطاب دینے پر بھی نہایت سختی سے تنقید کی گئی اور مدرسہ کی انتظامیہ اس کو کسی صورت قبول کرنے پر راضی نہ ہوئی۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور دوسرے بانیان مدرسہ کی کاوشوں اور بزرگوں کی دعاؤں سے مدرسہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ اب ضرورت تھی کہ مدرسہ کے انتظام و انصرام کے لیے کچھ اصول و ضوابط مرتب کیے جائیں۔ یہ تو مدرسہ کی روز اول سے پالیسی تھی کہ مدرسہ کے تمام اساتذہ اور انتظامیہ کسی فرقہ وارانہ جھگڑا میں شمولیت اختیار نہ کرے البتہ ہمارا یہ مدرسہ اہل السنّت والجماعت کے اصولوں اور فقہ حنفی کی فروعات پر سختی سے کاربند رہے گا، لیکن بعد میں بعض علماء نے ان کے بعض مسائل پر ناجائز تنقید کر کے ان کو مختلف مسائل میں الجھانے کی کوشش کی۔ یہ ان مسائل میں تو نہ الجھے البتہ ان لوگوں نے جن کی ہمدردیاں انگریزوں کے ساتھ تھیں اور وہ اس دارالعلوم کو

اور یہاں کے علماء کو انگریزوں کا دشمن سمجھتے تھے، ان پر ناجائز کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ یہاں تک ان کی بعض عبارتوں کو توڑ مروڑ کر علمائے حرمین کے سامنے پیش کیا اور ان سے بھی کفر کا فتویٰ لے کر ان کو ''حسام الحرمین'' کے نام سے شائع کر دیا۔ علمائے دیوبند نے اپنی صفائی میں ایک کتاب لکھی جس کا نام ''المہند علیٰ المفند'' تھا اور اس میں اپنے تمام عقائد کو بیان کر کے علمائے حرمین کے سامنے پیش کیا۔ چنانچہ علمائے حرمین کو پتہ چل گیا کہ جن علماء نے قبل ازیں غلط عبارتیں پیش کر کے ہم سے کفر کا فتویٰ لیا تھا ان کے پیچھے کوئی سازشی ہاتھ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پھر ان لوگوں کو مکہ اور مدینہ کے علماء کے سامنے پیش ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ بلکہ ہندوستان کے بھی کئی ایسے علماء تھا جنہیں پتہ چل گیا کہ ایسے پاکباز، متقی اور صحیح العقیدہ حضرات پر فتویٰ کفر لگانے کی کیا وجوہات تھیں۔ چنانچہ انہوں نے فتویٰ کفر پر دستخط کرنے کے بعد ان دستخطوں سے اظہار بیزاری کیا اور علمائے دیوبند کی بریت اور ان کے اہل سنت اور حنفی عقیدہ ہونے پر کتابیں لکھیں جن میں مولانا محمد خلیل خان بدایونی مرحوم پیش پیش تھے۔ اور آخر میں یہی کہنا پڑا کہ

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

اس فتویٰ کفر کا نتیجہ یہ ہوا کہ برصغیر پاک و ہند میں حنفی حضرات دو جماعتوں میں منقسم ہو گئے۔ ایک دیوبندی جماعت اور دوسری بریلوی جماعت۔ ان دونوں جماعتوں میں زیادہ تر اختلافات تو لفظی ہیں۔ جیسے بریلوی حضرات سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے عطائی علم غیب کے قائل ہیں۔ لیکن دیوبندی حضرات کہتے ہیں کہ

﴿قل لایعلم من فی السماوات والارض الغیب الا اللہ﴾

(النمل: ۶۵)

''آپ کہہ دیجئے کہ آسمانوں اور زمین کے غیب کو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حصر کے ساتھ علم غیب کو اپنی ذات کے لیے مخصوص فرمایا۔ اور علامہ ابن عابدین شامی نے لکھا ہے:

''غیب صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اگر بعض حضرات نے غیب کی باتیں جانیں تو وہ اللہ تعالیٰ کے بتلانے اور اطلاع دینے سے جانیں، اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ علم غیب رکھتے ہیں کیونکہ یہ ان کی کوئی ایسی صفت نہیں جس سے وہ مستقل طور پر کسی شی کو جان لیا کریں۔ اور یہ بات بھی ہے کہ انہوں نے اسے خود نہیں جانا بلکہ انہیں یہ باتیں بتلائی گئی ہیں۔''

(مجموعہ رسائل ابن عابدین شامی: جلد۲ ص ۳۱۳)

عالم الغیب ''یعنی حق تعالیٰ شانہ اپنے رسولوں کو غیب کی اطلاع دیتا ہے۔ اور یہ مسلمہ ہے کہ کل علم غیب کی اطلاع نہیں دیتا، لیکن جس قدر بھی انہیں علم دے دیا گیا، کم از کم اتنے حصے میں تو رسول اللہ ﷺ کا علم اللہ کے علم کے مماثل ہو گیا حالانکہ مخلوق کو کسی مرحلہ پر بھی خالق سے برابری میسر نہیں ورنہ مخلوق کی عبدیت اور خالق کی صمدیت ختم ہو جائے گی۔ اس اشکال کا حل بھی اسی کلمہ ''فلا یظہر'' سے کر دیا گیا کیونکہ تعلیم غیب کو ''اظہار غیب'' کے الفاظ سے بیان کیا، عطاء غیب کے لفظ سے بیان نہیں کیا تا کہ پتہ چل جائے کہ رسول کا یہ ''علم غیب'' ذاتی تو نہیں ہے لیکن ''عطائی'' بھی نہیں بلکہ صرف ''اطلاعی'' ہے کیونکہ عطاء کے معنی دے دینے کے ہیں اور دے دینے کی حقیقت کسی شی کو اپنے سے جدا کر کے دے دینے کی ہے، اور اپنے پاس رکھ کر اطلاع دینے کو ''عطا'' نہیں کہتے بلکہ صرف ''اطلاع'' کہتے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی ایک صفت ''معطی''، یعنی عطا کرنے والا بھی ہے، تو کیا عطائی علم غیب نہیں ہو سکتا۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ یہ درست ہے کہ حق تعالیٰ شانہ معطی ہیں مگر اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کی حد تک جو ذات کے اندر نہیں ہوتیں۔ خود اپنی ذات کے حق میں معطی نہیں کہ اپنی ذات دوسروں کو دے کر انہیں خدا بنا دیں۔ معلوم ہوا کہ اطلاعی علم حکایت علم ہے عین علم نہیں۔ عین علم اصل عالم کی ذات ہی میں قائم رہتا ہے، اور عطائی علم عین علم ہوتا ہے جو اصل عالم کی ذات سے جدا ہو جاتا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بریلوی حضرات جس کو عطائی علم غیب کہتے ہیں دیوبندی حضرات

کے ہاں اس کو ''اطلاع غیب'' کہتے ہیں کیونکہ ''علم غیب'' ہوتا ہی ذاتی ہے۔ عطائی یا اطلاعی کو علم غیب نہیں کہتے۔ اس چیز کو خود مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی نے بھی تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ ان کا ایک ملفوظ ہے:

''علم جب مطلق بولا جائے خصوصاً جب کہ غیب کی طرف مضاف ہو تو اس سے مراد علم ذاتی ہوتا ہے۔ اس کی تصریح حاشیہ کشاف میں میر سید شریف نے کر دی ہے اور یہ یقیناً برحق ہے۔''

(ملفوظات احمد رضا خان صاحب: ج ۳ ص ۳۴)

یہ علم غیب کی بات تو صرف جملہ معترضہ کے طور پر درمیان میں آ گئی تھی۔ بات یہ ہو رہی تھی کہ بعض بیرونی عناصر کی سازش سے فرقۂ احناف کے برصغیر پاک و ہند میں دو گروہ پیدا ہو گئے اور یہ اختلاف اس قدر بڑھا حالانکہ بڑھنے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ ایک فرقہ (بریلویوں) نے دوسرے فرقہ (دیوبندیوں) کو کافر کہنا شروع کر دیا، اور یہ اختلاف ابھی تک چل رہا ہے جو کہ ایک قابل افسوس بات ہے۔ بریلویوں نے یہ مشہور کر دیا کہ دیوبندی بھی وہابیوں کی ایک قسم ہے حالانکہ ان دونوں کے درمیان بہت فرق ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہابیوں نے اس اختلاف سے فائدہ اٹھایا اور ان کے گروہ میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا حالانکہ پورے ہندوستان میں سب سے پہلا وہابی سرسید احمد خان تھا اور دوسرا میاں نذیر حسین صاحب دہلویؒ۔ ان سے قبل نہ تو کوئی اپنے کو وہابی کہتا تھا اور نہ اہل حدیث اور سلفی کے نام سے اپنے کو یاد کرتا تھا بلکہ سب اپنے کو حنفی اہل سنت کہتے تھے۔

دارالعلوم دیوبند میں کئی لوگ ایسے تھے جنہوں نے 1857ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف باقاعدہ جنگ کی تھی جیسے کہ مولانا محمد منیر نانوتویؒ جو مولانا مملوک علی نانوتوی، مفتی صدرالدین آزردہؒ اور مولانا عبدالغنی محدثؒ کے شاگرد تھے، اور ان علماء میں ان کی ایک اہم شخصیت تھی جنہوں نے شاملی میں انگریزوں کے ساتھ دست بدست بڑی جرأت و ہمت کے ساتھ جنگ کی تھی۔

علاوہ ازیں سہارنپور اور مراد آباد میں دارالعلوم دیوبند کی دو برانچیں قائم کر دی

گئیں۔ سہارن پور میں مدرسہ مظاہر العلوم کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کے بانی حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ تھے جو مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے بہت قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ یہ 1823ء میں پیدا ہوئے اور 1885ء میں انتقال فرمایا۔ یہ بھی شاملی کی لڑائی ان حضرات کے شریک جنگ تھے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ چھپے رہے اور جب ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے عام معافی کا اعلان ہوا تو گوشۂ خمولت سے باہر آ کر بریلی کالج میں ملازمت اختیار کر لی اور وہاں 1861ء سے 1877ء یعنی سولہ سال پڑھاتے رہے۔ دارالعلوم دیوبند سے یہ 1884ء میں ریٹائرڈ ہوئے۔ سہارنپور کا مدرسہ بھی دارالعلوم دیوبند کے مدرسہ کی طرح دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتا رہا۔ یہ مدرسہ اگرچہ مولانا سعادت علی سہارن پوریؒ کی زیرنگرانی قائم کیا گیا تھا لیکن تین ماہ کے بعد 1866ء میں حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ کو مدرسہ کا شیخ الحدیث اور مہتمم مقرر کر دیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس کی بلڈنگ بھی تیار ہو گئی اور مدرسہ کا نام مظاہر العلوم رکھا گیا، اور جلدی ہی درس و تدریس میں اس مدرسہ کی شہرت پورے ہندوستان میں پھیل گئی اور اسلامی علوم کی ایک بہت بڑی تعلیمی درسگاہ کے طور پر علمی حلقوں میں اس کی شہرت ہو گئی اور ہندوستان کے ہر حصہ سے تشنگان علوم یہاں تحصیل علم کے لیے آنا شروع ہو گئے۔ اسی طرح دوسرا مدرسہ مراد آباد میں قائم ہوا۔ پھر چند ہی سالوں میں قریباً دیوبندی مکتب فکر کے چالیس مدرسے مختلف شہروں میں قائم ہو گئے۔ اگرچہ اس زمانہ میں باقاعدہ الحاق کا کوئی سلسلہ نہ تھا لیکن دیوبند کے فارغ التحصیل فضلاء ان مدارس میں درس و تدریس کے لیے مقرر ہوئے۔ ان مدارس کے اساتذہ کی تنخواہیں معمولی تھیں اور وہ ان مختصر تنخواہوں پر صبر و شکر سے اپنے تعلیمی فرائض انجام دیتے تھے لیکن ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ حکومت برطانیہ سے ان مدارس کے لیے کوئی مالی امداد نہیں لینی، اور حکومت تو ایک طرف رہی وہ کسی چندہ دینے والے کی بھی کسی قسم کی مداخلت مدارس کے انتظامی امور میں برداشت نہیں کرتے تھے کیونکہ اس سے طلبہ و اساتذہ کی آزادی میں فرق آتا تھا۔ اساتذہ نہایت محنت سے طلبہ کو پڑھاتے اور طلبہ بھی نہایت ذوق و شوق سے علم حاصل کرتے جس کی وجہ سے ان مدارس سے صرف کتابی کیڑے ہی پیدا نہیں ہوئے بلکہ

حضرت شیخ الہندؒ، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مفتی کفایت اللہؒ، حکیم الامت مولانا تھانویؒ، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ وغیرہم جیسے محقق اور دین و دنیا کے مسائل کو سمجھنے والے حضرات پیدا ہوئے جنہوں نے علمی اور غیر علمی دنیا میں اپنا نام پیدا کیا۔ ان حضرات نے عوام کو ایک نہایت عمدہ لیڈر شپ فراہم کی جنہوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں ایک نمایاں کردار ادا کیا جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور، مدرسہ شاہی مراد آباد اور اس مسلک کے جس قدر مدارس تھے یہ سب مسلک ولی اللہی کے تھے، لیکن ان کے مقابلہ میں سرسید احمد خان نے بھی چونکہ تحصیل علم شاہ ولی اللہ کے خاندان سے کی تھی، لہٰذا وہ بھی اپنے کو مسلک ولی اللہی کا نمائندہ کہتا تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کا نہ دینی مسلک یہ تھا اور نہ ہی سیاسی مسلک۔ سرسید نے 1875ء میں علی گڑھ کالج قائم کیا اور اس میں اپنی ساری زندگی وقف کر دی یہاں تک کہ 1920ء میں وہ یونیورسٹی بن گیا۔ وہ انگریزوں سے کچھ بہت ہی زیادہ متاثر تھا۔ چنانچہ 1857ء کی جنگ آزادی سے قبل اور بعد وہ ہر معاملہ میں ہندوستانیوں سے زیادہ انگریزوں کے حامی تھے، حتیٰ کہ قرآن و سنت کی نصوص کی بھی انہوں نے انگریزوں کے مقابلہ میں تاویلات شروع کر دیں۔ وہ یورپی طرز تعلیم کے زبردست حامی تھے۔ ان کا مقصد اس تعلیم سے کیا تھا اس کی ترجمانی ان کے رفیق خاص مولانا حالی نے ان الفاظ میں کی ہے ؏

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں

سرسید نے جب انگلستان سے واپس آکر دسمبر 1870ء میں تہذیب الاخلاق نکالنا شروع کیا تو انہوں نے اپنے پہلے پرچہ کے شروع میں لکھا: ”اس پرچہ کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس حقارت سے سویلائزڈ یعنی مہذب قومیں اُنہیں دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز اور مہذب قوم کہلائیں۔“

سرسید جب ترقی کا تصور کرتے تو ان کے ذہن میں ”زرق برق وردیاں پہنے کرنل اور میجر بنے ہوئے مسلمان نوجوان ہوتے تھے۔ ان کا منتہا مقصود ایسی تعلیم تھی جو

مسلمانوں کو اعلیٰ عہدوں تک پہنچا سکے۔ سرسید کی تہذیب کو مہدی افادی نے بجا طور پر اینگلو محمڈن کلچر کا نام دیا ہے۔

اس تقلیدی ذہنیت کا یہ نتیجہ تھا کہ ہمارے ان مصلحین کی ساری توجہ بس یورپ کی تہذیب اور یورپ کی زبان و ادب کے حصول پر لگی رہی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی جو مغربی قوموں کی ترقی کا اصل راز تھا، اس کو مسلمانوں کے اندر رائج کرنے کی زیادہ کوشش نہیں کی گئی۔ سرسید نے صراحتاً مسلمانوں کے لیے ٹیکنیکل ایجوکیشن کی مخالفت کی اور اعلیٰ درجہ کی دماغی تعلیم کو سب سے مقدم قرار دیا۔ یہی اس زمانے میں تعلیم جدید کے حامیوں کا عام نقطۂ نظر تھا۔ ان حضرات نے ساری توجہ صرف اس پر دی کہ ایسا گروہ پیدا ہو جائے جو مغربی تمدن اور یورپی ادب میں کمال حاصل کیے ہوئے ہو۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں ہماری کتاب ''اسلام کا نظام عدل'' ص ۳۶۔۳۸)

یہ ولی اللہی مسلک نہیں تھا۔ یہ سرسید اور اس کے حامی لوگوں نے مشہور کر دیا۔ پھر سرسید نے اپنے کو شاہ ولی اللہ کی طرف منسوب کر کے اپنے کو وہابی اور نیم چڑھا کہنا شروع کر دیا اور یہاں تک لکھا کہ سید میاں نذیر حسینؒ سے رفع یدین میں نے کروائی، سرسید مسلک ولی اللہی کا نمائندہ تو نہیں تھا البتہ ایک نئے مکتبۂ فکر کا بانی ضرور تھا۔ وہ نیا نظریہ فکر کیا تھا اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

البتہ سیاست میں علماء کے ہندوستان میں دو مکتبہ فکر ہو گئے۔ سرسید اور اس کے حامی علماء کا نظریہ یہ تھا کہ انگریزوں کی پوری وفاداری کی جائے اور ان کے ساتھ ہر معاملہ میں تعاون کا ہاتھ بڑھایا جائے۔ لیکن اس کے برعکس دیوبندی مکتبۂ فکر یہ تھا کہ انگریز مسلمانوں کی تہذیب، ان کی زبان، ان کے کلچر اور ان کے تمدن بلکہ پورے دین اسلام کو تاخت و تاراج کرنے والا اور قاتل ہے لہٰذا اس سے ملک کو آزاد ہونا چاہیے۔ ان کی زبان سیکھنے میں تو کوئی حرج نہیں۔ آخر ہم نے فارسی اور اردو زبان بھی سیکھی، یہ کون سی مسلمانوں کی زبانیں تھیں، لیکن جس طریقہ سے انگریز اپنی زبان سکھا رہا ہے اس طریقہ سے انگریزی زبان سیکھنے کے ساتھ ساتھ ایک مسلمان ذہنی طور پر انگریز بن جاتا ہے، لہٰذا انگریزی زبان پڑھنے میں تو کوئی حرج نہیں البتہ انگریز بننے میں مسلمانوں کے

لیے ضرر ہے۔ اور یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ انگریزوں نے اپنا نظام تعلیم اسی طرز پر بنایا تھا کہ اس کو پڑھنے والے ظاہری طور پر تو ہندوستانی نظر آئیں اور ذہنی اور باطنی طور پر وہ انگریز ہوں۔ وہی نظام تعلیم آج تک ہماری یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پڑھایا جاتا ہے جنہوں نے مردوں سے زیادہ عورتوں کو انگریزی رنگ میں ایسا رنگ دیا کہ عورت کی شرم و حیا جو اس کا ایک خاص وصف تھی وہ خود عورت سے منہ چھپاتی پھر رہی ہے، اور جو کچھ امریکہ اور یورپ میں ہو رہا ہے اس کی من و عن تقلید کی جا رہی ہے۔ اور ان کے لباس اور حرکات کو دیکھ کر سرکار دو عالم ﷺ کی وہ حدیث یاد آتی ہے جس میں آپ نے فرمایا تھا:

> "عنقریب میری امت میں کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو بہترین گدیوں والی سواریوں (یعنی بہترین کاروں) پر سوار ہو کر مسجدوں کے دروازوں پر اتریں گے۔ ان کی عورتیں کپڑے پہنے ہوں گی لیکن ننگی ہوں گی۔ ان کے سروں پر کمزور بختی اونٹوں کی طرح جوڑے ہوں گے۔ تم ان پر لعنت بھیجو کیونکہ وہ عورتیں ملعون ہیں۔ اگر تمہارے بعد کوئی اور امت ہوتی تو تمہاری یہ عورتیں ان کی عورتوں کی خدمت کرتیں جیسے پہلی امتوں کی عورتیں تمہاری خدمت کرتی ہیں۔"

(مسند امام احمد بن حنبل: جلد ۱۲ ص ۳۶ و اسنادہ صحیح، مستدرک حاکم: جلد ۴ ص ۴۳۶)

دیوبندی مسلک کے علماء کی نگاہ انگریزوں کے ان مظالم پر تھی جو جنگ آزادی 1857ء کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں پر کیے۔ یہ مظالم اتنے شرم ناک اور ہولناک تھے جن کی نظیر وحشی قوموں اور جاہل سے جاہل ملکوں میں بھی نہیں ملتی۔ توپوں کے منہ پر باندھ گولے سے اڑا دینا، ہاتھی کے پیر سے باندھ کر کچلوا دینا، زندہ آدمی کو لوہے کی گرم سلاخوں سے داغ کر آگ میں جلانا وغیرہ وغیرہ معمولی باتیں تھیں۔ ان کی آئے روز کی ناانصافیوں کو دیکھ کر بھی لوگوں میں آزادیٔ وطن کے لیے کھڑے ہونے کی ہمت نہ رہی تھی۔ اگرچہ ہر سمجھ دار، غیرت مند اور شریف النفس ہندوستانی اور بالخصوص مسلمان کے دل میں آزادی کی چنگاری بھڑکتی رہتی تھی، مگر خوف و ہراس کے تسلط کی بنا پر

کسی قسم کی ظاہری کاروائی کام میں لانا ان کی طاقت اور قدرت کے احاطہ سے باہر تھا۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ کچھ مسلمان جن پر خصوصی طور پر محبت قوم و وطن اور دین کا غلبہ تھا، ان انسانیت سوز مظالم کے باوجود سر ہتھیلی پر رکھ کر خفیہ کاروائیاں کرتے تھے جن کا تذکرہ ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ اور جن کی وجہ سے انگریزوں کو سرحد میں بار بار جنگی مہمات 1868ء تک جاری کرنی پڑیں اور متعدد مقدمات ہندوستان کی عدالتوں میں چلائے جن میں انبالہ کا مشہور مقدمہ بھی ہے۔ انہیں جیسے مسلمانوں کے متعلق 16 فروری 1877ء میں ولیم میور لیفٹیننٹ گورنر نے کہا تھا:

> ''لوگوں کی یہ عادت ہے کہ وہ مسلمانوں کو بے جان اور کمزور بیان کرتے ہیں۔ شاید ایسا ہو مگر بہت سے شکاریوں کو خطرہ برداشت کرنے کے بعد یہ بات معلوم ہوگئی ہے کہ اگر کسی عالی نسب شیر پر زخم لگایا جائے گا تو گو وہ کیسا ہی ضعیف اور ناتواں بلکہ قریب المرگ ہی کیوں نہ ہو مگر پھر بھی اپنی اصلی حرارت کے ساتھ ایک مرتبہ جست لگائے گا اور چاروں طرف ہلاکت اور تہلکہ مچا دے گا۔''
>
> (روح روشن مستقبل: ص۲۲)

بہرحال عام پبلک بالخصوص مسلمان انتہائی درجہ میں خائف اور ہراساں ہو گئے تھے۔ چونکہ سب کا یہی خیال تھا کہ آزادی بجز تشدد اور قتل و قتال کے حاصل نہیں ہو سکتی، اس وجہ سے ہر ایک چہرہ پر مایوسی اور قنوطیت کے آثار تھے، کوئی دم مارنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ کانگرس کے اجلاس اول کے بعد لوگوں کی سمجھ میں آیا کہ آزادی حاصل کرنے کی دوسری صورت بھی ہے۔ اس لیے لوگ جوق در جوق کانگرس میں شامل ہونے شروع ہوئے کیونکہ اس میں اطمینان تھا کہ انگریزوں کو اپنی وحشت، درندگی اور بربریت کا موقع ہاتھ نہیں آئے گا، اور ہم آزادی کی دیوی کو حاصل کر سکیں گے۔ چنانچہ 1886ء میں جب کانگرس کا دوسرا اجلاس کلکتہ میں دادا بھائی نوروجی کی صدارت میں ہوا تو ممبروں کی تعداد 78 سے بڑھ کر ایک ہی سال میں 436 ہوگئی جس میں مسلمان ممبران کی تعداد صرف 33 تھی۔ پھر جب 1887ء میں اس کا تیسرا اجلاس مدراس میں زیر

صدارت بدرالدین طیب جی منعقد ہوا تو اس وقت اراکین کی تعداد 604 تھی جن میں مسلمان 83 تھے۔ کانگرس کی اس بڑھتی ہوئی حالت کی مقبولیت کو دیکھ کر ممکن نہ تھا کہ مستبد اور سیاہ دل انگریزوں کے دماغ ماؤف نہ ہوں اور سینہ و دل میں رعشہ اور کپکپاہٹ پیدا نہ ہو۔ اس صورت حال کو دیکھ کر مسٹر بیک پرنسپل علی گڑھ کالج اور دوسرے انگریزوں کو انتہائی بے چینی اور پریشانی لاحق ہوئی۔ اس پریشانی اور بے چینی میں انگریزوں کے ساتھ سرسید احمد خان اور ان کے کچھ ہم خیال علماء بھی شامل تھے۔ چنانچہ انہوں نے انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن (Indian Patriotic Association) کی بنیاد ڈالی۔ اس انجمن کی طرف سے کانگرس کی مخالفت میں آرٹیکل بار بار شائع کیے گئے۔ مختلف مقامات پر سفر کیے اور تقریریں کیں۔ کہا جاتا ہے کہ سرسید پر اس قدر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ انتہائی درجہ کانگرس کے مخالف ہو گئے اور وہ مسلمانوں پر کانگرس میں داخل نہ ہونے کے لیے مختلف قسم کے دباؤ ڈالنے لگے۔ اور یہ بھی انہیں تاکید کرنے لگے کہ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن میں مسلمانوں کی شرکت فرض اور ضروری ہے اور کانگرس میں شامل ہونا مسلمانوں کے لیے سم قاتل اور زہر ہلاہل ہے۔ انہوں نے چند علماء کو اپنا خیال بنا کر ایک فتویٰ بھی شائع کرایا۔ جس کی رو سے مسلمانوں کے لیے کانگرس میں شرکت حرام قرار دی گئی اور پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی شرکت فرض قرار دی گئی۔ یہ تمام معاملہ 1888ء سے پرزور طریقہ پر جاری ہوا۔ اس پر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمود الحسن اور دوسرے مدرسین دارالعلوم دیوبند اور بہت سے علمائے حقانی نے اس فتویٰ کی پرزور مخالفت کی اور کانگرس میں شرکت کی حمایت کی۔ اس سلسلہ میں پیش پیش علمائے لدھیانہ مولانا محمد صاحب اور ان کے دو بھائی مولانا عبداللہ اور مولانا عبدالعزیز مرحومین تھے۔ انہوں نے برصغیر پاک و ہند کے اطراف و جوانب سے فتاویٰ منگوائے اور ان تمام فتوؤں کو ایک رسالہ ''نصرۃ الابرار'' میں جمع کیا، اور خود زوردار دلائل کے ساتھ کانگرس میں شرکت کا جواز اور انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن میں شرکت کا عدم جواز ثابت کیا۔ چنانچہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کا فتویٰ اسی رسالہ ''نصرۃ الابرار'' صفحہ ۱۹۔۲۰ اور ص ۲۶ میں اور حضرت شیخ الہند اور دیگر علمائے دیوبند کے فتاویٰ

اسی رسالہ نصرۃ الابرار میں درج ہیں، اور حضرت مولانا محمد صاحب اور ان کے دونوں بھائیوں کے تفصیلی فتوے بھی اسی رسالہ نصرۃ الابرار میں مذکور ہیں۔ اس رسالہ میں قریباً سو علمائے کرام کے فتاویٰ درج کیے گئے ہیں۔

انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن میں مسٹر بیگ اور ان کے ہم نواؤں کی جدوجہد سے ہندو امراء اور رؤساء اور تعلق دار بھی شریک ہوئے تھے، لیکن ہندو رؤساء اور امراء جلد سمجھ گئے کہ یہ جال ہندوستانیوں کو ہمیشہ غلام رکھنے کے لیے بچھایا گیا ہے۔ اس لیے وہ رفتہ رفتہ اس ایسوسی ایشن سے نکل گئے، لیکن مسلمان سرسید احمد خان اور مسٹر بیگ کی جادو اثر باتوں کی بنا پر بالکل نہ سمجھ سکے۔ مسٹر بیگ نے جب دیکھا کہ ایسوسی ایشن سے ہندو بالکل نکل گئے ہیں تو انہوں نے دسمبر 1893ء میں ایک اور انجمن مسلمانوں اور انگریزوں پر مشتمل بنائی اور اس کا نام ''محمڈن اینگلو اورینٹل ایسوسی ایشن (Mohammadan Anglo Oriental Assosiation) رکھا اور پہلی انجمن پیٹریاٹک کو ختم کر دیا۔ اس نئی ایسوسی ایشن کے مقاصد حسب ذیل تھے:

1- مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت۔
2- مسلمانوں کو سیاسی شورش پھیلانے سے روکنا۔
3- سلطنت برطانیہ کے استحکام کی تدابیر کرنا۔
4- لوگوں میں برطانیہ کی وفاداری کے جذبات پیدا کرنا۔

اس انجمن کے سیکرٹری خود مسٹر بیگ تھے اور تفرقہ اندازی، مسلمانوں کو بزدل بنانے، ان میں انگریزوں کی غلامی کی زوردار اسپرٹ پیدا کرنے اور کانگرس سے علیحدگی بلکہ دشمنی رکھنے کے کھیل خوب کھل کر کھیلے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں رفتہ رفتہ مستقل طور پر مایوسی چھا گئی، اور خصوصی طور پر تعلیم یافتہ مسلمان جو کہ ان انجمنوں کے ارکان اور جوشیلے ممبر تھے، یہ دیکھ کر کہ کانگرس دن بدن کامیابی کی طرف رواں دواں ہے، امتحانات مقابلہ رک نہیں سکتے، کونسلوں کی توسیع ہوتی جاتی ہے اور دوسرے امور میں بھی کانگرس کی آواز کچھ نہ کچھ اثر انداز ہو رہی ہے، ان کے دماغ معطل اور ان کے قلوب ضعیف اور ان کے قویٰ مضمحل ہو گئے۔ سرسید احمد خان 1898ء میں اور مسٹر بیگ 2 دسمبر 1899ء میں

اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس کے بعد مسٹر ماریسن علی گڑھ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ انہوں نے وہاں کی سیاست میں بھی قائم مقامی کی۔ 1900ء میں لیفٹینینٹ گورنر یو۔ پی مسٹر میکڈانلڈ نے اردو ہندی کا ایک نیا جھگڑا پیدا کیا جس سے ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ اور منتشر کر دیا گیا اور تشتت و افتراق کا زہر پورے ملک میں پھیلا دیا گیا۔ مسٹر ماریسن نے یہ دوسری انجمن محمڈن اینگلو اورئینٹل بھی دفن کر دی۔ اردو ہندی تنازعہ میں نواب مہدی علی خان محسن الملک کو سخت زک اٹھانا پڑی۔ اب 1901ء میں محمڈن پولیٹیکل آرگنائزیشن (Mohammadan Political Orgination) بنائی گئی جس کی وجہ سے نواب وقار الملک کو بہت زیادہ تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد تقسیم بنگال کا واقعہ پیش آیا جس نے مسلمانوں کو بالکل بے دم کر دیا۔

سر سید احمد خان، مسٹر بیک اور دیگر انگریزوں کی ان کاروائیوں اور پالیسیوں کا اثر انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ پر اس قدر برا پڑا کہ مسلمان سیاسیات میں ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ گئے جس کا احساس مسلمانوں کو بہت بعد میں ہو۔ اسی زہریلی پالیسی کے تحت 1906ء میں مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس کی تفصیل روح روشن مستقبل میں دی گئی ہے۔

سر سید کی خدمات:

سر سید احمد نے مختلف قسم کی جو قربانیاں اور جدوجہد کی وہ نہ تو نظر انداز کی جاسکتی ہے اور نہ ہی فراموش کی جا سکتی ہے، لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس کی یہ ساری جدوجہد اور جفاکشی انگریز کے نقطۂ نظر کے عین مطابق تھی۔ انگریز یہی چاہتا تھا کہ میرے وفاشعار اور وفادار لوگ یہی کچھ کریں جو سر سید نے کیا۔ اس لحاظ سے سر سید کو فریب خوردہ عقل مند کہا جا سکتا ہے۔

یہ بات درست ہے کہ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کے مقدر میں تباہی و بربادی تھی۔ حکومت ان کی ختم ہو گئی، صنعت اُن کی برباد ہوئی، املاک اور جائدادیں ان کی ضبط ہوئیں، تختہ دار پر وہ چڑھائے گئے اور سرکاری زبان کے بجائے دفاتر کی زبان انگریزی قرار دی گئی۔ اور جس طرح آج حکومت کا سربراہ علماء اور محدثین

وفقہاء کو جاہل اور دقیانوس کہہ رہا ہے صرف اس وجہ سے کہ وہ انگریزی نہیں جانتے کیونکہ آج کل کے ارباب اقتدار کے ہاں تعلیم یافتہ ہونے کا معیار انگریزی سے آشنا ہونا ہے۔ اسی طرح اس زمانہ میں بھی بڑے سے بڑے محدث، اعلیٰ سے اعلیٰ فقیہ اور مفتی، بڑے سے بڑے ادیب، بہترین فلسفی اور کامل ترین محاسب اور ریاضی دان اور علم نجوم کے ماہر کی قدر انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے ایک دیہاتی جاہل سے زیادہ نہ رہی تھی۔ مسلمانوں کو مشتعل کرنے والی تمام چیزوں کو نظام تعلیم کا جزو بنا دیا گیا جس طرح آج نظام تعلیم سے اسلامی تعلیم کی بہترین چیزوں جیسے جہاد کی آیات وغیرہ نکالی جارہی ہیں۔ ان کو ملازمتوں سے محروم کیا جا رہا تھا۔ اس زمانہ میں مسلمان مفکرین اور مدبرین نے بالاتفاق اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ انگریزی حکومت کا قائم کیا ہوا نظام مسلمانوں کی ضرورت کو پورا نہیں کرسکتا کیونکہ یہ اسلامی کلچر اور تہذیب کے لیے تباہ کن اور ان کے عقائد پر نہایت برا اثر ڈالتا ہے۔ لیکن تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے دو خیال تھے:

ایک یہ کہ حکومت سے نظام تعلیم کی اصلاح کا مطالبہ کیا جائے اور مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کا ذمہ دار حکومت ہی کو قرار دیا جائے کیونکہ انگریزی حکومت جو روپیہ تعلیم پر خرچ کرتی ہے اس سے صرف ہندو ہی فائدہ نہ اٹھائیں بلکہ مسلمان بھی اس سے پوری طرح مستفید ہوں۔

دوسری رائے اس بارے میں یہ تھی کہ تعلیمی نظام مسلمان اپنی ذمہ داری پر قائم کریں اور حکومت سے صرف امداد حاصل کرتے رہیں۔ سرسید احمد خان کی رائے یہ تھی۔ طریق تعلیم پر بحث شروع ہوئی تو مسلمانوں کی بدقسمتی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ سرسید کی رائے تھی کہ مسلمان انگریزی معاشرت اور کلچر اختیار کرلیں تاکہ انگریزوں کی نظر میں وہ عزت حاصل کرلیں۔ چنانچہ سید طفیل احمد منگلوری نے لکھا ہے کہ

> ”مسلمانوں کو ذلت سے نکالنے کے لیے سرسید نے دو طریقے اختیار کیے۔ اول اصلاح معاشرت اور دوسرے اصلاح مذہب۔“
>
> اصلاح معاشرت کے لیے سرسید نے 1857ء کے بعد ہی سے انگریزی تمدن اختیار کرلیا تھا اور انگریزوں کے ساتھ کھانا پینا

شروع کر دیا تھا جو ہندو مسلمانوں کو نا گوار تھا مگر انگلستان سے لوٹ کر سرسید نے یہ اضافہ کیا کہ اس کام کی باقاعدہ تبلیغ شروع کر دی۔ یہی طریقہ ترکوں نے بھی اپنے ملک میں جاری کیا تھا، اس لیے سرسید کو اپنے خیالات میں بہت تقویت ہوتی تھی۔ چنانچہ آپ نے تہذیب اخلاق میں لکھا:

"ترکوں کا تمام لباس بجز ٹوپیوں کے بالکل یورپین ہے۔ سب نے زمین پر بیٹھنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ میز و کرسی پر بیٹھتے ہیں۔ میز پر چھری کانٹوں سے کھانا کھاتے ہیں۔ ان کے مکان کی آراستگی اور طریقہ بالکل یورپین کا سا ہے۔ جب ترک اپنی ہمسایہ قوموں فرنچ اور انگریزوں میں مل کر بیٹھتے ہیں تو ہم جولی معلوم ہوتے ہیں، اور امید ہے کہ روز بروز اور زیادہ مہذب ہوتے جائیں گے۔ پس ہندوستان کے مسلمانوں سے بھی ہم یہی کہتے ہیں کہ اپنے تعصّبات اور خیالات خام کو چھوڑ دیں اور تربیت و شائستگی میں قدم بڑھائیں۔"

(روشن مستقبل: ص ۳۰۴۔۳۰۵)

اس بارے میں مزید یہ لکھا گیا ہے کہ

"مندرجہ بالا نظریے کے مطابق عیسائیوں کے ساتھ کھانے پینے میں چونکہ ان کا ذبیحہ مانع تھا اس لیے سرسید نے مسلمانوں کے لیے گردن مروڑی مرغی کا کھانا آیات اور احادیث سے جائز قرار دیا۔ جوتا پہن کر نماز پڑھنا عام طور پر معیوب تھا۔ کھڑے ہو کر پیشاب کرنا اور داڑھی منڈوانا گناہ سمجھا جاتا تھا، ان سب چیزوں کے جواز کو سرسید نے مذہب سے ثابت کرنے کی کوشش کی۔"

(روشن مستقبل: ص ۳۰۷)

اپنی تفسیر میں بھی سرسید نے وہی خیالات لوگوں کے سامنے پیش کیے جن کا ان کے معاصر مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی کتابوں میں اظہار کیا تھا۔ خیالات کے لحاظ سے

سرسید اور مرزا غلام احمد قادیانی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ فرق تھا تو وہ یہ تھا کہ مرزا غلام احمد نے انگریزوں کی ضرورت پورا کرنے کے لیے نبوت کا دعویٰ کیا اور سرسید نے دعویٰ تو نہ کیا لیکن بڑے دھڑلے سے اپنے کو وہابی اور نیم چڑھا کہتا تھا۔

علماء اسلام نے سرسید کے یہ خیالات جب سنے اور پڑھے تو انہوں نے سرسید کو تنبیہ کی، لیکن سرسید کے ذہن میں علماء کی یہ بات کب داخل ہو سکتی تھی کیونکہ جو سر انگریزوں کی چوکھٹوں پر رگڑا جائے اور جو زبان انگریزوں کے قصیدوں اور مدح سرائیوں میں رطب اللسان ہو وہ کب علماء کی تنبیہات سن سکتا ہے۔ چنانچہ سرسید نے بھی مرزا غلام احمد کی طرح علماء کو مغلظات سنائیں، احادیث کو غیر قابل اعتبار اور تمام قدیم مفسرین کو لغو اور بیہودہ قرار دیا بلکہ انہیں علمائے یہود کا مقلد تک کہا گیا۔ اور خود اپنے متعلق یہ کہا کہ ہمارے سوا تمام مفسرین اور علمائے متقدمین فلاں آیت کے معنی الٹے سمجھے مگر ان کی ہمیں کوئی پروا نہیں۔ (ملاحظہ ہو سرسید کی تفسیر قرآن: جلد۲ ص ۷۹، ص ۱۰۰، جلد۴ ص ۱۷ وغیرہ)

مختصر یہ کہ سرسید کی ساری جدوجہد صرف اس نقطہ پر منحصر ہوگئی کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ انگریزی تربیت بھی ہو۔ جس کے لیے انہوں نے اپنی تمام قوتیں صرف کر دیں۔ حتیٰ کہ اسی میں ان کی موت واقع ہوئی۔ علمائے دیوبند اور بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بھی انگریزی تعلیم پر آمادہ تھے، لیکن ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ اسلامی تعلیمات اور تربیت کا انتظام ہونا چاہیے۔ یعنی انگریزی زبان کو صرف زبان تک رکھا جائے اس کو روح کی پہنائیوں میں نہ اتارا جائے اور نہ ہی اعمال و جوارح میں اسے سرایت کرنے دیا جائے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اسلامی تربیت ہو۔

اس بارے میں سرسید کا نظریہ وہی تھا جو لارڈ میکالے کا تھا کہ

> ”ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو، اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔“

لارڈ میکالے کے اسی تصور تعلیم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے علی گڑھ کالج کا قیام عمل میں لایا گیا۔ چنانچہ سرسید کا بیان ہے:

> ''اصلی مقصد اس کالج کا یہ ہے کہ مسلمانوں میں عموماً اور بالتخصیص اعلیٰ درجہ کے مسلمان خاندانوں میں یورپین سائینسز اور لٹریچر کو رواج دے اور ایک ایسا فرقہ پیدا کرے جو از روئے مذہب کے مسلمان اور از روئے خون اور رنگ کے ہندوستانی ہوں مگر باعتبار مذاق اور رائے اور فہم کے انگریز ہوں۔''

(ایڈریس اور اسپیچیں (متعلقہ ایم اے او کالج) مرتبہ محسن الملک دیباچہ: ص۲)



دارالعلوم دیوبند کا قیام

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بتایا گیا ہے کہ ملکی حالات کو دیکھ کر چھ بزرگوں نے باہم مل کر ایک دینی مدرسہ کے قیام کا منصوبہ بنایا۔اس مدرسہ کے قیام کی وجہ وہ ملکی حالات تھے جو اس وقت مسلمانوں کو درپیش تھے۔ایک عجیب کیفیت تھی جو اہل اسلام پر طاری تھی۔انقلاب کی تباہ کاریوں نے ان کو پیس ڈالا تھے۔ ہزاروں خاندان تھے جو جاہ و جلال کی بلندیوں سے گر کر تباہی و بربادی کی پستیوں میں گر چکے تھے۔ان کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ ہندوستان کے طول وعرض میں عیسائی اور مسلم نما پادری رینگتے پھر رہے تھے۔شاہ عالم کے معاہدہ کے برخلاف حکومت کی زبان انگریزی قرار دے کر عربی اور فارسی کے تمام مدارس اور مکاتب کو گویا فنا کے گھاٹ اتار دیا گیا۔مسلمانان ہند ایک عجیب مصیبت و تباہی میں مبتلا تھے۔اسلام کے دشمن اگر چہ اسلام کو فنا کر دینے کا فیصلہ کر چکے تھے،لیکن کچھ ایسے اللہ والے بھی تھے جن کے ذریعہ اسلام اپنا اعجاز دکھانا چاہ رہا تھا اور وہ ایک نئی زندگی کے لیے مچل رہا تھا۔انہی پاک باز لوگوں کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے اور انہی کی پیشانیاں سربسجود ہوئیں۔انہی کی دعائے نیم شبی جس میں آنسوؤں کی آمیزش تھی،کی وجہ سے لطف الٰہی کا ترشح ہوا جس نے ایک مدرسہ کی شکل اختیار کر لی۔محض توکل الٰہی پر یہ مدرسہ قائم کیا گیا جو مسلمانوں کو مسلمان اور اسلام کو اپنی حقیقت کے ساتھ باقی رکھ سکے۔ایک طرف حکومت انگریزی اسکول،کالج اور یونیورسٹیاں بنا کر لوگوں کو اس میں ترغیب وتحریص دے رہی تھی،اسکے مقابلہ میں ایک مدرسہ کا قیام نہایت مشکل تھا کیوں کہ زمانے کا انقلاب،طبائع کا تغیر اور انگریز کا اقتدار ایسے مدارس کو نفرت کی نگاہ

سے دیکھتا تھا جس طرح کہ آج کل دیکھا جا رہا ہے۔لیکن ان پاک باز اللہ والوں نے تحفظ ملت اور بقائے دین کی خاطر ہر قسم کی قربانی، فاقہ اور ایثار کو قبول کر لیا اور حضرت شاہ ولی اللہ کے جانشینوں نے سرزمین دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا۔اس مدرسہ کے کچھ ہی عرصہ بعد سہارنپور میں مدرسہ مظاہر العلوم اور مراد آباد میں مدرسہ قاسم العلوم قائم کیا گیا،لیکن دیوبند کے مدرسہ نے مرکزیت کی شان حاصل کر لی۔اور وہ شہرت اور عظمت حاصل کی جو ہندوستان میں آج تک کسی اور مدرسہ کو حاصل نہیں ہوسکی یہاں تک کہ جامع ازہر، جامعہ نظامیہ اور قرطبہ اور غرناطہ کی یونیورسٹیوں کو بھی یہ شہرت اور معراج حاصل نہ ہوسکی حالانکہ ان کا قیام اور بقا حکومت کے خزانوں کا مرہون منت تھا۔حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ نے اس کے اصول و مقاصد ترتیب دیئے جو رسالہ القاسم کے دارالعلوم نمبر مجریہ 1347ھ میں شائع ہوئے۔ یہی اصول و مقاصد ہر دیوبندی مکتب فکر کے مدرسہ کے ہیں۔

دارالعلوم کے لیے کتنے لوگوں نے دعائے نیم شبی میں حصہ لیا، اس کا تو علم نہیں البتہ ایک واقعہ کتابوں میں مذکور ہے کہ دارالعلوم کے قیام کے بعد دارالعلوم کے سب سے پہلے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ جب حج بیت اللہ کے لیے مکہ مکرمہ حاضر ہوئے تو وہاں وہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے، اس کے لیے دعا فرمائیں، حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا:

> ''سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں کہ ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے، یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقات سحر میں سربسجود ہوکر بارگاہ خداوندی میں گڑگڑاتی رہیں کہ خداوندا! ہندوستان میں بقائے اسلام اور تحفظ دین کا کوئی ذریعہ پیدا فرما۔ یہ مدرسہ ان ہی دعائے نیم شبی اور سحر گاہی سجود کا ثمرہ ہے۔ یہ دیوبند کی قسمت ہے کہ اس دولت گراں قدر کو یہ سرزمین لے اڑی۔''

یہ مدرسہ سہارن پورہ شہر سے جنوبی جانب 22 میل کے فاصلہ پر اور دہلی سے

شمال مشرقی جانب قریباً 90 میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس قصبہ کی آبادی قریباً تیس ہزار ہے جس میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ مسلمانوں میں ایک تہائی سے زیادہ حصہ سادات اور شیوخ کا آباد ہے۔ یہاں قدیم زمانہ ہی سے مسجدوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ شہر کے مسلمانوں کی کل آبادی اٹھارہ ہزار ہے اور مسجدوں کی تعداد ایک سو سے بھی زائد ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے محلے الگ الگ ہیں۔ دیوبند کے ریلوے اسٹیشن سے ایک سڑک بازار میں سے گزرتی ہوئی جامع مسجد تک پہنچتی ہے۔ اس سڑک کے ایک جانب مسلمانوں کی آبادی ہے تو دوسری جانب ہندوؤں کی۔ مسلم آبادی میں ہندوؤں کے مکانات دو چار سے زیادہ نہیں البتہ ہندو آبادی میں مسلمانوں کے کئی محلے آباد ہیں۔ شہر کے سادات اور شیوخ قصبہ کے سربرآوردہ خاندان ہیں جو پہلے مال و دولت میں دوسروں پر فوقیت رکھتے ہیں لیکن اب انقلاب زمانہ کی وجہ سے ان کی حالت ناگفتنی ہے۔

دیوبند میں اسلامی علوم کے مدرسہ کے لیے قیام کا تخیل سب سے پہلے حضرت حاجی سید عابد حسین صاحبؒ کے ذہن میں آیا۔ آپ نے دیوبند کے دوسرے بزرگ حضرت مولانا مہتاب علیؒ جو حضرت شیخ الہند کے تایا تھے، سے مشورہ کیا۔ ان دونوں بزرگوں کے مشورہ کے بعد ایک مکتب کے قیام کی تحریک کی گئی۔ چندہ کے لیے جس نے سب سے پہلے رومال پھیلایا اور جس نے سب سے پہلے اس رومال میں چندہ کی رقم رکھی وہ بھی حضرت سید حاجی عابد حسینؒ ہی تھے۔ ان پاک باز اور پاک باطن بزرگوں کی ایک جماعت نے نہایت خلوص کے ساتھ ایک مکتب کی بنیاد رکھی لیکن جس مقدس ہستی نے اس معمولی مکتب کو ایک عظیم الشان انقلابی دارالعلوم کی شکل دی وہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ذات گرامی تھی۔

دارالعلوم دیوبند 15 محرم الحرام 1283ھ مطابق 30 مئی 1866ء بروز بدھ سرزمین ہندوستان میں دیوبند کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی جس کی شاخیں بعد میں برصغیر پاک و ہند میں ہزاروں کی تعداد میں قائم ہوئیں۔ چند بزرگوں نے تھوڑا سا چندہ اکٹھا کیا اور مسجد چھتہ کے فرش پر انار کے درخت کی ٹہنیوں کے سایہ میں ایک مدرسہ کا افتتاح ہوا۔ 9 محرم الحرام کو ایک اشتہار کے ذریعہ مدرسہ کے قیام

کا اعلان کیا گیا جس میں یہ بھی بتایا گیا کہ اس وقت تک چار سو ایک روپیہ آٹھ آنے چندہ جمع ہو چکا ہے اور سولہ طالب علموں کی خوراک وغیرہ کا بندوبست کیا گیا ہے، اور جیسے جیسے چندہ میں اضافہ ہوتا جائے گا طلبہ کو سہولتیں مہیا کر دی جائیں گی۔

دیوبند کے سب سے پہلے مدرس ملا محمود تھے جن کی تنخواہ پندرہ روپے ماہانہ تھی۔ علم ان کا نہایت مضبوط اور جید تھا چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ان کے بارے میں یہ شعر کہے ہیں جن سے ان کی علمی ثقاہت اور پختگی کا پتہ چلتا ہے ؎

در حدیث و فقہ و تفسیر و اصول
شہرت کامل بدارد در فہول
زیلعی و لوذعی دریائے علم
منبع خلق و تواضع، کان علم
برزبانش ہست مضمون کتاب
ہست تقریرش چو بارندہ سحاب

اور دارالعلوم کے سب سے پہلے شاگرد بھی محمود تھے یعنی مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ سب سے پہلے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ تھے جو حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے صاحبزادے اور مولانا خلیل احمد صاحب انبٹھویؒ کے ماموں تھے۔

سب سے پہلے مہتمم حضرت مولانا حاجی سید عابد حسین تھے، لیکن ڈیڑھ سال کے بعد وہ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تو ان کی جگہ حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ کو اہتمام کا منصب سپرد کیا گیا مولانا رفیع الدین اکابر اولیاء اللہ میں سے تھے اور مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی قدس سرہ آپ کے خلیفہ تھے۔

سب سے پہلا دورۂ حدیث 1289ء میں شروع ہوا، اور اس دورہ میں سب سے پہلے مندرجہ ذیل حضرات فارغ التحصیل ہوئے۔

(1) حضرت مولانا محمود الحسن شیخ الہندؒ
(2) حضرت مولانا عبدالحق صاحب ساکن پور قاضی
(3) حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ

(4) حضرت مولانا فتح محمد صاحب تھانویؒ

(5) حضرت مولانا عبداللہ صاحب جلال آبادیؒ

اہل قصبہ نے مدرسہ، طلبہ اور کارکنان مدرسہ کے ساتھ انتہائی خلوص کے ساتھ برتاؤ کیا لیکن اہل قصبہ میں سے بہت کم لوگ تحصیل علم کے لیے مدرسہ میں داخل ہوئے۔ چنانچہ جلسۂ دستار فضیلت میں جو 19 ذی قعدہ 1290ھ مطابق 8 جنوری 1874ء کو ہوا تھا اور جلسہ میں دیوبند کے اطراف و جوانب سے بہت سے علماء اور مشائخ تشریف لائے۔ اس میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ نے ایک تقریر فرمائی جس میں آپ نے اہل قصبہ کی اس کوتاہی کی طرف اشارہ فرمایا:

> ”دور دراز سے لوگ آئے اور اس دولت (علم کی دولت) کو لوٹ لے گئے پر یہاں کے باشندے ویسے ہی خالی دامن پڑے رہے۔ ہائے افسوس! اس مدرسہ کی خبر جس کے باعث دیوبند کا نام چار کھونٹ عالم میں پہنچ جائے دیوبند والوں کے کان میں نہ پہنچے۔ ہند کے چند طالب علم جو شوق علم سے مکہ معظّمہ میں پڑھتے تھے، دیوبند کے مدرسہ کا چرچا سن کر گرتے پڑتے مدرسہ دیوبند میں آ پہنچے، مگر کیا حسرت کی بات ہے کہ دیوبند والوں سے مدرسہ تک نہ پہنچا گیا۔ اطراف و جوانب کے لوگ شوق تماشا میں مدرسہ دیوبند کو آ کر دیکھیں، مگر دیوبند کے طالب علم کبھی بھولے بسرے بھی ادھر کو نہ نکلیں۔“ (رسالہ القاسم، دیوبند، محرم ۱۳۴۷ھ ص ۶۵)

مدرسہ کی ابتداء تو مسجد چھتہ سے ہوئی اس کے بعد قاضی کی مسجد میں اور کرایہ کے مکانات میں رہا، لیکن طلبہ کی کثرت نے بانیان مدرسہ کو مجبور کر دیا کہ مدرسہ کے لیے ایک مستقل عمارت تعمیر کی جائے۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ مدرسہ کسی فراخ اور کھلی جگہ پر اور شہر کے کنارے پر ہونا چاہیے، اور جگہ اتنی ہو کہ بوقت ضرورت اس میں اضافہ بھی ہو سکے، نیز مدرسہ اور مسجد کا باہمی مناقشہ نہ ہو۔ سب حضرات نے شہر کی مختلف جگہوں کو دیکھا بالآخر مدرسہ کی موجودہ جگہ حضرت حجۃ الاسلام مولانا قاسم نانوتویؒ کو پسند آئی۔ 2 ذی

الحجہ 1292ھ مطابق 30 دسمبر 1875ء جمعہ کے روز جامع مسجد میں شہری اور بیرونی حضرات کا بہت بڑا اجتماع ہوا جس میں شرکت کے لیے مراد آباد، علی گڑھ اور دہلی وغیرہ سے بہت سے لوگ تشریف لائے۔ حجۃ الاسلام قدس سرہ نے ایک تقریر فرمائی اور آخر میں یہ اعلان فرمایا کہ مسجد میں موجود سب حضرات تشریف لے چلیں تاکہ مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھا جائے۔ اب یہ فیصلہ ہونا تھا کہ مدرسہ کی پہلی اینٹ کون رکھے حضرت مولانا محمد قاسمؒ اگرچہ اس سلسلہ کے روحِ رواں تھے، لیکن وہ اس قسم کے ہر امتیازی معاملہ میں ہمیشہ پیچھے رہتے تھے۔ انہوں نے جگہ کی رجسٹری بھی حضرت حاجی صاحبؒ کے نام کرائی تھی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ مدرسہ کی پہلی اینٹ حضرت میاں جی منے شاہ صاحب رکھیں گے۔ (حضرت منے شاہ صاحبؒ حضرت میاں اصغر حسین شاہ صاحبؒ نے نانا اور مادر زاد ولی تھے۔ نہایت متقی و پرہیز گار، زہد و تقویٰ کی زندہ تصویر۔) پھر حاجی عابد حسین شاہ صاحبؒ اور ان کے بعد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اینٹ رکھیں گے۔ چنانچہ اسی طرح اینٹیں رکھوائی گئیں۔ پھر سب کے ساتھ بعد میں حضرت حجۃ الاسلامؒ نے اینٹ رکھی۔ حضرت مولانا محمد قاسمؒ نے اس مبارک بنیاد کو قندیل معلق سے تشبیہ دی جو توکل علی اللہ کی سنہری زنجیر میں آویزاں ہے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے والد ماجد حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانیؒ نے جو اس مدرسہ کے بانیوں میں سے تھے، اس بات کو ان اشعار میں بیان فرمایا ہے ؎

اس کے بانی کی وصیت ہے کہ جب اس کے لیے
کوئی سرمایہ بھروسے کا ذرا ہو جائے گا
پھر یہ قندیل معلق اور توکل کا چراغ
یہ سمجھ لینا کہ بے نور و ضیا ہو جائے گا
ہے توکل پر بنا اس کی تو بس اس کا معین
اک اگر جائے گا، پیدا دوسرے ہو جائے گا

دارالعلوم دیوبند کی پہلی مجلس شوریٰ حسب ذیل ارکان پر مشتمل تھی۔

1- حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

2- حضرت حاجی عابد حسین صاحبؒ
3- حضرت مولانا مہتاب علی صاحب دیوبندی
4- حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی
5- حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانیؒ
6- شیخ نہال احمد صاحب دیوبندیؒ
7- منشی فضل حق صاحب دیوبندیؒ

1291ھ میں مدرسہ کی دوسری مجلس شوریٰ حسب ذیل ارکان پر مشتمل تھی:

1- حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
2- حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ
3- حضرت مولانا حاجی عابد حسین صاحبؒ
4- حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ
5- حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانی
6- منشی فضل حق صاحب دیوبندیؒ



کانگرس کا قیام اور علمائے اسلام

انگریزوں کے ایک فرد مسٹر اے او ہیوم پنشنر ہندوستان کی سیاسی راہ نمائی کے لیے کھڑے ہوئے اور وہ ہندوستان کی تمام چھوٹی بڑی جماعتوں سے خط و کتابت کرتے رہے، حتیٰ کہ دسمبر 1884ء میں تھیوسیفیکل سوسائٹی پونا کے جلسہ میں یہ طے ہوا کہ آئندہ سال کے ماہِ دسمبر میں کانگرس کا پہلا جلسہ طلب کیا جائے۔ جلسہ کے ابتدائی امور طے کر کے مسٹر ہیوم وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن کے پاس چند تجاویز لے کر گئے جن کی غرض و غایت یہ تھی کہ ہندوستانیوں کے لیے اصلاح رسوم اور اصلاح تمدن کے لیے ایک انجمن قائم کی جائے لیکن لارڈ ڈفرن نے انہیں یہ مشورہ دیا:

> ''اس ملک میں ایسے لوگوں کی کوئی جماعت نہیں ہے جو مثل انگلستان کے بطور ملک معظم کی مخالف جماعت (حزب اختلاف) کے کام کرتی ہو۔ چونکہ انگریزوں کو یہ علم نہیں کہ ہندوستان میں ان کی پالیسی کی نسبت کیا خیالات ہیں۔ حاکم اور محکوم دونوں کے لیے یہ مفید ہوتا ہے کہ ہندوستان کے سیاست دان اصحاب سالانہ جمع ہو کر گورنمنٹ کو یہ بتائیں کہ ان کا انتظام کن امور میں ناقص ہے اور اس کی حالت کس طرح بہتر کی جاسکتی ہے۔'' (روشن مستقبل: ص ۲۵۶)

یہ مشورہ دیتے وقت لارڈ ڈفرن نے مسٹر ہیوم کو یہ تاکید کی تھی کہ جب تک وہ وائسرائے ہیں، ان کے اس مشورے کا کسی سے اظہار نہ کیا جائے۔ چنانچہ ان کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد یہ بات روشنی میں آئی۔ لارڈ ڈفرن سے اس مشورہ

کے بعد مسٹر ہیوم انگلستان گئے اور وہاں پارلیمنٹ کے کئی ممبران سے اس بارے میں گفتگو کی اور ان سے ہمدردی اور اعانت کا وعدہ لیا اور پھر دسمبر 1885ء میں بمبئی میں کانگرس کا پہلا اجلاس بلایا جس میں مختلف صوبوں اور مختلف سیاسی جماعتوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں مندرجہ ذیل تجاویز پاس ہوئیں۔

1- ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے ان سب کو متحد اور متفق کر کے ایک قوم بنانا۔

2- اس طرح جو ہندوستانی قوم پیدا ہو اس کی دماغی، اخلاقی اور سیاسی صلاحیتوں کو دوبارہ زندہ کرنا۔

3- ایسے حالات کی اصلاح و ترمیم کرانا جو ہندوستان کے لیے مضرت رساں اور غیر منصفانہ ہوں۔ اور اس طرح ہندوستان اور انگلستان کے درمیان اتحاد و یگانگت کو مضبوط اور استوار کرنا۔

کانگرس کی پہلی دو تجاویز انگریزوں کے خلاف تھیں لہٰذا انہیں پسند نہ آئیں۔ چنانچہ انگریزوں کی طرف سے اس کی مخالفت شروع ہوئی۔ چونکہ انگریزوں نے کانگرس کی مخالفت کی لہٰذا سرسید نے بھی انگریزوں سے زیادہ زور شور سے کانگرس کی مخالفت کی۔ مسلمانوں میں کانگرس کے خلاف جذبات کا رخ موڑنے کی پوری پوری کوشش کی گئی اور انہیں ہندو سے نفرت دلائی گئی۔ مسلمانوں کو انگریزوں کے وجود کو سایۂ رحمت بتا کر ان کی وفاداری اور اطاعت کا درس دیا گیا۔

کانگرس کی حمایت و مخالفت:

جونہی کانگرس قائم ہوئی۔ ہندوستانیوں میں دو گروہ بن گئے۔ کچھ علمائے کرام اس کی حمایت میں تھے اور کچھ زبردست مخالفت کر رہے تھے۔ مخالفت کرنے والوں میں سرسید اور اس کا گروہ تھا۔ سرسید نے جو آج تک متحدہ قومیت کا حامی تھا۔ چنانچہ سفر پنجاب میں ہندوؤں کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا تھا:

''آپ نے جو لفظ اپنے لیے ہندو کا استعمال کیا ہے وہ میری رائے

میں درست نہیں کیونکہ ہندو میری رائے میں کسی مذہب کا نام نہیں
ہے بلکہ ہر ایک شخص ہندوستان کا رہنے والا اپنے تئیں ہندو کہہ سکتا
ہے۔ پس مجھے نہایت افسوس ہے کہ آپ مجھ کو باوجود اس کے کہ
میں ہندوستان کا رہنے والا ہوں، ہندو نہیں سمجھتے۔''

(سفر نامۂ پنجاب، سرسید: ص ۱۲۹، روشن مستقبل: ص ۲۷۰)

ایک اور موقع پر سرسید نے کہا:

''قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔''

(روشن مستقبل: ص ۲۶۹)

اس طرح کئی مواقع پر سرسید نے صاف لفظوں میں اقرار کیا کہ ہندوستان کی تمام قومیں خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتی ہوں وطن کے لحاظ سے ایک قوم ہیں کیونکہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ یہ تو سرسید کا اصل عقیدہ تھا، لیکن جب دیکھا کہ انگریز کانگرس کی مخالفت کر رہا ہے کیونکہ کانگرس کو اگرچہ انگریزوں (مسٹر ہیوم اور لارڈ ڈفرن) نے بنایا تھا لیکن انہوں نے جس مقصد کے لیے کانگرس کو بنایا تھا کانگرس ان کا وہ مقصد پورا نہیں کر سکی بلکہ وہ آزادیٔ وطن کے لیے دل و جان سے کوشاں تھی۔ اس وجہ سے انگریز اور ان کے ساتھ سرسید اور ان کا گروہ کانگرس کا سخت مخالف ہو گیا بلکہ انگریزوں سے بھی دو قدم آگے ہو گیا۔ مسلمانوں کو کانگرس سے بدظن کرنے اور ان کو کانگرس میں شمولیت سے روکنے کے لیے اب سرسید اور اس کے ساتھیوں نے دو قومی نظریہ کو ہوا دینی شروع کی اور اس طریقہ سے مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف اکسایا۔ ہندو مسلم اتحاد اور اتفاق ہی وہ نقطہ تھا جس پر کانگرس اور انگریز کا مقابلہ شروع ہو گیا کیونکہ کانگرس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے ان سب کو متفق و متحد کر کے ایک قوم بنایا جائے اور اس طرح متحدہ طور پر انگریزوں سے آزادی حاصل کی جائے۔ اور انگریزی حکومت کا بنیادی نظریہ یہ تھا۔

''ہندوستان میں ہماری حکومت کے ہر صیغہ کو خواہ وہ خارجی
تعلقات سے واسطہ رکھتا ہو یا عدالتی نظم و نسق سے، یہ اصول ہمیشہ

مدنظر رکھنا چاہیے کہ تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو۔"

(حکومت خود اختیاری: ص ۵۲)

سرسید نے متحدہ قومیت کے مسئلہ کو خوب اچھالا حالانکہ وہ خود اس کا بڑی شدت سے قائل تھا (جیسا کہ بتایا گیا ہے) اور مسلمانوں کو کانگرس سے علیحدہ رکھنے میں کامیاب کوشش کی۔ اپنے ہم خیال علماء سے اس بارے میں فتوے بھی لیے۔ ہندو سے نفرت دلائی گئی اور انگریزوں کی وفاشعاری کا درس دیا گیا اور مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح اس کے وجود کو سایۂ رحمت قرار دیا گیا۔

اب جب کانگرس کی مخالفت میں سرسید اور ان کے حواری علماء کی جدوجہد نے طول اور شدت اختیار کی تو مولانا سعد الدین صاحب کشمیری اور مولانا امان اللہ صاحب کشمیری نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے بارے میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے استفسار کیا۔ ان کے جواب میں حضرت گنگوہی نے ایک مبسوط اور مدلل فتویٰ فارسی زبان میں تحریر فرمایا جس کی اشاعت کانگرس کی وزارتوں سے قبل ناممکن رہی۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ سے قبل حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ صاف اور صریح الفاظ میں دے چکے تھے اور اس کے لیے جہاد کا لائحہ عمل اور پروگرام بنا چکے تھے۔ امام ربانی حضرت گنگوہیؒ نے سات صفحات پر مشتمل ایک مفصل اور مدلل فتویٰ دیا اور نتیجہ کے طور پر فرمایا:

"اکنوں حال ہندرا خود غور فرمائند کہ اجرائے احکام کفار نصاریٰ دریں جا بچہ قوت و غلبہ است۔ اگر ادنیٰ کلکٹر حکم کرد کہ در مساجد جماعت اوانکنید ہیچ کس از امیر و غریب قدرت ندارد کہ ادائے آں نماید۔"

یعنی اب ہندوستان کی حالت پر آپ خود غور فرمائیں کہ اس جگہ کفار نصاریٰ کے احکام کا اجراء کس قوت اور غلبہ کے ساتھ ہے۔ اگر ایک ادنی کلکٹر حکم کر دے کہ مسجدوں میں جماعت سے نماز ادا نہ کریں تو کسی بھی امیر یا غریب کی مجال نہیں کہ مسجد میں جماعت

سے نماز ادا کر سکے۔

آپ نے اس فتویٰ میں مزید یہ فرمایا:

> ''بہر حال کافروں کا تسلط ہندوستان پر اس درجہ ہے کہ کسی وقت بھی کفار کا کسی دارالحرب پر اس سے زیادہ غلبہ نہیں ہوتا اور جو اسلامی رسومات اور شعائر مسلمان یہاں اس حکومت میں ادا کرتے ہیں وہ صرف ان کی اجازت سے ادا کرتے ہیں۔ کوئی رعایا مسلمانوں سے زیادہ عاجز اور درماندہ نہیں ہے۔ ہندوؤں کو بھی کسی قدر رسوخ حاصل ہے مسلمانوں کو وہ بھی نہیں۔''

اسی اثناء میں قریباً 1889ء میں انڈین نیشنل کانگرس کے وجود میں آنے سے کچھ عرصہ بعد ہندوستان کے علماء کے سامنے تین سوال پیش کیے گئے:

1- ہندوؤں کے ساتھ دنیوی معاملات میں شریک ہونا درست ہے یا نہیں؟

2- ایک قومی جماعت انڈین نیشنل کانگرس کے نام سے جو ہندوستان کے ہندو اور مسلمان دونوں کے لیے رفع تکالیف اور جلب منافع دنیوی چند سال سے قائم ہوئی ہے، اور ان کا اصل اصول یہ ہے کہ بحث انہیں امور میں ہو جو ہندوستان کی کل جماعتوں پر مؤثر ہوں، اور ایسے امور کی بحث سے گریز کیا جائے جو کسی ملت یا مذہب کو مضر ہوں یا خلاف سرکار ہوں۔ تو ایسی جماعت میں شریک ہونا درست ہے یا نہیں؟

3- سید احمد خان نے جو ایک جماعت (ایسوسی ایشن) قائم کی ہے اور لوگوں کو بذریعہ اعلان مطبوعہ 8 اگست 1888ء یوں ترغیب دے رہا ہے کہ میری جماعت میں بڑے بڑے ہندو ذی وجاہت مثل راجہ بنارس وغیرہ جو کانگرس کے برخلاف ہیں شامل ہیں۔ ہر شخص جو داخل ہو پانچ پانچ روپیہ چندہ ماہواری میرے نام علی گڑھ میں یا بنارس میں راجہ صاحب کے نام روانہ کیا کرے وغیرہ وغیرہ۔ اور اس کی مدد کے واسطے جابجا ایسوسی ایشن انجمن اسلامیہ کے نام سے لوگوں نے شہروں میں قائم کی ہیں۔ جو شخص ان کے ساتھ اتفاق کرنے سے

برخلاف معلوم ہوتا ہے اس کے ساتھ طرح طرح کا فساد اور فتنہ برپا کر کے اس کو جبراً ملانا چاہتے ہیں۔ آیا ایسی جماعت میں مسلمانوں کو شامل ہونا اور ان کی مدد کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اور نیچری لوگ بدخواہ اسلام ہیں یا نہیں؟

امام ربانی حضرت گنگوہیؒ نے تینوں سوالوں کے جواب میں ارشاد فرمایا:

اگر ہندو مسلمان باہم شراکت بیع و شراء اور تجارت میں کر لیں اس طرح کہ اس میں کوئی نقصان دین میں یا خلاف شرع معاملہ کرنا اور سود اور بیع فاسد کا قصہ پیش نہ آئے جائز ہے اور مباح ہے۔ مگر سرسید احمد سے تعلق نہ رکھنا چاہیے اگرچہ وہ خیر خواہی قوم کا نام لیتا ہے یا واقع میں خیر خواہ ہو، مگر اس کی شرکت مآل کار اسلام اور مسلمانوں دونوں کے لیے سم قاتل ہے۔ ایسا میٹھا زہر پلاتا ہے کہ آدمی ہرگز نہیں بچتا۔ پس اس کے شریک مت ہونا اور ہنود سے شرکت معاملہ کر لینا۔ اور اگر ہنود کی شرکت سے اور معاملہ سے بھی کوئی خلاف شرع امر لازم آتا ہے یا مسلمانوں کی ذلت یا اہانت اور ہنود کی ترقی ہوتی ہے، وہ کام بھی حرام ہے جیسا کہ اوپر لکھا گیا۔ اسی طرح پر ہے اور بس۔ (نصرۃ الابرار ۲۶ محرم الحرام ۱۴۰۶ھ ص ۱۹)

☆ ☆ ☆

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ

امام ربانی حضرت گنگوہی قدس سرہ کے بعد دیوبندی علماء میں جس شخصیت کا نمبر آتا ہے اور جس نے ملکی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، وہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن قدس سرہ ہیں۔ آپ علماء دیوبند میں ایک نہایت اہم شخصیت ہیں اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے نہایت برگزیدہ روحانی فرزند تھے۔ آپ 1268ھ میں بریلی میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد ماجد حضرت مولانا ذوالفقار علی ملازمت کے سلسلہ میں مقیم تھے۔ (تذکرۃ الخلیل ص ۱۱۱) ان کو شروع ہی سے حضرت حجۃ الاسلامؒ کے سپرد کر دیا گیا تھا چنانچہ انہی کے تلمذ سے دارالعلوم دیوبند کا افتتاح ہوا تھا۔ یہی وہ محمود ہیں جن کے استاذ کا نام بھی محمود تھا گویا کہ ''نام بھی محمود تیرا کام بھی محمود ہے، صبح بھی محمود تیری شام بھی محمود ہے۔''

ان دو محمودوں کی وجہ سے مدرسہ بھی محمود ہوا۔ آپ نے اولاً حضرت حجۃ الاسلام کے فیوض و علوم سے اپنے سینہ کو معمور کیا پھر سینہ رشیدی سے فیوض و برکات حاصل کیے۔ گویا یہ ہستی قاسمی اور رشیدی آفتابوں کا ماہ کامل بن کر نہ صرف ہندوستان کے مطلع پر بلکہ دنیا کے ہر ملک کی آزادی کے مطلع پر چمکی اور اسلام کے علوم و فیوض سے لوگوں کے سینوں کو منور کیا۔

1290ھ مطابق 1873ء میں آپ تحصیل علوم سے فارغ ہوئے اور پھر دارالعلوم دیوبند ہی میں تدریس میں مصروف ہو گئے۔ 1874ء میں آپ معین المدرسین بلا تنخواہ مقرر ہوئے اور پھر 1875ء میں باضابطہ مدرس چہارم مجلس شوریٰ کی طرف سے

مقرر ہوئے اور پندرہ روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی (القاسم، دیوبند محرم ۱۳۴۷ھ ص ۴۹) پھر 1889ء مطابق 1307ھ میں آپ صدر مدرس مقرر ہوئے۔ آپ حدیث وتفسیر اور دوسرے تمام علوم پر ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ہیئت اور علم ریاضی میں آپ ایک اجتہادی شان کے مالک تھے۔ آپ نے 1914ء تک دارالعلوم میں علمی اور تدریسی خدمات انجام دیں۔ پھر آپ نے تحریک دارالعلوم کے اصلی منشاء ومقصد کے حصول کے لیے تگ و دو شروع کر دی۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ دارالعلوم دیوبند صرف ایک دینی مدرسہ ہی نہیں بلکہ ایک تحریک ہے جو 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ نے شروع کی تھی۔ حضرت شیخ الہندؒ چونکہ حضرت نانوتویؒ کے شاگرد خاص اور ہم راز رفیق تھے، اس وجہ سے اپنے عہد صدارت میں حالات کے نشیب وفراز کو دیکھ کر اس تحریک کا آغاز کیا۔ چنانچہ آپ کے تلامذہ میں سے اکثر حضرات نہ صرف تدریسی عالم تھے بلکہ علمی اور عملی طور پر میدان سیاست کے بھی تابندہ ستارے تھے۔ جہاں تک میں نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے حضرت امام ابوحنیفہ قدس سرہ کے بعد تاریخ میں صرف حضرت مولانا محمود حسنؒ ہی ایک ایسی شخصیت ہیں جنہوں نے اتنی کثیر تعداد میں اتنے قابل شاگرد پیدا کیے۔ آپ کا ہر شاگرد آسمان علم کا ایک چمکتا ستارہ تھا۔ پھر ہر ستارے نے اپنے گرد ایک کہکشاں بنائی یعنی نہایت قابل شاگرد پیدا کیے۔ آپ کے تلامذہ میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں:

1- امام العصر شیخ المحدثین علامہ سید انور شاہ کشمیری قدس سرہ (م مئی 1934ء)

2- شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ (م 5 دسمبر 1957ء)

3- حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ (م 1943ء)

4- بطل حریت علامۂ جلیل حضرت مولانا عبیداللہ سندھی قدس سرہ (م 1944ء)

5- ابوحنیفۂ وقت حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب قدس سرہ (م 1952ء)

6- فخر الہند حضرت علامہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی قدس سرہ (م 1929ء)

7- شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی قدس سرہ (م 1949ء)

8- مجاہد جلیل مولانا محمد میاں عرف مولانا منصور انصاری قدس سرہ (م1946ء)

9- حضرت علامہ مولانا اعزاز علی صاحب امروہوی قدس سرہ (م1955ء)

10- استاذ الکل فی الکل حضرت مولانا رسول خان صاحب ہزاروی قدس سرہ

11- حضرت علامہ مولانا غلام رسول صاحب ہزاروی قدس سرہ

12- حضرت علامہ سید فخر الدین احمد صاحب شیخ الحدیث مدرسہ شاہی مرادآباد قدس سرہ (م1972ء)

13- مفسر قرآن حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری قدس سرہ (م1962ء)

14- حضرت علامہ مولانا عبدالسمیع صاحب دیوبندی قدس سرہ (م1947ء)

15- حضرت علامہ حافظ محمد احمد بن حجۃ الاسلام قدس سرہ

16- حضرت مولانا محمد صادق صاحب کھڈہ، کراچی قدس سرہ

17- حضرت مولانا عزیر گل صاحب رفیق اسارت مالٹا قدس سرہ

18- حضرت علامہ مولانا عبدالرحیم صاحب پوپلزئی قدس سرہ

19- حضرت مولانا علامہ عبدالوہاب صاحب دربھنگہ قدس سرہ

20- حضرت مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی قدس سرہ

ان کے علاوہ آپ کے اور بہت سے تلامذہ ہیں جو اگرچہ سیاست میں تو شامل نہ ہوئے لیکن علمی زندگی میں وہ آسمان شہرت کے نیر تاباں تھے۔

آپ نے اپنی تدریس زندگی میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور مختلف کتابیں اور بعض کتابوں کے حواشی لکھے جن میں حاشیہ ابوداؤد، حاشیہ مختصر المعانی ہیں۔ آپ نے بخاری کے ابواب و تراجم بھی لکھے اور دوسری تصنیفات میں ایضاح الادلہ آپ کی بہت اعلیٰ کتاب ہے۔ لیکن ان سب تصانیف کے علاوہ آپ کی سب سے آخری تالیفی محنت کا ثمرہ قرآن حکیم کا وہ الہامی ترجمہ ہے جس کو ہندوستان کے قریباً تمام علماء نے مستند اور بے نظیر تسلیم کیا ہے۔

15 اپریل 1880ء میں حجۃ الاسلام حضرۃ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اس دار فانی سے دار باقی کو انتقال فرما گئے۔ آپ کی وفات کے پانچ سال بعد انڈین نیشنل کانگرس

برطانیہ کی ایک وفادار جماعت کی حیثیت سے وجود میں آئی۔ اہل ہند کی بے چینی اور ذہنی پریشانی نے انگریز مدبرین کو کانگرس کے قیام پر مجبور کیا، لیکن حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان، روحانی اولاد اور جانشینوں کے دل بھی اسی سوز و اضطراب کے شمع دان بنے ہوئے تھے۔ لیکن وہ کیا کریں یہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ 1880ء میں حضرت شیخ الہندؒ اور آپ کے ساتھیوں نے دارالعلوم دیوبند کے حامیوں اور بہی خواہوں پر مشتمل ایک جماعت بنائی تھی جس کا نام انہوں نے ''ثمرہ التربیت'' رکھا۔ اس جماعت نے ایک عرصہ تک کام کیا لیکن پھر وہ کچھ سست پڑ گئی اور اس کی کاروائیاں کمزور اور مضمحل ہو گئیں۔ چنانچہ 1880ء مطابق 1297ھ سے تیس سال بعد ایک دوسرے نام سے اس جماعت کا احیاء عمل میں آیا۔

''ثمرہ التربیت'' (تربیت کا پھل) کا نام خود ایک پروگرام اور لائحہ عمل کا پتہ دیتا ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آزادی وطن کے لیے تمام انقلابی جماعتوں سے پیشتر علمائے اسلام نے ایک بنیاد قائم کر دی تھی، اس لیے کہ یہ جمعیت کانگرس کے قیام سے پانچ سال قبل قائم کی گئی تھی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد حکومت میں افغانستان ہندوستان کا ایک جزو اور حصہ تھا۔ انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں اس کو حصہ بنانا چاہا لیکن ناکام رہے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ کی جدوجہد نے ہندوستانی اور سرحدی مجاہدین میں ایک رابطہ اور تعلق قائم کر دیا جو 1864ء تک یعنی ثمرۃ التربیت کے قیام کے قریباً پندرہ سال پیشتر تک نہایت مضبوطی کے ساتھ قائم رہا۔ انبالہ اور پٹنہ کے مقدمات کے بعد امداد رسانی کا وہ تعلق ختم ہو گیا لیکن مجاہدین کا رابطہ ختم نہ ہوا اور ہندوستانی مجاہدین سرحدی علاقوں میں باقی رہے۔ دارالعلوم دیوبند نے اس رابطہ کو استادی اور شاگردی کی شکل میں تبدیل کر دیا جو پہلے سے زیادہ مضبوط اور مستحکم ہو گیا خصوصاً جب کہ حضرت شیخ الہندؒ جیسا مذہبی اور سیاسی مقتدا نہ صرف استاذ ہو بلکہ شیخ اور پیر بھی ہو، جس کے ہاتھ پر نہ صرف سلوک اور طریقت کی بیعت کی جاتی ہو بلکہ جہاد کی بیعت بھی کی جاتی ہو۔

حضرت شیخ الہند قدس سرہ کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی خوبیوں اور صفات سے نوازا

تھا اور پھر اپنے اساتذہ اورشیوخ کی دعائیں بھی ان کے شامل حال تھیں۔ انہوں نے اپنی اس تحریک کے استحکام اور تقویت کے لیے یہ ضروری سمجھا اور ضروری تھا بھی کہ ہندوستان کے مسلمان ایک نقطہ پر متحد و متفق ہو جائیں۔ اس خلوص اور مبارک جذبے کے تحت انہوں نے اس وقت کے مسلمان لیڈروں حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد کو اپنے اس مشن کی دعوت دی جو انہوں نے قبول کر لی اور وہ سارے حضرت شیخ الہندؒ کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ پھر یہ بھی کوشش کی گئی کہ سرسید نے علوم مشرقیہ اور علوم مغربیہ میں جو بُعد پیدا کیا تھا، اس کو ختم کر کے اس وقت کی دونوں عظیم الشان یونیورسٹیوں میں ''دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ'' مسلمانوں کے مفاد کے لیے یہ بُعد ختم کر کے ان میں آئینی اتحاد و اتفاق کا رابطہ قائم ہو جائے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی یہ تحریک نہ صرف مسلمانوں کے لیے تھی بلکہ ہندوستان کے تمام باشندوں کے لیے تھی، چنانچہ حضرتؒ نے راجہ مہندر پرتاپ اور ان کی پارٹی سے اسی نظریہ کے تحت رابطہ کیا اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔

پہلی جنگ عظیم سے قبل یعنی 1907ء اور 1908ء عیسوی کا زمانہ ایک نہایت ہنگامہ خیز زمانہ تھا۔ اس زمانہ میں ہر جگہ لوگ کسی تبدیلی کے خواہاں تھے۔ وہ منتظر تھے کہ اس تحریک کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ یہ دور حضرت شیخ الہندؒ کی جماعت کے لیے ایک حیات بخش دور تھا۔ آپ تو گذشتہ 27-28 برس سے خفیہ طور پر اس کی منصوبہ بندی فرما رہے تھے۔ لیکن اب حالات نے کچھ ایسی انگڑائی لی کہ 27 رمضان المبارک 1327ھ مطابق 12 اکتوبر 1909ء کو اس منصوبہ کو منظر عام پر لانے کا تہیہ کیا گیا۔ چنانچہ اس مقصد کی انجام دہی کے لیے آپ نے جمعیۃ الانصار کے نام سے ایک ہمہ گیر نظام کا خاکہ مرتب کیا جس کی مقبولیت بھی ہمہ گیر ہوئی۔

جلسۂ دستار بندی:

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ دارالعلوم دیوبند ایک مدرسہ نہیں تھا بلکہ ایک تحریک تھی اور اسی تحریکی مقصد کے لیے حضرت حجۃ الاسلامؒ نے اس کو قائم کیا تھا۔ اس وجہ سے

حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے اس ہمہ گیر نظام کے خاکہ کو عوام تک پہنچانے سے قبل مناسب سمجھا کہ سب سے پہلے اس کو خالص دینی پیرایہ میں ظاہر کیا جائے جو اس زمانہ کی سیاست کے لحاظ سے ایک نہایت مبصرانہ اور مدبرانہ اقدام تھا۔ چنانچہ 1910ء مطابق 1328ھ میں دارالعلوم میں دستار بندی کے نام سے ایک عظیم الشان جلسہ کیا گیا جس میں برصغیر پاک و ہند کے اطراف و اکناف سے قریباً تیس (30) ہزار مسلمانوں نے شرکت کی اور علماء کی بھی ایک بہت بڑی تعداد اس میں موجود تھی۔ اتنی بڑی تعداد کا ایک چھوٹے سے قصبہ میں آنا پھر اس کے انتظام و طعام کا بندوبست کرنا نہایت مشکل کام تھا، لیکن جب نیتوں میں خلوص کی آبیاری ہو تو اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال ہو کر معاملہ کو آسان سے آسان تر بنا دیتی ہے۔ چنانچہ اس تیس ہزار کے اجتماع پر کھانے وغیرہ کا خرچ نہایت قلیل تھا جس کو حضرتؒ کی کرامت کہا جا سکتا ہے۔ لکھا ہے کہ پورے اجتماع کو صرف دو اڑھائی سو میں کھانا کھلا دیا جاتا تھا۔ نہ کوئی شور و شغب اور نہ بدنظمی و بدانتظامی۔ یہ اجتماع اس زمانہ میں اکٹھا ہو جانا بھی حضرتؒ کی کرامت تھی وگرنہ اتنا بڑا اجتماع اس سے قبل کسی جماعت کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ تین روز کا جلسہ تھا اور تینوں روز کسی شخص کو کوئی تکلیف نہیں اٹھانا پڑی۔ پھر اس جلسہ میں ہر مکتب فکر اور ہر طبقہ اور ہر خیال کے علماء اور زعماء نے شرکت فرمائی۔ اسی جلسہ میں صاحبزادہ آفتاب احمد خان نے تجویز پیش کی کہ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل طلبہ انگریزی پڑھنے کے لیے علی گڑھ جایا کریں اور علیگڑھ کے گریجوایٹ حضرات عربی اور علم دین پڑھنے کے لیے دیوبند آیا کریں۔ یہ تجویز نہایت خوش آئند اور مبارک خیال کی گئی، اگرچہ اس کا نتیجہ اور ثمرہ نہایت تلخ نکلا۔ وہ یہ کہ پہلی مرتبہ جو طلبہ علی گڑھ سے عربی اور دینی علوم پڑھنے کے لیے دیوبند آئے وہ انگریز کے سی آئی ڈی کے آدمی تھے جنہوں نے حضرت شیخ الہندؒ کو گرفتار کرانے میں وطن دوستی، قوم پروری اور اسلامی برادری کا حق ادا کر کے سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی کا عہدہ حاصل کر لیا۔

علی گڑھ سے جو حضرات دیوبند عربی پڑھنے کے لیے آئے ان میں ایک شخص انیس احمد بھی تھا۔ یہ ریشمی رومال سازش کیس میں استغاثے کے ساتھ ملزمان میں انیسواں آدمی تھا۔ یہ نام اس طرح آیا ہے ''انیس احمد بی اے لیبر ادریس احمد اسسٹنٹ

سیکرٹری، اینگلو اورئینٹل کالج، علیگڑھ۔ اس کے علاوہ سازش کیس کے مقدمہ میں کئی حوالوں سے متعدد مقامات پر اس کا نام آیا ہے۔ جمعیۃ الانصار سے تعلق رکھنے والوں میں پانچواں نام اس کا ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے ساتھ نکالے جانے والوں میں دوسرا شخص یہی ہے۔ مولانا سندھیؒ کے درس قرآن کو انہوں نے ''تعلیم القرآن'' اور ''کلید قرآن'' کے نام سے دو کتابوں میں مرتب کیا تھا اور مقدمہ کے دوران تفتیش کنندگان کو پیش کیے تھے۔ استغاثہ کی دفعہ 18 میں ہے۔

> ''عبیداللہ نے قرآن کی خاص تفسیر وتشریح بنائی، وہ جہاد کی فرضیت کے بارے میں تھی۔ بتایا کہ اس موضوع پر عبیداللہ کی تعلیمات کو انیس احمد نے تعلیم قرآن اور کلید قرآن نام کی دو کتابوں میں 1914، 1915ء میں تعیین وصراحت کے ساتھ ساتھ بیان کیا ہے۔''
>
> (صوبہ جات متحدہ: ص ۲۶۷)

1914-15ء میں وہ نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی میں پڑھتے تھے۔ استغاثے کی اگلی دفعہ 19 میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔

> ''انیس احمد اور احمد علی دونوں نظارت سے تنخواہ پاتے تھے۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ قانون کے مطابق ان کتابوں کے نسخے حکومت کو پیش کیے بغیر ہی ان کی تقسیم شروع کر دی گئی۔''

اس بیان سے اشارہ ملتا ہے کہ یہ دونوں کتابیں شائع بھی کی گئی تھیں اور اس سے پہلے صاحبزادہ آفتاب احمد خان کی تجویز کے مطابق دارالعلوم دیوبند میں داخلے کے سلسلہ میں بایں الفاظ انیس احمد کا نام آیا ہے۔

> ''عبیداللہ نے انگریزی تعلیم پاتے ہوئے لوگوں مثلاً انیس احمد بی اے، خواجہ عبدالحی اور قاضی ضیاء الدین بی اے کو مدرسے میں داخل کیا۔ ان پر سیاسی رنگ چڑھا ہوا تھا۔ ان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اعتدال پسند مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔''
>
> (استغاثے کی دفعہ ۸: ص ۲۶۱)

تحریک شیخ الہند کے ایک حاشیے سے معلوم ہوتا ہے کہ انیس احمد نے سی آئی ڈی یا پولیس حکام کے سامنے کوئی بیان بھی دیا تھا۔ ایک خاص توجہ طلب بات یہ ہے کہ استغاثے کی دفعہ 82 میں مقدمہ کی کاروائی میں شمولیت یا استغاثے کے ملزمان کی فہرست سے انیس احمد کا نام خارج کر دیا گیا تھا، حال آں کہ وہ حیات تھے، پولیس کی دسترس میں تھے۔ وہ اندرون یا بیرون ملک نظر بند نہیں تھے، انہوں نے فرار اختیار نہیں کیا تھا، ان کا شمار سلطانی گواہوں میں بھی نہیں کیا گیا۔ ان تمام باتوں کے باوجود اگر ان پر مقدمہ نہیں چلایا گیا تو ایسا کیوں تھا؟ ان کا نام صرف مستغیث علیہم اور ملزمان کی فہرست ہی سے خارج نہیں کیا گیا بلکہ انہیں علیگڑھ کالج میں دینیات کا پروفیسر بنایا گیا تو کیوں؟ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی کہ وہ سی آئی ڈی کے آدمی تھے۔ وہ زیادہ دیر تک پروفیسر نہیں رہ سکے اور مستقلاً سی آئی ڈی کے محکمہ سے وابستہ ہو گئے تھے۔

آزادی کے بعد وہ پاکستان آ گئے تھے۔ کراچی میں انفارمر (Informer) کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ سید محمد خلیل نہٹوری اور ان کے بیٹے سید محمد جمیل (سابق آڈیٹر جنرل پاکستان) کے ہاں فاطمہ جناح کالونی (جمشید روڈ) ایک سفید ریش بزرگ صورت کو آتے جاتے دیکھا۔ ایک روز خواجہ عبدالوحید مرحوم کے ساتھ سید صاحبان کے ہاں پہنچا تو وہ بزرگ صورت وہاں موجود تھے۔ خواجہ صاحب مرحوم دیکھتے ہی مشتعل ہو گئے۔ سید صاحبان حیرت زدہ تھے کہ خواجہ صاحب جیسا سنجیدہ اور مہذب شخص نہ صرف زبان بلکہ ہاتھ کا بھی بے تکلف استعمال کر رہا ہے۔ معاملہ رفع دفع ہوا۔ وہ بزرگ تو فوراً کمرے سے باہر نکل گئے۔ معلوم ہوا کہ یہ بزرگ انیس احمد تھے۔ یہ 1961ء یا 1962ء کے آغاز کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد سید صاحبان کے ہاں تو نہیں البتہ کراچی میں آتے جاتے ان پر کئی بار نظر پڑی۔'' (حواشی علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے: ص ۱۴۸)

جمعیۃ الانصار کا قیام اور اس کا پہلا اجلاس:

جلسہ تقسیم اسناد اور دستار بندی تو دراصل ایک بہانہ تھا اصل بات تو جمعیۃ الانصار کا قیام تھا۔ چنانچہ دارالعلوم دیوبند کے فضلاء کی دستار بندی سے فارغ ہونے کے

بعد جمعیۃ الانصار کی تیاری کی گئی۔ طے پایا کہ شہر مراد آباد میں اس کا پہلا جلسہ ہوگا۔ چنانچہ 15-16-17 اپریل 1911ء کو مراد آباد میں یہ اجتماع ہوا۔ اس زمانہ میں ملک میں پلیگ کی نہایت شدت تھی۔ گاؤں اور شہروں میں لوگ پلیگ کی وجہ سے کثرت سے مر رہے تھے، لیکن پھر بھی لوگوں نے اس اجتماع میں اپنی حاضری کو باعث سعادت سمجھا اور ایک بہت بڑا اجتماع ہوگیا جس کا نظم و نسق بھی قابل رشک تھا، پلیگ کی شدت کی وجہ سے مراد آباد کے کلکٹر صاحب نے جلسے کی ممانعت کر دی کیونکہ انہیں خطرہ تھا جب اتنے لوگ ملک کے مختلف علاقوں سے اکٹھے ہوں گے تو پلیگ کی شدت میں اضافہ ہوگا اور پلیگ کے جراثیم ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہوں گے، لیکن علمائے اسلام نے کلکٹر سے مل کر کہا کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ علماء اور مشائخ کی تشریف آوری سے پلیگ ختم ہوگا۔ ملاقاتیوں نے علماء سے اپنے اظہار عقیدت کا اظہار کچھ ایسے لفظوں میں کیا کہ کلکٹر بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ اس نے ان تاریخوں میں جلسہ کی اجازت دے دی، اور اللہ تعالیٰ نے ملاقاتیوں کے علماء سے حسن عقیدت کو سچا کر دکھایا۔ جونہی جلسہ کا آغاز ہوا شہر سے طاعون ختم ہوگیا۔ چنانچہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ، ناظم جمعیۃ الانصار نے جلسہ کی روئیداد میں تحریر فرمایا تھا:

> ”رمضان المبارک 1327ھ کی ستائیسویں شب بھی عجیب زندگی بخش اور متبرک تھی جب کہ ہم چند ضعیف الاثر طالب علموں نے اپنے حقیقی مربیوں سے جمعیۃ الانصار کے افتتاح کی درخواست کی، اور گو جمعیۃ کے وسیع مقاصد ہم غریبوں کے پیمانہ قدرت سے زائد معلوم ہوتے تھے مگر ہمارے اکابر نے اپنی عالی قدر تائید و امداد کے وعدے کے ساتھ ان کو شرف قبول بخشا اور غایت شفقت سے جمعیۃ کی سرپرستی فرمائی۔ جن لوگوں نے اس وقت جمعیۃ کے چند مقاصد پر نظر فرما کر شیخ چلی کے خیالات سے تشبیہ دی تھی، وہ بے شک ہماری خستہ حالی اور بے سروسامانی کے اعتبار سے بالکل درست تھی، لیکن میں معاف کیا جاؤں اگر یہ کہوں کہ انہوں نے

ہمارے بزرگوں کی ہمت و اخلاص اور توجہ الیٰ اللہ کا ہرگز کافی طور پر اندازہ نہ کیا تھا۔" (القاسم، ربیع الثانی ۱۳۲۹ھ: ص ۵)

جلسہ کی صدارت حضرت مولانا احمد حسن امروہیؒ نے فرمائی۔ حضرت امروہیؒ حضرت حجۃ الاسلامؒ کے نہایت محبوب شاگرد تھے۔ یہ تبحر علمی میں حضرت مولانا محمد قاسم کے صحیح جانشین اور سیاسی خیالات میں حضرت شیخ الہند قدس سرہ کے رفیق کار تھے۔ آپ نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا:

"بعض نئی روشنی کے شیدائی کہتے ہیں کہ جمعیۃ الانصار اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی نقل ہے، لیکن یہ بات ہرگز صحیح اور درست نہیں۔ جمعیۃ الانصار کی تحریک غالباً اب سے تیس برس پہلے شروع ہوگئی تھی اور اس تحریک کے بانی مدرسہ عالیہ کے وہ طالب علم تھے جو آج علوم کے سرچشمہ اور فنون کے آفتاب ہیں اور جن کی ذات بابرکات پر زمانہ جس قدر ناز کرے بجا ہے۔ (اس سے مولانا امروہیؒ کی مراد حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن تھی کیونکہ آپ کے سوا ان صفات اور کارکردگی کا حامل اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا) لیکن یہ تحریک اس وقت ضروریات سے متعلق نہ تھی، اس لیے رک گئی اور آخر اس کلیہ کی بنا پر کہ ضرورت ہر چیز کو خود بخود پیدا کر دیتی ہے، 1327ھ مطابق 1909ء سے اس انجمن کو دوبارہ زندہ کر کے جمعیۃ الانصار نام رکھا گیا۔ جمعیۃ الانصار ہرگز کسی انجمن کی نقل نہیں ہے اور نہ کسی کے ذاتی مقاصد سے بحیثیت دنیاوی اس کا تعلق ہے بلکہ اس کے مقاصد وہ ضروری مقاصد ہیں جن کی آج بہت کچھ ضرورت ہے۔"

جلسہ نہایت کامیاب رہا اور کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا، لیکن اس جلسہ کی کاروائی اور اجتماع کی زیادتی نے انگریزوں کو چونکا دیا کیونکہ اس زمانہ میں اس طرح کے کامیاب جلسوں سے انگریزی حکومت ناآشنا تھی۔

جلسہ تو ہو گیا لیکن انگریز کے ذہن میں بدگمانیوں کے کیڑے رینگنے لگے یہاں تک کہ روز بروز بدگمانی میں شدت پیدا ہوتی گئی۔ انہیں اس بات پر بھی نہایت تعجب اور حیرانگی تھی جس نے بعد میں پریشانی کی صورت اختیار کر لی کہ دیوبند کے ایک مدرسہ کے مولوی نے ہندوستانی زعماء ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم محمد اجمل خان، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کے ساتھ اتنے گہرے سیاسی روابط کیسے قائم کر لیے۔ ڈاکٹر انصاری تو باقاعدہ آپ کے مرید تھے اور مولانا محمد علی جوہر قرآنی تعلیم میں آپ کے شاگردِ رشید۔

جمعیۃ الانصار کے اس اجلاس کے بعد 1912ء میں دنیائے اسلام پر ایک نئی مصیبت وارد ہوئی۔ وہ یہ کہ انگریزوں اور ان کی ہم نوا حکومتوں نے بلقان کی ریاستوں کو ترکوں کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا۔ پھر 1913ء میں کانپور میں ایک سڑک کو سیدھا کرنے کے لیے ایک مسجد کو شہید کرا دیا۔ مسلمان مسجد کے انہدام کے مقابلہ میں کھڑے ہو گئے لیکن ظالم انگریزوں نے ان کے سینے گولیوں سے چھلنی کر دیئے۔ اس واقعہ میں 12 مسلمان شہید ہوئے اور 23 زخمی ہو گئے۔ پچاسوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان شہداء، زخمیوں اور گرفتار رشدگان میں بوڑھے، نوجوان اور پندرہ پندرہ سال کے بچے بھی تھے۔ اسی واقعہ میں مولانا شبلی مرحوم کو بھی گولی لگی اور وہ ساری زندگی کے لیے لنگڑے ہوئے گئے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے شعر میں لکھا ؏

اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں

کانپور کی مسجد کے اس واقعہ نے پورے ہندوستان میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ اخبارات میں احتجاجی کالم لکھے گئے۔ جلسے اور جلوسوں سے ہنگامہ اور احتجاج کا شور برپا کیا گیا۔ مساجد کے لیے دفاعی کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ مولانا ابوالکلامؒ کے الہلال کا ایک شمارہ جس میں مشہدِ اکبر کے نام سے کان پور کے اس حادثہ کے بارے میں پرزور انداز میں احتجاج کیا گیا تھا، وہ حکومت نے ضبط کر لیا اور دو ہزار کی ضمانت طلب کی۔ اتنے احتجاج اور انسانی جانوں کی شہادت کے بعد آخر کار مسجد کا یہ فیصلہ ہوا کہ جو حصہ توڑا گیا ہے وہ ایک منزل کے طور پر اوپر بنا دیا گیا اور نیچے سے سڑک نکال دی گئی۔

ہنگامے اکثر و بیشتر بہتری اور اتفاق و اتحاد کا باعث بن جاتے ہیں۔ ان دونوں ہنگاموں نے بھی حامیان ملت اور زعمائے امت کو ایک نقطہ پر اکٹھا کر دیا جس کے نتیجہ میں آزاد حکومت کے قیام کی جدوجہد میں تیزی آ گئی اور دہلی میں "نظارت المعارف القرآنیہ" قائم کر کے ہندوستان کے نوجوانوں کو درس سیاست دیا جانے لگا۔

نظارۃ المعارف القرآنیہ کیا تھی؟ سی آئی ڈی کی ڈائری میں اس کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے:

> "ایک مشہور ادارہ ہے جسے مولوی عبیداللہ نے جمعیۃ الانصار دیوبند سے رابطہ منقطع کرنے کے بعد یکم نومبر 1913ء کو قائم کیا تھا۔ نظارۃ المعارف کا ظاہری مقصد یہ تھا کہ وہ انگریزی خوان مسلمانوں میں عربی تعلیم کا شوق پیدا کرے، لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کی مشنری ٹریننگ دینے کا ادارہ تھا اور ان کے ذہن میں سخت متعصبانہ خیالات پیدا کرتا تھا۔ اس کام میں عبیداللہ کے خاص ساتھی مولوی احمد علی، قاضی ضیاء الدین ایم اے، اصطفیٰ کریم بی اے، انیس احمد بی اے (یہ وہی انیس احمد ہے جو سی آئی ڈی کا آدمی تھا) وغیرہ تھے جب کہ مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری، محمد علی آف کامریڈ، مرحوم شبلی نعمانی، نواب مشتاق حسین وغیرہ اس کے پرجوش ہمدرد تھے۔ مصارف دو سو روپیہ مہینہ کی دربار بھوپال کی امداد، ڈاکٹر انصاری کا پچاس روپے ماہانہ کا چندہ اور سفیروں کے ذریعے جمع ہونے والی رقوم سے پورے ہوتے تھے۔ 1914ء میں یہ تجویز تھی کہ نظارۃ کو کلکتہ کے دارالاشاد میں ضم کر دیا جائے لیکن بعد میں اسے ردّ کر دیا گیا۔ حال ہی میں نظارۃ کو اتحاد اسلامی کے منصوبوں کی تیاری کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ نیز آزاد علاقہ کو جانے والوں اور وہاں سے واپس والوں کے لیے قیام کا کام دیتا ہے۔ عبیداللہ کے فرار کا بل

کے بعد مولوی احمد علی نے کچھ دنوں تک اس ادارے کا انتظام چلایا 25 جون 1916ء سے اس کا وجود ختم ہوگیا۔"

(تحریک شیخ الہند، سید محمد میاں: ص ۴۶۴)

1909ء میں حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا عبیداللہ سندھی کو جو ان کے شاگرد تھے، دیوبند طلب فرمایا اور انہیں دیوبند میں رہ کر کام کرنے کے لیے فرمایا۔ آپ نے فرمایا کہ اس طریقہ سے آپ کے ساتھ سندھ کا تعلق بھی قائم رہے گا۔ چنانچہ مولانا عبیداللہ چار سال تک جمعیت الانصار میں کام کرتے رہے۔ اس تحریک کی تاسیس میں مولانا محمد صادق سندھی، مولانا ابومحمد لاہوری اور مولانا احمد علی لاہور، مولانا عبیداللہ کے شریک کار تھے۔ 1913ء مطابق 1331ھ میں حضرت شیخ الہندؒ کے ارشاد کے مطابق یہ کام دیوبند سے دہلی منتقل کیا گیا اور دہلی کی جماعت کا نام نظارت المعارف القرآنیہ رکھا گیا۔ اس کے سرپرستوں میں حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ حکیم اجمل خان اور نواب وقار الملک بھی شریک تھے۔

حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا عبیداللہ کو چار سال دیوبند میں اپنے پاس رکھا اور اپنی تمام جماعت سے ان کا تعارف کرا دیا۔ پھر جب دہلی بھیجا تو خود دہلی تشریف لائے اور نوجوان طاقت سے مولانا عبیداللہ کا تعارف کرایا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے پہلے ڈاکٹر انصاری سے آپ کو ملایا۔ پھر ڈاکٹر انصاری نے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر سے متعارف کرایا۔ اس طریقے سے آپ قریباً دو سال مسلمانان ہند کی سیاست سے آشنا رہے۔

1915ء مطابق 1333ھ میں مولانا عبیداللہ سندھی حضرت شیخ الہند کے حکم کے تحت کابل گئے۔ مولانا عبیداللہ فرماتے ہیں کہ چونکہ حضرت شیخ الہند نے مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا تھا، اس لیے میری طبیعت کابل جانے کو پسند نہیں کرتی تھی، لیکن آپ کے حکم کی تعمیل ضروری تھی، اس لیے میں افغانستان چلا گیا اور اللہ تعالیٰ نے جانے کا راستہ بھی آسان فرما دیا۔ کابل جا کر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ جس جماعت کے نمائندہ تھے اس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیل حکم

کے لیے تیار ہے۔ انہیں میرے جیسے ایک خادم شیخ الہند کی سخت ضرورت تھی۔ اب مجھے اپنی اس ہجرت اور حضرت شیخ الہندؒ کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔

(سفرنامہ شیخ الہند: ص ۵)

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ فرماتے ہیں:

"بلقان کے خون خوار اور طرابلس کے سنگین واقع نے مولانا کے دل و دماغ پر نہایت عجیب مگر بے چین کنندہ اثر ڈالا۔ چنانچہ اس وقت حسب طریقہ استاد اکبر مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ (در جنگ روس) مولانا نے پوری جان توڑ کوشش امداد اسلام میں فرمائی۔ فتوے چھپوائے، مدرسہ کو بند کرایا، طلبہ کے وفود بھجوائے، خود بھی ایک وفد کے ساتھ نکلے، چندے کیے اور ہر طرح سے مدد کی ترغیب دے کر ایک اچھی مقدار بھجوائی، مگر اس پر بھی چین نہ پڑا کیونکہ جنگ بلقان کے نتیجہ نے دوربینوں کو بالکل غیر مطمئن کر دیا تھا اور بتا دیا تھا کہ یورپ کے سفید عفاریت اسلام کے ٹمٹماتے چراغ کو گل کرنے کی فکر میں ہیں۔ پھر ذمہ داران برطانیہ مسٹر اسکویتھ وغیرہ کی روباہ بازیاں، خرس روس کی جفا کاریاں تو یقین دلاتی تھیں کہ تقسیم ٹرکی اور اجرائے وصیائے گلیڈ اسٹون کا زمانہ سر پر ہی آ گیا ہے۔"

(سفرنامہ شیخ الہند اسیر مالٹا: ص ۵)

ابھی حضرت مولاناؒ یہ سب کچھ کر رہے تھے کہ فلک نے ایک نیا گل کھلایا وہ یہ کہ جنگ عظیم اول شروع ہوگئی۔ سارے عالم میں خون کے فوارے پھوٹ پڑے۔ بستیوں کی بستیاں برباد ہونے لگیں اور بحر و بر میں فتنہ و فساد کی آگ پھیل گئی۔ امن و جنگ میں ترکوں نے جرمنی کا ساتھ دیا اور میدان جنگ میں وہ انگریزوں کے مقابلہ پر تھے، اور بدقسمتی سے اس جنگ میں جرمنی کو شکست ہوگئی۔ اب ترکوں کو یہ سزا دی گئی کہ ان کو فاسق و فاجر قرار دے کر خلافت کا غیر مستحق قرار دیا گیا۔ گورنمنٹ پرست مولویوں نے فتوے مرتب کیے۔ مولوی عبدالحق حقانی اس فتوے کے موجد اور مؤلف تھے۔ حضرت

شیخ الہند قدس سرہ کی خدمت میں یہ فتویٰ دومرتبہ پیش کیا گیا لیکن آپ نے اس کو سختی سے ردّ کر دیا اور جن علماء نے اس کی تصدیق کی تھی اس کے بارے میں سخت کلمات کہے اور مجمع عام میں اس کو پھینک دیا۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو اپنے مشن پر کابل اور آزاد قبائل میں کام کرنے کے لیے بھیجا جاچکا تھا اور ان کے ذریعہ تحریک کا رابطہ امیر حبیب اللہ خان والی کابل سے ہو چکا تھا لیکن گرینڈ اپریشن اور انقلابی جدوجہد کے لیے سلطنت عثمانیہ سے تعلقات قائم کرنے بھی نہایت ضروری تھے۔ اس کے بغیر تحریک آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ حضرت مولانا محمد علی جوہر کو نظر بند کیا جاچکا تھا اور حضرت شیخ الہندؒ کے بارے میں بھی نظر بندی کے منصوبے بنائے جارہے تھے۔ آپ کا نظر بند ہونا تحریک کے لیے مضر تھا، اس وجہ سے آپ نے حج بیت اللہ کا ارادہ فرمایا اور ستمبر 1915ء کو آپ اس مقصد کے لیے دیوبند سے روانہ ہو گئے۔ آپ کے سفر میں حکیم عبدالرزاق غازی پوری اور ڈاکٹر انصاری نے بہت زیادہ مدد کی۔ حکیم صاحب حضرت شیخؒ سے پہلے بمبئی پہنچ گئے اور آپ کے قیام اور جہاز کے ٹکٹ وغیرہ کا بندوبست کر دیا۔ آپ جب دیوبند سے روانہ ہوئے تو کئی حقیقی اور مصنوعی عقیدت مند آپ کے ساتھ روانہ ہوئے جن میں سے خاص احباب حسب ذیل ہیں:

(1) مولانا محمد میاں انبہٹوی، (2) مولانا عزیر گل، (3) مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری، (4) مولانا محمد سہول بھاگل پوری، (5) حاجی خان محمد صاحب، (6) مولانا مطلوب الرحمٰن دیوبندی، (7) حاجی محبوب خان سہارنپوری، (8) حاجی عبدالکریم صاحب سرونجی اور مولانا وحید احمد صاحب مدنی رحمہم اللہ تعالیٰ۔ حکیم نصرت حسین کے بارے میں بھی آتا ہے کہ وہ بھی حضرت شیخؒ کے رفقائے سفر میں سے تھی لیکن درست بات یہ ہے کہ انہوں نے حجاز کا سفر آپ سے الگ کیا تھا۔ پھر حج کے بعد حضرتؒ سے ان کی ملاقات ہوئی۔ بعد ازاں مالٹا میں 6 اگست 1919ء یعنی اپنی وفات تک حضرت کے ساتھ رہے۔

حکومت برطانیہ کا محکمہ جاسوسی بڑا تیز تھا۔ مختلف جنگیں بھی انہوں نے اپنی جاسوسی کی وجہ سے جیتی تھیں۔ انہیں جب حضرت شیخؒ کے مکہ جانے کا علم ہوا تو انہوں

نے آپ کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے لیکن یہ بھی کہا کہ لوگوں میں ہیجان کی نوبت نہ آئے کیونکہ گورنمنٹ اس زمانہ میں ملک کی اندرونی گڑبڑ اور ہیجان سے بہت بچتی تھی۔ حضرت شیخؒ کے سفر کی یہ خبر کوئی معمولی نہ تھی۔ ہر جگہ بذریعہ تار اطلاع پہنچ چکی تھی، اس لیے ہر جگہ پر لوگوں کا ایک جمگھٹا آپ کے اردگرد رہتا تھا، اس وجہ سے راستہ میں کوئی کاروائی عمل میں نہ لائی گئی۔ آپ بمبئی پہنچے تو وہاں بھی ہر وقت لوگوں کا ایک ہجوم آپ کے اردگرد رہتا تھا۔ لہٰذا یہاں بھی آپ کو گرفتار نہ کیا جا سکا۔ اور آپ جہاز میں بیٹھ کر جدّہ روانہ ہو گئے۔ پھر گورنر یوپی نے مرکزی حکومت کے ذریعہ عدن کے گورنر کو تار دیا کہ مولانا محمود حسین کو جہاز سے اتار لو، مگر یہاں بھی لوگ ڈاکٹر انصاری مرحوم کے لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے تار میں اس قدر تاخیر کر دی کہ جہاز عدن سے روانہ ہو گیا۔ پھر جہاز کے کپتان کو ایک تار دیا گیا کہ ان کو جہاز ہی میں گرفتار کر لو جہاز سے اترنے نہ دو، لیکن اس وقت گورنر حجاز کا انتظام یہ تھا کہ جدّہ سے پہلے حجاج کو جزیرہ سعد میں اتار کر مکہ معظّمہ پہنچایا جائے، اس لیے وہ تار کپتان کو اس وقت ملا جب کہ حضرت شیخ جزیرہ سعد میں اتر چکے تھے۔ البتہ حضرت شیخ کے ساتھ متعدد سی آئی ڈی کے شخص بمبئی سے ساتھ کر دیئے گئے تھے تاکہ وہ آپ کی تمام حرکات وسکنات کی نگرانی کریں، لیکن جزیرہ سعد میں اترتے ہی بعض حضرات نے ترکی پولیس کو اطلاع کر دی کہ فلاں فلاں آدمی انگریزوں کا سی آئی ڈی ہے۔ چنانچہ ترکی پولیس نے ان سب کو گرفتار کر لیا اور اپنی حفاظت میں حج کرا کر واپس ہندوستان بھیج دیا، تاہم پھر بھی کچھ رہ گئے اور حضرت نہایت حفاظت کے ساتھ اونٹ پر بیٹھ کر مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔

مکہ معظّمہ میں دہلی کے ایک تاجر حاجی علی جان مرحوم کے خاندان کا تجارت میں ایک نام تھا اور دین داری اور علمی حیثیت بھی ان کی بہت زیادہ تھی۔ اس لیے ایک معمر اور سمجھدار شخص جو اس خاندان میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے تھے، حضرت شیخ ان سے ملے اور گورنر مکہ غالب پاشا سے ملاقات کرانے کی استدعا کی۔ انہوں نے اسی وقت ایک ہندوستانی معاملہ فہم تاجر کی معرفت حضرت شیخ کی غالب پاشا سے ملاقات کرا دی۔ یہ ملاقات کرانے والا شخص عربی اور ترکی دونوں زبانوں سے واقف تھا اس لیے اس نے

ترجمانی کے فرائض بھی انجام دیئے۔ غالب پاشا نے نہایت توجہ اور غور سے آپ کی باتوں کو سنا اور کہا کہ آپ کل اسی وقت پھر تشریف لائیں اور اس بارے آپ سے مزید گفتگو ہو گی اور آپ کی باتوں کا جواب بھی دوں گا۔ چنانچہ اس روز آپ واپس آ گئے۔ غالب پاشا نے حضرت کے بارے میں وہاں کے ہندوستانی تاجروں سے تحقیق کی اور آپ کی حیثیت عرفی کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے آپ کی علمی اور عملی حیثیت اور شہرت و مقبولیت کے بارے میں بتایا۔ لہٰذا اگلے روز جب حضرت ملاقات کے لیے تشریف لے گئے تو اس نے آپ کا بہت زیادہ اعزاز کیا اور حضرت والاؒ کی ہر بات سے اتفاق کیا۔ پھر حضرت نے فرمایا کہ میں انور پاشا سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا کہ میں جو کچھ آپ سے کہہ رہا ہوں وہ یوں سمجھیں کہ انور پاشا ہی آپ سے کہہ رہا ہے لیکن آپ نے انور پاشا سے ملنے پر اصرار کیا۔ چنانچہ انہوں نے ایک تحریر تمام ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اپنی طرف سے بحیثیت گورنر حجاز لکھ دی اور ایک تحریر گورنر مدینہ بصری پاشا کو لکھی کہ یہ معتمد علیہ شخص ہیں۔ ان کا پورا پورا احترام کیا جائے اور ان کو استنبول انور پاشا کے پاس پہنچا دیں۔ اور ایک انور پاشا کے نام لکھ دی کہ یہ معتمد علیہ شخص ہیں ان کے تمام مطالبات پورے کیے جائیں۔ پھر تحریک آزادی کے بارے میں حضرت شیخؒ کو کچھ ہدایات دیں کہ آپ تمام ہندوستان کو آزادی کامل کے مطالبہ پر آمادہ کریں، ہم ہر قسم کی امداد کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ ایسا نہ ہونا چاہیے کہ ہندوستانی لیڈر سست پڑ جائیں اور انگریزوں کی باتوں میں آ کر ان کی تابعداری پر راضی ہو جائیں۔ تمام ہندوستانیوں کو اخباروں، عام اجتماعات اور تقریروں اور تحریروں میں اندرون ہند اور بیرون ہند یک زبان اور یک قلم ہو کر آزادی کا مطالبہ جاری رکھنا چاہیے، اور جب تک مقصد حاصل نہ ہو جائے خاموش نہیں بیٹھنا چاہیے، لہٰذا اس مقصد کے لیے آپ کا واپس ہندوستان جانا اور آپس میں اتفاق و اتحاد کے ساتھ آزادی کا مطالبہ کرانا ازبس ضروری ہے۔ حضرتؒ نے فرمایا: "اس وقت انگریز مجھ کو نہایت خطرناک نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ میں اگر ہندوستان جاؤں گا تو راستہ ہی میں گرفتار کر لیا جاؤں گا، مگر میں اپنے رفقاء کو اس کام کے لیے تیار کر کے ہندوستان بھیجتا ہوں، اگرچہ وہاں کی جماعتیں کانگرس وغیرہ اس پر عمل درآمد کر رہی ہیں مگر آپ کے حکم کے مطابق زیادہ کوشش

کی جائے گی۔ میں خود بالا بالا ہندوستان کی مغربی حدود میں جانا چاہتا ہوں، وہاں میرے مشن کے لوگ کام کر رہے ہیں، میں ان میں مل کر کام کروں گا۔ اس پہلی ملاقات کے بعد دو تین اور ملاقاتیں ہوئیں۔ (نقش حیات: جلد۲ ص ۲۱۲۔۲۱۵)

مختصر یہ کہ حضرت شیخؒ مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ پہنچے۔ بصری پاشا سے ملاقات فرمائی۔ گورنر حجاز غالب پاشا کا خط بصری پاشا کو دیا اور بصری پاشا سے انور پاشا سے ملانے کا وعدہ کیا۔

انور پاشا اس وقت ترکی کے وزیر جنگ تھے اور جمال پاشا جنوبی اور غربی محاذ سویز، سینا اور حجاز کے کمانڈر تھے۔ حضرت شیخ ان دونوں حضرات سے استنبول میں ملنے کی تیاری کر رہے تھے کہ ایک روز پتہ چلا کہ انور پاشا جمال پاشا کی معیت میں مدینہ منورہ تشریف لا رہے ہیں۔ یہ لوگ دربار رسالت پناہ میں عجز و انکسار اور زیارت روضۂ کے لیے حاضر ہوئے تھے۔ کس کیفیت میں حاضر ہوئے اس کی تفصیل شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب قدس سرہ نے اپنی کتاب نقش حیات اور سفرنامہ شیخ الہند میں دی ہے۔

حضرت شیخؒ نے انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقات فرمائی۔ ان کو اپنے کام کا نقشہ سمجھایا اور انہیں کچھ تجاویز پیش کیں۔ انور پاشا انگریزوں کے پہلے ہی بہت خلاف تھے اور ان کی چیرہ دستیوں سے بخوبی آشنا تھے، لہٰذا انہوں نے حضرت شیخ کی امداد کا وعدہ فرما لیا اور چند وثیقے تحریر کر کے حضرت شیخ کو دیئے جن میں آزاد قبائل کے باشندگان کو امداد اور تعاون کا پورا پورا یقین اور اطمینان دلایا۔ انور پاشا کی رائے تھی کہ آزاد قبائل میں آپ خود پہنچیں۔ حضرت کی خواہش کہ بحری راستہ سے ہندوستان ہو کر آزاد قبائل میں جانا میرے لیے ممکن نہیں، لہٰذا خشکی کے راستہ سے میرا ہندوستان جانے کا کوئی انتظام ہو جائے۔ انور پاشا نے کہا کہ چونکہ ایران میں انگریزی فوجیں پہنچی ہوئی ہیں لہٰذا خشکی کا راستہ بھی بہت خطرناک ہے۔ چنانچہ طے یہ ہوا کہ اطراف بغداد سے بحری راستہ سے مکران ہوتے ہوئے حضرت آزاد قبائل میں پہنچیں اور اپنے وہاں پہنچنے سے پہلے انور پاشا کا تحریر کردہ وثیقہ آزاد قبائل میں پہنچا دیں۔ اس کام کے لیے مولانا ہادی حسن کو منتخب کیا گیا اور ایک صندوق کی دیوار کے تختوں میں سوراخ کر کے وثیقہ کو اس میں رکھ دیا گیا

اور تختہ کو دونوں اطراف سے برابر کر دیا گیا۔ مولانا ہادی حسن جب بمبئی جہاز سے اترے تو نہایت سختی کے ساتھ ان کی تلاشی لی گئی لیکن کوئی شی برآمد نہ ہوئی۔ جب وہ اپنے مکان پہنچے تو انہوں نے وہ وثیقہ صندوق سے نکال لیا اور وہ کپڑے جو اس بکس میں تھے وہ دوسرے صندوق میں رکھ دیئے گئے۔ انگریزوں کی سی آئی ڈی نے اس وثیقہ کے بارے پھر اطلاع دی تو پولیس نے اسی وقت مکان پر چھاپا مارا۔ اس وقت مولانا ہادی حسن کے ایک ساتھی مولانا محمد نبی ان تحریروں کو نکالے ہوئے نقل کر رہے تھے۔ سپاہیوں کا محاصرہ دیکھ کر انہوں نے جلدی سے ان کاغذات کو توڑ مروڑ کر اپنی صدری کی جیب میں رکھ لیا اور صدری مردانہ مکان میں ایک کھونٹی سے لٹکا دی۔

رپورٹ پکی تھی لہٰذا تلاشی 10 بجے سے لے کر چار بجے بعد دوپہر تک نہایت سختی کے ساتھ جاری رہی۔ ہر شی کی تلاشی لے کر اس کو مردانہ مکان سے بھی نکال دیا گیا۔ ہر شی کی تلاشی لی گئی۔ عورتوں کے ڈبوں تک کو کھول کر دیکھا۔ کپڑوں کے صندوقوں کو ریزہ ریزہ کر دیا گیا لیکن جس شی کی تلاش تھی وہ نہ ملی۔ وہ واسکٹ سب کے سامنے دالان میں کھونٹی سے لٹکی رہی وہ نہ تو کسی کو نظر آئی اور نہ ہی کسی کا اس کی طرف دھیان گیا۔ چنانچہ چھ گھنٹہ کی تلاشی کے بعد پولیس کو ناکام واپس آنا پڑا۔

حضرت شیخ الہند انور پاشا کے مشورہ کے مطابق بحری راستے سے سفر کا ارادہ فرما رہے تھے کہ حالات میں انقلاب آنا شروع ہو گیا۔ آپ نے ارادہ فرمایا کہ غالب پاشا سے ملاقات کر کے استنبول پہنچیں اور اپنی تحریک کی کامیابی کی کوئی صورت نکالیں۔ چنانچہ آپ 12-13 جمادی الآخرہ 1334ھ/ 1916ء کو اپنے رفقاء کے ساتھ مکہ معظمہ روانہ ہو گئے۔ مکہ پہنچ کر 23 مئی 1916ء کو غالب پاشا سے ملاقات کے لیے آپ طائف تشریف لے گئے۔ غالب پاشا سے ملاقات کے بعد آپ کا استنبول جانے کا ارادہ ہوا لیکن مشکل یہ پیش آئی کہ شتربان ایک ہفتہ کی چھٹی لے کر جا چکا تھا۔ اور کوئی سواری نہ ملی۔ حضرتؒ نے دو تین دن کے بعد دوبارہ تاکید سے سواری کے لیے کہا لیکن پھر بھی کوئی سواری دستیاب نہ ہوئی۔ چنانچہ مولانا حسین احمد مدنیؒ لکھتے ہیں:

"ہم اس وقت اس راز کو نہ سمجھ سکے کہ کیوں اس قدر تقاضا کیا جا

رہا ہے مگر دو ہی تین دن کے بعد معلوم ہو گیا کہ آئندہ آنے والے واقعات نے خلاف عادت مولانا کو تقاضائے سفر پر مجبور کیا ہے۔ جس کی نظر کشفی سے مولانا نے معلوم کر لیا تھا، مگر چونکہ ضبط اور اخفا کا مادہ بہت زیادہ تھا اور پھر مقام رضا میں قدم راسخ تھا، اس لیے چند مرتبہ ظاہری تقاضا کرنے کے بعد چپ ہو رہے اور پھر معلوم ہوا کہ طائف نہایت خطرے میں پڑ گیا ہے۔" (سفر نامہ شیخ الہند: ص ۲۷)

عربوں کو باغی کرنے کا طریقہ:

انگریز کی ڈپلومیسی اور عربوں کو ترکوں کا باغی بنانے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے گئے۔ ایک تو کرنل لارنس جس کو لارنس آف عربیا کہا جاتا ہے، اس کی تمام تبلیغ شریف حسین اور سر ہنسری میکموہن کے خفیہ معاہدوں کے باوجود، غالباً عام باشندگان حجاز ترکوں سے بغاوت پر آمادہ نہیں تھے، تو ان کو باغی بنانے کے لیے انگریزوں نے ویسے تو بہت حربے اختیار کیے لیکن ایک وحشت ناک اور انسانیت سوز حربہ یہ استعمال کیا جس کی تفصیل حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

-1 "غلہ ملک حجاز سے بند کر دیا گیا۔ اوائل ماہ صفر 1334ھ میں آخری جہاز پہنچا۔ اس کے بعد غلہ کی آمد ملک حجاز میں بند کر دی گئی جس کی وجہ سے سخت گرانی ہو گئی اور لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ اہل ہند کے سخت مطالبہ پر ماہ جمادی الآخرہ 1334ھ میں کلکتہ سے فیروزی آگ بوٹ چاول وغیرہ کے چند ہزار بورے لے کر روانہ ہوا۔ اس کو جبراً عدن میں خالی کرا لیا گیا اور وہ غلہ جدہ میں اس وقت پہنچا جب ترکی حکومت کا اثر بالکل اٹھ گیا تھا۔"

-2 اسی زمانہ میں بادبانی جہازوں کو جو بحر احمر سے افریقہ کے سواحل سے غلہ لا کر جدہ، مکہ اور حجاز کے اہالی کو پہنچاتے تھے اور لوگوں کو بھوک سے مرنے کے محافظ ہوتے تھے، انگریزی جہازوں نے ان کو ڈبونا اور لوگوں کو قید کرنا اور غلہ چھیننا شروع کر دیا، اور اسی طرح بہت سے بادبانی جہاز اہل عرب کے غارت

کردیئے گئے جس کی وجہ سے غلہ کی آمد بالکل بند ہوگئی اور لوگ بہت زیادہ پریشان ہوگئے۔

3- ''دو برس سے زیادہ مدینہ منورہ کو محصور رکھا گیا، راستے بالکل بند کردیئے گئے، ریل کی پٹڑی ڈائنا میٹ کے گولوں کے ذریعہ اڑادی گئی۔ غلہ بند کردینے کی وجہ سے اس قدر شدت سے لوگوں میں گرانی ہوئی کہ ہزاروں شخص بھوک سے مرگئے۔ قبروں سے مردوں کو نکال کر لوگوں نے ان کا گوشت کھایا اور طرح طرح کے ناگفتنی آلام اٹھانے پڑے۔'' (رسالہ ترک موالات: ص ۲۴)

یہ سب طریقے لوگوں کو ترکوں کا باغی بنانے کے لیے کیے گئے۔ عربوں کے ذہنوں میں عربی قومیت کا مسئلہ بھی ڈالا گیا کہ قرآن عربی میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عربی لیکن تمہارے حکمران غیر عربی۔ ان سارے حربوں نے مل کر عربوں کو ترکوں کا باغی بنادیا اور جزیرہ عرب میں بغاوت کی وبا پھوٹ پڑی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 16 جون 1916ء مطابق 11 شعبان 1334ھ کو صبح صادق کے قریب چاروں طرف سے شریف حسین کی فوجوں نے زیر کمان عبداللہ بیگ طائف جو گورنر مکہ کا ہیڈ کوارٹر تھا چڑھائی کر دی۔ حضرت شیخ الہند اپنے رفقاء کے ساتھ اس وقت طائف ہی میں مقیم تھے اور آپ وہاں سے جلد روانگی کا ارادہ فرما رہے تھے لیکن سواری مہیا نہ ہونے کی وجہ سے وہیں رکے ہوئے تھے، نیرنگی زمانہ نے دوسرا گل کھلا دیا۔ شریف حسین کی فوج میں اکثر و بیشتر غیر منظم بدّو تھے جن کو ترکی کی ٹرینڈ فوج کے ایک معمولی دستے نے مار بھگایا۔ اس سے دو روز پہلے مکہ معظّمہ، جدّہ، ینبیع، مدینہ منورہ میں بھی یہی واقعہ پیش آچکا تھا کیونکہ شریف حسین کا انتظام اور طریقہ کار یہ تھا کہ ایک ہی روز میں سب جگہ بغاوت ہو۔

شریف حسین اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے انگریزوں کی بھرپور طاقت تھی، وہ تو میر جعفر اور میر صادق کا کردار ادا کر رہا تھا۔ وہ ننگ ملک، ننگ دیں، ننگ وطن تھا۔ انگریز خلافت عثمانیہ سے خائف تھا کیونکہ خلافت نے تمام اسلامی دنیا کو متحد و متفق رکھا ہوا تھا۔ اگرچہ خلافت خود بے جان تھی لیکن انگریزوں کا خیال تھا اور وہ خیال صحیح بھی ہوسکتا تھا کیونکہ یہ یورپین قومیں خصوصی طور پر انگریز تو بڑی دور کی کوڑی لاتے ہیں وہ یہ کہ

خلافت ایک درست اور صحت مند بھی ہوسکتی ہے۔ وہ خلافت کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ مسلمانوں کو تشتت و انتشار میں مبتلا کرنا چاہتے تھے اور وہ خلافت عثمانیہ کو ختم کر کے ہی ہوسکتا تھا۔ شریف حسین تو انگریزوں کا ایک مہرہ تھا، اور ایسے مہرے وہ ہر وقت تلاش کرتے رہتے ہیں۔

مختصر یہ کہ شریف حسین اور ترکی افواج میں جنگ چھڑ گئی۔ جنگ چھڑنے کا سب سے پہلا اثر یہ ہوا کہ ذرائع آمدورفت مسدود ہو گئے۔ میوے، ترکاریاں، غلے اور کھانے پینے کی دوسری اشیاء سب آنی جانی بند ہو گئیں۔ ہر طرف دن رات گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ ترکوں کی مختصر سی فوج شریف حسین کی کثیر تعداد اور انگریزوں کے جدید سامان جنگ سے لیس فوجوں کو موت کے گھاٹ اتارتی رہی۔ نصف رمضان تک یہی حالت رہی، لیکن جب جدّہ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو انگریز کی مصری فوجیں مکہ معظّمہ کے قلعے اور قشلہ کو فتح کرتے ہوئے طائف پہنچیں۔ اور طائف کے چاروں طرف توپیں نصب کر کے گولہ باری شروع کر دی۔ رمضان المبارک (جولائی) کا پورا مہینہ اسی اضطراب، بے چینی اور خوف و ہراس میں گزرا۔ عیدالفطر کے روز بھی انگریزوں اور شریف کی فوجوں نے مہلت نہیں دی۔ مسجد سیدنا ابن عباسؓ جو طائف کی سب سے بڑی مسجد ہے اس میں آخری دس سورتوں سے تراویح پڑھی گئی اور وہ بھی خوف و ہراس کی حالت میں کیونکہ بعض دفعہ گولیوں کی بوچھاڑ اتنی مہلت بھی نہ دیتی تھی۔ اسی اثناء میں طائف میں ذرائع آمدورفت کے مسدود ہونے کی وجہ سے غلہ ختم ہو گیا تھا اس وجہ سے لوگ فاقوں مرنے لگے۔ مجبوراً ترکوں سے نجات کی درخواست کی چنانچہ انہیں نکلنے کی اجازت دے دی گئی۔

حضرت شیخ الہندؒ 16 اگست 1916ء/ 6 شوال 1334ھ کو اپنے رفقاء کے ساتھ طائف سے روانہ ہو کر 10 شوال/10 اگست کو مکہ معظّمہ پہنچے۔ ملکی حالات کے پیش نظر آپ کی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی صورت استنبول پہنچ جائیں لیکن "وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔" تقدیر ہمیشہ تدبیر پر غالب آتی ہے۔ آپ استنبول جانے کے ارادہ سے جدہ تشریف لے گئے۔ چونکہ مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ مکہ کے امن گزیدہ

حالات کے پیش نظر مجبور ہو کر ہندوستان کے لیے روانہ ہو چکے تھے اور جہاز کی تلاش میں جدہ میں مقیم تھے۔ حضرت شیخؒ کو اس بات کا علم تھا، اس لیے آپ جدہ میں مولانا خلیل احمد صاحب سے بھی ملاقات کرنا چاہتے تا کہ مستقبل کے بارے میں ان سے کوئی مشورہ کیا جا سکے اور حجاز کے موجودہ حالات پر کچھ تبادلۂ خیالات کیا جا سکے۔ حضرت شیخ کو قریباً دو ہفتہ جدہ میں ٹھہرنا پڑا، پھر مجبوراً آپ مکہ واپس آ گئے۔ اس سال ایک سی آئی ڈی انسپکٹر بہاء الدین نامی خاص طور پر مکہ معظمہ بھیجا گیا تا کہ وہ حضرت شیخؒ کے اعمال و افعال کی ٹوہ لگاتا رہے۔

شریف حسین نے جو کچھ کیا وہ کوئی درست نہیں تھا۔ یہ وطن سے غداری، ملک سے غداری اور دین سے غداری تھی۔ اس بغاوت نے مسلمانوں کا ناجائز خون بہایا۔ چنانچہ حرم میں جس بے رحمی، سنگ دلی اور سفا کی کا مظاہرہ شریف حسین اور اس کی فوجوں کی طرف سے کیا گیا اس کی مثال ملنی بھی مشکل ہے۔ گرمیوں کی شدت تھی۔ گرمی کا مہینہ۔ ترکوں نے روزے رکھ کر بے مثال شجاعت اور جرأت کا مظاہرہ کیا، لیکن جب شکست کھا کر گرفتار ہوئے تو ان کی تمنا اور خواہش یہ تھی کہ روزے کی حالت میں وہ ذبح کیے جائیں، لیکن زبردستی پہلے تو ان کے حلق میں پانی ڈالا گیا اور اس طرح سے ان کا روزہ توڑا گیا اور پھر ان کو حرم پاک میں ذبح کیا گیا۔ یہ تھا شریف حسین اور اس کی فوج کا کردار۔ یہ حجاز کا میر جعفر اور میر صادق تھا جس نے ترکوں کی طاقت کو تاخت و تاراج کر کے انگریزی حکومت کو مضبوط کیا۔

انگریزوں کا ایجنٹ بن کر شریف حسین نے ترکوں کو جو اس بے رحمی اور سفا کی سے حرم میں قتل کیا اس کا ردِّعمل ہندوستان میں یہ ہوا کہ لوگوں میں ایک عجیب قسم کی بے چینی اور بے اطمینانی پیدا ہو گئی۔ اس بے چینی کو دور کرنے کے لیے انگریزوں نے یہ تجویز کیا کہ ایک شخص کو مکہ مکرمہ بھیجا جائے اور وہاں سے ایک فتویٰ منگوایا جائے۔ چنانچہ خان بہادر مبارک علی اورنگ آبادی کو اس مقصد کے لیے مکہ بھیجا گیا اور وہاں انہوں نے شریف حسین کے تنخواہ دار علماء سے استفتاء اور جواب مرتب کرایا جس میں ترکیوں کی مطلقاً تکفیر کی گئی۔ سلاطین آل عثمان کی خلافت سے انکار کیا گیا اور شریف حسین کی اس

بغاوت کو حق بجانب بلکہ مستحسن قرار دیا گیا۔ بہت سے بکاؤ علماء نے جن کا تعلق شریف حسین سے تھا اس فتویٰ پر دستخط کر دیئے، لیکن علماء کی ایک بہت بڑی تعداد نے اس فتویٰ پر دستخط نہ کیے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے پاس محرم 1335ھ کی آخری تاریخوں میں شیخ الاسلام مکہ معظّمہ عبداللہ سراج کی طرف سے نقیب علمائے مکہ عصر کے بعد آیا اور کہا کہ مجھ کو شیخ الاسلام نے بھیجا ہے اور حضرت شیخ الہندؒ سے اس فتویٰ کی تصدیق طلب کی ہے۔ اس کا عنوان تھا "**من علماء مكة المكرمة المدرسين بالحرم الشريف المكي**" یعنی مکہ مکرمہ کے علاء کی جانب سے جو مکہ کے حرم شریف میں درس دیتے ہیں)۔ اس فتویٰ میں تمام ترکوں کی تکفیر اس بنا پر کی گئی تھی کہ انہوں نے سلطان عبدالحمید خان مرحوم کو معزول کیا ہے۔ شریف حسین کی بغاوت کو حق بجانب اور مستحسن قرار دیا گیا تھا، اور ترکوں کی خلافت کا انکار کیا گیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ حضرت شیخؒ نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ چونکہ یہ ان علمائے مکہ کی طرف سے ہے جو حرم مکی میں پڑھاتے ہیں، اور میں ہندوستان کا باشندہ ہوں اور حرم مکی میں مدرس بھی نہیں ہوں، اس لیے مجھ کو کسی طرح اس پر دستخط کرنا درست نہیں۔ وہ واپس چلا گیا۔ حاضرین میں سے بعض احباب نے کہا کہ اس کا نتیجہ خطرناک ہوگا۔ حضرت نے جواب دیا کہ پھر کیا کیا جائے۔ نہ عنوان اجازت دیتا ہے اور نہ مُعنون۔ اس کے بعد سنا گیا کہ شیخ الاسلام عبداللہ سراج بہت برہم ہوئے۔ خطرہ تھا کہ وہ لوٹ کر آئے گا لیکن وہ نہ آیا۔ دو چار روز کے بعد شریف حسین خود جدّہ گیا اور وہاں سے حکم دیا کہ فوراً مولانا محمود حسین اور ان کے رفقاء سید ہاشم اور حکیم نصرت حسین کو گرفتار کر کے بھیجو۔

اس استفتاء کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ ہندوستانیوں کے جذبات جو شریف حسین کی اس بغاوت کے خلاف تھے ان کو فرو کیا جائے، لیکن اس سے اہم مقصد یہ تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ کو اس بہانے سے شریف حسین کے ہاں طلب کیا جا سکے۔ حکومت کی پالیسی نہایت کامیاب رہی۔ شریف حسین اور اس کے شیخ الاسلام اور بقیہ علماء وغیرہ کے دل میں حضرت شیخ کی جانب سے غبار پیدا ہو گیا کہ آپ ہم لوگوں کو باغی اور خارجی سمجھتے ہیں۔ فتوے پر دستخط نہ کرنے کی وجہ سے حضرت اور آپ کے رفقاء کو یہ یقین ہو گیا

تھا کہ شریف حسین اب کوئی الزام لگا کر گرفتار کرلے گا یا انگریزوں کے حوالے کر دے گا۔ چنانچہ حضرتؒ نے یہ ارادہ فرمایا کہ شریف کی حکومت سے باہر چلے جائیں لیکن سواری کا کوئی بندوبست نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس غدار قوم اور غدار ملت شریف حسین نے حضرتؒ کو طلب کیا اور انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے آپ اور آپ کے ساتھیوں کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیئے حضرت شیخ کے رفقاء نے اولاً تو یہ طے کیا کہ حضرت شیخ اور مولانا وحید احمد صاحب کو کہیں چھپا دیا جائے۔ پھر خفیہ طور پر انہیں کہیں باہر بھیج دیا جائے۔ باقی حضرات کو اگر گرفتار بھی کر لیا گیا تو امید ہے کہ کچھ دنوں بعد چھوڑ دیئے جائیں گے۔ چنانچہ اس پر عمل بھی کیا گیا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔

سب سے پہلے حضرت شیخؒ کو کوتوالی طلب کیا گیا اور انگریزوں کو برا بھلا کہنے کے جرم میں قید کر دیا۔ حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری کی خبریں شہر میں نہایت تیزی سے گشت کرنے لگیں۔ دہلی کے تاجر صاحبان شریف حسین کے پاس گئے اور حضرتؒ کو چھوڑ دینے کی درخواست کی، لیکن شریف حسین نے جواب دیا اور اس کو یہی جواب دینا بھی چاہیے تھا کیونکہ پوری ملت سے ٹوٹ کر اس نے انگریزوں سے رشتہ جوڑا تھا:

''ہماری انگریزوں سے دوستی بالکل نئی ہے۔ ہمیں یہ دوستی قائم رکھنی ضروری ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس میں رخنہ پیدا ہو۔''

گوری چمڑی والوں کے ساتھ جب بھی وہ لوگ جو غلط ذرائع اور غیر آئینی طریقوں یا پھر کسی سازش کے تحت برسر اقتدار آتے ہیں تو ان گوروں کو خواہ وہ گورے امریکہ کے ہوں اور انگلستان کے، خوش کرنے کے لیے پھر وہ ہر ذلیل حرکت کرتے ہیں تاکہ ان کی غیر آئینی حکومت محفوظ رہے۔ اس کے لیے وہ خانہ کعبہ پر بھی گولیاں چلاتے ہیں، نہایت سفاکی سے مسلمانوں کو قتل بھی کرتے ہیں اور علمائے اسلام اور ان کی خانقاہوں اور مدارس کی توہین بھی کرنے سے نہیں چوکتے۔ اقتدار کے نشہ کی مدہوشی میں انہیں کچھ یاد نہیں رہتا۔ کفر کا ساتھ دے کر اور اسلام اور مسلمانوں کو تاخت وتاراج کر کے بھی وہ اپنے سچے پکے مسلمان ہونے کے دلائل دیتے ہیں کہ ہم سید ہیں، ہم نے اتنے حج کیے ہیں، ہم خانہ کعبہ کے اندر بھی گئے۔ یہ شریف حسین بھی یہی دلائل اپنے

سچے پکے مسلمان ہونے کے دیتا تھا کہ میں سید ہوں، میں نے کئی حج کیے ہیں میں خانہ کعبہ کے اندر بھی نوافل پڑھ کے آیا ہوں۔ وہ انگریزوں سے دوستی مستحکم کرنے کے لیے ہر ذلیل سے ذلیل کام کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اگر مسئلہ جہاد بھی ختم کرنا پڑے تو اس کے دلائل بھی دینے شروع کر دیتے ہیں تا کہ ان گوروں کی دوستی میں رخنہ نہ پڑے۔ یہی بات سید شریف حسین نے تجار دہلی سے کی۔ اور وہ تاجر ناکام واپس لوٹے۔

22 صفر 1335ھ کو حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ کو گرفتار کر لیا گیا۔ حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا وحید احمد صاحب حسب مشورہ پہلے چھپا دیئے گئے تھے۔ مولانا عزیر گل اور مولانا حکیم نصرت حسین سامنے تھے، ان دونوں سے حضرت شیخ الہندؒ کے بارے میں پوچھا گیا کہ وہ کہاں ہیں؟ ان دونوں حضرات نے لاعلمی کا اظہار کیا لیکن دونوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ پولیس نے شام تک حضرت شیخ کو تلاش کیا لیکن وہ ناکام رہی۔

اب سید شریف حسین نے ایک دھمکی دی اور یہ دھمکی اس نے مغرب کے بعد دی جب پولیس نے اس کے سامنے حضرت کی تلاش میں اپنی ناکامی کا اظہار کیا کہ ''اگر عشاء تک مولانا محمود حسین صاحب حاضر نہ ہوں تو ان کے دونوں رفیقوں مولانا عزیر گل اور حکیم نصرت حسین کو گولی سے اڑا دو اور ان کے مطوف کی مطوفیت چھین لو اور اس کو سو کوڑے لگاؤ۔'' حضرت شیخ الہند کو گرفتار کر کے انگریزوں کے سپرد کرنا اتنا ہی ضروری تھا جتنا ہمارے لیے طالبان کو پکڑ کر امریکہ کے سپرد کرنا تھا۔ تا کہ دوستی میں کوئی رخنہ نہ پڑے۔ حضرت شیخ الہند کو جب اس دھمکی کی اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا: ''مجھے یہ ہرگز گوارا نہیں کہ میری وجہ سے میرے کسی دوست کا بال بیکا ہو۔'' چنانچہ عشاء کے قریب حضرت خود تشریف لے آئے۔ احباب نے اصرار کیا کہ احرام باندھ لیجیے تا کہ یہ کہا جا سکے کہ احرام باندھنے کے لیے حدود حرم کے باہر تشریف لے گئے تھے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ پولیس نے آپ کو فوراً زیر حراست لے لیا۔ آپ کے ساتھ آپ کے تین حضرات اور تھے حکیم نصرت حسین، مولانا عزیز گل اور مولانا وحید احمد صاحب۔ یہ چاروں حضرات قریباً عشاء کے وقت وہاں سے دو اونٹوں پر جدہ روانہ کر دیئے گئے۔ حضرت شیخ احباب سے ملاقات فرما رہے تھے اور ارشاد فرماتے تھے: ''الحمد للہ بمصیبتے گرفتارم نہ بمعصیتے۔''

حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ اس سے قبل گرفتار ہو کر جیل جا چکے تھے اس لیے انہیں حضرت شیخ کی اس گرفتاری کا علم صبح کے وقت ہوا جب احباب انہیں ملنے کے لیے تشریف لے گئے اور کہا کہ ہم نے آپ کی رہائی کے لیے از حد کوشش کی ہے لیکن چونکہ شریف حسین بہت خفا ہے اس لیے آپ کو آٹھ دس روز تک جیل میں رہنا پڑے گا۔ آپ نے احباب سے فرمایا: ''میں تو مدینہ طیبہ سے آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوا ہوں، اگر حضرت مولانا کو ہندوستان کے بجائے کہیں اور بھیجا گیا تو حضرت کی خدمت میں میرا رہنا نہایت ضروری ہے۔ جس طرح ممکن ہو مجھے حضرت مولانا کے پاس بھجوانے کا انتظام فرمائیں۔ انہوں نے کہا: ''یہ تو بہت آسان ہے، ہم ابھی شیخ الاسلام سے جا کر کہتے ہیں کہ مادۂ فساد کا باقی رکھنا مناسب نہیں، مولانا حسین احمد کو بھی مولانا محمود حسن کے پاس پہنچا دینا چاہیے۔'' چنانچہ ظہر کے بعد معلوم ہوا کہ مولانا حسین احمدؒ کو بھی جدّہ لے جانے کا حکم ہوا ہے۔ پھر اگلے روز خچر پر سوار کرا کر آپ کو جدّہ روانہ کر دیا گیا۔

ان سب حضرات کو قریباً ایک ماہ جدّہ میں ٹھہرانا پڑا کیونکہ معتمد برطانیہ کرنل ولسن کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو حکم ہوا کہ ان تمام حضرات کو مصر روانہ کر دیا جائے۔ چنانچہ 18 ربیع الاول 1335ھ/ 12 جنوری 1917ء خدیوی آگبوٹ پر سوار کرا کر ان سب کو مصر روانہ کر دیا گیا 22 ربیع الاول/ 16 جنوری کو آگبوٹ سویز پہنچا۔ وہاں قریباً ڈیڑھ درجن گوروں کی ایک مسلح گارڈ نے ان حضرات کو حراست میں لے کر قاہرہ پہنچا دیا، اور وہاں سے ''جیزہ'' جو قاہرہ کے مقابل نیل کی دوسری جانب واقع ہے، پہنچا دیا گیا، جہاں انگریزوں نے ایک سیاسی جیل خانہ بنایا ہوا تھا۔ اس جیل میں اس وقت قریباً دو سو سیاسی قیدی مختلف ممالک کے اور بھی تھے جن میں اکثر و بیشتر مسلمان تھے۔ اگلے روز حضرت شیخ کو شہر میں لے گئے جہاں جنگی دفتر تھا اور آپ کو ایک علیحدہ کمرے میں کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ وہاں تین انگریز موجود تھے جن میں دو انگریز نہایت صاف اردو بولتے تھے۔ ان کے پاس حکومت ہند کی ایک موٹی سی فائل تھی جن میں ان سب حضرات کے بارے میں سی آئی ڈی کی رپورٹیں تھیں۔ حضرت شیخ کی رپورٹیں بہت زیادہ تھیں۔ ان تینوں انگریزوں نے آپ سے بہت سے سوالات کیے جن کی تفصیل سفر نامہ اسیر مالٹا میں

ہے۔ آپ کو چونکہ انگریزوں سے طبعی نفرت تھی اس وجہ سے آپ نے نہایت بے التفاتی سے اکھڑے اکھڑے جوابات دیئے جس کی بعد میں ان انگریزوں نے حکیم نصرت حسین سے شکایت بھی کی۔ آپ کے رفقاء سے بھی کچھ پوچھ گچھ ہوئی۔ اس کے بعد ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ کوٹھڑیوں میں بند کر دیا گیا۔ اس عرصہ میں ہر ایک کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ پھانسی کا حکم ہو گا لیکن بظاہر کوئی ثبوت فراہم نہ ہو سکے۔ اس لیے ان سب حضرات کو مالٹا جانے کا حکم ہوا۔

22 ربیع الثانی 1335ھ/ 15 فروری 1917ء کو ان سب کو مالٹا روانہ کر دیا گیا جو اس وقت سیاسی اور جنگی قیدیوں کا مرکز تھا۔ 29 ربیع الثانی / 22 فروری کو یہ حضرات مالٹا پہنچے۔ شام کے وقت ان کو اس لیے اتارا گیا کہ شہر والے دیکھیں اور خوش ہوں کیونکہ وہاں کے رہنے والے سب عیسائی تھے، مالٹا میں کوئی تین ہزار کے قریب قیدی تھے۔ گورنمنٹ کے کاغذات میں وہ سب خطرناک قسم کے قیدی تھے۔ مختلف ملکوں کے قیدی تھے گویا مختلف زبانوں کے لوگ تھے۔ کوئی کام اور کوئی خدمت کسی کے ذمہ نہ تھی۔ اس وجہ سے بڑے بڑے لوگوں نے بیکار رہنے کے بجائے مختلف علوم اور زبانیں سیکھنی شروع کر دی تھیں ان قیدیوں میں مختلف زبانوں اور فنون کے ماہر موجود تھے۔ ہر علم اور ہر زبان کی کتاب وہاں دستیاب تھیں ورنہ دیگر ممالک سے منگالی جاتی تھیں۔ اس لحاظ سے یہ اسارت گاہ ایک اچھی خاصی یونیورسٹی بن گیا تھا، دوسرے لفظوں میں یہ جیل خانہ ایک کالج تھا جس میں فکری اور عملی سیاست دونوں کے ماہرین موجود تھے۔ یہاں پر سی آئی ڈی کا کوئی اہل کار نہیں تھا اس وجہ سے ہر شخص نہایت آزادی کے ساتھ تبادلۂ خیالات کر سکتا تھا۔ لیکن یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تمام قیدی انگریزی حکومت اور انگریزی قوم کے نہ صرف مخالف بلکہ دشمن تھے۔ علانیہ انگریزوں کو برا بھلا کہتے۔ کسی ملک میں یا کسی محاذ پر انگریزوں یا ان کے حلیفوں کی شکست کی خبر آتی تو سب خوشیاں مناتے۔ سب ایک دوسرے کے درد و غم میں شریک ہوتے، گویا مصیبتوں نے سب کو اتحاد و اتفاق کے رشتہ میں منسلک کر دیا تھا۔ سب ایک دوسرے کا خیال رکھتے۔ کسی کو کوئی تکلیف پہنچتی تو اس کے ساتھ دلی طور پر اظہار ہمدردی کرتے لیکن انگریزی افسروں اور فوجیوں کو غضب آلود نگاہوں سے دیکھتے۔

حضرت شیخ اور آپ کے ساتھیوں نے تقویٰ، طہارت اور زہد و پاکیزگی کے

باعث وہاں کے سب قیدیوں کو مسخر کر دیا تھا۔ وہ سب آپ کا بے حد احترام کرتے۔ آپ سے نہایت تکریم و تعظیم سے پیش آتے۔ یہاں حضرت شیخ کو تمام زندگی میں سب سے زیادہ فرصت میسر آئی، لہٰذا آپ اپنا ایک ایک لمحہ ذکر خداوندی میں صرف کرتے تھے۔ دن میں اوسطاً دس پارے پڑھ لیتے۔ تین چار ہزار بار اسم ذات کا ذکر فرماتے۔ ترمذی، مشکوٰۃ اور جلالین آپ کے ساتھ تھیں، ان کا بھی مولانا وحید احمد صاحب کو درس دیتے تھے۔ ترجمہ قرآن حکیم کا مشغلہ بھی بہت محبوب تھا۔ حضرت شیخ کو سردی بہت تنگ کرتی۔ آپ کو تو ہندوستان کی سردی بھی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ سردیوں میں اکثر گھٹنوں میں درد رہتا اور ہاتھ پاؤں متورم ہو جایا کرتے تھے، لیکن مالٹا کی شدید سردی میں بھی آپ کی شب بیداری کی عادت بدستور قائم رہی۔ پیشاب بار بار آنے کا عارضہ تھا اس لیے بار بار وضو کرنا پڑتا تھا لیکن کیا مجال کہ سستی آئے۔ رات دس بجے تک مختلف دینی مشاغل میں مصروف رہتے۔ غالباً ستمبر یا اکتوبر 1917ء میں ایک روز آپ کو بلا کر کہا گیا کہ ہمیں حکم آیا ہے کہ آپ کی پوری خاطر داری کریں، لہٰذا فوج کے کپتان کے حقوق اور مراعات آپ کو حاصل ہوں گی۔ گویا مالٹا گوانتاموبے نہ تھا جہاں انسانی حقوق پامال ہو رہے ہیں۔

کتاب کی ضخامت زیادہ ہوتی جا رہی ہے ورنہ میں آپ کو بتاتا کہ علماء نے آزادی وطن کے لیے کیا کیا خدمات انجام دیں اور کیا کیا مصائب و تکالیف برداشت کیں۔ آج کہنے والے کہہ دیتے ہیں کہ یہ علماء جاہل تھے، دقیانوس تھے۔ انہوں نے وطن کی آزادی کے لیے کیا کیا ہے؟ جب ان لوگوں کے بڑے مال و زر بنانے کے لیے انگریزوں کی دربانی، چوکیداری اور ان کی حفاظت و تحفظ کی خدمات انجام دے رہے تھے اس وقت علماء کا یہ گروہ برصغیر پاک و ہند کی آزادی کے لیے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہا تھا۔ وہ بھی اگر اپنی دنیا بنانا چاہتے تو انگریز کی حمایت میں دو بول بول کر سب کچھ اس سے حاصل کر سکتے تھے لیکن لوگوں نے گھروں میں فاقے برداشت کیے، اپنے اہل و عیال کو نان شبینہ کا محتاج رکھا لیکن جس شی کو وہ غلط سمجھتے تھے اس کو دار و رسن پر بھی غلط کہا

ہر بات میں حق بات کا اظہار کریں گے
منبر نہیں ہو گا تو سر دار کریں گے

پھر جو کچھ انہوں نے کیا اس پر انہوں نے کوئی افسوس نہیں کیا، کہ ہائے فلاں خان بہادر نے جاگیر حاصل کر لی، اور فلاں نوابزادہ نے اتنی جائداد بنالی، میں نے اپنی اولاد کے لیے کیا کیا؟ بلکہ انہوں نے مرتے دم تک کہا کہ ؎

حیات خضر بھی اس کے عوض کروں نہ قبول
وہ چار دن جو کہ زنداں میں ہم گزار آئے

حضرت شیخ رحمہ اللہ نے اتنے سال غریب الوطنی کے گزار کر گورنر حجاز غالب پاشا سے جو فرمان حاصل کیا، وہ بھی جب تک قارئین کو نہ بتایا جائے اس وقت تک یہ مضمون ادھورا رہے گا۔ دوسرے غالب پاشا کے اس فرمان سے ایک مجاہد اور غدار کا فرق بھی معلوم ہوگا۔

سید شریف حسین جس کو شریف مکہ بھی کہتے ہیں ترکوں سے غداری کر کے اپنی اولاد کے لیے دنیوی فوائد حاصل کر گیا لیکن مستقبل کا مؤرخ اس کا نام سیاہ حروف میں لکھ رہا ہے اور لکھے گا۔ آئندہ آنے والے مسلمانوں کی نسلیں اس پر لعنت بھیج رہی ہیں کہ اس نے اپنی ذاتی وقتی منفعت کی خاطر مسلمانوں کی خلافت کو ختم کر کے ان کی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جس کے نتیجہ میں صدیوں تک مسلمان اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ اور ایک مجاہد غالب پاشا کو آج بھی ساری دنیا کے مسلمان خراج تحسین پیش کرتے ہیں ع

بولی اماں، محمد علی! جان بیٹا خلافت پہ دے دو



نقل فرمان غالب پاشا گورنر حجاز

قائم مقام (نمائندہ) اعلیٰ حضرت خلیفہ رسول رب العالمین، امیر المؤمنین دام اقبالہ

یہ بات کسی پر مخفی نہیں ہے کہ جنگ عمومی گذشتہ ایک سال سے ترکی کی اسلامی حکومت کا رخ کیے ہوئے ہے۔ روس، فرانس اور انگریز (دشمنان اسلام) ممالک عثمانیہ پر بری اور بحری حملے کر رہے ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر حضرت امیر المؤمنین و خلیفہ المسلمین نے محض اللہ کی نصرت اور خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی روحانی طاقت کے بھروسے پر جہاد مقدس کا اعلان کر دیا جس کے جواب میں ایشیاء یورپ اور افریقہ کے مسلمانوں نے لبیک کہا ہے، اور ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدان جنگ میں کود پڑے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ترکی کی افواج اور مجاہدین کی تعداد دشمنان اسلام کی تعداد سے بڑھ گئی ہے اور انہوں نے دشمنوں کی قوت کو مادی اور اخلاقی طور پر کمزور کر دیا ہے۔ چنانچہ روسیوں کی قوت کا ایک بڑا حصہ قفقازیہ میں تباہ کر دیا گیا ہے اور ایک لاکھ برطانوی اور فرانسیسی فوج اور ان کے جنگی جہاز درۂ دانیال اور دوسرے مقامات پر برباد کر دیئے ہیں۔ ترکوں، جرمنوں اور آسٹریلیوں نے مشرق میں روسیوں کو اور مغرب میں فرانسیسیوں اور بلجمیوں کو پیچھے دھکیل دیا ہے۔ ایک تہائی روسی اور فرانسیسی علاقے اور سارے بلجیئم اور لاکھوں رائفلوں، بندوقوں اور دوسرے سامان جنگ پر قبضہ کر لیا ہے، اور ہزاروں فوجیوں کو قیدی بنا لیا ہے۔ اب بلغاریہ بھی مرکزی قوتوں کے ساتھ شریک ہو کر جنگ میں شامل ہو گیا ہے اور اس نے سربیا کے علاقے میں اندر تک گھس کے وہاں کے لوگوں کو شکست فاش دے دی ہے۔ اس لیے میرا یہ پیغام میرے سلام کے ساتھ ان

مسلمانوں کو پہنچا دیا جائے جو ان حکومتوں کی غلامی میں ہیں کہ وہ اب مکمل طور پر شکست کھا چکی ہیں اور اب بالکل لاچار اور بے یارو مددگار ہیں اور ان کے یعنی مسلمانوں کے سامنے جس قوت و طاقت کا مظاہرہ کیا جارہاہ، وہ محض خیالی ہے۔

مسلمانو! آج تمہاری نجات کا دن ہے، اس لیے اب اپنی ذلت و خواری اور اپنی غلامی پر قانع نہ ہوؤ۔ بلاشبہ آزادی، کامیابی، فتح و نصرت تمہارے ساتھ ہے۔ اب خوابِ غفلت سے بیدار ہو اور متحد و متفق ہو کر اپنے اندر تنظیم و اتحاد پیدا کرو، اپنی صفوں کو درست کرو اور اپنے آپ کو ان چیزوں سے لیس کرو جو تمہارے لیے ضروری اور کافی ہوں، اور پھر ان ظالم و جابر عیسائی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں جس کی غلامی کا کمزور طوق تمہاری گردنوں میں پڑا ہے اس زنجیر غلامی کو اپنے مذہب کی طاقت اور دین کی تیز دھار سے کاٹ ڈالو۔ اس طرح اپنے وجود اور انسانی آزادی کے حقوق کو حاصل کرلو۔ ہم انشاء اللہ عنقریب مکمل فتح اور کامیابی کے بعد معاہدے کریں گے تو تمہارے حقوق کی پوری طرح حفاظت کریں گے۔

اس لیے اب جلدی کرو اور پختہ عزم و ارادہ کے ساتھ دشمن کا گلا گھونٹ کر اسے موت کے منہ میں پہنچا دو، اور اس سے نفرت اور دشمنی کا مظاہرہ کرو، ہم تمہاری طرف بھروسے اور اعتماد کی نظر سے دیکھتے ہیں، اس لیے یہ اچھا موقع ہاتھ سے نہ جانے دو، بددل نہ ہوؤ اور خداوند بزرگ و برتر سے دلی مراد پوری ہونے کی امید رکھو۔

تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ مولانا محمود حسن (جو پہلے دیوبند، ہندوستان کے مدرسے میں تھے) ہمارے پاس آئے اور ہم سے مشورہ طلب کیا۔ ہم اس بارے میں ان سے متفق ہیں، اور ان کو ضروری ہدایات دے دی ہیں۔ ان پر اعتماد کرو۔ اگر وہ تمہارے پاس آئیں تو روپے سے، آدمیوں سے اور جس چیز کی انہیں ضرورت ہو اس چیز سے ان کی مدد کرو۔

(دستخط) غالب (پاشا)
والی حجاز

☆ ☆ ☆

حضرت شیخ الہندؒ کی مالٹا سی واپسی

چار سال کی طویل قید و بند کے بعد 22 جمادی الآخرہ 1338ھ/12 مارچ 1920ء بروز جمعۃ المبارک حضرت شیخ الہند اپنے رفقاء کے ساتھ مالٹا سے سرکاری حفاظت میں روانہ کیے گئے۔ سرکاری نگرانی ہی میں ''سیدی بشر'' میں اٹھارہ روز اور سویس میں پونے دو ماہ قیام کرتے ہوئے 3 ماہ کے بعد 20 رمضان المبارک 1338 / 7 جون 1920ء کو یہ حضرات بمبئی کی بندرگاہ پر اترے اور انہیں اس وقت معلوم ہوا کہ وہ آزاد ہیں۔

حضرت شیخ ابھی جہاز ہی میں تھے کہ ایک سرکاری مولوی ''مولوی رحیم بخش'' انگریزوں کا ایجنٹ ہونے کی حیثیت سے حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور نہایت خیر خواہانہ انداز میں درخواست کی کہ حضرت ہندوستان کے سیاسی جھگڑوں میں شرکت نہ فرمائیں۔ اپنی یہ بات حضرت کے ذہن میں اتارنے کے لیے اس سرکاری مولوی نے کچھ دلائل و براہین بھی دیئے اور کہا کہ اب ضعف آپ پر طاری ہو چکا ہے اور آپ پیری کی منازل سے گزر رہے ہیں، لہٰذا پیری کا یہ زمانہ یادِ الٰہی اور ذکر اللہ میں یا پھر درس و تدریس میں گزار دیں۔ اس قسم کی بے شمار نصائح کیں۔ نیز یہ کہ بمبئی اترتے ہی آپ راستہ میں ہرگز نہ ٹھہریں بلکہ سیدھے دیوبند تشریف لے جائیں۔ اس زمانہ میں ہندوستان میں تحریک خلافت چل رہی تھی۔ اس سرکاری مولوی نے کہا کہ ان خلافت والوں کے ہاتھ نہ آئیں۔ یہ آپ کو خراب کریں گے۔ یہ ساری باتیں اس نے اس انداز میں کیں کہ گویا سب سے بڑا خیر خواہ حضرت شیخ کا پورے ہندوستان میں یہی ہے، لیکن یہاں تو معاملہ دوسرا تھا۔ اس نشۂ کو اس کی نصائح کی یہ ترشی نہ اتار سکتی تھی اب تو سیاست

ہی آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ آپ کے رگ و پے میں سیاست سرایت کر چکی تھی، اس لیے ''مولوی رحیم بخش'' کی گھنٹہ آدھ گھنٹہ کی باتیں اس نشہ کو کیسے اتار سکتی تھیں۔ پھر یہ سیاست تو انبیاء کا شعبہ تھا جیسا کہ حدیث میں ہے:

﴿کانت بنو اسرائیل تسو سهم الانبياء﴾

یعنی بنی اسرائیل کی سیاست ان کے نبی کیا کرتے تھے۔ سیاست تو ایک نہایت پاکیزہ عمل تھا جس کو آج کل کے گندے سیاست دانوں نے گندہ کر کے رکھ دیا۔ آپ کا قلبی اور ذہنی مذاق ہی سیاست تھا۔ مرض وفات کے زمانہ میں کئی مرتبہ فرمایا کہ اگر اس مرض سے اچھا ہو گیا تو اس تحریک کی اشاعت کے لیے سارے ہندوستان میں دورہ کروں گا۔

حضرت شیخ الہندؒ 7 ذی قعدہ 1333ھ/16 ستمبر 1915ء کو ہفتہ کے روز بمبئی سے اکبر نامی جہاز سے جدّہ روانہ ہوئے۔ مکہ مکرمہ میں 22 صفر 1335ھ کو آپ کی گرفتاری عمل میں آئی اور 23 صفر کی رات کو اونٹوں پر سوار کر کے انہیں جدّہ روانہ کر دیا گیا۔ 24 صفر کو حضرت مولانا حسین احمدؒ کو پولیس کی سخت نگرانی میں خچر پر سوار کر کے جدّہ روانہ کر دیا گیا، اور حضرت شیخ الہند اور آپ کے تین رفقاء کے ساتھ انہیں ملا دیا گیا۔ 18 ربیع الاول 1335 / 12 جنوری 1917ء بروز جمعہ حضرت شیخ کو آپ کے ساتھیوں کے ساتھ سویز روانہ کر دیا گیا۔ مصر میں ایک ماہ کے قیام اور سب کے بیانات لے جانے کے بعد 16 فروری 1917ء کو انہیں مالٹا روانہ کیا گیا۔ 21 فروری کی صبح کو جہاز مالٹا پہنچا۔ چار بجے ان گرفتار شدگان کو جہاز سے اتارا گیا۔ مالٹا سے واپسی کا سفر 12 مارچ 1919ء کو شروع ہوا تھا اور راستہ میں اسکندریہ، سید بشر، عدن، بمبئی اور دہلی وغیرہ قیام کرتے ہوئے آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ 10 رمضان المبارک 1338ھ/ 13 جون 1920ء بروز اتوار صبح نو بجے دیوبند واپس پہنچے۔ قمری لحاظ سے حضرت کا سفر چار برس دس ماہ اٹھارہ دن اور شمسی حساب سے چار سال آٹھ ماہ چھبیس روز بنتا ہے۔ آپ کی اس اسارت کے چار سالوں میں ہندوستان کن حالات سے گزرا۔ حکمرانوں نے رعایا پر کیا کیا ظلم کیے؟ یہ داستان تفصیل طلب ہے۔

حضرت شیخ ہندوستان میں جب تشریف لائے تو خلافت کمیٹی نے آپ کے

لیے ''شیخ الہند'' کا خطاب تجویز کیا جو آپ کے اسم گرامی کا جزو لاینفک بن گیا۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ خطاب آپ کے لیے حضرت مفتی کفایت اللہؒ نے تجویز کیا تھا لیکن بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ یہ خطاب آپ کے تلمیذ رشید ابوالوفا حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ نے تجویز کیا تھا۔ کسی نے بھی تجویز کیا ہو لیکن یہ خطاب آپ کے نام کا ایک مقبول اور مشہور جزو بن گیا۔ حضرت تھانویؒ نے ایک ملفوظ میں فرمایا ہے کہ جن لوگوں نے آپ کو یہ خطاب دیا وہ آپ کے اصلی مرتبہ سے ناآشنا تھے۔ انہوں نے ''شیخ العالم'' کو ''شیخ الہند'' بنا دیا۔

خلافت کمیٹی نے بمبئی میں آپ کا فقید المثال استقبال کیا۔ ایڈریس پیش کیے 22-23 رمضان المبارک 1339ء / 9-10 جون 1920ء کو بمبئی میں قیام رہا۔ پھر 25 رمضان کی صبح کو دہلی پہنچے اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی کوٹھی پر قیام فرمایا۔ پھر 26 رمضان بروز اتوار صبح نو بجے آپ دیوبند پہنچے۔ راستہ میں اہل میرٹھ نے بھی ایڈریس پیش کیا۔

حضرت شیخ الہند کوئی بہتر مقرر اور لچھے دار تقریر کرنے والے نہیں تھے۔ آپ صاف صاف اور سادہ باتیں کرتے تھے لیکن آپ کے انفاس قدسیہ اور خلوص نیت کی برکت تھی کہ آپ کی تحریک جنگل کی آگ کی طرح پھیلی اور لوگوں کے دل و دماغ پر اس تحریک کا تسلط ہو گیا۔ جلیانوالہ باغ کا حادثہ بھی پیش آچکا تھا۔ لوگوں کے دل و دماغ میں ایک ہیجان تھا، جذبات مشتعل تھے لیکن مسلمانوں کے دل اطمینان کی دولت سے خالی تھے۔ وہ کسی اطمینان دینے والے کی تلاش میں تھے، چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ کی تشریف آوری نے انہیں اطمینان وسکون کی دولت عطا کر دی۔ ان کے دل مطمئن ہو گئے اور اب مسلمانوں کا قدم دوسری تمام قوموں سے تیز تھا اور ہر شخص تحریک شیخ الہند کا متوالا و شیدا اور جان و مال کو آپ کے قدموں میں نچھاور کرنے والا تھا۔ کچھ لوگ آپ کے مخالف تھے اور مخالفت تو اس دنیا میں ہر ایک کی ہوتی چلی آئی ہے۔ کوئی ایسا نہیں جس کی مخالفت نہ ہوئی ہے۔ یہ مخالفت تو شاہین کو اونچا اڑانے کے لیے ہوتی ہے۔ لیکن ایک بہت تھوڑی تعداد آپ کی مخالف تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ اس وقت پورے ہندوستان کے قائد اور صحیح معنوں میں شیخ الہند تھے۔ یہ حضرت شیخ کی برکت تھی کہ آپ کی پارٹی

کے افراد اور آپ کے چاہنے والے پورے ہندوستان کے مسلمہ لیڈر تسلیم کیے گئے جن میں ایک مولانا محمد علی جوہر بھی تھے۔ جن کے بارے میں گاندھی نے بھی یہ اعتراف کیا تھا کہ "مولانا محمد علی کی جھولی کا ایک مہرہ ہوں۔"

حضرت شیخ الہندؒ کی بیماری:

اس سفر حجاز سے قبل حضرت شیخ گھٹنوں کے درد اور وجع المفاصل (جوڑوں کے درد) میں مبتلا تھے۔ سردیوں میں یہ مرض ترقی کر جاتا تھا۔ سیڑھیوں پر چڑھنا اترنا نہایت مشکل ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں بواسیر اور کثرت بول وغیرہ کی بھی شکایت رہتی تھی لیکن اس سفر اور زمانہ اسارت میں ان تکالیف میں خاصی کمی آ گئی۔ مالٹا نہایت سرد مقام ہے۔ ان حضرات کو پہلے خیموں میں رکھا گیا۔ خیموں کے باہر سردی تو انتہائی درجہ کی ہوتی تھی، لیکن اندر بھی سردی کی نہایت شدت تھی۔ سردی کی شدت کی وجہ سے رات نیند نہیں آتی تھی، لیکن حضرت شیخ حسب معمول رات ڈیڑھ دو بجے اٹھتے۔ پیشاب وغیرہ سے فارغ ہو کر ٹھنڈے پانی سے وضو کرتے، اور چونکہ رات میں کئی بار پیشاب آتا تھا تاہم بلا تکلیف بار بار وضو فرماتے۔ اگرچہ بعد میں ساتھیوں نے گرم پانی کا انتظام بھی کر دیا لیکن کافی عرصہ آپ ٹھنڈے پانی سے ہی وضو فرماتے رہے۔ بیماریوں کی شکایات تمام سفر میں نمودار نہیں ہوئیں، البتہ ہندوستان پہنچ جانے کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں یہ ساری بیماریاں لوٹ آئیں اور پھر تیزی سے بڑھنے لگیں۔ لیکن ان بیماریوں میں بھی حضرت کا جذبۂ آزادی وطن نہ صرف قائم رہا بلکہ قوی اور شدید ہو گیا۔ بار بار فرماتے تھے کہ میں پختہ ارادہ کیے ہوئے ہوں کہ اس بیماری سے اچھا ہوتے ہی تمام ہندوستان کا دوبارہ دورہ کروں گا۔ اور اگر عمر وفا کرتی تو آپ ایسا ضرور کرتے لیکن حق تعالیٰ کو یہ منظور نہ تھا۔ اگرچہ یونانی اور ایلو پیتھک معالجوں کی فراوانی تھی، لیکن تقدیر کے سامنے تدبیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ آپ کو اپنی بیماریوں کے علاوہ سب سے بڑا غم جو اندر ہی اندر سے آپ کو کھائے جا رہا تھا اور اسی نے ان امراض کو پھر واپس لوٹایا وہ ترکوں کی شکست اور اپنی جدوجہد کی ناکامی کا صدمہ تھا جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوا۔ مالٹا سے رہائی کے بعد قریباً

تین ماہ راستہ کی مشقت بھی آپ کی بیماریوں کی شدت کا سبب بنی۔ پھر ہندوستان پہنچنے پر مخلوق کا ہجوم، مشاغل کی کثرت یہ سب چیزیں اضافہ مرض کا سبب بنتی رہیں۔ لیکن یہ شیخ الہند کی ہمت اور آپ کا استقلال تھا جو ان بیماریوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ بعض حضرات کا یہ بھی کہنا کہ آپ کو تپ دق کا آخری اسٹیج تھا۔ چلنا پھرنا تو دور کی بات ہے بیٹھنا بھی ممکن نہ تھا لیکن اس حالت میں بھی تحریک قیادت جاری ہے۔ مختلف اجلاسوں میں شرکت ہو رہی ہے اور ان کی صدارت فرمائی جا رہی ہے۔

جامعہ ملّیہ کی تاسیس:

تحریک خلافت اپنے پورے عروج پر تھی۔ انگریزوں کی غداری سے لوگوں میں سخت برہمی تھی۔ ترک موالات کا جوش تھا۔ لوگ یہ چاہتے تھے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی انگریزوں سے ترک تعلق کرے۔ لیکن یونیورسٹی کے پرانے ٹرسٹی اور ارکان اس پر آمادہ نہیں ہو رہے تھے۔ انہوں نے اس مطالبہ کی سخت مخالفت کی۔ جس کے نتیجہ میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم اور ان کے ہم خیال لوگوں کے ساتھ یونیورسٹی کی ایک بہت بڑی جماعت نے یونیورسٹی کا بائیکاٹ کر دیا، اور ایک آزاد درس گاہ قائم کرنے کے لیے جس میں انگریزوں کی کوئی مداخلت نہ ہو، اس کی تیاری کرنے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں ناگپور میں کانگرس کا اجلاس ہوا تھا اور اس میں نان کواپریشن (Non Co-operation) کی تحریک پاس ہو چکی تھی۔ ملک کے تمام اہل الرائے ہندو اور مسلمان برطانیہ سے نہایت برگشتہ ہو رہے تھے۔ حضرت شیخ الہند سے ترک موالات کے بارے میں یونیورسٹی کے طلبہ نے فتویٰ حاصل کر لیا تھا اور آپ نے تمام مسلمانوں اور مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کو زور دار مشورہ دیا تھا کہ اس، پر عمل کریں۔ گورنمنٹ سے قطع تعلق کریں، اور تمام کالج اور اسکول حکومتی امداد چھوڑ دیں، اور اگر کالجوں اور اسکونوں کے زعماء حکومت سے امداد اور گرانٹ لینا نہ چھوڑیں تو طلباء ایسے کالجوں اور اسکولوں سے نکل آئیں۔ نیز انگریزی حکومت کے ملازمین ان ملازمتوں سے علیحدہ ہو جائیں جن میں حکومت کی امداد خاص طور پر ہوتی ہے۔ اس فتویٰ کی وجہ سے حکومت نے سر رحیم بخش کو خصوصی طور پر دوسری

مرتبہ حضرت شیخ کو سمجھانے اور فتویٰ کو واپس لینے کے لیے بھیجا تھا، لیکن حضرت نے اس کی کوئی بات نہ مانی، وہ فتویٰ نقش حیات جلد دوم ص ۲۵۳۔ ۳۵۵ پر درج ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے صاحبزادہ حافظ محمد احمد صاحبؒ کو حکومت کی طرف سے ''شمس العلماء'' کا خطاب سر جیمس گورنر یو۔ پی نے دلوایا تھا، حضرت شیخؒ نے اس کو واپس کروایا اور ایسی مؤثر تقریر فرمائی کہ حضرت حافظ صاحبؒ اور تمام مجمع متاثر ہو کر بیک زبان واپسی کا متقاضی ہوا۔ الغرض اسی تحریک اور اسی فتویٰ اور اسی تحریر کی بنا پر مسلم نیشنل یونیورسٹی قائم کرنے کی بنیاد ڈالی گئی جو کہ بعد میں جامعہ ملیہ کے نام سے موسوم ہوئی۔

(نقش حیات: جلد۲ص ۲۵۵)

اہل علم نے اس مسلم نیشنل یونیورسٹی کا جلسہ کرنا چاہا تو حضرت شیخ الہند کو صدارت کے لیے منتخب کیا۔ حضرت اس زمانہ میں سخت بیمار تھے، چلنا پھرنا ناممکن تھا۔ رفقاء اور خدام نے اس سفر کو نہایت خطرناک اور نہایت تکلیف دہ قرار دیا۔ دوسری طرف صدارت کی دعوت دینے والوں کا اصرار تھا کہ ہماری تمام جدوجہد کی کامیابی کا مدار اس پر ہے کہ حضرت صدارت فرمائیں۔ دیر تک فریقین کی گفتگو سننے کے بعد حضرت شیخؒ نے فرمایا:

''اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو میں اس جلسہ میں ضرور شریک ہوں گا۔''

چنانچہ 16 صفر 1339ھ/ 29 اکتوبر 1920ء اجلاس کی تاریخ مقرر ہوئی۔ حضرت نے خطبہ صدارت کا مضمون حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کو بلا کر تحریر کرنے کا حکم فرمایا۔ اور جب مولانا شبیر احمد مسودہ لکھ کر لائے تو اسے سن کر حسب منشاء ترامیم فرما کر چھپنے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ ایک پالکی میں لٹا کر حضرت شیخؒ کو دیوبند کے اسٹیشن پر لے گئے۔ دارالعلوم دیوبند کے طلباء نے پالکی کو اپنے کندھوں پر اٹھایا۔ علی گڑھ پہنچ کر حضرت شیخ نے جامعہ ملیہ کا سنگ بنیاد رکھا جو اس نظریہ کے مطابق قائم کیا گیا تھا کہ علوم عصریہ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ایسی آزاد درس گاہ ہو جو حکومت کی گرانٹ اور اس کے اثرات سے بالکل آزاد ہو، اور جس کا تمام تر نظام عمل اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔

یہ اجلاس 29 اکتوبر 1920ء کو علی گڑھ میں ہوا۔ حضرت شیخ کا خطبہ صدارت

آپ کے تلمیذ رشید حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے پڑھا۔ اس صدارتی خطبہ کے مندرجہ ذیل اقتباسات یادگار ہیں۔ اس خطبہ میں آپ نے فرمایا:

1- ''میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں آپ کی اس دعوت پر اس لیے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گم شدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے، لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا جلد اٹھو اور اس امت مرحومہ کو کفار کے نرغہ سے بچاؤ تو ان کے دلوں پر خوف و ہراس مسلط ہو جاتا ہے۔ خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامان حرب وضرب کا۔''

پھر چند سطور کے بعد ارشاد فرمایا:

2- ''اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار (جس میں میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم ''علی گڑھ'' کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں ''دیو بند اور علی گڑھ'' کا رشتہ جوڑا۔

3- ''آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے اکابر سلف نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان کے سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم وفنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔ ہاں یہ بے شک کہا گیا کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں، یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور اپنے مذہب والوں کا مذاق اڑائیں، یا حکومت کی پرستش کرنے لگیں، تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لیے جاہل رہنا ہی اچھا ہے۔

4- ''ہماری قوم کے سربرآوردہ لیڈروں نے سچ تو یہ ہے، کہ امت اسلامیہ کی ایک بہت بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا۔ بلاشبہ مسلمانوں کی درس گاہوں میں

جہاں علوم عصریہ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہو، اگر طلباء اپنے مذہب کے اصول وفروع سے بے خبر ہوں اور اپنے قومی محسوسات اور اسلامی فرائض فراموش کردیں، اور ان میں اپنی ملت اور اپنی قوموں کی حمیت نہایت ادنیٰ درجہ پر رہ جائے تو یوں سمجھو کہ وہ درس گاہ مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانے کا ایک آلہ ہے۔ اس لیے اعلان کیا گیا ہے کہ ایسی آزاد یونیورسٹی کا افتتاح کیا جائے گا جو گورنمنٹ کی اعانت اور اس کے اثر سے بالکل علیحدہ ہو، اور جس کا تمام نظام عمل اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔'' (نقش حیات، جلد۲ص ۲۶۵۔۲۵۷)

ہندوستان میں انگریزی حکومت اور تعلیم اور زبان کے متعلق جو ارشاد حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا ہے وہ من وعن درست اور صحیح ہے۔ اور یہ اسکول اور کالج کھولے اور کھلوائے بھی اسی مقصد کے لیے گئے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

> ''مسلمانوں میں بھی عیسائیوں کی طرح وہ لوگ اقلیت میں ہیں جو واقعی باغیرت اور خوددار ہوں۔ دنیا دار لوگ ہمیشہ قائم شدہ حکومت کا ساتھ دیتے ہیں۔ ہمارے اینگلوانڈین اسکولوں سے کوئی نوجوان خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، ایسا نہیں نکلتا جو اپنے اباء واجداد کے مذہب سے انکار کرنا نہ جانتا ہو۔ ایشیا کے پھلنے پھولنے والے مذاہب جب مغربی سائنس کے یخ بستہ حقائق کے مقابلہ میں آتے ہیں تو سوکھ کر لکڑی ہو جاتے ہیں۔ ان بے دینوں کی بڑھتی ہوئی نسل کے علاوہ ہم کو عافیت پسند طبقہ کی امداد حاصل ہے۔ یہ لوگ جو کچھ بے ضرر اعتقادات اور تھوڑی بہت جائداد کے مالک ہیں، اپنی نمازیں ادا کرتے اور بڑے اہتمام سے مسجدوں میں جاتے ہیں لیکن ضروری اور اہم مسائل پر سوچنے کی قطعاً پروانہیں کرتے۔
>
> (ولیم ہنٹر، ہمارے ہندوستانی مسلمان: ص ۲۰۲)

مسلم نیشنل یونیورسٹی کا سنگ بنیاد 29 اکتوبر 1920ء کو حضرت شیخ الہندؒ کے دست مبارک سے علی گڑھ میں رکھا گیا تھا۔ انگریز پرستوں اور خصوصی طور پر علی گڑھ کالج

کے اراکین نے اس کی سخت مخالفت کی بلکہ اس کو بند کرانے کی سر توڑ کوشش کی، لیکن چونکہ اس کا وجود قومی زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت کے تحت ہوا تھا، پھر اس کا سنگ بنیاد بھی ایک ایسی پاکیزہ شخصیت کے ہاتھوں رکھا گیا تھا، اس لیے اس کو بند کرانا ممکن نہ تھا، لہٰذا ان سب رکاوٹوں اور مخالفتوں کے باوجود یہ ادارہ روز بروز ترقی کی منزلیں طے کرتا چلا گیا۔ اس مسلم نیشنل یونیورسٹی کا نام بعد میں مولانا ابوالکلام آزاد نے جامعہ ملیہ تجویز کیا جو آج تک چل رہا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر اس کے شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) اور حکیم اجمل خان اس کے امیر (چانسلر) مقرر ہوئے۔ 1921ء کے آخر میں مولانا محمد علی مقدمہ کراچی میں ماخوذ ہوئے تو عبدالمجید خواجہ کو ان کا شیخ الجامعہ مقرر کیا گیا۔ 1927ء میں حکیم اجمل خان کے انتقال کے بعد ڈاکٹر مختار احمد انصاری کو اس کا چانسلر بنایا گیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی وائس چانسلری کے زمانے میں یہ قومی درسگاہ اپنے بام عروج کو پہنچی اور قومی اور سیاسی حلقوں میں اس کا نام عزت و احترام سے لیا جانے لگا۔ آزادی ہندوستان کی تاریخ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا نام کئی حوالوں سے ہمیشہ یادگار رہے گا۔

جمعیت علماء کے جلسہ کی صدارت:

علی گڑھ میں جامعہ ملیہ کے سنگ بنیاد کے اجلاس سے فراغت کے بعد حضرت شیخ رحمہ اللہ دہلی تشریف لے گئے اور ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر قیام فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت توجہ سے حضرت کا علاج شروع کیا۔ چونکہ اس سے قبل امرتسر میں جمعیۃ العلماء کا انعقاد مولانا عبدالباری فرنگی محلی رحمہ اللہ کی مساعی جمیلہ اور مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید اور دیگر حضرات کی جدوجہد سے ہو چکا تھا، اور جمعیۃ کا پہلا جلسہ بھی وہیں ہو چکا تھا، اس لیے اہل الرائے حضرات نے یہ ضروری سمجھا کہ اب اس کا دوسرا اجلاس دہلی میں بڑے پیمانے پر حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی صدارت میں منعقد کیا جائے۔ کیونکہ حضرت رحمہ اللہ کو عام مقبولیت حاصل ہے اور مسلمان سب سے زیادہ آپ کے گرویدہ ہیں اور آپ پر پورا اعتماد ہے۔ چنانچہ ان علماء نے آپ سے صدارت کی استدعا کی جس کو آپ نے قبول فرمایا اور 7-8 اور 9 ربیع الاول اجلاس کی تاریخ مقرر کی گئی۔ حضرت شیخ رحمہ اللہ نے مولانا مفتی

کفایت اللہ کو صدارتی خطبہ کی تحریر پر مامور فرمایا اور ضروری مضامین آپ کو بتا دیئے۔ چنانچہ انہوں نے خطبہ لکھا اور حضرت نے اس میں ضروری ترامیم کے بعد اس کو چھپوانے کا حکم فرمایا۔ خود حضرتؒ اس قدر بیمار تھے کہ دہلی میں موجود ہونے کے باوجود جلسہ میں تشریف نہ لا سکے۔ اس وجہ سے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے آپ کا وہ خطبہ اجلاس میں آخری روز پڑھا۔ اگرچہ آپ کا یہ خطبہ نہایت مختصر تھا لیکن ملی سیاست کے تقاضے پورا کرنے کے لیے کافی تھا۔ حضرتؒ نے اس خطبہ میں علماء اسلام کو مندرجہ ذیل اصول نظریات کی ہدایت فرمائی:

1- اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن انگریز ہے جس سے ترک موالات فرض ہے۔

2- تحفظ ملت اور تحفظ خلافت کے خالص اسلامی مطالبہ میں اگر برادرانِ وطن ہمدردی اور اعانت کریں تو جائز اور مستحق شکریہ ہیں۔

3- استخلاص وطن کے لیے برادران وطن سے اشتراک عمل جائز ہے مگر اس طرح کہ مذہبی حقوق میں رخنہ واقع نہ ہو۔

4- اگر موجودہ زمانے میں توپ، بندوق اور ہوائی جہاز کا استعمال مدافعت اعداء کے لیے جائز ہو سکتا ہے (باوجودیکہ قرون اولیٰ میں یہ چیزیں نہ تھیں) تو مظاہروں اور قومی اتحادوں اور متفقہ مطالبوں کے جواز میں تامل نہ ہوگا، کیونکہ موجودہ زمانے میں ایسے لوگوں کے لیے جن کے ہاتھ میں توپ، بندوق اور ہوائی جہاز نہیں یہی چیزیں ہتھیار ہیں۔ (خطبہ صدارت: ص ۱۶ بحوالہ علمائے حق)

آپ نے اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا:

''کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ شانہ نہیں آپ کے ہم وطن اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر التعداد (ہنود) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول میں مؤید بنا دیا ہے، اور میں دونوں قوموں کے اتفاق و اتحاد کو بہت ہی مفید اور منتج سمجھتا ہوں، اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لیے

فریقین کے عمائد نے کی ہے اور کر رہے ہیں، اس کے لیے میرے دل میں بہت قدر ہے، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورت حالات اگر اس کے مخالف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لیے ناممکن بنا دے گی۔ ادھر دفتری حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا اور اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلا سا نقشہ باقی رہ گیا ہے تو وہ بھی ہماری بداعمالیوں سے حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہے گا، اس لیے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں عنصر بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر تینوں عنصر اگر صلح و آشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ وہ کتنی ہی بڑی طاقتور ہو، ان اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر و استبداد سے شکست دے سکے گی؟

ہاں! یہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت اور آشتی کو اگر آپ اور پائیدار اور خوش گوار دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح دل نشین کر لیجئے، اور وہ حدود یہی ہیں کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں ان سے کوئی رخنہ نہ پڑے جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ اس صلح و آشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور سے کسی ادنیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے، اور دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے کسی ایک فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری مقصود ہو۔

"مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے۔ مذہبی معاملات میں تو بہت لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لیے اپنے مذہب کی حد سے گزر جاتے ہیں لیکن محکموں اور ابواب معاش میں ایک دوسرے کی ایذا رسانی کے درپے رہتے ہیں۔

''میں اس وقت جمہور سے خطاب نہیں کر رہا ہوں بلکہ یہ گذارش دونوں قوموں کے زعماء لیڈروں سے ہے کہ ان جلسوں میں ہاتھ اٹھانے والوں کی کثرت اور ریزولیوشنوں کی زبانی تائید سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے کہ یہ طریقہ سطحی لوگوں کا ہے۔ ان کو ہندو مسلمانوں کے نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصبانہ رقابتوں کا اندازہ کرنا چاہیے۔

اگر فرض کرو کہ ہندو مسلمان کے برتن سے پانی نہ پیے یا مسلمان ہندو کی ارتھی کو کندھا نہ دے تو ان دونوں کے لیے مہلک نہیں، البتہ ان دونوں کی وہ حریفانہ جنگ آزمائی اور ایک دوسرے کو ضرر پہنچانے اور نیچا دکھانے کی وہ کوششیں جو انگریزوں کی نظروں میں دونوں قوموں کا اعتبار ساقط کرتی ہیں، اتفاق کے حق میں سم قاتل ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات میرے اس مختصر مشورے کو سرسری نہ سمجھ کر ان باتوں کا علمی انسداد کریں گے۔

آپ نے مسلمانانِ ہند اور علمائے ملت کو وصیت فرمائی:

''جو صراط مستقیم آپ نے معلوم کرلیا ہے، قرآن وسنت کی روشنی میں اس پر سیدھے چلتے جایئے اور یمین وشمال کی طرف مطلق التفات نہ کیجئے۔

﴿ان هذا صراطي مستقيماً فاتبعوه، ولا تتبعوا السبل فتفرق بكم عن سبيله﴾

''جو لوگ آپس میں علیحدہ ہیں ان کو بھی حکمت اور مواعظ حسنہ سے اپنی جماعت کے اندر جذب کیجئے اور اگر اس میں مجادلہ کی نوبت آئے تو ''بالتی ھی احسن'' ہونی چاہیے۔''

(خطبہ صدارت: ص ۱۷، بحوالہ علمائے حق: ص ۲۴۹۔۲۵۰)

حضرت شیخ الہند کا وصال:

حضرت مولانا محمود حسنؒ کی بیماری کے بارہ میں گذشتہ صفحات میں کچھ بیان کیا گیا ہے اس کی تفصیل وغیرہ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ نے اپنی کتاب ''حیات شیخ الہندؒ'' میں دی ہے۔ علی گڑھ سے جامعہ ملیہ کی تاسیس کے بعد آپ سید ھے دہلی تشریف لائے اور یہاں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے ہاں قیام فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب نے حضرتؒ کے علاج میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ دہلی میں جمعیۃ کا دوسرا اجلاس ہوا جس کی صدارت آپ نے کرنا تھی لیکن کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے آپ اجلاس میں نہ پہنچ سکے اور آپ کا خطبہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے پڑھا۔ 14 ربیع الاول 1339ھ تک حالت کچھ اطمینان بخش تھی۔ 15 ربیع الاول کو پھر لرزہ بخار آیا اور حالت نہایت نازک ہو گئی۔ بخار بہت تیز تھا۔ حالت اگرچہ تشویش ناک تھی تاہم ہوش وحواس بجا تھے۔ آدمی کو پہچانتے تھے۔ بہت نحیف آواز سے کچھ بات بھی فرماتے تھے۔ 18 ربیع الاول کی تمام رات یہی حالت رہی۔ سینہ پر بلغم جما ہوا تھا جس کو ضعف کی وجہ سے رفع نہیں کر سکتے تھے۔ صبح کو شہد کا شربت دیا گیا تو خلاف امید حلق میں اتر گیا۔ 6 بجے کچھ اجابت ہوئی۔ اس کمزوری کی وجہ سے ایک استغراقی کیفیت طاری تھی۔ مخصوص لوگ چارپائی کے گرد موجود تھے۔ دل دھڑک رہے تھے، ہر ایک کی طبیعت ہراساں تھی کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ حضرت دنیا سے یک قلم غافل ہو گئے۔ تنفس طویل اور غیر طبعی ہو گیا اور انقطاع عن الدنیا اور توجہ الی الرفیق الاعلیٰ کا گمان غالب ہونے لگا۔ چارپائی کے گرد حاضرین خاموشی اور آہستگی سے ذکر اللہ میں مشغول تھے کہ اسی حالت میں حضرتؒ نے اس غیر فانی اور واجب الوجود ہستی کو یاد کیا جس کے نام پر اپنے آپ کو محو کر دیا تھا یعنی بلند آواز سے تین مرتبہ اللہ اللہ فرمایا۔

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا بیان ہے کہ حضرت نے تھوڑی دیر آنکھ کھول کر چھت کی طرف دیکھا۔ پھر فرمایا کہ مرنے کا تو کچھ افسوس نہیں ہے مگر افسوس ہے کہ میں بستر پر مر رہا ہوں۔ تمنا تو یہ تھی کہ میں میدان جہاد میں ہوتا اور اعلاء کلمۃ الحق کے جرم میں میرے ٹکڑے کئے جاتے، اس کے بعد بلند آواز سے سات مرتبہ اللہ اللہ کہا اور آٹھویں

مرتبہ آواز بند ہوگئی۔ دیکھا تو زبان تالو سے لگی ہوئی تھی۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب نے سورۃ یٰسین شروع کی مگر وہ جوش گریہ اور ادب کی وجہ سے بلند آواز سے نہیں پڑھ سکتے تھے، اس لیے مولوی حافظ محمد الیاس صاحب نے پڑھنا شروع کیا۔ سورۃ قریب الختم ہوئی تو حضرتؒ نے خود بخود حرکت کر کے اپنا بدن سیدھا اور درست کرلیا۔ ہاتھوں کی انگلیاں کھول کر سیدھی کرلیں اور آٹھ بجے جب کہ مولوی صاحب بالکل سورت کے اخیر میں پہنچے تو حضرت نے ذرا آنکھ کھولی اور تصدیق قلبی کی تائید کے لیے زبان کو حرکت دی اور خاص "الیہ ترجعون" کی آواز پر قبلہ رخ ہوکر ہمیشہ کے لیے آنکھ بند کرلی اور نہایت سہولت سے سانس منقطع ہوگیا اور روح مقدس "روح و ریحان و جنۃ نعیم" کی بہار دیکھنے کے لیے تمام اہل اسلام کو یتیم و بے کس چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوئی اور رفیق اعلیٰ سے جا کر مل گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

"وفات سرور عالم ﷺ کا یہ نمونہ ہے۔" (سوانح شیخ الہندؒ: ص ۱۴۷)

غم زدہ اور پریشان حال حاضرین کے صدمے اور قلق و بے قراری کا اندازہ آسان نہیں ہے۔ کچھ دیر تو وہ حالت رہی کہ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔ کسی کی آہ نکلی تو کوئی سر پکڑ کر بیٹھ گیا لیکن حضرتؒ کا فیض صحبت کام آیا اور رضا بالقضاء کا مضمون غالب ہوا۔

نصف گھنٹہ کے بعد ڈاکٹر انصاری نے حضرتؒ کے بھائی حکیم محمد حسن اور خدام سے پوچھا کہ اگر آپ دہلی میں دفن کرنا مناسب سمجھیں تو محدثین کے مزارات میں بندوبست کیا جائے۔ (اس سے مراد قبرستان مہندیاں جہاں شاہ ولی اللہؒ اور ان کا خاندان دفن ہے) اور اگر دیوبند کا خیال ہے تو پھر وہاں کا انتظام کیا جائے۔ بتایا گیا کہ حضرت کی خواہش تھی کہ اپنے مخدوم استاد کے جوار میں جگہ ملے اور یہی آرزو آپ کو مالٹا سے ادھر کھینچ کر لائی ہے۔ نیز صاحبزادیاں بھی اب تک دہلی نہ پہنچیں تھیں، اس لیے دیوبند لے جانے کی رائے ہوئی۔

ڈاکٹر انصاری مرحوم نے دیوبند اس مضمون کا مفصل تار دیا کہ "حضرت شیخؒ کی وفات ہوگئی ہے۔ جنازہ شام کو دیوبند پہنچے گا۔" اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کفن اور تابوت اور ریل کے انتظام میں مصروف ہو گئے۔ آپ کے بھائی حکیم محمد حسن صاحب نے مخصوص شاگردوں کی امداد سے بطریق مسنون غسل دیا اور کفن پہنا کر تابوت

میں رکھا۔ 12 بجے تک یہ سارے انتظامات مکمل ہو گئے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کوٹھی کے سامنے میدان میں ایک مرتب بڑے مجمع کے ساتھ نماز جنازہ ادا کی گئی۔ پھر جنازہ آہستہ آہستہ ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ اسٹیشن تک جاتے تعداد کوئی بیس ہزار ہو گئی وہاں پھر دوسری دفعہ نماز پڑھی گئی۔ ساڑھے سات بجے رات کو تابوت دیوبند پہنچا۔ اسٹیشن سے مکان تک بہت دیر سے جنازہ پہنچا۔ قبر چونکہ پہلے سے تیار تھی لہٰذا اکثر کی رائے یہ تھی کہ ابھی رات ہی کو تدفین کا مرحلہ طے ہو جائے، لیکن چونکہ صاحبزادیاں اور داماد جو کہ فوتیدگی کا تار ملنے کے بعد دیوبند سے دہلی روانہ ہو چکے تھے، ابھی راستہ ہی میں تھے، لہٰذا فیصلہ یہ کیا گیا کہ تدفین صبح کی جائے۔ صبح نماز جنازہ دارالعلوم میں پہنچایا گیا اور حضرت کے دلی اقرب اور برادر عزیز حکیم محمد حسن بادل مضطر اور چشم تر نماز جنازہ پڑھانے کھڑے ہوئے تمام لوگوں پر ایک سکوت طاری تھا اور ایک ہیبت و نورانیت دیکھی جا رہی تھی۔ جنازہ مقبرہ پہنچا یعنی بیالیس برس کی ظاہری جدائی کے بعد دنیا کی کشاکش سے استراحت کے لیے یہ شاگرد رشید فخر استاذ اپنے مقدس مرشد و استاد کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ جنازہ قبر کے پاس رکھا گیا مولانا حکیم محمد حسن اور حضرت کے داماد اور بعض مخصوص خدام نے قبر میں اتر کر قدوۃ الواصلین، امام المحدثین والعارفین، بخاری زمان، کوہ وقار و حلم، آفتاب معرفت وعلوم، گنجینۂ حکمت الٰہیہ اور خزینہ احادیث سنن نبویہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کو لحد میں اتار دیا گیا اور شریعت و طریقت کے آفتاب عالمتاب کو ہمیشہ کے لیے نظروں سے چھپا دیا گیا۔ ایک غم زدہ کی زبان نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا ؎

مٹی میں کیا سمجھ کے چھپاتے ہو دوستو
گنجینۂ علوم ہے یہ گنج زر نہیں

آپ کے بعض جانثاروں نے مرثیے لکھے جن میں سے ایک مرثیے کا شعر ہے ؎

فقط ایک آپ کے دم سے نظر آتے تھے سب زندہ
بخاری و غزالی، بصری و شبلی و نعمانی

(نقش حیات: جلد۲ص ۲۶۵ـ۲۷۱)

☆ ☆ ☆

جمعیت علمائے ہند کا قیام

حضرت شیخ الہند کے زمانہ اسارت میں ہندوستان میں بہت سے واقعات رونما ہوئے جن میں ایک جلیانوالہ باغ کا حادثہ فاجعہ بھی تھا 13 اپریل 1919ء میں یہ ہوا۔ ظلم و بربریت کے اس مظاہرے نے ہندوستان کے سیاسی راہ نماؤں اور علماء کو انگریزی استعمار اور بربریت کے مقابلہ میں قومی اتفاق و اتحاد کا مظاہرہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ علماء ہند نے اپنے ایک اجلاس میں جمعیت کے قیام کے بارے میں غور وفکر کیا۔ جمعیت کی تاریخ تو گذشتہ ایک صدی پر پھیلی ہوئی ہے اور یہ دراصل نتیجہ ہے حضرت شیخ الہند کے ''ثمرۃ التربیت'' کا۔ ثمرۃ التربیت کا قیام ہی دراصل جمعیت کے قیام کی تحریک کا نقطہ آغاز تھا، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ 1866ء میں دارالعلوم دیوبند کا قیام ہی جمعیت العلماء کا قیام تھا اور تحریک دارالعلوم دیوبند دراصل آزادی وطن کی ایک تحریک تھی جس کی آبیاری کے لیے حضرت شیخ اور ان کے ساتھیوں نے مالٹا تک قید و بند کی صعوبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ کئی لوگوں نے اپنا وطن اور گھر بار چھوڑا، اہل وعیال اور رشتہ داروں کی جدائی برداشت کی، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور کئی ایسے بھی تھے جنہوں نے دار و رسن کو بھی گلے لگایا۔ آزادی ملنے پر بھی قریباً 10 لاکھ مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا، قریباً ساٹھ ہزار سے زائد مسلمان عورتیں ہندوؤں اور سکھوں کے قبضہ میں چلی گئیں۔ لوگوں نے لاکھوں کی تعداد میں اپنے وطنوں کو چھوڑا جہاں وہ پیدا ہوئے تھے، ان کا بچپن گزرا تھا، ان کا لڑکپن گزرا تھا۔ لوگوں نے قافلوں کی شکل میں کوسوں سفر کیا، اور آج آزادی کے بعد جو لوگ اقتدار پر قابض ہوئے وہ اسلام کو چھوڑ کر رقص وسرود اور طاؤس و

رباب میں منہمک ہو گئے ہیں اور آج ٹیلی ویژن پر قوم کے بیٹوں اور بیٹیوں کو رقص و سرود کا رسیا بنا رہے ہیں۔ نوجوان لڑکیاں اور لڑکے ناچ رہے ہیں، گویا بتایا یہ جا رہا ہے کہ یہ ساری قربانیاں صرف اس مادر پدر آزادی کے لیے کی گئی تھیں۔

غرضیکہ نومبر 1919ء کی آخری تاریخوں میں خلافت کانفرنس کے ایک اجلاس کی تقریب سے ہندوستان کے تمام علاقوں سے بہت سے علماء دہلی میں جمع ہوئے۔ خلافت کانفرنس سے فراغت کے بعد دہلی میں موجود علماء نے ایک جلسہ منعقد کیا جس میں صرف علماء شریک ہوئے۔ حضرت مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسریؒ کی تحریک اور مولانا منیر الزمان اور دوسرے حاضر علماء کی تائید سے حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ اس جلسہ کے صدر قرار پائے، اور پھر حضرت مولانا کی اجازت سے مندرجہ ذیل کاروائی شروع ہوئی۔

طے یہ ہوا کہ ہندوستان کے مختلف گروہوں اور مختلف اقوام کی انجمنیں قائم ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں جو متفقہ جدوجہد اور اخوتِ اتحاد سے بہت کچھ ملک و قوم کی خدمت کرتی ہیں اور اتفاق و اتحاد کی برکات سے خود بھی مستفید ہو رہی ہیں اور ملک و قوم کو بھی فائدہ پہنچاتی ہیں، لیکن آج تک ہندوستان کے علماء کی کوئی متفقہ جماعت یا انجمن قائم نہیں ہوئی۔ چنانچہ بحث و مباحثہ کے بعد تمام حاضرین نے اس بات پر اتفاق کیا کہ علماء کی جماعت بھی ایسے تمام امور میں جو قریباً تمام مذہبی فرقوں میں متفق علیہ ہیں، متفقہ طور پر شریک ہو کر کام کر سکتی ہے، اور یہی ایک صورت ہے جس میں دینی وقار اور علمی شوکت قائم رہ سکتی ہے کہ علماء اپنی ایک مضبوط، مستحکم اور مقتدر جماعت قائم کریں، اور صرف مشترکہ مذہبی اور سیاسی امور میں اہل اسلام کی راہ نمائی کا فریضہ ادا کریں۔ ان کی آواز اسی وقت با وقعت اور اہمیت کی حامل ہو سکتی ہے جب کہ وہ ایک باقاعدہ منظم جماعت کی طرف سے بلند ہو اور ان کی تعلیم و رہنمائی کی تکمیل اسی صورت سے ہو سکتی ہے کہ اسے اتفاق و اتحاد کی قوت سے مؤثر بنائیں۔

یہ ایسے امور تھے کہ ان کی معقولیت میں کسی کو کلام کرنے کی گنجائش نہ تھی، اس وجہ سے تمام حاضرین جلسہ نے بالاتفاق یہ طے کر لیا کہ علماء کی ایک جمعیت قائم کی جائے اور اس کا نام ''جمعیت علمائے ہند'' رکھا جائے اور پھر اس کے حلقہ کو وسیع کر دیا جائے

تا کہ پورے ہندوستان کے علماء اس میں شریک ہوسکیں۔ اور ملک کے ہر گوشہ میں اس جمعیت کے ارکان تمام مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے ذرائع اور وسائل پر غور وفکر کر کے سچی مذہبی خیرخواہی اور ہمدردی کے ساتھ راہ نمائی کی جاسکے۔ چنانچہ اس وقت تمام حاضرین نے جمعیت العلماء کی رکنیت قبول کر لی اور اسی اجلاس میں جمعیت علمائے ہند کے نام سے ایک جماعت قائم ہوگئی۔ اور قرار پایا کہ آئندہ دسمبر کی آخری تاریخوں میں جماعتوں کے اجلاس امرتسر میں ہونے والے ہیں، اور مسئلہ خلافت اور ترکی کے مسائل پر بحث کرنے کے خیال سے علمائے اسلام کی ایک معقول تعداد وہاں موجود ہوگی، اس لیے مناسب یہ ہے کہ اس موقع پر جمعیت علمائے ہند کا جلسہ بھی کیا جائے اور ابتدائی مراحل طے کر لیے جائیں۔ حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ اور حضرت مولانا سید محمد داوٗد غزنویؒ نے جمعیت علمائے ہند کے موجودہ ارکان کو امرتسر میں تشریف لانے کے لیے اسی وقت دعوت دے دی اور یہ بات بالاتفاق طے ہوگئی کہ جمعیت کا آئندہ اجلاس آئندہ دسمبر میں امرتسر میں ہوگا۔

دہلی کی اس میٹنگ یا جلسہ میں جن حضرات نے شرکت کی تھی وہ حسب ذیل تھے:

حضرت مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی، حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری، مولانا سلامت اللہ صاحب، حضرت پیر محمد امام صاحب سندھی، مولانا اسد اللہ صاحب سندھی، مولانا سید محمد فاخر صاحب، مولانا محمد انیس صاحب، خواجہ غلام نظام الدین صاحب، مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی، مولانا حافظ احمد سعید صاحب دہلوی، مولانا سید کمال الدین صاحب، مولانا قدیر بخش صاحب، مولانا تاج محمد صاحب، مولانا محمد ابراہیم صاحب دربھنگہ، مولانا خدا بخش صاحب مظفر پوری، مولانا مولا بخش صاحب امرتسری، مولانا عبدالحکیم صاحب گیاوی، مولانا محمد اکرم خان صاحب، مولانا منیر الزمان صاحب، مولانا محمد صادق صاحب کراچی، مولانا سید محمد داوٗد صاحب غزنوی، مولانا سید اسماعیل صاحب، مولانا محمد عبداللہ صاحب اور مولانا آزاد سبحانی وغیرہم۔

جب جمعیت کا قیام عمل میں آ گیا اور اس کا آئندہ اجلاس امرتسر میں طے ہونا

بھی قرار پا گیا تو مولانا ثناء اللہ صاحب نے ایک تحریک یہ پیش کی کہ جمعیت علمائے ہند کے لیے بالفعل کوئی عارضی صدر جس کو آج کل کی اصطلاح میں کنوینر کہتے ہیں اور ایک عارضی ناظم (سیکرٹری) مقرر کرلیا جائے تاکہ ضروری امور کے انتظام و انصرام کی ایک آسان صورت میسر ہو جائے۔ اور صدارت کے لیے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ کا نام اور نظامت کے لیے مولانا حافظ احمد سعید دہلوی کا نام پیش کرتا ہوں۔ اگرچہ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب نے صدارت قبول کرنے سے معذرت کی لیکن حضرات حاضرین نے اس تحریک کو جس کی تائید مولانا سلامت اللہ صاحب، مولانا مظہر الدین صاحب، مولانا محمد اکرم خان صاحب اور دیگر علماء کر چکے تھے، منظور کرلیا اور بالآخر مفتی صاحب کو بھی عہدہ صدارت قبول کرنا پڑا، اور مولانا احمد سعید صاحب نے بھی نظامت قبول فرمالی۔ اس کے بعد بالاتفاق حاضرین نے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا محمد اکرم خان صاحب، ایڈیٹر اخبار محمدی کو جمعیت کے اغراض و مقاصد اور ضوابط کا مسودہ تیار کرنے کے لیے کہا اور طے پایا کہ یہ مسودہ جمعیت کے آئندہ دسمبر میں امرتسر میں ہونے والے اجلاس میں پیش کریں۔ اس کے بعد دعائے خیر و برکت کر کے جلسہ برخاست کیا گیا اور اس طرح جمعیۃ علماء ہند کا قیام عمل میں آیا:

امرتسر میں جمعیت علمائے ہند کا پہلا اجلاس:

28 دسمبر 1919ء کو بعد نماز عصر امرتسر میں اسلامیہ ہائی اسکول کے وسیع و عریض کمروں میں جمعیت کا پہلا جلسہ ہوا جس میں بہت سے علماء نے شرکت کی۔ چنانچہ مفتی کفایت اللہ صاحب کی تحریک پر اس جلسہ کے صدر مولانا عبدالباری قرار پائے۔ اس تحریک کی تائید مولانا قاضی حبیب اللہ صاحب اور مولانا محمد فاخر صاحب نے کی اور تمام حاضرین نے اس سے اتفاق کیا۔ پھر صاحب صدر کی اجازت سے درج ذیل کاروائی عمل لائی گئی۔

1- حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب نے انعقاد جمعیت و جلسہ دہلی کی مختصر روئداد بیان کی۔

-2 جناب مولانا ابوتراب محمد عبدالحق اور مولانا عبدالرزاق وغیرہ نے جمعیت کے انعقاد کی ضرورت پر زور دیا اور کہا یہ دیرینہ فرائض کو ادا کرنے کی ایک منظم صورت ہے۔

-3 سید جالب صاحب ایڈیٹر اخبار ہمدم نے انعقاد جمعیت پر بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ جب علماء کی کئی انجمنیں صوبہ وار قائم ہو چکی ہیں تو فطری طور پر اس کا تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ ایک آل انڈیا جمعیت علماء قائم کی جائے لیکن میرے نزدیک علماء کو جداگانہ اپنی جمعیت قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ مذہبی راہ نمائی تو اس کا ہمیشہ سے فریضہ ہے اور وہ اسے انجام بھی دے رہے ہیں۔ رہی سیاسی رہنمائی تو اس کے لیے مسلمانوں کی ایک جماعت (مسلم لیگ) پہلے سے قائم ہے۔
علماء سیاسی مسائل کو اگر مذہب کے موافق طے کرانا چاہتے ہیں تو ان کے لیے یہ آسان طریقہ ہے کہ وہ مسلم لیگ کے ساتھ مل کر کام کریں۔ ارکان لیگ مذہبی امور میں علماء کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کو تیار ہوں گے۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ لیگ میں علماء کے انتخاب اور نیابت کا علیحدہ انتظام کر دیا جائے۔ اس میں تعلیم یافتہ جماعت کی اصلاح بھی ہو جائے گی اور امور سیاست مذہب کے مطابق طے ہوتے رہیں گے۔ علماء کے کام کرنے کے لیے بہت سے میدان پڑے ہیں، مثلاً وہ اقتصادیات میں ترقی کرنے کی لوگوں کو ترغیب دیں۔ صنعت وحرفت کی ترقی پر وعظ کریں۔ تعلیم یافتہ اشخاص کی شخصی طور پر اصلاح کریں کہ وہ یورپین تہذیب اور یورپین عادات واطوار کو ترک کریں وغیرہ وغیرہ۔ پس میں ان حالات میں مناسب نہیں سمجھتا کہ جمعیۃ علمائے ہند قائم کی جائے۔

-4 حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نے جمعیۃ العلماء کے قیام کی ضرورت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جمعیت علمائے ہند کے قائم کرنے کی دوسری مذہبی یا سیاسی انجمن سے مصادمت یا مزاحمت مقصود نہیں ہے بلکہ علماء اپنی آواز کو وقیع

بنانے کے لیے جمعیۃ منعقد کر رہے ہیں، اور دنیا میں ہمیشہ سے یہ قاعدہ چلا آتا ہے کہ افراد کی آواز اتنی وقعت نہیں رکھتی جتنی کہ متحدہ جمعیت بطور ایک انجمن کے رکھتی ہے۔ مسلم لیگ میں جب کبھی مذہبی مسائل زیر بحث آئے ہیں، علماء نے برابر اس میں حصہ لیا ہے۔ مسلم لیگ کا اجلاس دہلی اس بیان کا شاہد ہے اور آئندہ جمعیۃ العلماء مسلم لیگ کے ساتھ اتفاق عمل رکھنے کی پوریٰ کوشش کرے گی۔ فرق صرف اس قدر ہوگا کہ اب تک مسلم لیگ میں علماء کی شرکت شخصی اور انفرادی حیثیت سے تھی اور اب جمعیۃ علماء کا فیصلہ مسلم لیگ میں بحیثیت ایک متفق علیہ دستور العمل کے پیش کیا جایا کرے گا۔

یہ صحیح ہے کہ علماء کے لیے اقتصادیات اور شخصی اصلاح کے وسیع میدان کھلے ہوئے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ اقتصادیات اور شخصیات کی اصلاح کرنے میں علماء کی انفرادی حیثیت ہی مفید ہو اور انعقاد جمعیت اس میں خلل انداز ہو بلکہ میں کہتا ہوں کہ انفرادی حیثیت کے اعتبار سے جمعیت علماء کی متفقہ طاقت زیادہ اصلاح کر سکتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ اقتصادیات و شخصیات کی اصلاح تو علماء کا فرض ہو اور سیاست سے علیحدہ رہنے کی انہیں ہدایت کی جائے، اور سیاسیات کو مذہبی دائرہ سے خارج سمجھ کر ان لوگوں کے لیے چھوڑ دیا جائے جو مذہبی معلومات پر چنداں عبور نہیں رکھتے۔

5- مولانا ثناء اللہ صاحب نے مفتی کفایت اللہ صاحب کی تقریر سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے فرمایا کہ سید جالب صاحب کا غالباً مدعا یہ ہے کہ جمعیۃ علماء ایسی اعلیٰ پیمانے پر قائم کی جائے کہ اس میں مذہبیات اور سیاسیات کے علاوہ اقتصادیات اور شخصیات وغیرہ کی اصلاح کا بھی کافی انتظام ہو تو میں سید صاحب کو یقین دلاتا ہوں کہ طبعی ترتیب کے لحاظ سے ہر شی ترقی کے مدارج تدریجی طور پر طے کرتی ہے۔ ہم نے ابھی اسکول کی بنیاد رکھی ہے اور ہمارا پختہ ارادہ ہے کہ انشاء اللہ ہم اس کو کالج کے مرتبہ تک پہنچا دیں گے لیکن ابھی سے ہمیں یہ صلاح دینا کہ ابتداء ہی سے کالج قائم کرنا طبعی سلسلہ کے خلاف ہے۔

6- غازی محمود صاحب نے بھی مفتی کفایت اللہ صاحب کی پرزور تائید کی اور کہا کہ جمعیت علمائے ہند کا قیام نہایت ضروری ہے اور موقع کے لحاظ سے ہے، مثال کے طور پر لدھیانہ کے ایک تازہ واقعہ کا ذکر کیا کہ مسیحی مشن مسلمانوں کے ایک محلے کو برباد کرنے کی کوشش کر رہی ہے جس میں ایک مسجد اور دینی تعلیم گاہ بھی داخل ہے۔ اگر جمعیۃ علماء قائم ہوتی تو اس کی متفقہ اور متحدہ طاقت مشن کی اس کوشش کو روکنے میں بہت زیادہ مفید اور کارگر ہوتی۔

7- مختصر یہ کہ مفتی کفایت اللہ صاحب نے اغراض و مقاصد کا اجمالی نقشہ پیش کیا۔ اس کے بعد جناب حکیم حافظ اجمل خان صاحب جلسہ میں تشریف لائے اور آپ نے انعقاد جمعیت سے اپنا دلی اتفاق ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ میں جمعیت کے انعقاد سے بہت خوش ہوا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اس جمعیت کا نظام عمل ایسے عمدہ اور اچھے اصول پر مرتب کیا جائے گا جس سے مذہب اور مسلم قوم کی عظیم الشان اسلامی خدمت ہو سکے گی۔ اور آپ نے تحریک فرمائی کہ اساسی اصول اور ضوابط کا مسودہ مرتب کرنے کے لیے ایک کمیٹی کا انتخاب کر دیا جائے۔ اس تحریک کی اکثر حضرات نے تائید کی، اور پھر باتفاق حاضرین اس کمیٹی کے لیے مندرجہ ذیل حضرات کا انتخاب ہوا۔

مولانا ثناء اللہ صاحب، مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا محمد اکرم خان صاحب، مولانا منیر الزمان خان صاحب۔

مولانا عبدالباری صاحب نے حکیم اجمل خان کا نام بھی اس میں شامل کرنے کی تحریک فرمائی اور حاضرین نے اس سے اتفاق بھی کیا لیکن حکیم صاحب نے فرمایا کہ میں اس قدر کثیر المشاغل ہوں کہ مجھے کمیٹی کے جلسہ میں شامل ہونے کی بھی بالکل فرصت نہیں ہے۔ یہ ممکن ہے کہ چار حضرات مسودہ تیار کر لیں اور پھر میں بھی اسے دیکھ کر اپنی رائے کا اظہار کر دوں۔ عذر نہایت صحیح اور درست تھا، لہٰذا زیادہ اصرار نہ کیا گیا اور اساسی اصول وضوابط کا مسودہ تیار کرنے کی خدمت مذکورہ بالا حضرات کے سپرد کر دی گئی۔ مغرب کا وقت ہو گیا تھا لہٰذا دعا کر کے جلسہ برخاست کر دیا گیا۔

جمعیت کے اس جلسہ میں کچھ تجاویز بھی پاس ہوئیں اور اصول وضوابط بھی پیش کیے گئے اور مجلس نے ان کی منظوری بھی دی۔

پھر جمعیت العلماء کے دوسرے سالانہ اجلاس منعقدہ 19-20-21 نومبر 1920ء میں جو دہلی میں ہوا، مندرجہ ذیل حضرات کو عہدیداران جمعیۃ منتخب کیا گیا۔

صدر	حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی
نائب صدر مستقل	حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب
اعزازی نائب صدر	ہر صوبہ کی جمعیۃ کے صدر مرکزی جمعیۃ کے اعزازی نائب صدر ہوں گے
ناظم	مولانا احمد سعید صاحب دہلوی
معین ناظم	مولانا عمر دراز بیگ مراد آبادی، مولانا عقیل الرحمٰن ندوی
خازن	شیخ فضل الرحمٰن سوداگر چاندنی چوک، دہلی

30 نومبر یعنی دس روز کے بعد حضرت شیخ الہندؒ کا انتقال ہو گیا لہٰذا حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کو صدر بنا دیا گیا۔ حضرت مفتی صاحب 1939ء تک یعنی 19 سال اس منصب پر فائز رہے۔

☆ ☆ ☆

جمعیت علماء کی چند کارگزاریاں

جمعیت کے قیام کے بعد علماء کو کام کرنے میں نہایت آسانی ہوگئی۔ پہلے علماء کا کام انفرادی تھا اب جماعتی ہو گیا۔ یہ سب مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی اس سیاسی فکر کا نتیجہ تھا جو دیوبند کی سیاسی تحریک میں مضمر تھی۔ ان کے ذہن میں مستقبل میں سیاسی جدوجہد کے لیے ایک مرکز کے قیام کی ضرورت کا تصور تھا اور اسی تصور کے مطابق انہوں نے اپنے شاگرد خاص حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی کی تربیت کی تھی۔ مولانا محمود حسن نے 1880ء میں ثمرۃ التربیت کے قیام سے اس ذوق کی تخم ریزی کی۔ پھر 1909ء میں جمعیت الانصار کی تحریک سے ایک نئے دور کی تحریک کو رقم کرنا شروع کیا اور پھر جو تاریخ انہوں نے رقم کی اس کی ایک مختصر روئیداد گذشتہ صفحات میں بیان کی جا چکی ہے۔ اب وہی تحریک جمعیۃ علمائے ہند کے نام سے موسوم ہو کر وجود میں آئی جس میں نہ صرف دیوبندی علماء تھے بلکہ غیر دیوبندی علماء کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد موجود تھی، اور اب اس جمعیت نے سیاست کے نئے دور کا آغاز کیا۔ جس دور میں جمعیت علمائے ہند کا قیام عمل میں آیا یہ دراصل ثمرۃ التربیت کی تخم ریزی کا ایک عمل صالح تھا جو وجود میں آیا۔ اور ملک کے سیاسی حالات کا بھی سخت تقاضا تھا کہ علماء کی یہ جمعیت قائم ہو۔ اس وقت کے دیوبندی علماء اگر وقت کے اس تقاضے کو محسوس نہ کرتے تو اقدام وسعی میں سبقت کا یہ شرف دوسرے حاصل کر لیتے۔

جمعیت علمائے ہند کی تحریک دراصل دارالعلوم دیوبند کی تحریک کی ایک فرع اور شاخ تھی۔ ٹھیک اسی طرح دیوبندی مسلک کے وہ علمائے کرام جنہوں نے تحریک

پاکستان میں بھر پور حصہ لیا تھا، تو یہ پاکستان کی تحریک بھی بزرگان اور اکابر دیوبند کے سیاسی مقاصد ہی کی ایک شکل تھی کیونکہ ان دو گروہوں میں اختلاف آزادی کے نصب العین اور آزادی کے بعد برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی آبرو مندانہ اور اجتماعی اسلامی زندگی کے قیام کے بارے میں نہ تھا بلکہ اصل اختلاف اور نزاع یہ تھا کہ مطلوبہ اسلامی زندگی متحدہ ہندوستان میں میسر آسکتی ہے یا نہیں؟ اس بارہ میں جمعیۃ علمائے ہند کے اکابر کے دلائل بہت قوی تھے اور پاکستان کی نصف صدی سے زائد کی تاریخ نے ان کی اصابت رائے پر مہر صداقت ثبت کر دی ہے، اور اب حالات دن بدن پاکستان کو اس کے مقصد سے دور لے جا رہے ہیں، اور اب تو ترکی کی طرح اس کو سیکولر بنانے کوشش کی جا رہی ہے۔ متحدہ قومیت کے مقابلہ میں قائداعظم نے جو دو قومی نظریہ پیش کیا تھا اس کو جھٹلا کر مخلوط انتخاب کو گذشتہ الیکشن میں رواج دیا گیا۔ اور مسلمان اور غیر مسلم دونوں کو ایک قومیت شمار کیا گیا ہے۔ اس وقت جو یہ کہا گیا تھا وہ بھی دراصل قوم کو ایک دھوکہ دیا گیا تھا اور اس دھوکہ میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف تھانوی قدس سرہ بھی آ گئے جن کے حکم پر شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اور حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ وغیرہ حضرات نے دن رات مسلم لیگ کے لیے کام کیا۔ لیگی لیڈروں کو الیکشن میں کامیاب کروایا۔ نہ ان لوگوں نے پاکستان میں اسلام نافذ کرنا تھا اور نہ ہی اسلام نافذ کرنے کا ان کو کوئی ارادہ تھا۔ چنانچہ پاکستان کی سب سے پہلی کیبنٹ جو بنائی گئی تھی اس کا وزیر قانون ایک بنگالی ہندو جوگندوناتھ منڈل تھا، جس نے پاکستان میں اسلامی قانون بنانا تھا اور حکومت الٰہیہ کو پاکستان میں قائم کرنا تھا۔ وہ خود ایک سال کے بعد رات کو چوری پاکستان سے ہندوستان بھاگ گیا اور آج اٹھاون برس کے بعد وہ پاکستان جو اسلامی نظریہ کے تحت بنایا گیا تھا، وہ اسلام کے نظریہ سے دور ہوتا گیا۔ اسلام تو اس ملک سے ختم ہو گیا البتہ نام اسلامی جمہوریہ رہ گیا۔ معلوم نہیں وہ کب ختم ہوتا ہے؟ لیکن اس حقیقت سے بھی کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ اگر حکیم الامت مولانا اشرف تھانویؒ مسلم لیگ کی حمایت اور مطالبۂ پاکستان کے حق میں اپنا فتویٰ اور فیصلہ

بنام تنظیم المسلمین 10 فروری 1938ء کو صادر نہ فرماتے تو مسلم لیگ کو کون جانتا اور پاکستان کیسے وجود میں آتا۔ اگر حکیم الامت تھانوی قدس سرہ کے مریدین اور متوسلین شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ، حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ، حضرت مولانا شبیر علی تھانویؒ، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ، حضرت مولانا عبدالجبار صاحب ابوہریؒ، حضرت مولانا شمس الحق فرید پوریؒ، حضرت مولانا اطہر علی سلہٹیؒ، حضرت مولانا عبدالغنی پھول پوریؒ، حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ، حضرت مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوریؒ، علامہ سید سلیمان ندوی، حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسریؒ اور حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھریؒ وغیرہ پاکستان کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ نہ لیتے تو کون کہہ سکتا ہے کہ پاکستان معرض وجود میں آتا؟

وہ پاکستان جو اسلام کے نام پہ بنا بڑی مشکل سے اس میں قرارداد مقاصد منظور ہوئی لیکن قرارداد مقاصد کو غیر مؤثر کرنے کی پوری پوری کوشش کی گئی۔ اللہ مغفرت فرمائے جنرل ضیاء الحق کی جنہوں نے اس قرارداد مقاصد کو آئین کا حصہ بنایا۔ اس امور کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ انشاء اللہ اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں بیان کی جائے گی۔

مختصر یہ کہ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب قدس سرہ پورے بیس سال تک جمعیت علمائے ہند کے صدر رہے اور اس عرصہ میں انہوں نے سیاسی دعوت اور عمل دونوں میدانوں میں اپنے تدبر اور پختہ سیرت کا ثبوت فراہم کیا۔

جشن صلح کا مقاطعہ:

پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کو شکست ہوگئی اور ترکی جرمنی کا حلیف تھا۔ لہٰذا انگریز اور ان کے اتحادیوں نے ترکی کو جرمنی کا ساتھ دینے کی یہ سزا دی کہ تمام غیر مسلم ریاستیں ترکی سے الگ کر دی گئیں اور اسے صلح کی شرائط میں اس طرح جکڑ دیا گیا کہ ''نہ جائے رتن نہ پائے ماندن''، ان شرائط میں اس کے اقتدار کی نفی تک بات پہنچ گئی۔ اس خوشی میں کہ ترکی کی حکومت بے بس اور منتشر کر دیا گیا ہے، برطانیہ اور اس کے مقبوضات

میں جشن فتح منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن ہندوستان کے بیدار مغز اور حریت پسند طبقہ نے کہا کہ اس پر جشن نہیں سوگ منانا چاہیے، مسلمانوں کی ذلت و رسوائی پر صف ماتم بچھانی چاہیے نہ کہ جشن مسرت کا اہتمام کیا جائے۔ چنانچہ آزادی پسند طبقہ نے جشن فتح کا مقابلہ کرنے کا عزم کر لیا۔ خلافت کمیٹی کے پلیٹ فارم سے حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نے اس جشن فتح کے بائیکاٹ کی تجویز پیش کی جو منظور کر لی گئی۔ کانگرس کا فیصلہ بھی وہی تھا جو خلافت کمیٹی کا تھا 24 نومبر 1919ء کو ہندو مسلم کانفرنس گاندھی کی زیر صدارت دہلی میں ہوئی، اس نے بھی مقاطعہ اور بائیکاٹ کا متفقہ فیصلہ کیا۔ اس وقت جمعیت علمائے ہند تو قائم نہیں ہوئی تھی، لیکن اس کو وجود میں لانے والے تمام علماء دہلی میں موجود تھے۔ انہوں نے دونوں کانفرنسوں میں شرکت کی۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے خلافت کانفرنس منعقدہ 23 نومبر 1919ء میں جو تحریک مقاطعہ پیش کی تھی اور اس پر جو تقریر کی تھی، اس کے چند اقتباسات حسب ذیل ہیں۔ آپ نے فرمایا:

> ''شرعاً ایسی حالت میں کہ مقامات مقدسہ خلیفۃ المسلمین کے قبضہ سے باہر ہیں اور بغداد شریف، بیت المقدس اور نجف اشرف وغیرہ غیر مسلموں کے قبضہ میں ہیں، مسلمان کسی طرح بھی ایسی صلح کی خوشی میں شریک نہیں ہو سکتے۔ جس کا نتیجہ اس وقت تک اس کے سوا کچھ نہیں نکلا کہ امیر المومنین خلیفۃ المسلمین کے قبضۂ اقتدار سے ان کے ممالک نکال لیے گئے ہیں اور اسلام کی دنیاوی طاقت و اقتدار کو زائل کیا جا رہا ہے۔''
>
> ''میں طبقہ علماء سے ہوں اور شرعی نقطہ نظر سے کہتا ہوں کہ مسلمان کسی طرح ایسی صلح کی خوشی میں شریک نہیں ہو سکتے، اگر ہوں گے تو شرعاً گنہگار ہوں گے۔''

اس تقریر کے بعد حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے جو ریزولیشن پیش کیا تھا وہ یہ ہے:

> ''یہ جلسہ ان دل دوز واقعات کو پیش نظر رکھ کر جو سلطنت ترکی کی

خلافت، مقامات مقدسہ اور سلطنت ایران کے متعلق اس صلح کے
نتیجہ کے طور پر پیش آئے، مذہبی نقطۂ نظر سے تجویز کرتا ہوں کہ
ہندوستان کے مسلمانوں کو جشن صلح میں کوئی حصہ نہ لینا چاہیے۔"

تطہیر حجاز کی تحریک:

سید شریف حسین گورنر حجاز جس ترکی خلافت کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے جون 1917ء میں اور ترکی فوج کو قتل کر کے (جس کا ذکر گذشتہ میں مختصر کیا گیا ہے) حجاز پر قابض ہو گیا تھا۔ اس بغاوت کے پیچھے برطانیہ کا ہاتھ تھا اور انگریزوں ہی کی مدد نے اس نے فتح حاصل کی تھی اور ترکوں کو حجاز سے نکالا تھا۔ اس کا یہ فعل اتنا گھناؤنا تھا کہ مستقبل کا مؤرخ یہ کہنے پر مجبور ہے کہ اس سید زادے نے مسلمانوں کو پوری دنیا میں ذلیل و رسوا کیا۔ اس کے اس رسوائے زمانہ فعل سے نہ صرف ممالک اسلامیہ بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی سخت بے چینی پھیل گئی تھی۔ قبضہ تو اس نے حجاز پر کر لیا لیکن نہ اس نے انتظام کی طرف کوئی توجہ کی اور نہ ہی یہ انتظام اس سے ہو سکتا تھا، کیونکہ رائے عامہ اس کے سخت خلاف تھی اور نہ صرف اس کی اپنی رعایا میں بلکہ ہندوستان میں بھی اضطراب پھیلتا اور بڑھتا رہا۔ علاوہ ازیں اس نے کچھ ایسے کام بھی انجام دیئے جن کی وجہ سے وہ لوگوں کے لیے قابل نفرین ہو گیا، مثلاً سابق ترکی حکام پر مظالم، ان کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دینا، حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقاء کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کرنا اور پھر جزیرۂ مالٹا میں ان کی اسارت وغیرہ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آٹھ سال کے اندر اندر امیر عبدالعزیز ابن سعود آل فیصل نے اس کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا اور ایک سال کے اندر اندر پورا عرب و حجاز امن و امان کا گہوارہ بن گیا۔ ابن سعود کی آمد اور اس کے حسن انتظام کے باعث برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں میں اطمینان و سکون کی لہر دوڑ گئی۔ حکومت کے اس انقلاب میں علمائے دیوبند اور پنجاب کے اہل حدیث علماء نے شریف کے اقتدار کو ختم کرنے میں خاص مدد کی تھی۔ چنانچہ 1925ء کے اواخر تک عرب و حجاز ایک نئے دور میں داخل ہو گیا۔ حجاز کی اس تطہیر کے تمام اعمال

حضرت مفتی کفایت صاحبؒ کے دور صدارت میں انجام پائے تھے۔ چنانچہ وہ ان خدمات کے لیے تحسین کے بجا طور پر سزاوار ہیں۔عرب پر اپنا تسلط قائم کرنے کے بعد 26ذی قعدہ 1322ھ/7جون 1926ء کو مکہ معظّمہ میں عالم اسلام کے مطالبہ پر ایک مؤتمر بلائی گئی تھی۔اس میں حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کی زیر قیادت جمعیت علمائے ہند کا ایک وفد شریک ہوا۔اس مؤتمر کے لیے جو سبجیکٹ کمیٹی تشکیل دی گئی تھی اس میں مفتی اعظم فلسطین کے بعد آپ کا نام تھا۔مؤتمر میں شرکت کے لیے جو وفد مکہ معظّمہ گیا تھا اس میں حسب ذیل ارکان مختلف حیثیتوں سے شریک تھے:

1- حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ (رئیس وفد)
2- حضرت مولانا عبدالحلیم صدیقی (پرائیویٹ سیکرٹری رئیس وفد)
3- مولانا محمد عرفان ہزاروی (سیکرٹری وفد)
4- علامہ شبیر احمد عثمانی دیوبندیؒ (رکن وفد)
5- حضرت مولانا احمد سعید دہلوی (رکن وفد)
6- حضرت مولانا نثار احمد کانپوری (رکن وفد)

اس وفد نے مؤتمر کی کاروائی میں بھرپور حصہ لیا اور اپنے علم و فضل اور اعتدال پسندی کا نقش تمام شرکاء کے دلوں پر چھوڑا۔

ترک موالات اور تحریک خلافت:

ترکی خلافت کے اقتدار کے استحکام، مملکت کی سرزمین اور اس کے حدود کے تحفظ، اقتدار و اختیارات کے کامل نفوذ کے لیے اہل ہند کی منظم کوششوں اور اس کے حدود و مملکت میں مداخلت، اس کے محروسات میں بغاوت پھیلانے کی کوششوں اور اس کے مقبوضات کو اس سے الگ کرنے کی سازشوں، غیر مسلم رعایا خاص طور پر عیسائیوں کو ترکی کے خلاف بھڑکانے کی حرکات اور اس پر جنگ مسلط کر دینے کے خلاف منظم اعمال انجام دینے کا جو فیصلہ کیا گیا تھا، اس کا نام ''تحریک خلافت'' ہے۔

ترکی کے مقابل چونکہ انگریز صف آرا تھے اور یہی استعماری قوت ہندوستان پر

قابض تھی جس سے نجات کی ایک زوردار تحریک چل رہی تھی، اس لیے خلافت کمیٹی کے مقاصد میں ہندوستان کی آزادی کا حصول بھی شامل کر لیا گیا تھا۔ تحریک خلافت کو کامیاب بنانے کے لیے جو لائحہ عمل اور پروگرام تجویز کیا گیا تھا، اس کا عنوان ''ترک موالات' تھا۔ ترک موالات فی نفسہ مقصد نہ تھا بلکہ مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔

(علمائے حق: ص ۳۵۶)

تحریک خلافت میں سب سے زیادہ حصہ مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے۔ مولانا آزاد تین سال نو ماہ جلاء وطن اور نظر بند رہنے کے بعد جب رہا ہوئے تو رہا ہوتے ہی سیاسی سرگرمیوں اور ہنگامہ آرائیوں میں کھو گئے۔ رہا ہونے کے بعد آپ فوراً دہلی پہنچے اور 20 جنوری 1920ء کو حکیم اجمل خان کے دولت کدہ پر گاندھی جی سے آپ کی پہلی ملاقات ہوئی۔ جب انہیں رہا ہوئے صرف تین ہفتے گزرے تھے تو دہلی کے اجلاس میں ترکی اور خلافت کے مسائل پر مسلمانوں کا نقطۂ نظر واضح کرنے کے لیے وائسرائے سے ملاقات کی تجویز پیش ہوئی اور ایک وفد تشکیل دینے پر غور ہوا۔ اس وفد میں مولانا کو بھی شامل کیا گیا لیکن آپ نے وفد میں شامل ہونے سے انکار کر دیا، البتہ یادداشت پر دستخط کر دیئے۔ ان کی رائے تھی کہ اب معاملہ عرض داشتوں اور وفدوں کی منزلوں سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ وائسرائے نے وفد کو مایوس کن جواب دیا، البتہ مسلمانوں کو پیش کش کی کہ اگر حکومت کے سامنے مطالبات پیش کرنے کے لیے کوئی وفد انگلستان بھیجنا مقصود ہو تو حکومت ضروری سہولتیں فراہم کرنے کے لیے تیار ہے۔

وائسرائے کے مایوس کن جواب کے بعد اب گاندھی جی بھی مولانا آزاد کے ہم خیال ہو گئے کہ اب عرض داشتوں اور ملاقاتوں کا زمانہ گزر گیا ہے۔ جنوری 1920ء کے ایک جلسہ میں جس میں اور حضرات کے علاوہ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خان، مولانا آزاد اور مولانا عبدالباری بھی موجود تھے، گاندھی جی نے حکومت سے ہر قسم کا عدم تعاون کرنے کا پروگرام پیش کیا۔ مولانا آزاد کے مطابق گاندھی جی نے کہا: ''ہمیں حکومت کی تائید کرنے اور تقویت پہنچانے سے ہر طرح سے پرہیز کرنا چاہیے۔ یہی طریقہ حکومت کو آمادہ کر سکتا ہے کہ وہ ہم سے معاملہ کرے۔ انہوں نے

تجویز کیا کہ تمام سرکاری خطابات واپس کر دیئے جائیں، عدالتوں اور سکولوں کا بائیکاٹ کیا جائے، ہندوستانی سرکاری ملازمتوں سے استعفا دے دیں اور جو نئی قانون ساز جماعتیں بننے والی ہیں، ان میں ہر طرح سے حصہ لینے سے انکار کر دیں۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں: ''گاندھی کی تجویز اصلاً ٹالسٹائی کا خاکہ تھی جو اس نے بہت سال پہلے پیش کیا تھا۔ 1901ء میں ایک انارکسٹ نے اٹلی کے بادشاہ پر حملہ کیا تھا۔ اس وقت ٹالسٹائی نے انارکسٹ کے نام ایک کھلا خط شائع کیا جس میں لکھا تھا کہ تشدد کا طریقہ اخلاقی اعتبار سے غلط اور سیاسی نقطۂ نظر سے بے سود ہے۔ اگر ایک شخص قتل کیا گیا تو ہمیشہ کوئی دوسرا اس کی جگہ لینے کے لیے مل جائے گا۔ درحقیقت تشدد کا نتیجہ ہمیشہ زیادہ سخت تشدد ہوا کرتا ہے۔ یونانیوں کی ایک داستان ہے کہ ہر سپاہی جو مارا جاتا ہے اس کے خون کے چھینٹوں سے 999 سپاہی پیدا ہوئے۔ سیاسی مقصد سے قتل کرنا اپنے دشمنوں کی تعداد کو برابر بڑھاتے رہنا ہے۔ ٹالسٹائی نے مشورہ دیا کہ اگر کسی جابر حکومت کو بے بس کرنا ہو تو صحیح طریقہ یہ ہے کہ ٹیکس دینے سے انکار کیا جائے، ملازمتوں سے استعفیٰ دے دیا جائے اور تمام اداروں کا بائیکاٹ کیا جائے جن سے حکومت کو سہارا مل رہا ہے۔ اسے یقین تھا کہ ایسا پروگرام کسی بھی حکومت کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دے گا۔''

گاندھی نے اپنی یہ تجویز شرکائے مجلس کے سامنے پیش کر کے رائے طلب کی تو ہر ایک نے کوئی نہ کوئی وجہ بتا کر مہلت چاہی، لیکن مولانا آزاد نے بلا تامل اس تجویز سے اتفاق کیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں: ''میں نے بغیر ایک لمحہ تامل کیے کہہ دیا کہ میں اس پروگرام کو کلی طور پر صحیح سمجھتا ہوں۔ اگر لوگ واقعی چاہتے ہیں کہ ترکی کی مدد کریں تو گاندھی جی کے پیش کیے ہوئے پروگرام پر عمل کرنے کے سوا چارہ نہیں''۔

چنانچہ تحریک خلافت وجود میں آ گئی۔ مجلس خلافت بنگال کی صوبائی کانفرنس 28 فروری 1920ء کو کلکتہ میں منعقد ہوئی۔ مولانا آزاد نے خطبہ صدارت ارشاد فرمایا جو بڑا مبسوط اور جامع مانع تھا۔ بعد میں یہ خطبہ مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب کے نام سے چھپا۔ اس خطبہ کا ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

''عزیزانِ ملت! اس طول طویل صحبت میں جو کچھ بیان کیا گیا،

اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو میری زبان پر نئی ہو۔ یہ تمام وہی فسانہ کہن ہے جو پچھلے دس سالوں سے برابر دہراتا رہا ہوں۔ اور اگر ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کی پیہم صدائیں تمہارے حافظہ سے فراموش نہیں ہوگئی ہیں تو تم اس کی تصدیق کرو گے۔ تمہارے رہبروں اور پیشواؤں کی رائیں اور صدائیں کتنی ہی مضطرب و متزلزل رہی ہوں، لیکن میری طرف دیکھو۔ میں ایک انسان تم میں موجود ہوں جو دس سال سے صرف ایک ہی صدائے دعوت بلند کر رہا ہے، اور صرف ایک ہی بات کی جانب تڑپ تڑپ کر بلا رہا اور لوٹ لوٹ کر پکار رہا ہوں ''ولکن لاتحبون الناصحین'' (۷:۷۹) افسوس ہے کہ تم حقیقی اور سچی بات کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ تم نمائش کے پجاری، شور وہنگامہ کے بندے اور وقتی جذبات وانفجار ہیجان کی مخلوق ہو، تم میں نہ امتیاز ہے نہ نظر، نہ تم جانتے ہو نہ پہچانتے ہو، تم جس قدر تیز دوڑ کر آتے ہو اتنی ہی تیزی کے ساتھ فرار بھی کر جاتے ہو۔ تمہاری اطلاعات جس قدر سہل ہیں اور تمہاری ارادت جتنی سستی ہے، اتنا ہی تمہارا انحراف آسان ہے، اور اسی نسبت سے تمہاری مخالفت بھی ارزاں ہے۔ پس نہ تو تمہاری تحسین کی کوئی قیمت نہ تمہاری توہین کا کوئی وزن۔ نہ تمہارے پاس دماغ ہے نہ دل، وساوس ہیں جن کو تم افکار سمجھتے ہو۔ خطرات ہیں جن کو تم عزائم کہتے ہو۔ خدارا بتلاؤ، میں تمہارے ساتھ کیا کروں؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ آج جن باتوں کے لیے تم رو رہے ہو، یہ وہی باتیں ہیں جو ایک زمانے میں میری زبان سے فریاد کا اضطراب اور طلب کی چیخ بن کر نکلتی تھیں مگر تمہارے سینے کے اندر پتھر کا ایک ٹکڑا ہے اس سے ٹکرا ٹکرا کر واپس آ جاتی تھیں اور تم یک قلم انکار واعراض میں غرق تھے؟

''تم نے ہمیشہ اعراض کیا۔ تم نے اعراض ہی نہیں کیا بلکہ ''جعلوا اصابعھم فی اذانھم واستغشوا ثیابھم، واصروا واستکبروا استکبارا'' (۷:۷۱) کی ساری سنتیں غفلت وانکار کی تازہ کردیں۔ میں نے تم میں سے ہر گروہ کو ٹٹولا۔ میں نے دلوں اور روحوں کا ایک ایک گوشہ چھان مارا، جب کبھی کوئی بھیڑ دیکھی فریاد کی۔ جب کبھی انسانوں کو دیکھا اپنی طرف بلایا، لیکن ''فلم یزدھم دعائی الا فرارا'' (۶:۷۱) بہت کم روحیں ایسی نکلیں جن کو حقیقت کا فہم ہو، اور بہت کم دل ایسے ملے جو طلب و عشق سے معمور ہوں یہاں تک کہ میں تمہاری آبادیوں سے الگ ہو کر رانچی کے گوشہ قید و بند میں چلا گیا، اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہاں میری صبحیں اور میری شامیں کن فکروں میں اور کاموں میں بسر ہوتی رہیں۔ اب میں پھر تم میں واپس آ گیا ہوں، لیکن تمہاری بھیڑوں اور غولوں میں بھی جستجو کا چہرہ اسی طرح مفقود ہے جیسا کہ ہمیشہ سے مفقود رہا ہے۔ اب تک حقیقت شناسی کی کوئی گیرائی تم میں نظر نہیں آتی۔ تم مجھے بلاتے ہو کہ استقبال سے بھرے ہوئے ریلوے اسٹیشنوں پر اتارو اور ایسے پر جوش انسانوں کے نعرے سناؤ، جن کے ہاتھوں میں فتح مند فوجوں کی طرح جھنڈیاں ہوں اور پھر اتنے انسان میری گاڑی کے چاروں طرف اکٹھے کر دو کہ ان کے ہجوم میں دو چار آدمیوں کا خون ہو جائے، مگر آہ! میں تمہاری ان بھیڑوں کو لے کر کیا کروں جب تمہارے دلوں میں سناٹا چھایا ہوا ہے اور تمہارے اس جوش استقبال سے مجھے کیا خوشی ہو جب تمہاری روحیں موت کی افسردگی سے مرجھائی ہوئی ہیں۔ افسوس! تم میں سے کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو، تم میں سے کوئی نہیں جو میرا شناسا ہو۔ میں سچ کہتا

ہوں کہ تمہارے اس پورے ملک میں ایک بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں۔

''میری رایوں میں نہ کبھی تبدیلی ہوئی، نہ میرے سفر میں کبھی یمین ویسار کا تذبذب پیش آیا ہے تبدیلیاں فکروں میں ہو سکتی ہیں، قیاسوں میں ہو سکتی ہیں، پولیٹیکل حکمت عملیوں میں ہو سکتی ہیں۔ انسانی تقلید اس کا سرچشمہ ہے، اور انسانوں اور قوموں کا اتباع اس کا منبع، لیکن ان عقائد میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ جو وحی و تنزیل کی اٹل اور دائمی ہدایتوں سے ماخوذ ہیں۔ الحمدللہ! میں جو کچھ کہتا اور کرتا رہا وہ میرے عقائد و معلومات تھے۔ تمہارے بڑوں کی طرح آراء اور مظنونات نہ تھے ''ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً'' (۲۸:۳۵) اس وقت تم میں سے اکثروں نے اعراض کیا، بہتوں نے استہزاء کیا، کتنوں نے کہہ دیا کہ یہ تو ایک طرح کی مذہبی بناوٹ اور مافوق الفطرۃ دعووں کا اعلان ہے: ''یریدون تفضل علینا'' بعضوں نے تو فیصلہ ہی کر دیا کہ یہ صرف فصاحت و بلاغت کی ساحری اور ایک طرح کی ادیبانہ افسوں نگاری ہے، لیکن دیکھو! بالآخر رفتہ رفتہ سب نے اپنی جگہیں چھوڑ دیں، سب اسی راہ پر چل پڑے،، بہتوں نے دانستہ اور بہتوں نے نادانستہ مگر راہ سب نے وہی اختیار کی۔ آج تم سب اسی مافوق الفطرۃ دعوؤں اور ساحرانہ فصاحت طرازیوں کو اپنا اصل الاصول بنائے ہوئے ہو اور ''قیام شریعت'' اور ''تقدیم و اتباع شریعت'' اور ''حفظ و دفاع ملت'' کے ناموں سے موسوم کرتے ہو۔

''پس جب کہ یہ پہلا تجربہ و مشاہدہ تمہارے سامنے ہے تو آج میں اعلان کرتا ہوں کہ دوسرے تجربہ کا وقت آ گیا ہے۔ راہِ عمل کے لیے تمہارا رخ وہ ہے جس کی طرف تم دوڑ رہے ہو اور میری راہ

وہ ہے جس کی طرف تمہیں میں بلا چکا ہوں۔تم بارش کے وجود سے
انکار تو نہیں کرتے مگر منتظر رہتے ہو کہ پانی برسنے لگ جائے تو
اقرار کریں، لیکن میں ہواؤں میں پانی کی بوسونگھ لینے کا عادی ہوں
اور صرف بادلوں ہی کو دیکھ لینا میرے علم کے لیے کافی ہوتا ہے۔
پس اگر پچھلا تجربہ بس کرتا ہے تو اس سے عبرت پکڑو، اور اگر ابھی
اور انتظار کرنا چاہتے ہو تو انتظار کر دیکھو۔''

1921-20ء کی تحریک خلافت میں تمام افکار کا سرچشمہ یہی ایک تصنیف تھی اردو انگریزی میں جتنا لٹریچر بھی اس وقت سامنے آیا اس میں کوئی بات ایسی نہ تھی جس کی طرف اس خطبہ میں رہنمائی نہ کی گئی ہو۔ اس کے مطالعہ سے قرآن، حدیث، فقہ اور تاریخ اسلام میں مولانا آزاد کے علم وفکر کی گہرائی اور گیرائی کا نقش دل پر ثبت نہ ہوتا ہو۔ ترک تعاون اور ترک موالات کی پوری تحریک میں مولانا کا یہی خطبہ راہنمائی کی قندیل بن کر چمکتا رہا۔ اس کے بعد جتنی تقریریں ہوئیں جتنی کانفرنسیں آراستہ ہوئیں۔ جتنے اجلاس ہوئے، اخبارات اور رسائل نے تحریک کی حمایت میں جو کچھ لکھا، ان سب کا سرچشمہ (Source) اور اساس و بنیاد مولانا کا یہی خطبۂ صدارت تھا۔

23 مارچ 1920ء کو میرٹھ خلافت کانفرنس بڑی شان وشوکت اور دھوم دھام سے منعقد ہوئی۔ اس میں گاندھی نے پہلی مرتبہ پلیٹ فارم عدم پر تعاون کا پروگرام پیش کیا اور وہ پروگرام یہ تھا:

-1 تمام سرکاری خطابات اور سول عہدوں سے علیحدگی۔
-2 فوج اور پولیس کی نوکری سے علیحدگی۔
-3 ٹیکس اور دوسرے سرکاری واجبات کی ادائیگی سے انکار۔

گاندھی کے بعد مولانا آزاد نے زبردست تقریر کی اور گاندھی کی تجویز کی بھرپور حمایت اور تائید کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکیم اجمل خان مرحوم نے حکومت کی جانب پہلا پتھر پھینکا۔ انہوں نے اپنے تمام تمغات اور خطابات واپس لوٹا دیئے۔
اپریل کے پہلے ہفتے میں یو۔پی کے مختلف مکاتیب فکر کے علماء کا ایک اجلاس

ہوا تاکہ عوام کو مسئلہ خلافت اور تحریک ترک موالات کے لیے تیار کیا جائے۔ چنانچہ اجلاس میں عوام کو متحرک بنانے کی ذمہ داری قبول کی گئی اور حکیم اجمل خان کو اعزازات واپس کرنے پر زبردست خراج تحسین پیش کیا گیا اور مسیح الملک اور رئیس الحکماء کے خطابات ہندوستانیوں کی طرف سے ان کی خدمت میں پیش کیے گئے۔تحریک خلافت کے باعث مسلمانوں کے تمام مسالک اور مکاتیب فکر کے علماء حضرات میں بھی اتفاق و اتحاد کی بنیاد پڑ چکی تھی اور وہ فقہی اختلافات بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو گئے۔ ہندوستان کے نوسو جید اور اہل الرائے علماء سے ترک موالات کے حق میں فتویٰ دیا۔جن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں:

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، حضرت مولانا احمد سعید صاحب، (دیوبندی علماء مکتب فکر) حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری، حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی، حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی، اور مولانا عبدالحکیم گیاوی (اہل حدیث مکتب فکر) حضرت مولانا سید محمد فاخر بیخود الہ آبادی سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل، حضرت مولانا عبدالماجد بدایونی، شمالی ہندوستان کے قدیم مرکز اسلام کے اعتدال پسند علماء میں حضرت مولانا عبدالباری اور حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد حیدر بہاری وغیرہ وغیرہ۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس ملک کے علماء حضرات بھی اس مسئلہ میں پیچھے نہ تھے۔ اگرچہ کئی علماء نے انفرادی طور پر مخالفت کی۔ مولانا احمد رضا خان بریلوی نے اس مخالفت میں بڑی سرگرمی دکھائی۔تحریک کی مخالفت میں زبردست مہم چلائی اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر تحریک آزادی وطن کی جدوجہد میں حصہ لینا از روئے اسلام حرام قرار دیا۔ ان کے نزدیک ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام سے امن وامان کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔مسلمانوں کو ارکان دین ادا کرنے کی آزادی تھی، اس بنا پر ہندوستان دارالحرب نہیں رہا تھا بلکہ دارالسلام ہو گیا تھا، اس لیے مسلمانوں کو انگریزوں کی اطاعت وفرماں برداری کرنی چاہیے۔ چنانچہ مسٹر فرانسس رابنس نے (Among Indian Muslims) میں لکھا ہے کہ ’’1922ء میں بریلی میں ترک موالات کے مخالف علماء کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی اور اس کا عوام پر خاطر خواہ اثر تھا لیکن پڑھے لکھے طبقہ کی حمایت حاصل نہ تھی۔‘‘

تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات نے ہندوستان کی فضا کو گرما دیا اور اس میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ اپنے قائدین کی شجاعتوں، جرأتوں اور بے باکیوں کو دیکھ کر عوام کی ہمتوں اور حوصلوں میں اضافہ ہوا۔ ہر کوئی دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے بے قرار تھا۔ اگر مولانا محمد علی کی والدہ بچوں سے یہ کہتی تھی کہ ع

بولی اماں محمد علی کی۔ جان بیٹا خلافت۔ پہ دے دو

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ تحریک خلافت اور ترک موالات کی تحریک جمعیت علمائے ہند کے قیام سے پہلے چل رہی تھی اور علمائے دیوبند نے دامے، درمے اور سخنے قدمے اس میں حصہ لیا تھا، اور جمعیت کے قیام کے بعد حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کی زیر صدارت زیادہ منظم طریقے سے اس تحریک کو تقویت پہنچائی گئی۔

اسلام کے معاشرتی قوانین کا تحفظ:

ہندوستان کے مختلف صوبوں میں قانون سازی کے مختلف مراحل میں خود مسلمان جاگیرداروں اور زمینداروں نے اپنے ایمان کی کمزوری، دوسری قوموں کے رسم و رواج سے متاثر ہو کر اور اپنی زمینوں اور جاگیروں کے لالچ میں آ کر حکومت کو یہ لکھ کر دے دیا تھا کہ وہ اسلام کے قانون وراثت کے بجائے رواج پر عمل کرتے ہیں۔ جس کے مطابق وہ باپ کے ترکے میں بیٹیوں کو حصہ نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ صوبہ پنجاب، صوبہ سندھ (جس میں اس وقت بمبئی بھی شامل تھا) میں رواج پر عمل کی وجہ سے لڑکیوں کو ان کے والدین کے ترکے سے محروم رکھا گیا تھا۔ یہ بات اسلام کے قانون وراثت کے سراسر خلاف تھی، اس وجہ سے جمعیۃ علمائے ہند کے رہنماؤں نے اپنے مواعظ، تقاریر اور خطبات میں اور اخبارات کے مضامین اور اسمبلیوں میں دستور سازی کی کوششوں کے ذریعے اس قانون کو تبدیل کرانے کی جو کوششیں کیں وہ آخر تک جاری رہیں۔ صوبہ سرحد، صوبہ پنجاب اور صوبہ سندھ میں اسلام کے معاشرتی قوانین کو توڑنے کے لیے جمعیۃ نے بارہا مسلمانوں کو شریعت اسلامیہ پر عمل کرنے کی طرف متوجہ کیا لیکن کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ کیونکہ برطانوی عدالتیں رسوم و رواج کے مطابق فیصلہ کرنے پر آمادہ

تھیں۔ آخر مجبور ہو کر جمعیۃ العلماء نے ایک آئینی قدم اٹھایا اور حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیت علمائے ہند کی راہ نمائی من ایک مسودہ قانون شریعت بل کے نام سے تیار کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں پر نکاح، طلاق، مہر اور ترکہ وغیرہ میں اسلامی قانون نافذ ہو۔ چنانچہ صوبہ سرحد کی اسمبلی میں جمعیۃ علماء صوبہ سرحد اور مسلمانان سرحد کی کوششوں سے یہ شریعت بل قانون بن گیا اور بہت سے مسلمان گناہِ عظیم سے بچ گئے۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بتایا گیا ہے کہ انگریز 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ہندوستان میں اسپین کی طرح عیسائی مذہبی انقلاب لانا چاہتے تھے، لیکن حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، ڈاکٹر وزیر خان اور دوسرے علماء کی پیہم کوششوں سے وہ یہ انقلاب نہ لا سکے اور عیسائی پادریوں کو مسلمان علماء کا مقابلہ کرنے کی ہمت اور جرأت نہ ہوئی۔ پادری فنڈر تو آگرہ کے پہلے ہی مناظرہ میں ہندوستان ہی سے بھاگ گیا تھا۔ اب انگریزوں نے ایک میرج ایکٹ بنایا یعنی شادی بین المذاہب کا قانون۔ یہ اس لیے بنایا گیا کہ چونکہ عیسائی مذہبی انقلاب نہیں لایا جا سکا، لہٰذا ہندوستان کے مذاہب کو ایسا خلط ملط کر دیا جائے کہ کوئی شخص ہندو اور مسلمان بھی نہ رہے اور رفتہ رفتہ ملک میں ایک لادین معاشرہ وجود میں آ جائے۔ اس قانون کے نفاذ کا نتیجہ مشنری تحریک کے خطرناک نتائج سے بھی زیادہ خطرناک اور ہندوستان کی سیاسی غلامی کی تباہی سے زیادہ تباہ کن تھا۔ جمعیۃ العلماء نے روز اول ہی سے اس قانون کی خطرناکی کا اندازہ لگا لیا تھا اور اس کے نفاذ کے خلاف تحریر و تقریر اور اسمبلی میں راسخ العقیدہ مسلمانوں کے ذریعہ انتہائی کوشش کی کہ اس کے نفاذ کو روکا جا سکے اور اس کے دائرہ اثر سے امت مسلمہ کو الگ رکھا جا سکے لیکن بعض لیگی ارکان نے ان کوششوں کو ناکام بنا دیا اور ایک ترمیم کے ذریعہ اس کے دائرۂ اثر و نفاذ کو مسلمانوں تک وسیع کر دیا۔

☆ ☆ ☆

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

مولانا ظفر علی خان نے دارالعلوم دیوبند کو مخاطب کر کے کہا تھا ؎

گرمیٔ ہنگامہ تیری آج حسین احمد سے ہے
جس سے پرچم روایاتِ سلف کا سربلند

''کیا ہے فخر الدین رازی کی نواسنجی و نکتہ آفرینی، بوعلی سینا اور فارابی کی منطق، ابن حزم اور ابن رشد کی حکمت؟ صرف ایک نتیجہ ہے ذی الطبع افراد کی پر عافیت کتب بینی کا۔ کیا ہے ترک دنیا اور متقشفانہ تصوف؟ ایک خوشگوار جذبہ ہے دنیوی جھگڑوں سے فارغ البالی کا، بہت آسان ہے سال ہا سال اعتکاف کے مکاشفات اور مراقبات کی لطف اندوزی، بہت سہل ہے برس ہا برس مطالعہ کتب کر کے تبحر علمی کے ملکات کی فراہمی، بہت سہل ہے کسی خانقاہ کی کنج عزلت اور بہت سہل ہے کسی دارالعلوم کی مسند تدریس۔

تم پوچھو.................. مشکل کیا ہے؟

''میں بتاؤں گا بہت مشکل ہے رجوع الی اللہ، زہد اور تقویٰ کے ساتھ خدمت خلق اور نوع انسانی کی ہمدردی یعنی وہ سوز و گداز، وہ تڑپ، وہ بے چینی جو کبھی مسجد میں لے جائے، کبھی حلقہ درس میں، کبھی منبر پر وعظ و تلقین کے لیے کھڑا کرے، کبھی سیاسی پلیٹ فارم پر ترقی ملت اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے

پھر کبھی اپنوں کی گالیاں سنوائے اور کبھی پابہ زنجیر جیل خانوں کی سلاخوں میں بند کرائے، دن کے وقت خدمت خلق میں مصروف اور پریشان رکھے تو رات کی تاریکی

میں محبوب حقیقی کے سامنے راہب شب بیدار بنا کر کھڑا کر دے۔

بلاشبہ بہت مشکل ہے ہمدردیٔ خلق اور غم گساری مسلم کی وہ خلش جو رات کی میٹھی نیند حرام کر دے، مجلس احباب کو مجلس سوز و گداز بنا دے۔

افق پر صبح صادق کی کرن چمکے تو وہ توبہ و استغفار میں مشغول ہو، آفتاب کی پہلی کرنیں اس کو تسبیح و تہلیل میں مشغول دیکھیں، پھر اس کے تبلیغی، تعلیمی، مذہبی اور سیاسی مشاغل کو دیکھتے دیکھتے حیرت و استعجاب کے مغرب میں روپوش ہو جائیں، عالم پر تاریکی کی سیاہ چادر تانی جائے، تھکے ماندے انسان اپنی آرام گاہوں کی طرف دوڑیں، اہل و عیال کی پرلطف چہل پہل سے دن بھر کی کوفت دور کریں، لیکن یہ مبتلائے سوز خلق اب بھی یا دور دراز کا سفر طے کر رہا ہو، یا عالی اور عمیق مضامین کے حل کرنے میں دماغ سوزی کر رہا ہو، یا مخلوق خدا کی تلقین میں مشغول ہو، یا اپنے پروردگار کے سامنے سربسجود، گریہ و بکا، عجز و نیاز، مناجات و تلاوت، طویل قیام، طویل رکوع و سجود سے زاہدان خشک کے خلوت خانوں کو شرما رہا ہو۔

بے شک یہی ہے مشکل ترین سنت، یہی ہے انبیاء علیہم السلام کی سچی وراثت، یہی ہے مضمون حدیث کے بموجب انبیائے سابقین علیہم السلام سے مشابہت، یہی شخص ہے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا محبوب، اسوۂ صحابہ کا سچا پیرو، یہی ہے مصلح وقت، یہی ہے شیخ وقت، یہی ہے مرشد صادق، یہی ہے قطب عالم، اسی کی زندگی درس عبرت ہے، قابل اتباع بلکہ واجب الاتباع ہے۔"

یہ الفاظ ہیں ایک بہت بڑے محدث، فقیہ، مؤرخ اور مجاہد فی سبیل اللہ حضرت مولانا سید محمد میاںؒ کے۔ ان الفاظ کو اگر حقیقت کا جامہ پہنایا جائے تو وہ ہے

شیخ العرب والعجم، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ

سابق شیخ الحدیث، دار العلوم دیوبند

مولانا سید محمد میاں نے یہ الفاظ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی کے بارے میں عقیدت کی بنا پر نہیں کہے بلکہ حقیقت کی بنا پر کہے ہیں۔ واقعی ان صفات کو اگر جمع کیا جائے تو اس کی مجسم صورت حضرت مولانا حسین احمد مدنی ہوتی ہے

داستان جہد جب پھیلی تو لا محدود تھی
اور جب سمٹی تو تیرا نام ہو کر رہ گئی

آپ کے والد ماجد سید حبیب اللہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادیؒ کے خلیفہ تھے۔ بارہ سال کی عمر میں یعنی 1309ھ میں آپ کو دیو بند حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں بھیج دیا۔ حضرت شیخ نے اپنی اولاد کی طرح آپ کی تعلیم و تربیت شروع فرمائی۔ شاگرد نے بھی ہر معاملہ میں اپنی شاگردی کا حق ادا کر دیا۔ 1316ھ/1899ء میں آپ کے والد ماجد نے اپنے تمام اہل وعیال کے ساتھ ہجرت کی غرض سے بیت اللہ کا قصد فرمایا۔ چنانچہ آپ بھی اپنے والد کے ساتھ حجاز مقدس تشریف لے گئے حجاز پہنچ کر آپ کو بڑے مصائب و ابتلاء میں اپنی زندگی کے دن گزارنے پڑے۔ بالآخر آپ کے والد ماجد نے گھر کی عورتوں اور بچوں کو ساتھ ملا کر مدینہ طیبہ میں ایک چھوٹا سا مکان حرم کے قریب تعمیر کر لیا اور حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ نے 1318ھ/1900ء سے 1326ھ/1908ء تک مسلسل جوار رسول میں قیام فرمایا۔ حرم پاک میں آپ کا حلقۂ درس دن بدن ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا۔ صبح کی نماز کے بعد سلسلہ درس شروع ہوتا اور عشاء کے بعد تک رہتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے درس کی شہرت عرب سے تجاوز کر کے دوسرے ممالک میں پہنچ گئی۔ 8 سال کے بعد 1326ھ/1908ء میں آپ ہندوستان تشریف لائے اور جمعیۃ الانصار کی مؤتمر اور دارالعلوم کا جلسہ دستار بندی آپ کی جدوجہد کے رہین منت ہیں۔ ہندوستان میں تین سال قیام کرنے کے بعد آپ دوبارہ مدینہ طیبہ تشریف لے گئے۔ 1330ھ میں آپ دوبارہ ہندوستان تشریف لائے اور یہی زمانہ تھا جب انقلاب کی تجاویز ہندوستان میں بڑی شدو مد سے جاری تھیں۔ اور یورپ کی جنگ عظیم اول کا آغاز ہو رہا تھا۔

1915ء میں حضرت شیخ الہند بھی اپنے اس انقلابی خاکہ کو عملی جامہ پہنچانے کے لیے ہندوستان سے حجاز مقدس تشریف لے گئے اور حج سے فراغت کے بعد مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ اسی دوران آپ نے جمال پاشا اور انور پاشا سے مدینہ طیبہ میں ملاقات فرمائی اور پھر کچھ عرصہ بعد ایک سید زادے شریف حسین نے بغاوت کر کے ترکی

حکومت کو حجاز سے ختم کر دیا اور 23 صفر 1335ھ/ 9 دسمبر 1916ء کو اس سید زادے شریف حسین نے حضرت شیخ الہندؒ، مولانا عزیر گل، مولانا حکیم نصرت حسین اور مولانا وحید احمد مدنی کو گرفتار کر کے انگریزوں کے سپرد کر دیا۔ بعد میں حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ کو بھی گرفتار کر کے حضرت مولانا شیخ الہندؒ کے پاس جدّہ بھیج دیا گیا۔ اور وہاں سے ان سب حضرات مالٹا بھیج دیا گیا۔ بالآخر وہاں کی اسارت سے 13 مارچ 1920ء کو حضرت مدنی حضرت شیخ الہند اور دوسرے رفقاء کے ساتھ مالٹا سے رہا ہوئے۔ اسی اثناء میں آپ کے والد ماجد، بڑے بھائی، اہلیہ محترمہ، اور لختِ جگر سب کے سب کچھ انقلابی مصائب اور کچھ امراض وغیرہ میں مبتلا ہو کر اس دنیا سے انتقال فرما چکے تھے، لیکن حضرت مدنیؒ کو جوشِ حریت اور اعلائے کلمۃ اللہ کے جذبات نے اس بات کی اجازت نہ دی کہ براہِ راست مدینہ طیبہ جائیں بلکہ خلافت اسلامیہ کی بقا اور تحفظ کے لیے ہندوستان کو مفید سمجھ کر یہاں مستقل تشریف لے آئے اور تحریک آزادی وطن اور تحریک خلافت اور تحریک ترکِ موالات میں بھرپور حصہ لیا، لیکن اہلِ ہند کی بدقسمتی سمجھیے، کہ ہندوستان پہنچنے کے صرف پانچ ماہ بعد حضرت شیخ الہند کی وفات ہوگئی اور شیرازہ ملت منتشر ہوگیا۔ گویا ؎

یہ حالت ہو گئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے
کہ خم کے خم بھرے ہیں مے سے اور مے خانہ خالی ہے

حضرت شیخ الہند کی وفات کے بعد دنیا نے آپ کو حضرت کا سچا جانشین سمجھا۔ آپ نے لوگوں کا جذبۂ محبت اور حضرت شیخ الہند کے مشن کی تکمیل کی خاطر خود کو دینی اور ملکی خدمات کے لیے وقف کر دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد فوجی بھرتی، پولیس اور فوج کی ملازمت کی حرمت کے فتوے کے سلسلہ میں جو کراچی میں حضرت کی طرف سے پیش کیا گیا تھا، اور مولانا نثار احمد کانپوری، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی نے اس کی تائید فرمائی تھی، گرفتار ہو کر دو سال قید بامشقت کی مصیبت برداشت کی۔

مولانا مدنیؒ کا ہر عمل اخلاص وللّٰہیت پر مبنی ہوتا تھا اور تصنع اور شہرت سے آپ کو سخت نفرت تھی اور سادگی آپ کا فطری جوہر تھا۔ کراچی سے رہائی کے بعد رہا ہونے والوں کے لوگوں نے بڑے بڑے جلوس نکالے، لیکن آپ کو ان جلوسوں سے نفرت تھی۔

رہا ہونے کے بعد لوگوں کو دیو بند میں آپ کا شدید انتظار تھا اور آپ کے شاندار استقبال کے لیے انتظامات بھی ہو رہے تھے، لیکن رات کو 2 بجے بالکل خاموشی کے ساتھ دیو بند تشریف فرما ہو کر حضرت شیخ الہندؒ کے مکان پر پہنچ گئے۔ لوگوں نے صبح کو سنا کہ حضرت مدنیؒ رات کو تشریف لے آئے ہیں، لہٰذا ان کی تمام استقبالی تیاریاں دھری کی دھری رہ گئیں۔ مراد آباد والوں نے شاندار جلوس کا انتظام کیا تھا لیکن پھر اچانک انہیں معلوم ہوا کہ حضرت مدرسہ شاہی مراد آباد میں تشریف فرما ہیں۔

اسارت کراچی کے زمانہ میں مولانا محمد علی جوہر نے آپ سے قرآن حکیم کا ترجمہ پڑھا۔ مولانا محمد علی آپ کو چہیتا بھائی کہا کرتے تھے اور استادانہ تکریمات سے پیش آیا کرتے تھے۔

سیاسی مقاصد:

حضرت مدنی کی سیاست کے وہی دو مقاصد تھے جو حضرت شیخ الہندؒ کے تھے۔ حضرت شیخ الہند کے سیاسی پروگرام کے دو جزو اعظم تھے:

(1) اقتصادی تباہ حالی کا احساس (2) قومیت مشترکہ کا احساس

وجہ اس کی یہ تھی کہ پہلی جنگ عظیم میں جب برطانیہ اور اس کے خلیفوں کو فتح نصیب ہوئی تو دنیا کی سیاست کا نقشہ تبدیل ہو گیا۔ ذرائع آمدورفت کی وسعت اور سہولت نے اب تمام دنیا کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا۔ اس چیز نے دنیا کی سیاست میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اس انقلاب کے نتیجہ میں یہ بات غور وفکر کی محتاج تھی کہ اگر برصغیر پاک و ہند میں کسی دوسری حکومت کے ذریعہ کوئی انقلاب برپا کیا جائے تو اس سے ہندوستان کو کیا فائدہ ہو گا؟ اور دوسری بات یہ تھی کہ کسی بیرونی طاقت کے ذریعہ انقلاب برپا ہو بھی سکتا ہے یا نہیں؟ اور یہ ممالک اس جنگ میں کامیاب بھی ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ دنیا نے یہ دیکھ لیا تھا کہ جرمنی کی فوجیں طوفان بن کر اٹھیں لیکن اقتصادی بھنور میں پھنس کر تباہ و برباد ہو گئیں۔ جاپان کے برق خرمن سوز کو امریکہ کے ایک ہی ایٹم بم نے آبگینہ بنا دیا۔ مصارف جنگ کی بے پناہ زیادتیوں نے حکومتوں کا

مالک ان جماعتوں کو بنا دیا جو ملوں اور مشینوں کی مالک ہیں اور جن کے قبضے میں بے پناہ دولت ہے۔ چنانچہ اخبارات کے کالم اس بات کے شاہد ہیں کہ جنگ عظیم دوم میں برطانیہ کا خرچہ 32 کروڑ روپیہ یومیہ تھا جب کہ امریکہ نے قریباً 140 کھرب سالانہ تک خرچ کیے۔ آج بھی امریکہ کو عراق میں چھ ارب ڈالر ماہانہ خرچ کرنے پڑ رہے ہیں اور کابل میں اس کے اخراجات ایک ارب ڈالر ماہانہ ہیں۔ یہ امریکی وزارت دفاع کا بیان ہے۔ (ضرب مومن ۱۴۔۲۰ اکتوبر ۲۰۰۵) صنعتی انقلاب کے بعد تمام دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام نافذ ہو گیا جس کی وجہ سے غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہوتا جا رہا ہے جس کی وجہ خود کار مشینوں اور برق و اسٹیم نے دنیا کے غریبوں کو بے روزگار بنا دیا ہے اور دنیا کے غریب ملکوں کی دولت کھنچ کر سرمایہ دار اور صنعتی ملکوں میں چلی آ رہی ہے۔ اب دنیا میں اصل مسئلہ مذہب کا نہیں رہا بلکہ بھوک اور فاقہ مستی کا ہے۔ البتہ یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے کہ سرمایہ دار مذہب کی آڑ لے کر بھوکوں اور فاقہ مستوں کی ٹکر سے بچنا چاہتا ہے۔ اس سرمایہ داروں کو تو کوئی خاص فائدہ نہ ہوا البتہ یہ نقصان ضرور ہوا کہ بھوکے جب مصنوعی مذہب کو ظالم کے ساتھ دیکھتے ہیں تو وہ مذہب ہی سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ زار روس کی آخری غلطی یہی تھی کہ اس نے مذہب کے لالچی اور حریص پیشواؤں کا ایمان خریدا اور ان کو غریبوں اور مزدوروں کے مقابلہ میں کھڑا کر دیا جس کے نتیجہ میں بے دینی اور لا مذہبی کمیونزم کا جزو اعظم بن گئی۔

ان حالات میں سب سے زیادہ ضروری تھا کہ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو اپنی غربت اور فاقہ مستی کا احساس دلایا جاتا اور انہیں ان کی اقتصادی حالت سے آشنا کرایا جاتا اور بتایا جاتا کہ یہ غربت اور فاقہ مستی ان کے مقدر میں کیسے آئی اور انگریز نے ان کی صنعت و حرفت کو کس طرح پامال کیا۔ انہیں کس طرح کنگال کیا۔ پھر یہ بھی ضروری تھا کہ ان میں حب وطن کا جذبہ بھی پیدا ہو تبھی تو وہ غیر ملکی حکومت کے مفاد کو ختم کرنے کے لیے اپنا تن من دھن قربان کریں گے، اور انہیں احساس ہوگا کہ ہم جو کچھ غیر ملکی مفاد کی خاطر کر رہے ہیں وہ خود اپنے آپ کو اور اپنی نسلوں کو برباد کرنے کے مترادف ہے ان کو وہ یاد دلانا تھا کہ انگریزوں نے کس طرح ان کے مقدس مقامات پر قبضہ کیا، ان کی

حکومت کس طرح تباہ برباد کیا اور پھر کس طرح انہیں غلام بنایا۔ انہیں یہ بھی بتانا تھا کہ انگریزوں نے کس طرح حجاز اور خصوصی طور اہل مدینہ پر غلہ بند کیا۔ ترکی فوج اور حکومت نے انتہائی کدوکاوش اور جدوجہد کی کہ ان کے لیے رزق کے دروازے کھل جائیں لیکن یورپ کے سفید فام درندے رحم کے لفظ و معنی سے ناآشنا تھے حتیٰ کہ ہزاروں مجاور بھوک اور پیاس کی شدت کی وجہ سے اس دنیا سے انتقال کر گئے۔ کچھ وہ بھی تھے جو بھوک کی شدت میں مردوں کا گوشت کھانے پر مجبور ہوئے۔ اس قسم کی لرزہ خیز داستانوں سے انہیں آشنا کرنا ضروری تھا۔

حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ نے اپنی مختلف تقاریر میں ان حقائق سے پردہ اٹھایا اور مسلمانانِ ہند کی غلامی کے اسباب بتائے لیکن لوگوں کی طرف سے ان کی یہ تقاریر پسند نہیں کی جاتی تھیں۔ مگر لیکن آپ نے اپنی تقاریر کے تسلسل سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ انقلاب برپا کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود مسلم لیگ بھی اس قسم کا اقتصادی پروگرام لوگوں کے رکھنے لگی۔

دوسری بات متحدہ قومیت کی تھی۔ مسلمانوں کی تعداد اس وقت ہندوستان میں آٹھ کروڑ تھی اور ہندوؤں کی تیس کروڑ۔ آٹھ کروڑ اپنی تنہا جدوجہد سے ہندوستان کو انگریزوں کے آہنی پنجے سے آزاد نہیں کرا سکتی تھی۔ اس زمانہ میں قومیت صرف سیاسی اور اقتصادی اصول پر ترتیب نہیں دی جا سکتی۔ انگریز نے عربوں کو ترکوں کا باغی بنایا۔ اس نے عربوں کے ذہنوں میں یہ بات ڈالی کی آج قومیں مذہب سے نہیں بنتیں بلکہ آج قومیں سیاسی اور اقتصادی مصالح کی بنا پر ترتیب پاتی ہیں، لہٰذا ترک الگ قوم ہے اور عرب الگ۔ اسلام کی وجہ سے یہ دونوں ایک قوم نہیں ہیں، لہٰذا عربوں کے لیے ترکوں کی غلامی عار ہے۔ اس بنیاد پر عربوں کو ترکوں کا باغی بنایا بلکہ یہ جراثیم اس نے تمام اسلامی ممالک میں پھیلا دیئے۔ اب سوال یہ ہے کہ انگریزی ڈپلومیسی اگر عربوں کو ترکوں سے جدا ایک دوسری قوم قرار دیتی ہے تو کیا ہندوستان کے لوگوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اقتصادی اور سیاسی اصول پر ہندوستانیوں کو انگریزوں کے مقابلہ میں ایک مستقل قوم قرار دے دیں۔ یہی وہ متحدہ قومیت ہے جو انگریز کی نظروں میں خار بن کر کھٹکتی ہے اور اس

کی نگاہ میں یہ سب سے زیادہ مہلک مرض ہے۔ چنانچہ دہلی کے ایک جلسہ عام میں حضرت مدنیؒ نے تقریر کرتے ہوئے اس حقیقت کو واضح کیا۔ اس تقریر سے انگریز سٹپٹا اٹھا۔ انگریز پرست شعرا کی زبانیں دراز ہونے لگیں اور متحدہ قومیت کی مخالفت میں بہت سے ادارے قائم کر دیئے گئے اور مختلف لوگوں اور نان نہاد علماء سے اس کے خلاف کتابیں اور مضامین لکھوائے گئے تاکہ لوگوں کے ذہنوں سے متحدہ قومیت کے تصور کو مٹائیں۔ چنانچہ پھر حضرت مدنیؒ نے متحدہ قومیت کی توضیح کے لیے ایک مستقل کتاب ''متحدہ قومیت اور اسلام'' کے نام سے لکھی اس میں وضاحت فرماتے ہوئے لکھا:

> ''ہماری مراد متحدہ قومیت سے اس جگہ وہی قومیت متحدہ ہے جس کی بنا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ میں ڈالی تھی، یعنی ہندوستان کے باشندے خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، بہ حیثیت ہندوستانی اور بہ حیثیت متحد الوطن ہونے کے ایک قوم ہو جائیں اور اس پردیسی قوم سے جو کہ وطنی اور مشترک مفاد سے محروم کرتی ہوئی سب کو فنا کر رہی ہے، جنگ کر کے اپنے حقوق کو حاصل کریں اور اس ظالم اور بے رحم قوت کو نکال کر غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھوڑ ڈالیں۔ ہر ایک دوسرے سے کسی مذہبی امر میں تعرض نہ کرے بلکہ تمام ہندوستان کی بسنے والی قومیں اپنے مذہبی اعتقادات اور مذہبی اعمال میں آزاد رہیں۔ اپنے مذہبی رسم و رواج، مذہبی اعمال کو اخلاقی آزادی کے ساتھ عمل میں لائیں، اور جہاں تک ان کا مذہب اجازت دیتا ہو، امن و امان قائم رکھتے ہوئے اپنی اپنی نشر و اشاعت بھی کرتے رہیں۔ اپنے پرسنل لا، کلچر اور تہذیب کو محفوظ رکھیں۔ نہ کوئی اقلیت دوسری اقلیتوں اور اکثریت سے ان امور میں دست و گریباں ہو، اور نہ اکثریت اس کی جدوجہد کرے کہ وہ اقلیتوں کو اپنے اندر ہضم کر لے۔ یہی وہ چیز ہے جس کا اعلان کانگرس ہمیشہ سے کر رہی ہے۔''
>
> (متحدہ قومیت اور اسلام: ص ۲۸)

کرپس مشن:

جاپانی فوجیں بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں اور مشرق کا مضبوط ترین دروازہ جس کی مضبوطی پر انگریزوں کو بڑا ناز تھا، 15 فروری 1942ء کو جاپانی فوجوں کے قبضہ میں آچکا تھا، اور 9 مارچ 1942ء کو برما بھی ان کے قدموں میں گر چکا تھا۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے حکومت برطانیہ ہندوستانیوں سے بات چیت کرنے پر مجبور ہوگئی، چنانچہ 11 مارچ کو برطانیہ کے وزیراعظم نے اعلان کیا کہ سر اسٹیفورڈ کرپس اہل ہند سے گفتگو کرنے کے لیے ہندوستان جا رہے ہیں۔ 22 مارچ 1942ء کو مسٹر کرپس بذریعہ ہوائی جہاز دہلی پہنچ گئے۔ 20-21-22 مارچ کو مرکزی جمعیۃ علمائے ہند کا ایک اجلاس حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی زیر صدارت لاہور میں ہو رہا تھا۔ جمعیۃ کے اس اجلاس میں کرپس مشن کے بارے میں جو تجویز پیش کی گئی وہ واقعات کی رو سے ایک پیش گوئی ثابت ہوئی۔ تجویز یہ تھی:

> ''ہندوستان کی آزادی کے متعلق سر اسٹیفورڈ کرپس برطانوی حکومت کا کوئی نظریہ لائے ہیں۔ معلوم نہیں وہ نظریہ کیا ہے، اس لیے اس کے متعلق اظہار رائے کا کوئی موقع نہیں، تاہم یہ امر بھی یقینی ہے کہ برطانوی حکومت نے اس کام کا بہترین وقت اپنی ناعاقبت اندیشی اور مغرورانہ بے پروائی سے ضائع کر دیا۔ اندیشہ ہے کہ موجودہ نازک لمحات میں کوئی ایسی تجویز بھی جو اگر بروقت ہوئی تو مناسب سمجھی جاتی، لیکن بعد از وقت کی مشہور مثل کی مثال نہ بن سکی۔ تاہم اس نازک لمحات میں ہندوستانیوں کے فرائض بہت اہم ہو گئے ہیں، جمعیۃ علماء تو مسلمانان ہند اور مسلم اداروں کو پرزور توجہ دلاتی ہے کہ اس وقت تمام مسلم ادارے اور جماعتیں اشتراک عمل سے کام لیں اور پورے غور و فکر اور تبادلۂ خیالات کے بعد کسی متحدہ فیصلہ پر سب متفق ہو جائیں۔''

(رپورٹ اجلاس جمعیۃ علماء، لاہور، ۱۹۴۲)

اس تجویز میں تمام مسلم اداروں اور جماعتوں کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ ایک متحدہ فیصلہ پر متفق ہو جائیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ ناظم اعلیٰ جمعیت علمائے ہند نے مسلم جماعتوں کو دعوت دی لیکن یہ دعوت ناکام ہوئی اور اس کا کوئی اثر مسلم لیگ کے نوابزادوں اور خانزادوں پر نہ ہوا۔

اس موقع پر جمعیت علماء نے ایک فارمولا بھی پیش کیا جو کہ حسب ذیل ہے:

''جمعیۃ علماء بارہا اس امر کا اعلان کر چکی ہے کہ اس کا نصب العین آزادی کامل ہے۔ اس پر تمام مسلمانانِ ہند متفق ہیں اور اسی کو اپنے لیے ذریعہ نجات سمجھتے ہیں۔ جمعیۃ نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ وطنی آزادی میں مسلمان آزاد ہوں گے، ان کا مذہب آزاد ہو گا اور مسلم کلچر اور تہذیب و ثقافت آزاد ہو گی۔ وہ کسی ایسے آئین کو ہرگز قبول نہ کریں گے جس کی بنیاد ایسی آزادی پر نہ رکھی گئی ہو۔

جمعیۃ علماء ہندوستان میں صوبوں کی کامل خودمختاری اور آزادی کی زبردست حامی ہے جس میں غیر مصرحہ اختیارات بھی صوبوں کے ہاتھ میں ہوں اور مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کریں اور جن کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہو۔

''جمعیۃ علمائے ہند کے نزدیک ہندوستان کے آزاد صوبوں کا سیاسی وفاق ضروری اور مفید ہے، مگر ایسا وفاق اور ایسی مرکزیت جس میں اپنی مخصوص تہذیب و ثقافت کی مالک نو کروڑ نفوس پر مشتمل مسلمان قوم کسی عددی اکثریت کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو، ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہ ہو گی یعنی مرکز کی تشکیل ایسے اصول پر ہونی ضروری ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی، سیاسی اور تہذیبی آزادی کی طرف سے مطمئن ہوں۔'' (رپورٹ اجلاس لاہور، ۱۹۴۲ء)

جمعیت کے اس فارمولے میں چار اہم چیزیں پیش کی گئیں:

1- آزادی کامل ہو۔

2- ایسی وطنی آزادی ہو کہ مسلمان اپنے کلچر، تہذیب اور مذہب و ثقافت کے لحاظ سے بھی آزاد ہوں۔

3- صوبے کامل اور مکمل طور پر خود مختار ہوں۔ مرکز کو صرف وہی اختیارات حاصل ہوں جن کو صوبے طے کر دیں۔ باقی غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے ہاتھ میں ہوں۔

4- ہندوستان کی حیثیت ایک وفاق کی ہوگی مگر اس وفاق کو اس طرح مرتب کیا جائے کہ مسلمان اپنی مذہبی، سیاسی اور تہذیبی آزادی کی طرف سے مطمئن ہوں۔ وہ کسی عددی اکثریت کے رحم و کرم پر مجبور نہ ہوں۔

کرپس مشن نے جو تجاویز پیش کیں ان میں وعدۂ فردا کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ تشکیل حکومت کا کلی اختیار وائسرائے کو دے دیا گیا تھا۔ ڈیفنس (دفاع) کسی صورت سے اور کسی طرح بھی ہندوستانیوں کو نہیں مل سکتا تھا۔ موجودہ آئین کا سکہ رائج الوقت ہر ایک تغیر و تبدل سے محفوظ کر دیا گیا تھا۔ کرپس مشن کی تجاویز کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے لوگ ایک سبز باغ کے تصور پر اپنا سب کچھ قربان کر دیں، جب کہ تجربہ اور مشاہدہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ فرنگیوں کے وعدے وعدۂ فردا سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ صرف کام نکالنے کے لیے ہوتے ہیں پورا کرنے کے لیے نہیں ہوتے۔

ایک طرف انگریزوں کے یہ وعدے وعید تھے جن کے ایفا ہونے کی کوئی امید نہ تھی اور دوسری طرف جنگ کی حالت یہ تھی کہ جرمنی اور اٹلی کی فوجیں ایک طرف کا کیشیا تک پہنچی ہوئی تھیں، اور خطرہ تھا کہ وہ ایران میں گھس کر ہندوستان پر حملہ کر دیں۔ دوسری طرف جاپان برما کے بیشتر حصہ کو فتح کر چکا تھا اور عنقریب وہ آسام کی سرحد تک پہنچنے والا تھا۔ کلکتہ پر اس کے جہازوں نے بمباری کی تھی، ایسی صورت میں کرپس مشن کی تجاویز اور پیشکش، ''دیوالیہ بنک کے چیک اور وہ بھی سادہ'' سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھیں۔ جنگ کی اس شدت کے باعث وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو نے ہندوستان کی لوٹ کھسوٹ اور جبر و اکراہ کا وہ تباہ کن طریقہ اختیار کر رکھا تھا جس کے نتیجہ میں چند ماہ بعد بنگال میں وہ قحط پڑا جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ اس صورت حال میں اہل ہند کی رائے

عامہ برطانیہ کا ساتھ اسی وقت دے سکتی تھی جب اس کو یہ محسوس ہوتا کہ ہندوستان اپنا ہے۔ ہندوستان کی حفاظت کے نام پر انگریزی حکومت کی حفاظت نہیں کی جا سکتی تھی۔ قریباً دو ہفتہ تک کانگرس کے لیڈروں مولانا آزاد، گاندھی اور جواہر لعل نہرو کے درمیان میٹنگز ہوتی رہیں۔ کانگرس کا مطالبہ یہ تھا کہ فی الحال ایک بااختیار قومی حکومت قائم کر دی جائے، اس کے بغیر ملک رضا کارانہ طور پر قربانی دینے کے لیے کسی صورت تیار نہیں ہو سکتا۔ حالات اس بات کی غمازی کرتے تھے کہ کرپس کانگرس کے دلائل سے متاثر ہوا اور وہ اپنی تجاویز میں کچھ ترامیم بھی کرنا چاہتا تھا لیکن چرچل اور ایمرے اور ان دونوں کے ساتھ وائسرائے ہند اس تبدیلی پر رضا مند نہ ہوئے۔ چنانچہ وہ اپنے مشن میں ناکام واپس چلا گیا بلکہ وہ حکومت اور ہندوستانیوں کے مابین اختلافات کی خلیج کو کچھ وسیع کر گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے واپس جانے کے چند روز بعد ہندوستان میں گرفتاریوں کا ایک وسیع سلسلہ شروع ہو گیا جو ایک ہولناک تحریک کا سبب بن گیا۔ کرپس نے اگرچہ مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کا اپنی تجاویز میں انکار کیا تھا، لیکن کرپس نے ایک سوال کے جواب میں کانگرس کا یہ حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ

> ”کانگرس کے حلقوں میں یہ بھی مانا جا چکا ہے کہ اگر مسلمانوں کی رائے عامہ علیحدگی کے حق میں ہوگی تو اسے نہیں روکا جا سکتا۔“

کرپس کی واپسی پر 10 اپریل 1942ء کو کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس دہلی میں ہوا۔ اس میں مندرجہ ذیل تجویز پاس کی گئی:

> ”کانگرس ہندستان کی آزادی اور اتحاد کی حامی رہی ہے اور اس اتحاد میں کوئی رخنہ بالخصوص جدید دنیا میں جب کہ لوگوں کے دماغوں میں وسعت پذیر فیڈ ریشنوں کا تصور بندھا ہوا ہے، سب متفقہ فریقوں کے لیے نقصان دہ ہو گا اور اس کا خیال کرنا بھی تکلیف دہ ہوگا۔ پھر بھی کانگرس کسی علاقہ وارانہ واحدے کے لوگوں کو ان کی اعلانیہ اور مسلمہ مرضی کے خلاف انڈین یونین میں رہنے پر مجبور کرنے کا خیال دل میں نہیں لا سکتی۔ ہر علاقہ وارانہ واحدے کو

انڈین یونین میں پوری پوری خوداختیاری حاصل ہونی چاہیے۔"

(روزنامہ تیج ۱۳ اپریل ۱۹۴۲ء)

کانگرس کی یہ تجویز بڑی واضح تھی اور اس تجویز کے ذریعہ اس نے حق خودارادیت کو باضابطہ تسلیم کرلیا تھا۔ اگرچہ تجویز میں وحدت ہندوستان کے الفاظ نمایاں ہیں اور ان کو غلبہ حاصل ہے اور اسی کو ہندوستان کی حفاظت وترقی کے لیے ضروری مفید سمجھا جارہا ہے مگر تاہم کسی علاقہ کی رائے کو ان سب پر ترجیح دی گئی ہے۔

کانگرس کی یہ تجویز جمعیۃ علمائے ہند کے فارمولے کی تائید تھی:

1- جمعیۃ علمائے ہند ہندوستان میں صوبوں کی کامل خودمختاری اور آزادی کی زبردست حامی ہے۔

2- جمعیۃ علمائے ہند کے نزدیک ہندوستان کے آزاد صوبوں کا سیاسی وفاق ضروری اور مفید ہے۔

اس کے بعد کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ 16 اگست 1942ء بمبئی میں ایک طویل ریزولیشن منظور کیا جس میں تسلیم کیا گیا کہ

"کانگرس کے نظریہ کے مطابق یہ آئین (جو نمائندہ مرتب کرے گی) فیڈرل یعنی وفاقی ہونا چاہیے اور اس فیڈرل میں شریک ہونے والے یونٹوں کے لیے زیادہ سے زیادہ آزادی ہونی چاہیے، اور باقی اختیارات انہیں یونٹوں کے ہاتھ میں ہونے چاہئیں۔"

یہ ریزولیشن بھی جمعیۃ علماء ہند کے اس فارمولہ کی تائید کررہا تھا جو اس نے اپنے اجلاس لاہور میں پاس کیا تھا۔

29 جولائی 1942ء کو مولانا آزاد نے بحیثیت صدر آل انڈیا کانگرس کمیٹی ایک بیان پریس کو دیا کہ

"کانگرس کو قطعی افسوس نہ ہوگا اگر گورنمنٹ مسلم لیگ کو بلائے اور اسے طاقت دے دے، لیکن حقیقی آزادی ہونی چاہیے۔ کانگرس کو صرف اس ہی سے تعلق ہے۔ ہمارا جھگڑا یہ نہیں کہ طاقت کن

ہاتھوں میں دی جا رہی ہے بلکہ کیا چیز دی جا رہی ہے۔ اگر لیگ کو طاقت دی بھی گئی تو وہ کانگرس کو ضرور ملائے گی۔ میں نے مسلم لیگ کا خاص طور پر اس لیے ذکر کیا ہے کہ موجودہ کشمکش میں اس کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے، کانگرس کو اس میں بھی اعتراض نہ ہوگا کہ طاقت نان پارٹی کے لیڈر سر سپرو وغیرہ کو دے دی جائے۔"

(تیج مورخہ ۳۰ جولائی ۱۹۴۲ء)

مولانا آزاد کے اس بیان کی تائید میں گاندھی نے بمبئی کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میں دل سے مولانا آزاد کی اس پیشکش کی تصدیق کرتا ہوں کہ برٹش حکومت ہندوستان کی حکومت کسی قوم کے حوالے کر دے، اگرچہ حکومت مسلم قوم کے حوالہ کر دی جائے تو مجھے کبھی افسوس نہ ہوگا۔ ہندوستان ہندوستان کے مسلمانوں کا گھر ہے۔"

(تیج ۱۲ اگست ۱۹۴۲ء بحوالہ علمائے حق ص ۴۸۶)

کرپس مشن تو واپس چلا گیا لیکن وائسرائے ہند نے 25 جون 1942ء کو حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کو گرفتار کر لیا اور ملک میں وسیع پیمانہ پر گرفتاریوں کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اپنے صدر کی گرفتاری کے بعد جمعیۃ بھی برطانوی سامراج سے نبرد آزمائی کے لیے تیاری میں مصروف ہوگئی۔ چنانچہ 15 اگست 1942ء کو حضرت مفتی کفایت اللہ، مولانا حفظ الرحمٰن ناظم اعلیٰ جمعیۃ، مولانا احمد سعید اور مولانا عبدالحلیم صدیقی کی جانب سے ایک بیان اخبارات میں شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ ہندوستان کا ہر بچہ، بوڑھا، جوان اور عورت و مرد اپنی زندگی کی خاطر آزادی حاصل کرنے کے لیے مضطرب اور بے چین ہے، اور اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ اس قیامت خیز اور ہلاکت انگیز دور میں آزادی کامل کے سوا نجات کا اور کوئی راستہ نہیں۔" اس بیان میں یہ بھی کہا گیا کہ "اس جنگ آزادی میں کامیابی کی شرط اولین تمام ہندوستانیوں کا اتحاد اور متحدہ محاذ ہے۔ اگر تمام ہندوستانی متحد ہو کر حکومت کے مقابلہ پر کھڑے ہو گئے تو فتح یقینی ہے اور حکومت کے پاؤں اکھڑنے میں زیادہ دیر نہ لگے گی۔ اور جب کہ ہندوستان کی آزادی کامل کے مقصد عظیم اور نصب العین میں کانگرس، مسلم لیگ، جمعیۃ علماء، احرار اور دیگر تمام

جماعتیں متحدہ و متفق ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ آزادی کی جنگ سے علیحدہ رہنا اور محض تماشائی بن کر دور سے تماشا دیکھتے رہنا پسند کریں۔ اگر ان میں باہمی بے اعتمادی اور شبہات ہوں تو ان کو باہمی سمجھوتہ سے جلد سے جلد دور کر دینا وقت کا اہم ترین فریضہ ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد صدر انڈین نیشنل کانگرس کا یہ بیان کہ ہم آزادی چاہتے ہیں اور ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ انگریز حکومت کے تمام اختیارات ہندوستانیوں کو دے، خود دست بردار ہو جائے، اگر وہ ہندو مسلم یا کانگرس اور مسلم لیگ کے اختلاف کو بہانہ بنائیں تو کانگرس کو اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ وہ حکومت کے اختیارات مسلم لیگ کو دے دیں کیونکہ ہمارا مقصد اس صورت میں بھی پورا ہو جاتا ہے کہ حکومت ہندوستانیوں کو مل گئی اور انگریز علیحدہ ہو گئے، نہایت دانشمندی، حب الوطنی اور عشق آزادی پر مبنی ہے۔ اگر مسلم لیگ اس حد تک جانے پر آمادہ نہ ہو تو نہ ہو لیکن بہر حال اس پر یہ فرض تو عائد ہوتا ہے کہ وہ اس بہترین وقت اور نازک ترین لمحات کو ضائع نہ کرے اور پوری سرگرمی اور انتہائی جدوجہد کر کے باہمی سمجھوتہ کی راہ نکالے اور پھر جنگ میں شریک ہو کر اپنا ملی، وطنی اور قومی فریضہ ادا کرے۔ ہمیں امید ہے کہ مسلم لیگ اور اس کے محترم صدر مسٹر جناح وقت کی نزاکت کا پورا احساس فرمائیں گے اور اس تاریخی موقع کو ضائع نہ ہونے دیں گے اور مسلمان قوم کو دشمنانِ آزادی کے کیمپ میں شامل ہونے اور فداکارانِ وطن کے مقابلہ پر آنے کی رسوائی اور ذلت سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ ہمیں یہ بھی توقع ہے کہ کانگرس بھی وسعت قلب اور دانش مندی سے کام لے گی اور آل انڈیا کانگرس کے اجلاس بمبئی میں وہ ان تمام شبہات کو رفع کر دے گی جو مختلف جہات سے پیش کیے جاتے ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کا مقصد اس قدر اعلیٰ اور ارفع ہے کہ اس کی خاطر کانگرس کو اپنی طرف سے ایسا صاف صاف اعلان کر دینا ضروری ہے جس سے مسلم لیگ اور تمام متعلقہ جماعتیں مطمئن ہو جائیں اور کسی کے دل میں کوئی شبہ اور خدشہ باقی نہ رہے۔ ایسی صورت میں باہمی سمجھوتہ ہونے میں کوئی چیز مانع نہ رہے گی۔"

یہ سب تجویزیں اور اپیلیں بالکل اکارت گئیں۔ 8 اگست 1942ء کی صبح کو آل انڈیا کانگرس ورکنگ کمیٹی کے موجود تمام ارکان کو گرفتار کر لیا گیا اور شہر میں ہر طرف

پولیس اور فوج کو گشت کرنے اور اپنا حق وفاداری ادا کرنے کا حکم دیا گیا۔ پورا ملک ہنگامہ کا ایک آتش کدہ بن گیا۔ پنجاب میں حکومت تمام ہندوستان سے کمزور رہی۔ صوبہ سرحد میں حکومت نے انتہا سے زیادہ نرم پالیسی اختیار کی۔ ان کی قانون شکنی اور سول نافرمانی کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ بڑے بڑے علماء کو گرفتار کرلیا گیا اور ان کے ساتھ کئی ہزار مسلمان پس دیوار زنداں چلے گئے۔ امریکہ کے صدر روز ویلٹ کے خاص فرستادہ فلپس انہیں دنوں ہندوستان پہنچا، ہندوستان کے حالات کا اس نے اپنی آنکھوں سے معائنہ کیا۔ اس میں اس نے گاندھی سے ملاقات کرنا چاہی لیکن وائسرائے نے ملاقات کی اجازت نہ دی۔

حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ کی اسارت:

جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ کرپس مشن کی ناکامی کے بعد حکومت بڑی برافروختہ اور سیخ پا تھی، لہٰذا حکومت نے اب سختی کرنا شروع کی۔ سختی کا آغاز گرفتاریوں سے ہوا۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ کو 24 جون 1942ء کی رات 2 بجے سہارنپور اور دیوبند کے درمیان تلہیڑی کے اسٹیشن پر گرفتار کیا گیا۔ رات سہارنپور حوالات میں رکھ کر صبح مراد آباد روانہ کر دیا۔ آپ کے وکلاء نے ضمانت کی درخواست دی لیکن ضمانت منظور ہونے کے بعد پھر مسنوخ کر دی گئی۔ 25 جون سے 18 اگست 1942ء تک مراد آباد جیل میں پھانسی کے ملزمان کی ایک کوٹھڑی میں آپ کو قید تنہائی میں رکھا گیا۔ آپ کی چھ ماہ کی سزا 4 جنوری 1943ء کو ختم ہونے والی تھی کہ اس سے چار پانچ روز قبل آپ کو دفعہ 26 ڈیفنس آف انڈیا رولز کا نوٹس تعمیل کروا کر غیر محدود عرصہ کے لیے نظر بند کر دیا۔ 24 جنوری کی صبح کو نینی جیل الٰہ آباد میں منتقل کر دیا گیا۔ وہاں اگرچہ مولانا عبدالباری عباسی، مولانا عبدالقیوم لکھنوی، مولانا عبدالحی، مولانا عبدالمجید اور مولانا سید محمد شاہد فاخری پہلے سے موجود تھے۔ یہ حضرات یکے بعد دیگرے رہا ہوتے رہے لیکن آپ قریباً 19 ماہ نینی جیل میں محبوس رہے اور 26 اگست 1944ء کو آپ غیر مشروط طور پر رہا کر دیئے گئے۔

☆ ☆ ☆

حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ

مولانا ابوالکلام آزاد نہ صرف ایک سیاسی شخصیت تھے بلکہ ایک نابغہ روزگار شخصیت تھے۔ وہ مفسر قرآن بھی تھے، حدیث کے محدث بھی تھے، فقیہہ و ادیب بھی تھے۔ جس فن کا بھی وہ تقریر و تحریر میں اظہار کرتے، معلوم ہوتا کہ قدرت نے اسی فن کے لیے ان کو پیدا کیا تھا۔ مولانا آزاد کی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور 1905ء سے شروع ہوا اور 1919ء پر ختم ہوا۔ دوسرا دور 1920ء سے 1930ء تک جب کہ تیسرا دور 1940ء سے 1947ء تک ہے۔ 1940ء سے 1946ء تک آپ آل انڈیا نیشنل کانگرس کے صدر رہے۔ اس عرصہ میں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر بہت سی تبدیلیاں اور تغیرات نے جنم لیا اور مولانا کو بہت سنگین حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ مولانا کی سیاسی دانش مندی، فراست، بصیرت و اہلیت، فہم و ادراک، نازک ترین مسائل اور گتھیوں کو سلجھانے کی صلاحیت و اہلیت نے ان تمام گتھیوں کو نہایت احسن طریق سے سلجھایا، لیکن اپنوں کے عدم تعاون، ایجاب وقبول کے بعد انکار اور پذیرائی سے گریز پائی کے باعث مولانا جو نتائج حاصل کرنا چاہتے تھے، وہ نہ کر سکے۔ ایک موقع ایسا بھی آیا کہ آپ ہندوستان کی متحارب قوتوں اور مختلف سیاسی طاقتوں کو ایک نقطہ پر مجتمع کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے، لیکن بعض لوگوں کی غیر سیاسی سوچ، حقیقت سے گریز پائی اور انگریزوں کی مداخلت اور سازش سے وہ نقطۂ اجتماع تشتت و انتشار کا شکار ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غیر ملکی استعمار سے آزادی کی تاریخ نیا رخ اختیار کر گئی جس سے جانی اور مالی دونوں قسم کا نقصان ہوا۔

مولانا آزاد اس وقت سیاست کے میدان میں آئے جب گاندھی ابھی ساؤتھ افریقہ میں آزادی کی جنگ لڑ رہا تھا۔ آپ کی سیاست کے تین پہلو تھے:

1- مسلمانوں میں سیاسی اور مذہبی شعور بیدار کرنا۔

2- ہندو مسلم اتحاد۔

3- استخلاص وطن کی جدوجہد۔

ان تینوں مقاصد کے حصول کے لیے آپ نے عمر بھر جدوجہد اور کدوکاوش کی۔ ہر قسم کے مصائب و آلام کو نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائے۔ آپ نے مسلمانوں کو جہالت وضلالت اور ذلت وغلامی سے نکالنے اور انہیں صراط مستقیم کی شاہراہ دکھانے کے لیے الہلال کا اجراء کیا جس نے برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کے ذہنوں میں بیداری کی لہر پیدا کرنے کی پوری کوشش کی جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ الہلال کے بند ہونے کے بعد پھر البلاغ نکالا۔ ان دونوں رسالوں کے اوراق پر آپ کے دردمند دل کی آہیں اور صدائیں بکھری پڑی ہیں۔ 1931ء میں جمعیت علمائے ہند کے لاہور میں منعقدہ اجلاس میں اپنے ایک تحریری خطبہ میں فرمایا:

> ''مجھے امید ہے کہ آپ مجھے خودستائی اور خودفروشی کا الزام نہ دیں گے۔ اگر میں بطور تحدیث نعمت اس موقع پر دعوت ''الہلال'' کا بھی ذکر کروں۔ عالم اسلامی کے ماضی قریب میں اصلاح دینی اور انتباہ وانبعاث علماء ملت اور احیاء وتجدید امت کی جو دعوت ان تمام پچھلی دعوتوں کے طریقوں اور اسلوبوں سے بالکل مختلف اسلوب پر بلند ہوئی ہے، وہ دعوت ''الہلال'' ہے۔ آج آپ کی یہ مقدس و مبارک جمعیۃ العلماء جس مقصد کی جستجو میں منعقد ہوئی ہے، میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ یہ وہی یوسف مقصود ہے جس کے فراق میں میں 1911ء سے مستقل فغاں سنجی کر رہا ہوں، اور جس کے لیے میں نے ''الہلال'' مرحوم کے صفحوں کو کبھی اپنے چشم

خونین کے آنسوؤں سے رنگا ہے اور کبھی اس کے سوادِ حروف کے اندر اپنے دل و جگر کے ٹکڑے بچھا دیئے ہیں۔ 1911ء سے لے کر آج تک یہ مقصد میرے دل کی تمناؤں اور آرزوؤں کا مطلوب اور میری روح کی عشق و شیفتگی کا محبوب رہا ہے۔ خدا کی کوئی صبح مجھ پر ایسی طلوع نہیں ہوئی جب اس مقصد کی طلب سے میرا دل خالی ہوا ہو، اور کوئی شام مجھ پر ایسی نہیں گزری جب میں نے اس کی تمنا میں اپنے بسترِ غم واندوہ پر بے قراری کی کروٹیں نہ بدلی ہوں۔ میں نے اپنی آزادی کی تمام فرصت اسی کے عشق میں بسر کی اور نظر بندی و قید کے سال بھی اسی فراق میں کاٹے۔"

مولانا آزاد ہندو مسلمان اتحاد کے ایک بہت بڑا داعی تھے کیونکہ وہ ایمانداری اور خلوص دل سے یہ سمجھتے تھے کہ اس سفید فام ریچھ انگریز سے اس وقت تک رہائی ممکن نہیں اور ہم اس وقت تک عروس آزادی سے ہم کنار نہیں ہو سکتے جب تک کہ ساری قومیں متحد و متفق ہو کر جدوجہد نہیں کریں گی کیونکہ ہندو تیس کروڑ ہیں اور مسلمان صرف آٹھ سے دس کروڑ ہیں۔ دونوں قومیں مل کر اگر آزادی کے لیے جدوجہد کریں تو ہم جلد آزادی کے حصول میں کامیاب ہو سکتے ہیں، لیکن بعض حلقوں خصوصی طور پر وہ حلقے جن کا اندرون خانہ انگریزوں سے رابطہ تھا، وہ "تقسیم کرو اور حکومت کرو۔" (Divide and Rule) کے اصول پر کاربند تھے۔ چنانچہ ان کی طرف سے مختلف قسم کے اعتراضات اور شبہات اٹھائے جاتے تھے اور ان اعتراضات اور شبہات سے ان کا مقصد یہ تھا کہ انگریز ہی اس ملک پر قابض رہیں اور ان سے آزادی حاصل کرنے میں جس قدر بھی تاخیر ہو سکے بہتر ہے۔ مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین بابر نے اپنی فراست، دور اندیشی اور مومنانہ بصیرت سے اپنے بیٹے ہمایوں کو یہ وصیت کی تھی کہ "اے میرے بیٹے! ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں، اور یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی عنایت اور رحمت ہے کہ اس نے تمہیں اس ملک کی حکمرانی عطا کی، میں تمہیں وصیت کرتا ہوں:

1- تم مذہبی تعصب کو اپنے دل میں ہرگز راہ نہ دینا اور یہاں کے لوگوں کے مذہبی

رسوم کا خیال رکھتے ہوئے اور رعایت کے بغیر سب کے ساتھ پورا انصاف کرنا۔

2- کسی قوم کی عبادت گاہ کو مسمار اور منہدم نہ کرنا تا کہ بادشاہ اور رعیت کے تعلقات دوستانہ رہیں اور امن واماں کا مسئلہ کسی صورت پیدا نہ ہو۔

3- اسلام کی نشر واشاعت اور تبلیغ کے سلسلہ میں ظلم وستم کی تلوار کے مقابلہ میں لطف واحسان سے کام لینا۔

ہمایوں اور اس کے بعد تمام مغلیہ حکمرانوں نے بابر کی اس وصیت پر عمل کیا اور غیر مسلم رعایا پر کسی قسم کی کوئی زیادتی نہ کی اور حسن سلوک سے کام لیا۔ جس کے نتیجہ میں غیر مسلموں نے مغلیہ سلطنت کی توسیع کے لیے اپنی جان تک کی بازی لگا دی۔ مسلمان بادشاہوں نے ان کو اپنے درباروں میں بڑے بڑے عہدے عطا کیے۔ مختلف اعزازات اور انعامات سے نوازا اور ہر معاملہ میں غیر مسلم رعایا سے انصاف سے کام لیا۔ یہی وجہ تھی 1857ء کی جنگ آزادی میں ہندو اور مسلمان دونوں نے ہندوستان کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی حکومت کو بچانے اور انگریزوں کے پنجۂ استبداد سے ملک کو آزاد کرانے کے لیے متحدہ کوشش کی حالانکہ بادشاہ مسلمان تھا اور ایک مسلمان کی حکومت کو بچانا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ قدرت کو ابھی اس سفید فام قوم سے آزادی منظور نہ تھی۔

جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد سرسید احمد خان نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کرنے والوں کو سخت مطعون کیا، جنرل بخت خان کو جنرل بدبخت خان کہا گیا اور مغلظات تک سنائیں کیونکہ سرسید نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان کے لوگ انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوں، لیکن وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے اور اس اتحاد کا انہوں نے بہت پرچار بھی کیا، لیکن اس کے ساتھ ہی سرسید انگریز سے وفاشعاری کا درس بھی دیتے رہے۔ پھر معلوم نہیں ان نو آبادکاروں نے ان کے کان میں کیا پھونکا کہ وہ یکا یک ہندوؤں کی عددی اکثریت کا رونا رونے لگے اور عددی اکثریت کا ایک ہوا کھڑا کر دیا اور مسلمانوں کو خود اعتمادی سے محروم کرنے اور ان میں خوف و ہراس پھیلانے میں کمر بستہ ہو گئے، اور ان میں متحدہ ہندوستانی قومیت کا جذبہ ختم ہو گیا اور اب ان کی عملی زندگی میں یہ انقلاب آیا کہ وہ مسلمان کو مسلم قومیت کی بنیاد پر ملازمتوں میں کوٹہ کی

استدعا کرنے لگے۔ یہ سب کچھ کیوں کیا جا رہا تھا، ہر ذی عقل اس کو سمجھ رہا تھا کہ ''کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں۔'' یہ سب کچھ سرسید نے انگریزوں کے مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد میں رخنہ اندازی کے لیے کہا کیونکہ ہندو مسلم اتحاد برطانوی استعمار اور سامراج کے مستقبل کے لیے ایک شدید خطرہ تھا۔ مولانا آزاد سمجھ رہے تھے کہ سید احمد خان نے مسلم قومیت کا جو شوشہ چھوڑا ہے، اس سے ہندوستان کی آزادی کو شدید ضعف کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے اور اس کا فائدہ ہندوستانیوں کو نہیں انگریزی استعمار کو ہو رہا ہے۔ مولانا نے اس کو شکست خوردہ ذہنیت (Defeated Mentality) سے بھی تعبیر کیا اور مسلمان کی خود اعتمادی کے منافی بھی قرار دیا اور اس کو سب سے بڑا شیطانی وسوسہ بھی بتایا۔ چنانچہ 18 دسمبر 1912ء کے ''الہلال'' میں لکھا ہے:

> ''ہندو مجارٹی کے عفریت کا خوف بھی اب خدا کے لیے دل سے نکال دیجئے۔ یہ سب سے بڑا شیطانی وسوسہ ہے جو مسلمانوں کے قلب میں القاء کیا گیا ہے۔ طاقت محض تعداد پر نہیں بلکہ اور باتوں پر موقوف ہے۔ اصل شی قوموں کی معنوی طاقت ہے جو اس کے اخلاق، اس کے کردار اور اس کے اتحاد سے پیدا ہوتی ہے۔ آپ کی تمام بے راہ روی، نفس پرستی، اغراض پرستی، باہمی جنگ و جدال، ایثار و فدویت فراموشی اور ہر قسم کے اشغال ضلالت صرف اس لیے ہیں کہ سامنے کوئی کوشش نہیں، اور جس بلائے ہوش کو ہم دیکھ رہے ہیں آپ نے ابھی دیکھا ہی نہیں۔ جس دن ایک اچٹتی ہوئی نظر بھی ''آزادی'' کے حسن پر پڑ گئی پھر آپ خود بخود یہ تمام قصے بھول جائیں گے۔''

مولانا آزاد کا ہندو مسلم اتحار پر غیر متزلزل اعتماد تھا۔ وہ اس میں آزادی اور دین کے لیے بڑے فوائد دیکھ رہے تھے۔ لیکن اس بارے میں ان کے مخالفین کی طرف سے ان پر بڑے گھناؤنے اعتراضات کیے گئے۔ یہاں تک کہا گیا کہ مسلم لیگ کے باہر کے عناصر کانگرس کے اجیر اور اسیر ہیں اور کانگرس صرف ہندوؤں کے مفادات اور حقوق

کی نگہبان جماعت ہے۔ مولانا مارچ 1940ء میں آل انڈیا کانگرس کے سالانہ اجلاس رام گڑھ میں فرمایا:

''میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے۔ خود میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں، اور میں یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے، لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی۔ وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل ہوں۔''

پھر اسی خطبہ میں آپ نے فرمایا:

''تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعہ پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے۔ اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے، ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہب اسلام کے

پیروکار ہیں۔ میں اس دائرہ کو اس سے زیادہ وسیع کروں گا۔ میں ہندوستانی مسیحی کا بھی یہ حق تسلیم کروں گا کہ وہ آج سر اٹھا کر کہہ سکتا ہے کہ میں ہندوستانی ہوں اور باشندگان ہند کے ایک مذہب یعنی مسیحیت کا پیرو ہوں............''

اس خطبہ کے آخری الفاظ آج بھی ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے اسی طرح شمع ہدایت ہیں جس طرح کہ اس وقت تھے جب مولانا نے یہ خطبہ دیا تھا۔ مولانا دیکھ رہے تھے کہ ہندوؤں کی ایک جماعت میں رجعت پسندی کے جذبات ابھر رہے ہیں اور اس Revivalism کے خطرات ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں تھے۔ چنانچہ خطبہ کے آخری پیراگراف میں مولانا نے اس صورتحال کی طرف اشارہ کر کے متحدہ قومیت کے اساس پر ان الفاظ میں زور دیا تھا۔

''صدیوں کی مشترک تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامان سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ سکی ہو۔ ہماری بولیاں الگ تھیں مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسوم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے مگر انہوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کر لیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے، مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا ہے۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانہ کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں تو انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایک خواب

دیکھ رہے ہیں اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔

مولانا آزادؒ کے اس خطبہ پر قاضی عبدالغفار نے لکھا کہ

''مولانا 1940ء میں ہندو Revivalism کے اس خطرہ سے واقف تھے۔ وہ خطرہ زیادہ طاقتور صورت میں آج ہمارے سامنے ہے اور بلاشبہ اس طاقت میں مسٹر جناح کے ''دوقومی نظریہ'' (جس کو مجیب الرحمٰن نے بنگلہ دیش بنا کر اور موجودہ حکومت نے مخلوط انتخاب کے ذریعہ ختم کر دیا ہے) نے بہت اضافہ کیا، لیکن اس قدرتی سانچہ کو توڑنے کے آج سوائے اس کے اور کوئی معنی نہیں ہو سکتے کہ ہم عالمگیر اور بین الاقوامی ارتقاء سے ٹکر لے کر شکست کھائیں اور آزاد ہندوستان کو ایک لمحہ کی آزادی کے بعد پھر غلامی کے خندق میں ڈال دیا جائے۔ جس وقت مولانا اس غیر فطری تخیل کی مذمت کر رہے تھے عین اسی وقت مسٹر جناح صاف صاف کہہ رہے تھے کہ وہ مسلمانوں کی قسمت کے فیصلے کو ہندوستان کی قسمت کے فیصلے سے وابستہ نہیں کر سکتے اور یہ کہ ''مسلمانوں کو خود ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے اپنی قسمت کا فیصلہ کرنا ہوگا۔'' واقعات نے بتا دیا کہ جو فیصلہ پاکستان کے مسلمانوں نے اپنی قسمت کا کیا ہے اس کی قیمت زیادہ تر ہندوستان کے مسلمانوں کو ادا کرنا پڑی ہے، اور پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خود پاکستان کا مستقبل بغیر اس تیسری قوت کے محفوظ ہے جس کی طرف مولانا نے اپنے خطبہ صدارت میں اشارہ کیا تھا، اور جس نے ہندوستان کی آزادی کو تقسیم کے حربہ سے کافی مجروح کر کے اپنے سامراج کی گرتی ہوئی عمارت کی دیواروں کو مسمار ہونے سے بچا لیا ہے۔''

مولانا ایک بالغ نظر عظیم سیاست دان تھے۔ ان کی نگاہ کے سامنے قوموں اور ملکوں کے عروج کی داستانیں دامن پھیلائے کھڑی تھیں۔ وہ تاریخ کے تغیر و تبدل سے

بخوبی آشنا تھے اور وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ہندوستان کی آزادی کے نقشہ میں ہندو مسلم اتحاد کے ذریعہ ہی رنگ بھرا جا سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایشیا اور افریقہ کی آزادی کا راز بھی ہندوستان کی آزادی ہی میں مضمر ہے۔ اگر دونوں قوموں کے اختلافات کی خلیج کو نہ پاٹا گیا تو اس کا فائدہ غیر ملکی حکمرانوں کو ہوگا اور آزادی کی منزل دن بدن دور ہوتی جائے گی۔ کیونکہ آزادی آپ کو ہر شی سے زیادہ عزیز تھی۔ چنانچہ آپ نے لکھا ہے:

> ''میرا اعتقاد ہے کہ آزاد رہنا ہر فرد اور قوم کا پیدائشی حق ہے۔ کوئی انسان یا انسانوں کی گھڑی ہوئی بیوروکریسی یہ حق نہیں رکھتی کہ خدا کے بندوں کو اپنا محکوم بنائے۔ محکومی اور غلامی کے لیے کیسے ہی خوش نما اور الفاظ کیوں نہ رکھ لیے جائیں لیکن وہ غلامی ہی ہے اور خدا کی مرضی اور قانون کے خلاف ہے۔ اسلام جو بنی نوع انسان کو اس کی چھینی ہوئی آزادی واپس دلانے کے لیے آیا تھا۔ یہ آزادی بادشاہوں، اجنبی حکومتوں، خود غرض مذہبی پیشواؤں اور سوسائٹی کی طاقتور جماعتوں نے غصب کر رکھی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ حق ''طاقت'' اور ''قبضہ'' ہے، لیکن اسلام نے ظاہر ہوتے ہی اعلان کیا کہ حق طاقت نہیں ہے بلکہ خود حق ہے اور خدا کے سوا کسی انسان کو سزاوار نہیں کہ بندگان خدا کو اپنا محکوم اور غلام بنائے۔'' (قول فیصل: ص ۱۱)



مولانا آزاد کی سیاسی زندگی کا آغاز

تاریخ کے اوراق اور دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا آزاد کی سیاسی زندگی کا آغاز 1905ء میں ہوا۔ پھر 1912ء میں الہلال جاری کر کے انہوں نے قلمی جہاد شروع کیا۔ مسلمان اس زمانہ میں انگریز حکومت کے اشاروں پر رقص کناں تھے۔ جنگ آزادی 1857ء کے بعد انگریز مسلمانوں پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہو گیا تھا۔ بڑے بڑے جاگیردار اس کے جاسوس تھے۔ چنانچہ بنگال کا گورنر بیم فیلڈ فلر علی الاعلان کہتا تھا کہ حکومت مسلمانوں کی جماعت کو اس نظر سے دیکھتی ہے جیسے کوئی شوہر اپنی محبوب بیوی کو۔ اس وجہ سے ملک میں جو انقلابی جماعت تھی جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے، مسلمان افسروں کے رویہ سے نہایت شاکی تھے۔ اس انقلابی جماعت کا ایک رکن شیام سندر چکرورتی تھا۔ مولانا اس سے ملتے لیکن وہ مسلمان ہونے کی وجہ سے مولانا پر کوئی زیادہ اعتماد نہ کرتا تھا، لیکن پھر رفتہ رفتہ مولانا کو ان کا اعتماد حاصل ہو گیا۔ مولانا نے ان انقلابیوں کو بتایا کہ ہندوستان کے مسلمان بھی سیاسی جدوجہد میں دلچسپی لینے لگیں گے بشرطیکہ ان میں کام کیا جائے، لہٰذا انہیں اپنا دوست اور ساتھی بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ بات دراصل یہ تھی کہ شملہ وفد کے تماشا سے مسلمانوں کا اعتماد متزلزل ہو گیا تھا۔ لیگ نے شملہ ڈیپوٹیشن کی کوکھ سے جنم لیا تھا اور اس کے مقاصد انگریز حکومت سے وفا شعاری اور مسلمانوں کو سیاست سے دور رکھنا تھا۔ مولانا نے شملہ وفد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

"تم نے غلامی کا ایک بت کدہ بنایا اور اس کا نام سیاست کی مسجد رکھا۔ تم نے سجدے کا سر جھکایا اور قوم کو دھوکا دیا کہ ہم عزت کو

سر بلند کر رہے ہیں۔"

لیگ کے قیام کے ساتھ ہی ہندوؤں کی فرقہ وارانہ تنظیم ہندومہاسبھا بھی اسی سال دسمبر 1906ء میں قائم ہوگئی، اور اس طرح سے سیاست میں فرقہ واریت راہ پانے لگی۔

اس زمانہ مولانا کو عراق، مصر، شام اور ٹرکی جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں کے انقلابیوں سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ ان لوگوں کی ملاقات کے نتیجہ میں مولانا کے خیالات میں وسعت اور رفعت کا اضافہ ہوا۔ آپ نے مسلمانوں کو جنگ آزادی میں شامل کرنے کے لیے ایک نئی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ الہلال کا اجراء اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔ تحریک ریشمی رومال کے سلسلہ میں مولانا کی دو مرتبہ ملاقات مولانا حسرت موہانی سے بھی ہوئی۔ یہ کلکتہ جا کر بھی مولانا آزاد سے ملے تھے۔ انڈیا آفس کی دستاویزات میں کہا گیا ہے کہ مولانا نے حزب اللہ کے نام سے ایک جماعت بھی قائم کی جس کا مقصد ظاہری طور پر اسلام کا احیاء تھا۔ اس کا بانی ایک قابل اعتراض اخبار "الہلال" کا ایڈیٹر تھا جو بعد میں پریس ایکٹ کاروائی کی وجہ سے بند ہوگیا تھا۔ وہ باغی صحافی، مقرر اور اتحاد اسلامی کے کٹر حامی کی حیثیت سے پہلے ہی شہرت حاصل کر چکا تھا۔

انڈیا آفس کی ایک اور دستاویز میں مولانا کے بارے میں لکھا ہے:

محی الدین کنیت، ابوالکلام آزاد، الہلال کا بدنام ایڈیٹر، انجمن حزب اللہ اور کلکتہ دارالارشاد کالج کا بانی۔

دلی کا باشندہ ہے لیکن تعلیم عرب میں پائی ہے۔ انتہاء درجہ میں اتحاد اسلامی کا حامی ہے۔ نہایت کٹر انگریز دشمن اور بے حد متعصب ہے۔ دیوبند کی سازش جہاد کا نہایت سرگرم رکن تھا۔

(1) یقین کیا جاتا ہے کہ حالیہ شورش میں اس نے ہندوستانی متعصبوں کو روپے کی اور دوسری طرف کی مدد دی ہے۔

(2) جنود ربانیہ کی فہرست میں لیفٹیننٹ جنرل ہے۔

مولانا آزاد کے بارے میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے ذکر آزاد میں لکھا ہے:

''یہ واقعہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ شروع شروع میں مولانا تشدد پسند انقلابیوں کے ساتھ تھے اور ہندوستان میں مسلح بغاوت کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ایک طرف بنگال کے انقلابیوں سے تعلقات استوار تھے۔ دوسری طرف سرحد کے قبائل میں ان کے آدمی کام کر رہے تھے۔ جب میں ان کی رفاقت میں (1920ء) آیا تو اس وقت تک مولانا مسلح بغاوت ہی کے قائل تھے۔ایک دفعہ خود مجھے ایک جگہ بھیجا تھا اور میں دو درجن پستول لے آیا تھا جو انہوں نے کسی اور کے ہاتھ کہیں بھیج دیئے تھے،مگر اسی زمانے میں ان کے خیالات میں تبدیلی ہوئی اور سمجھ گئے کہ ہتھیاروں کے زور سے انگریزوں کو نہیں نکالا جا سکتا۔''

کانگرس کا پہلی دفعہ صدر منتخب ہونا:

مولانا رانچی میں نظر بند کر دیئے گئے۔اس نظر بندی کے دوران ملک اور بیرون ملک کئی انقلاب آفرین برق رفتار تغیرات رونما ہو چکے تھے۔ سیاسی ذہنیت میں تبدیلی آ چکی تھی۔ اب التجاؤں، استدعاؤں اور عرض داشتوں کے بجائے ایجی ٹیشن اور مزاحمت و جارحیت کی سیاست نے جگہ لے لی تھی اور حکومت کے رویہ میں بھی فرق آ گیا تھا کیونکہ وہ پہلی جنگ عظیم کی فاتح ہو چکی تھی۔تحریک ریشمی رومال جس کا مقصد حکومت کا تختہ الٹ کر مسند اقتدار پر قبضہ کرنا تھا۔ ریشمی رومال دین پور پہنچ گیا تھا اور وہاں کے سجادہ نشین خواجہ غلام محمد نے پروگرام کے مطابق اسے سندھ بھیج دیا تھا،لیکن چند کمزور ہمت لوگوں نے اس منصوبہ کو فاش کر دیا۔ مولانا آزاد اس زمانہ میں رانچی میں نظر بند تھے۔ ملک میں ایک ہنگامہ سا بپا تھا۔ جلیانوالہ باغ کے خونی سانحہ سے ہندوستان کی سیاست کا رخ متعین ہو گیا۔ گاندھی جی جنوبی افریقہ سے واپس آ کر ہندوستانی سیاست میں سرگرم ہو چکے تھے، لیکن مولانا آزاد سے گاندھی کی ابھی تک ملاقات نہ ہوئی تھی۔ 31 دسمبر 1919ء کو مولانا رانچی کی نظر بندی سے رہا ہو کر آئے۔ مولانا تین سال نو ماہ جلا وطن رہے، رہا ہوتے ہی

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا
وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

20 جنوری 1920ء کو حکیم اجمل خان کے دولت کدہ پر گاندھی سے آپ کی پہلی ملاقات ہوئی، اور عدم تعاون کی تحریک میں آپ نے حصہ لیا جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ 1923ء کو دہلی میں کانگرس کا اسپیشل اجلاس ہوا تا کہ ملکی حالات پر غور و خوض کیا جا سکے۔ اس اجلاس میں مولانا کو پہلی مرتبہ کانفرنس کا صدر منتخب کیا گیا۔ مولانا کانگرس کے سب سے کم عمر صدر تھے۔ مولانا نے اپنی صدارتی تقریر میں قومی اور بین الاقوامی مسائل کا نہایت اچھے طریقے سے تجزیہ کیا۔

حضرت مولانا ایک علمی شخصیت تھے اور تحریر و تقریر کے شہنشاہ۔ صدر بننے کے بعد سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ آپ قلم و قرطاس کا مشغلہ بھی جاری رکھنا چاہتے تھے لیکن سیاست کی ہنگامہ آرائیاں آپ کے اس مشغلہ میں آڑے آئیں، لہٰذا قلم و قرطاس کو خیر باد کہہ کر آپ نے اپنے آپ کو سیاست میں زیادہ مشغول کر لیا، چنانچہ کانپور کے 29 دسمبر 1925ء کے اجلاس کے خطبہ صدارت میں آپ نے فرمایا:

''حضرات! ایک ایسے وقت میں آپ نے مجھے دوبارہ صدا دی ہے۔ آپ میں سے اکثر احباب اس بات سے بے خبر ہوں گے کہ میں کئی سال سے اس کوشش میں ہوں کہ صرف اپنی قلمی مشغولیت کے لیے وقف ہو جاؤں۔ میری طبیعت کا یہ میلان محض میرے ذوق طلب کا ہی تقاضا نہیں ہے بلکہ میرا یقین ہے کہ میرے لیے وقت کی تمام قومی خدمات میں یہی خدمت سب سے زیادہ ضروری اور اہم ہے۔ گذشتہ پانچ سال کے اندر میں نے بار بار کوشش کی کہ قومی مجالس کی سرگرمیوں کے ساتھ یہ کام بھی جاری رکھ سکوں لیکن تجربہ سے ثابت ہو گیا کہ بغیر یک سوئی کے یہ ممکن نہیں۔ بالآخر مجبور ہو کر فیصلہ کرنا پڑا کہ ان سرگرمیوں سے بالفعل کنارہ کش ہو جانا چاہیے، اور اگر اس میں حصہ لینا بھی چاہیے تو

• اس حد تک جہاں تک میری قلمی مشغولیتوں کا ضروری انہماک اجازت دے، اس حالت کا قدرتی نتیجہ تھا کہ مجھے ان ذمہ داریوں کی قبولیت میں تامل ہوتا، چنانچہ مجھے تامل ہوا۔''

مولانا نے گردوپیش کے حالات اور وقت کے تقاضوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور سیاست میں پوری طرح مصرف ہونے کا فیصلہ کیا کیوں کہ ''اگر موت سے زندگی، پستی سے بلندی اور ذلت سے شرف وعظمت کی طرف پلٹنا ہے تو نئے عزم اور تازہ ہمت کے ساتھ اٹھنا اور بڑھنا پڑتا ہے۔ 28 جنوری 1932ء کو انہوں نے علامہ سید سلیمان ندویؒ کو دہلی سے ایک خط لکھا:

''میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ اب تمام کاموں سے الگ ہو کر محض تالیف وتصنیف کے لیے وقف ہو جاؤں گا، اور اگر موجودہ صورت حال اس طرح پیش نہ آ گئی ہوتی جس طرح پیش آئی ہے تو میں قطعاً یکسوئی کر لیتا لیکن کیا کیا جائے، رفتار زمانہ ہماری خواہشوں کا پابند نہیں۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک وقت وہ بھی آیا تھا کہ مولانا اپنی تمام مشغولیتوں کو ترک کر کے تصنیف و تالیف کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنے کے آرزومند تھے، لیکن زمانہ کی رفتار نے آپ کی آشاؤں اور خواہشوں کا ساتھ نہ دیا اور آپ تصنیف و تالیف کے بجائے سیاست کے کارزار میں بلکہ خارزار میں الجھ کر رہ گئے۔ اگر مولانا تصنیف و تالیف کے لیے اپنے کو مخصوص کر لیتے تو تصنیف و تالیف میں بھی آپ ہندوستان کے ابن تیمیہ ہوتے۔

انتخابات میں شرکت:

1937ء کے انتخابات میں حصہ لیتے یا نہ لینے کے بارہ کانگرس میں دو گروہ تھے ایک بہت بڑا گروہ انتخاب میں حصہ لینے کا سخت مخالف تھا جب کہ مولانا انتخاب کے بائیکاٹ کے مخالف تھے۔ مولانا کا نقطۂ نظر غالب رہا۔ کانگرس نے انتخاب میں حصہ

لیا اور پانچ بڑے صوبوں میں واضح اکثریت حاصل کی۔ صرف بنگال، پنجاب اور سندھ میں کانگرس کو کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ چنانچہ مولانا کی رائے کے مثبت نتائج نکلے اور کانگرس کے ارکان پر مولانا کی سیاسی بصیرت کی تصدیق ہو گئی۔ پنجاب مسلمانوں کی آبادی کی اکثریت کے صوبہ میں مسلم لیگ کو صرف دو سیٹیں ملیں (ہسٹری آف فریڈم موومنٹ آف انڈیا جلد ۴ ص ۲۲۰، تارا چند) زیادہ سیٹوں پر یونینسٹ پارٹی کامیاب ہوئی۔ کچھ سیٹیں احرار کے حصہ میں آئیں جو انگریزی استعمار کے مخالف تھی لیکن وہ مسلمانوں کی معاشی پس ماندگی دور کرنے کی زبردست حامی تھی۔ اس کی قیامت متوسط اور نچلے طبقہ کے شعلہ نوا خطیبوں کے ہاتھ میں تھی۔ احرار پنجاب میں ایک زبردست سیاسی قوت تھے لیکن تھے غریب۔ اس کے مقابلہ میں یونینسٹ پارٹی جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں پر مشتمل تھی۔

پنجاب میں مسلم لیگ کا پہلا جلسہ:

انہیں دنوں قائداعظم محمد علی جناح لاہور آئے تو ان کا لاہور میں پہلا جلسہ بیرون دہلی گیٹ احرار کا مرہون منت ہے۔ جلسہ میں احرار رضا کار سفید کپڑوں میں ملبوس کلہاڑیوں سے مسلح جلسہ گاہ کی حفاظت کر رہے تھے۔ مسلم لیگ کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ ہم یہاں جلسہ کر سکیں گے لیکن مجلس احرار اسلام نے انہیں یقین دہانی کرائی کہ آپ کا جلسہ لاہور میں ضرور ہو گا۔ اس پر قائداعظم کو خوش گوار حیرت ہوئی۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ سر فضل حسین کے پنجاب میں مسلم لیگ کا جلسہ ہو سکے گا۔ چنانچہ مسلم لیگ اور احرار کا پارلیمانی بورڈ تشکیل دیا گیا لیکن مسلم لیگ کی بدعہدیوں اور چال بازیوں کی وجہ سے نتیجہ صفر نکلا۔ مسلم لیگ اگر نیک نیتی سے احرار کا ساتھ دیتی تو ان دونوں کے مشترکہ امیدوار کافی تعداد میں کامیاب ہو سکتے تھے اور اس کامیابی سے ہندوستان کی سیاست کا مستقبل نیا موڑ لے سکتا تھا۔ لیکن مسلم لیگ پر جاگیرداروں اور اشرافیہ کا قبضہ تھا اور مجلس احرار نچلے طبقہ کی جماعت تھی۔ دونوں کے مزاج میں اتنا ہی فرق تھا جتنا امیر اور غریب کے مزاج میں ہوتا ہے۔ لہٰذا مشترکہ امیدوار تو کھڑے نہ ہو سکے

البتہ دونوں جماعتوں نے الگ الگ امیدوار کھڑے کر کے یونینسٹ پارٹی کے امیدواروں کی کامیابی کے لیے راہ ہموار کر دی۔

مسلم لیگ کے جو دو امیدوار کامیاب ہوئے ان میں ایک راجہ غفنفر علی تھے جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے۔ لیکن ان کامیابی کا مسلم لیگ کے ٹکٹ سے کوئی خاص تعلق نہ تھا۔ وہ اپنے حلقہ کے حامیوں کے اثر و رسوخ اور مقامی دھڑے بندیوں کی وجہ سے کامیاب ہوئے۔ (سید نور احمد، مارشل لا سے مارشل لا تک ص ۱۸۱) انتخاب کے نتائج آنے کے بعد وہ اگلے روز مسلم لیگ کو چھوڑ کر یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے (پاتھ وے ٹو پاکستان، خلیق الزمان: ص ۱۶۵) اب پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ کا صرف ایک ممبر برکت علی رہ گیا۔

سرحد میں مسٹر جناح خود گئے اور مسلم لیگ کے ٹکٹ پر امیدوار کھڑے کرنے کی بہت کوشش کی لیکن انہیں کوئی امید وار نہ ملا۔ انہوں نے پیر بخش خان اور سردار عبدالرب نشتر کو آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی اور دونوں نے لیگ کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنے کے بجائے آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب میں حصہ لینے کو ترجیح دی۔



یورپ جنگ کی آگ میں

1939ء میں یورپ میں جنگ کی آگ نے پورے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ 1933ء میں جرمنی کی نازی پارٹی الیکشن جیت کر برسر اقتدار آ گئی اور انہوں نے ہٹلر کو اپنا صدر بنا لیا۔ ہٹلر نے اقتدار پر قابض ہوتے ہی قوم کے انتقامی جذبات کو ابھارنا شروع کر دیا۔ فوجی بھرتی لازمی قرار دے دی گئی۔ تاوان جنگ کی ادائیگی سے انکار کر دیا۔ اندرون ملک اور خفیہ طور پر دوسرے ممالک میں سامان جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ بڑے بڑے کارخانے قائم کر دیئے۔ مضبوط ہوائی بیڑہ اور آب دوز کشتیوں کے بنانے میں مصروف ہو گیا۔ برطانیہ، فرانس اور روس ان تیاریوں سے بخوبی باخبر تھے، لیکن آپس کی رقابت نے ان کی عظمت و شوکت کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ دنیا میں اس وقت آج کل کی یونائیٹڈ نیشن کی طرح ایک ''لیگ آف نیشنز'' کا تابوت مقدس بھی تھا۔ جس کو ''جمعیۃ الاقوام'' کہتے ہیں۔ اس پر برطانیہ اور فرانس کا تسلط تھا اور روس نے اس کی رکنیت قبول نہیں کی تھی یا پھر اس کو اس کا رکن بنایا ہی نہیں گیا تھا۔ جرمنی 1926ء میں جب کہ وہ بہت کمزور تھا، اس کا رکن بنا تھا، لیکن جب جمعیۃ الاقوام نے جرمنی کے اسلحہ کی تیاری پر پابندی عائد کرنا چاہی تو ہٹلر نے اس سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ ارکان جمعیۃ الاقوام نے روس کی طاقت کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کے باعث جرمنی کی اس گستاخی کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیا۔

لیگ آف نیشنز کی ریشمی ڈور سے گلو خلاصی کے بعد ہٹلر اپنے ارادوں کی تکمیل میں بالکل آزاد ہو گیا۔ چنانچہ چند مہینوں میں دنیائے سیاست میں جرمنی کا پھریرا سربلند

ہو کر لہرانے لگا، اور جرمنی نے دنیا کے سیاسی جغرافیہ کی لکیروں کو اپنی مرضی کے مطابق ردوبدل کرنے کی ٹھان لی۔ جرمنی کی ان جنگی تیاریوں کو روس نے بھی اپنے لیے خطرے کا باعث سمجھا۔ دوسری طرف جرمنی کے ہمسایہ ممالک فرانس اور چیکوسلاویکیہ بھی کچھ پریشان ہو گئے۔ چنانچہ روس لیگ آف نیشنز کا رکن بننے پر مجبور ہو گیا۔

مارچ 1938ء میں ہٹلر نے آسٹریا میں اپنی فوجیں داخل کر دیں۔ ہٹلر آسٹریا کو جرمنی کا ایک حصہ سمجھتا تھا اور وہ خود بھی آسٹریا کا تھا۔ آسٹرین فوجوں نے خاموشی سے ہتھیار ڈال دیئے اور صرف تین روز میں پورے آسٹریا پر جرمن فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔ یورپ کی دوسری حکومتوں نے جب یہ خبر سنی تو وہ پریشان ہو گئیں، لیکن کسی کو جرمنی پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی بلکہ برطانیہ کی طرف سے یہ تاویل کی گئی کہ آسٹریا میں جرمن آباد ہیں، اگر وہ جرمن سے الحاق کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس میں مداخلت کا کوئی حق نہیں۔

اب ہٹلر 1931ء والا ہٹلر نہیں تھا۔ اب اس پر حملہ کرنا ایک خوفناک جنگ کو دعوت دینا تھا۔ جب آسٹریا پر قبضہ کرنے پر یورپی حکومتیں خاموش رہیں تو مارچ 1939ء کو جرمنی کی فوجوں نے چیکوسلاویکیہ پر قبضہ کر لیا۔ سمجھوتے کی وہ تمام کوششیں بارآور نہ ہوئیں جو برطانیہ کے وزیراعظم چیمبرلین نے ہٹلر سے ملاقات کر کے کی تھیں۔ بے شمار آلات جنگ، اسلحہ بنانے والی دو فیکٹریاں، دو ہزار ہوائی جہاز اور کئی لاکھ پونڈ سونا اس قبضہ کی وجہ سے جرمنی کی فوجوں کے ہاتھ لگا جس نے جرمنی کی جنگی اور اقتصادی حالت کو بہت زیادہ بلند اور مضبوط کر دیا۔ چیکوسلاویکیہ کے بعد پولینڈ جرمن فوجوں کی زد میں تھا، اور چونکہ بیس لاکھ جرمن پولینڈ میں آباد تھے جن کے حقوق بقول ہٹلر تلف کیے جا رہے تھے، لہٰذا جرمن فوجوں کے لیے اس پر قبضہ کرنے کے جواز کی وجہ موجود تھی، لیکن مشکل یہ تھی کہ 31 مارچ 1939ء کو برطانیہ اور فرانس دونوں کی جانب سے پولینڈ کی حمایت کا اعلان ہو چکا تھا، لیکن ہٹلر کی خوش قسمتی سمجھئے کہ نصف پولینڈ کے بارے میں روس کا یہ مطالبہ تھا کہ مجھے دیا جائے کیونکہ 1914ء کی جنگ میں وہ روس کے قبضہ سے نکل گیا تھا۔ اور پھر صلح کانفرنس نے اس کو پولینڈ کے ساتھ شامل کر دیا تھا۔ ہٹلر نے روس کے اس مطالبہ کا جائزہ لیتے ہوئے روس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور 23 اگست 1939ء کو

دس سال کے لیے ان دونوں کا معاہدہ ہو گیا۔

29 اگست 1939ء کو وزیر اعظم برطانیہ نے پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہم ہٹلر کے جواب کا انتظار کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ ہٹلر ہم سے بگاڑنے کے لیے تیار نہ ہوگا، لیکن اس کے دوسرے ہی دن یہ اطلاع ملی کہ پولینڈ نے اپنی فوج کو حرکت کا حکم دے دیا ہے۔ اس چیز نے ہٹلر کو چراغ پا کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یکم ستمبر 1939ء کا سورج نکلنے سے پہلے ہٹلر کی فوجوں نے اتنا زبردست حملہ کیا کہ 17 ستمبر تک یعنی صرف سولہ دن میں پورے پولینڈ پر قبضہ کر کے اس کی عظمت و رفعت کے قصر بلند کو تودۂ خاک بنا کر نصف پر اپنا پرچم لہرا دیا اور نصف روس کو دے دیا۔ جس کی فوج نے پولینڈ کی شکست خوردہ فوجوں پر مشرق کی جانب سے حملہ کر کے پولینڈ کی بچی کھچی محفوظ فوجوں کو بھی ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔

3 ستمبر 1939ء تاریخ عالم کا وہ منحوس ترین دن ہے جس کے دامن کی شکنوں میں سینکڑوں ملکوں کے انقلاب، کروڑوں انسانوں کی موت، لاکھوں بستیوں کی تباہی و بربادی، اربوں ڈالر کی پراپرٹی کا انہدام مضمر ہے۔ اس تاریخ کو انگلستان کے بادشاہ نے حکومت برطانیہ اور اس کی نو آبادیات (کالونیز) کی طرف سے جرمنی اور اٹلی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ یہ اعلان کرنا تھا کہ ہندوستان کے وائسرائے نے اپنی ایگزیکٹو کونسل کا ہنگامی اجلاس طلب کیا اور اہل ہند کے نام ایک طویل پیغام نشر کیا۔ برطانیہ نے ہندوستان کو اپنا غلام ملک سمجھتے ہوئے اس جنگ میں شامل کر لیا جو متواتر چار سال رہی اور کرۂ زمین کا 3/2 حصہ اس کے شعلوں سے جھلس گیا۔ جس میں کروڑوں انسان موت کے گھاٹ اترے، زمین نے معدنیات کے سینے چاک کر دیئے، کروڑوں ٹن کے جہاز سمندروں کی تہہ میں غرق ہو گئے۔ ہٹلر، مسولینی اور جاپان کی فوجیں طوفان بن دنیا کے 3/2 رقبہ پر چھا گئیں۔

اعلان جنگ کے بعد وائسرائے ہندوستان لارڈ لنلتھگو نے یہ کوشش شروع کر دی کہ ہندوستان کے بارسوخ رہنماؤں کی ہمدردیاں کسی نہ کسی طریقہ سے حاصل کی جائیں۔ چنانچہ 3 ستمبر کو وائسرائے نے تار دے کر گاندھی کو شملہ بلایا۔ گاندھی وائسرائے

ملاقات ہوئی، اور گاندھی نے ملاقات کے بعد 25 ستمبر 1939ء کو شملہ میں ذومعنی بیان اخبارات کو دیا۔ گاندھی کا یہ جواب موقع محل کے لحاظ سے کسی حد تک درست تھا۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ وائسرائے نے مولانا آزاد کو بھی صدر کانگرس ہونے کی حیثیت سے شملہ آنے کی دعوت دی تھی لیکن مولانا نے ملاقات سے انکار کر دیا۔ مولانا آزاد کی اس خوددارانہ پالیسی کو عوام نے بہت پسند کیا۔ مولانا نے وائسرائے کی دعوت کو ٹھکراتے ہوتے کہا: ''مجھے کانگرس کے مطالبہ آزادی اور وائسرائے کی تجویز کے درمیان کوئی تعلق نظر نہیں آتا لہٰذا اس صورت میں وائسرائے سے ملاقات کرنا بے معنی اور وقت کا ضیاع ہے۔'' بہت کانگرسی مولانا کے فیصلہ کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وائسرائے سے ملاقات کرنا چاہیے تھی۔ مولانا کے انکار پر گاندھی نہیں انہیں تحسین کا خط لکھا جس میں اس فیصلہ کو خدا کی رحمت سے تعبیر کیا۔ مولانا برطانوی حکومت کے خلاف وسیع پیمانہ پر اور شدید تحریک چلا کر فیصلہ کن رویہ اختیار کرنے پر مجبور کرنا چاہتے تھے لیکن گاندھی انفرادی ستیہ گرہ کے ذریعہ مقصد حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔ چنانچہ حکومت نے مولانا اور نہرو کو گرفتار کر لیا۔

امریکہ کے دباؤ پر چرچل نے وائسرے کو کہا کہ ہندوستانی لیڈروں سے بات چیت کی جائے۔ چنانچہ حکومت نے سیاسی مقصد برآری کے لیے اور فضا کو خوش گوار بنانے کے لیے صدر کانگرس مولانا آزاد اور پنڈت نہرو کو رہا کر دیا۔ مولانا نے دسمبر 1941ء میں رہا ہوتے ہی باردولی میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بلایا اور یہیں آپ گاندھی سے بھی ملے۔ گاندھی سے ملاقات میں انہوں نے محسوس کیا کہ دونوں ایک دوسرے سے پہلے سے بھی زیادہ دور ہو گئے ہیں۔ مولانا گاندھی کو اپنا ہم خیال نہ بنا سکے۔ لیکن آپ نے کلکتہ میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

> ''جنگ کے مسئلہ میں کانگرس کی رائے یا پالیسی عقیدہ کی سی نہیں جس میں کبھی تغیر نہ ہو۔ اگر جاپان ملک پر حملہ کرے تو ہر ہندوستانی کو ہاتھ میں تلوار لے کر ملک کا تحفظ کرنا چاہیے، لیکن یہ ہم اس صورت میں کر سکتے ہیں کہ وہ زنجیریں کھول دی جائیں جس میں

ہمارے ہاتھ پاؤں جکڑے ہوئے ہیں۔''

مولانا کے اس بیان پر انگلستان کے اخبارات ''لنڈن ٹائمز'' اور ''ڈیلی مرر'' نے بڑا اچھا تبصرہ کیا اور مولانا کے بیان کے بارے میں لکھا کہ اس سے گفت وشنید کی راہ نکلتی ہے۔

اسی دوران چین کے قوم پرست راہ نما موسیو چیانگ کائی شک بھی ہندوستان آئے اور مولانا سے ملاقات کی۔ ان کے ایک استفسار پر مولانا نے واشگاف الفاظ میں کہا: ''اگر ہمارے راستہ سے رکاوٹیں ہٹا دی جائیں تو ہندوستان جمہوری ریاستوں کا ساتھ دے گا نازی جرمنی کا نہیں، لیکن ہندوستان کو یہ فیصلہ آزادانہ اور خودمختارانہ فضا میں کرنے دیا جائے۔'' چیانگ کائی شک نے ہندوستان سے روانہ ہونے سے قبل ایک بیان جاری کیا جس میں پرزور اپیل کی گئی کہ ''ہندوستان کو حقیقی معنوں میں سیاسی اختیارات سونپ دیئے جائیں۔'' اس کے اس بیان سے اس کا مولانا کی شخصیت اور ان کے موقف سے متاثر ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

بالآخر امریکہ کے صدر روز ویلٹ اور چین کے قوم پرست راہ نما چیانگ کائی شک کے دباؤ نے برطانیہ کے وزیر اعظم چرچل کو مجبور کیا کہ وہ ہندوستان سے مصالحت کی راہ نکالے جس کے لیے کرپس مشن ہندوستان بھیجا گیا جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا گیا ہے۔ کرپس مشن ناکام واپس گیا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو اور مسٹر کرپس کی گہری دوستی تھی لیکن مسٹر کرپس کے خط نے پنڈت نہرو کو بھی شدید مایوس کیا۔ وہ اس پر اپنے ردِّعمل کو چھپا نہیں سکے۔ چنانچہ انہوں نے ایک اخباری بیان میں کہا: ''یہ انتہائی افسوس ناک ہے کہ مسٹر کرپس جیسا شخص بدمعاش کا وکیل ہوسکتا ہے۔'' (نیشنل ہیرالڈ ۳۰ جولائی ۱۹۴۲ء)

مولانا نے نہایت افسوس کے ساتھ لکھا ہے:

> ''اس شدید خطرے کے وقت بھی برطانوی حکومت اپنی تباہ کن پالیسی سے دست کش نہیں ہو پا رہی ہے۔ مجبوراً ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑتا ہے کہ برطانوی حکومت حملے اور جارحانہ کارروائیوں کے خلاف ہندوستان کے مؤثر دفاع کے مقابلہ میں اس بات کو زیادہ اہمیت دیتی ہے کہ ہندوستان پر امکانی مدت تک اپنی گرفت قائم

رکھے اور اسی مقصد کے پیش نظر وہ ملک میں نفاق اور انتشار کو تقویت دے رہی ہے۔''

کرپس بے نیل مرام واپس گیا۔ چرچل اور وائسرائے ہند اس کی ناکامی پر بڑے خوش تھے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ

''کرپس تلخی اور مایوسی کے عالم میں واپس لوٹا۔ وہ کانگرس کے راہ نماؤں کے فیصلہ کو بے ڈھنگا خیال کرتا تھا اور سخت خفا تھا۔ چرچل اور وائسرائے ہند کرپس کو پریشان اور ناکام دیکھ کر بہت خوش تھے۔''

کرپس مشن کے واپس جانے کے بعد گاندھی جی اور مولانا آزاد کے درمیان شدید اختلافات رونما ہو گئے۔ دونوں کے نقطۂ نظر میں بہت دوری پیدا ہو گئی تھی۔ گاندھی کے نزدیک عدم تشدد عقیدہ کا درجہ رکھتا تھا اور مولانا حصول آزادی کے لیے ہر حربہ استعمال کرنا جائز خیال کرتے تھے ان کے نزدیک عدم تشدد مصلحت کی بات تھی عقیدہ نہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر کوئی چارہ نہ ہو تو ہندوستانیوں کو توپ و تفنگ سے بھی کام لینے کا حق ہے، لیکن پرامن طریقوں سے آزادی حاصل کرنے میں عظمت اور شرافت زیادہ ہے۔ مولانا کا مقصد آزادی حاصل کرنا تھا۔ انگریز خواہ آزادی کا پروانہ مسلم لیگ کو دے کر جائیں یا کانگرس کو یا پھر دونوں کو، لیکن ان غیر ملکی سفید نام ریچھوں کو یہاں سے جانا چاہیے۔ چنانچہ مولانا نے صدر کانگرس ہونے کی حیثیت سے یہ پیش کش کی کہ

''کانگرس کو قطعی افسوس نہ ہوگا اگر حکومت مسلم لیگ کو بلائے اور اسے اقتدار سونپ دے لیکن آزادی حقیقی ہونی چاہیے۔ کانگرس کو صرف اس سے دلچسپی ہے کہ کیا چیز دی جا رہی ہے۔ ہمارا جھگڑا یہ نہیں کہ کن ہاتھوں میں آزادی دی جا رہی ہے۔ میں نے مسلم لیگ کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا ہے کہ موجودہ کشمکش میں اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ کانگرس کو اس پر بھی اعتراض نہ ہوگا کہ اقتدار نان پارٹی لیڈر کے سپرد کر دیا جائے۔''

ایسا ہی ایک بیان پنڈت جواہر لعل نہرو نے بھی دیا تھا جب لارڈ ویول نے کہا کہ ''برطانیہ ہندوستان کے اقتدار سے دست بردار ہونے کے لیے بالکل تیار ہے لیکن فرقہ وارانہ مسئلہ کی موجودگی میں اقتدار کس کے حوالے کیا جائے؟'' پنڈت نہرو نے بلا توقف جواب دیا: ''اقتدار جناح کے حوالے کر دیا جائے کانگرس کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ برائے کرم آپ تشریف لے جائیں۔'' (میری زندگی اور جدوجہد ص ۶۲۵) پنڈت نہرو کے اس جملہ کا کانفرنس پر بڑا اچھا اثر پڑا، لیکن مسٹر جناح تقسیم ہند کے موقف پر اڑے رہے۔

کانگرس نے ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک چلائی جس کو مسلم لیگ نے بغاوت قرار دیا۔ اس تحریک کے نتیجہ میں ہنگامے بپا ہو گئے لیکن مسلم لیگ برابر انگریزی حکومت کی حمایت میں اڑی رہی۔ اس تحریک سے ہندوستان کی چالیس کروڑ آبادی کی غلامی کی زنجیریں کچھ ڈھیلی ہوئی تھیں کہ اس موقع پر آل انڈیا مسلم لیگ نے تحریک شروع ہونے کے قریباً ایک ہفتہ بعد ورکنگ کمیٹی کے اجلاس 16-20 اگست 1942ء میں ایک ریزولیشن پاس کیا جس میں کہا گیا تھا:

> ''آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا یہ اجلاس ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال جو کانگرس ورکنگ کمیٹی کے 8 اگست 1942ء کے اجلاس کے فیصلے سے پیدا ہوئی ہے، پر گہری تشویش کا اظہار کرتا ہے، اور غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ کانگرس کی تحریک سول نافرمانی ''کھلی بغاوت'' ہے جس کا مقصد ہندوستان پر ہندو بالا دستی قائم کرنا ہے۔ اس کے باعث ملک میں بدامنی اور لاقانونیت کا دور دورہ ہے، جان و مال کا اتلاف ہو رہا ہے۔''

چنانچہ ریزولیشن کے آخر میں مسلمانوں سے پرزور اپیل کی گئی کہ حکومت مخالف اس تحریک سے بالکل لاتعلق رہیں۔

تحریک آزادی کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ کانگرس نے جب بھی انگریزوں سے آزادی کے لیے کوئی تحریک چلائی، مسلم لیگ کے وڈیروں نے اس کو حکومت کے خلاف بغاوت کے الفاظ سے تعبیر کیا۔ اس قسم کے ریزولیشنوں سے

آزادی کی منزل دور ہوئی۔ ہماری دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے جس وسیع ظرفی کا کانگرس نے ثبوت دیا، مسلم لیگ کے وڈیروں نے اس طرح کا ثبوت نہیں دیا۔ جیسے پنڈت نہرو، گاندھی جی اور مولانا آزاد کا یہ کہنا کہ ہندوستان آزاد ہونا چاہیے خواہ انگریز عنان اقتدار مسلم لیگ ہی کو کیوں نہ دے کر جائے۔ آخر وہ بھی اس ملک کے باشندے ہیں، لیکن ان اجنبی لوگوں کو یہاں سے نو دو گیارہ ہو جانا چاہیے، اس قسم کا بیان مسلم لیگ کی پوری تاریخ میں اس کے کسی وڈیرے نے نہیں دیا۔ کانگرس نے ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک کے ریزولیشن کے آخری پیرا میں بڑے واشگاف الفاظ میں واضح کیا:

> ''کمیٹی نے مستقبل کے آزاد ہندوستان کی حکومت کے بارے میں اپنا نظریہ صاف بیان کر دیا ہے لیکن وہ یہ واضح کر دینا چاہتی ہے کہ جدوجہد کے شروع کرنے سے اس کا یہ مقصد قطعی نہیں ہے کہ کانگرس کو اقتدار حاصل ہو۔ اقتدار جب حاصل ہوا سارے ہندوستان کی ملکیت ہوگا۔''

اس واضح اور صاف یقین دہانی کے باوجود مسلم لیگ کے وڈیرے الزام تراشی سے باز نہ رہے اور انگریزی حکومت کی برابر حمایت کرتے رہے۔

اپریل 1945ء میں یورپ میں جنگ قریباً قریباً ختم ہو گئی تھی۔ ہٹلر کی حکومت ختم کر دی گئی تھی، لیکن جاپان ابھی ڈٹا ہوا تھا۔ وہ ایک وسیع علاقہ پر قابض تھا۔ امریکہ یہ سمجھتا تھا کہ ہندوستان کا دلی تعاون حاصل کر کے جاپان کو شکست دینا زیادہ آسان ہے۔ لارڈ ویول وائسرائے ہند مارچ 1945ء میں لندن گئے تا کہ ہندوستان کی آزادی کے مسئلہ کا نئے سرے سے جائزہ لیا جائے۔ جنگ کے اچانک ختم ہونے پر برطانیہ کے ریاستی دانش وروں کے انداز فکر میں تبدیلی آ گئی اور وہ ہندوستان کو برطانوی تاج و تخت کے مفادات میں زیر اقتدار رکھنے کے حق میں دلائل دینے لگے۔ لارڈ ویول کا بیان ہے کہ جو منصوبہ میں لے کر گیا تھا، اس کی منظوری کی کامیابی کی مجھے کوئی توقع نہ تھی۔ ویول کے ہندوستان واپس آنے کے صرف بارہ گھنٹے قبل کابینہ نے اس منصوبہ کی منظوری دی

26 مارچ سے 31 مئی 1945ء تک انڈیا کمیٹی کے 26 اجلاس ہوئے جن میں ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں غور وخوض ہوتا رہا۔ پھر کہیں جا کر ویول کو اس منصوبہ کا اعلان کرنے کی اجازت ملی۔

14 جون 1945ء کو لارڈ ویول نے اپنی ایک نشری تقریر میں اپنے منصوبے کے خدوخال بیان کیے کہ وہ ہندوستان کی منظّم رائے عامہ کے قائدین کو دعوت دے رہے ہیں تاکہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کو نئے سرے سے تشکیل دیا جائے اور اسے زیادہ نمائندہ بنایا جائے۔ اس کونسل میں وائسرائے اور فوج کے کمانڈر انچیف کے سوا تمام ممبران ہندوستانی ہوں گے اور پہلی دفعہ وزارت داخلہ، خارجہ اور مالیات ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں دیئے جائیں گے۔ چنانچہ وائسرائے نے کانگرس ورکنگ کمیٹی کے گرفتارشدہ ممبران کی فوری رہائی کا حکم دیا۔ مولانا بانکوڑا سے رہا ہونے کے بعد کلکتہ پہنچے۔ یہاں اخباری نمائندوں نے وائسرائے کی تجاویز کے بارے میں کانگرس کے تاثرات کے بارے میں سوال کیا تو مولاناؒ نے فرمایا: ''وہ کوئی قطعی بات نہ کہہ سکیں گے جب تک ان تجاویز کی تفصیلات سامنے نہ آئیں۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ جب تک ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط ہے اس وقت تک ہندوستانی جنگ میں شرکت کا شوق پیدا نہ کرسکیں گے۔ اگر کسی شخص کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوں تو وہ ہاتھ پیر باندھنے والے کے دشمنوں سے لڑنے کا حوصلہ کیوں کر کرے گا''؟

شملہ کانفرنس:

مولانا ابھی کلکتہ ہی میں تھے کہ وائسرائے کی طرف سے آپ کو گول میز کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا جو 25 جون کو شملہ میں منعقد ہونا طے پائی تھی۔ مولانا نے وائسرائے کو جواب دیا کہ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس 20 جون کو بمبئی میں متوقع ہے۔ اس میں اس دعوت نامہ پر غور وخوض ہوگا اور پھر اس کے لیے نمائندے مقرر کیے جائیں گے۔ مولانا کی صحت اگرچہ نہایت خراب ہو چکی تھی۔ ڈاکٹروں نے دو ہفتہ کے لیے کانفرنس کو ملتوی کرنے کا مشورہ دیا لیکن مولانا اپنی صحت کی

خاطر اس اہم قومی کام کو معرضِ تاخیر میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔

قائداعظم نے وائسرائے کی دعوت کے جواب میں لکھا کہ کانفرنس دو ہفتے تک کے لیے ملتوی کر دی جائے کیونکہ 25 جون تک لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہونا ممکن نہیں، لیکن وائسرائے نے التواء کی اس درخواست کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ اس دعوت کے بعد مولانا بمبئی پہنچے اور بھولا بھائی ڈیسائی کے یہاں قیام کیا جہاں سے 19 اگست 1942ء کو یعنی تین سال قبل آپ کو علی الصبح گرفتار کیا گیا تھا۔ 20 جون کو کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ دعوت نامہ پر غور وفکر کے بعد کانفرنس نے کانگرس کی نمائندگی کرنے کا اختیار مولانا کو دے دیا اور وائسرائے کو اس کی اطلاع دے دی گئی۔ وائسرائے نے مولانا کو بمبئی سے شملہ پہنچانے کے لیے انبالہ تک ہوائی جہاز کے سفر کا انتظام کیا جہاں سے وہ موٹر کار کے ذریعہ رات دس بجے شملہ پہنچے کیونکہ راستہ میں مولانا کا ہر جگہ زبردست استقبال ہوا۔ 24 جون کو مولانا نے وائسرائے سے اکیلے میں ملاقات کی جو قریباً ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہی۔ پنڈت پنتھ نے مترجم کے فرائض انجام دیئے۔

وائسرائے لکھتا ہے کہ مولانا انگریزی خوب سمجھتے ہیں لیکن بولنے میں حجاب محسوس کرتے ہیں۔ وائسرائے نے اپنا سارا پلان مولانا کے سامنے رکھا اور اس کونسل کا بھی ذکر کیا جو تمام تر ہندوستانیوں پر مشتمل ہوگی۔ وائسرائے نے کانگرس اور مسلم لیگ کے مابین مفاہمت پر بھی زور دیا۔ مولانا نے وائسرائے سے کہا کہ ''لیگ سے مفاہمت ہو سکنے کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ لیگ کے وڈیرے اور منتظم یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں حکومت کی تائید حاصل ہے اور ان کی حالت یہ ہے کہ وہ معقول شرائط کو بھی قبول کرنے پر راضی نہ ہوں گے۔'' وائسرائے نے مولانا کو یقین دلایا کہ حکومت غیر جانب دار رہے گی اور لیگ کی ہرگز حمایت نہیں کرے گی۔ مولانا نے وائسرائے کے انداز گفتگو کو مخلصانہ پایا۔ چنانچہ اس ملاقات کا وائسرائے پر بڑا اچھا اثر ہوا۔ سرکاری ضیافت میں وائسرائے نے مولانا کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ''اگرچہ کانگرس کے حکومت کے ساتھ سیاسی اختلافات ہیں مگر وہ ہیں سیاسی آدمی۔'' 24 جون کو ورکنگ کمیٹی کا اجلاس شملہ میں مولانا کی صدارت میں ہوا۔ مولانا نے وائسرائے سے ملاقات کی اجمالی

رپورٹ کر کے رائے دی کہ اس پیشکش کو قبول کر لینا چاہیے۔ اگر چہ کرپس کی پیشکش سے مختلف نہیں لیکن اب حالات کافی حد تک بدل چکے ہیں۔ اس وقت لڑائی شروع اور اب جنگ ختم ہو چکی ہے۔ ہمیں کانفرنس میں اس جذبہ سے شریک ہونا چاہیے کہ اگر حکومت کی شرائط کسی اعتبار سے قابل قبول ہوں تو مان لی جائیں۔ گاندھی اس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں شروع سے آخر تک موجود رہے لیکن انہوں نے تشدد اور عدم تشدد کی بحث نہیں چھیڑی۔ معلوم ہوتا ہے کہ نظر بندی کے دوران گاندھی نے مولانا کی تجاویز اور اعتدال پر غور وفکر کیا ہوگا اور انہوں نے مولانا کے استدلال میں اور آپ کے خیالات میں وزن محسوس کیا ہوگا۔ چنانچہ اب گاندھی کے خیالات میں کافی تبدیلی آچکی تھی۔ گاندھی اگر چہ بہت بڑا لیڈر تھا لیکن مولانا عقل و دانش اور سیاست میں اس سے دو قدم آگے ہی تھے، لہٰذا نظر بندی کی خلوتوں میں گاندھی جی مولانا کے ہم رائے ہو چکے تھے۔

25 جون 1945ء کو شملہ میں با قاعدہ کانفرنس شروع ہوئی۔ پورے ہندوستان کی نگاہیں شملہ کی چوٹیوں کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ وائسرائے کے مختصر خطاب سے کانفرنس کا افتتاح ہوا اور مولانا نے کانگرس ورکنگ کمیٹی کا نقطۂ نظر پیش کیا۔ 26 جون کو لارڈ ویول نے دو نکات میں اپنا پلان پیش کیا تا کہ اس پر غور کر کے فیصلہ کیا جا سکے۔

(1) کونسل کی تشکیل، وائسرائے کی نشری تقریر میں پروگرام کا خاکہ، ہندوؤں اور مسلمانوں کی مساوی نمائندگی، اقلیتوں کی نمائندگی، جنگ کی سرگرمیوں میں شرکت، جنگ کے خاتمہ تک نئی کونسل کا برقرار رہنا اور ایکٹ 1935ء کے تحت کام کرنا وغیرہ وغیرہ۔

(2) اگر مندرجہ بالا امور پر اتفاق ہو جائے تو اس صورت میں نئی کونسل تشکیل دی جائے اور اس کے ممبران کا مسئلہ طے کیا جائے۔

وائسرائے کے مطابق پلان کے پہلے حصہ پر کانگرس اور مسلم لیگ میں سمجھوتہ طے پا گیا تھا اور دوسرے حصہ پر غور وفکر کرنے کے لیے کانفرنس اگلے روز صبح پر ملتوی کر دی گئی۔ آج کے اجلاس کا ماحول دوستانہ تھا اور گفتگو کا معیار بھی بلند تھا۔ مسٹر جناح کا موڈ بھی زیادہ خوشگوار اور اچھا تھا۔ (وائسرائز جرنل: ص ۱۴۸)

27 جون کو ساڑھے پانچ بجے سہ پہر مسٹر جناح وائسرائے سے ملے اور سوا

سات بجے تک وائسرئے لاج میں ٹھہرے۔ اس دوران انہوں نے کچھ ایسی تجاویز پیش کیں کہ جن کی وجہ سے شملہ کانفرنس ناکامی کی طرف جانے لگی۔ دراصل مسٹر جناح پنجاب سے ایک مسلمان ممبر کو روکنے کی راہ ہموار کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ ان کا یہ خیال تھا کہ تمام مسلمان ممبروں کی نامزدگی صرف مسلم لیگ کرے گی اور وہ سب مسلم لیگی ہوں گے۔ ویول لکھتا ہے کہ یہ میرے لیے بالکل قابل قبول نہیں تھا۔ ویول نے کہا کہ آپ اس مسئلہ پر ساری کانفرنس کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔

مولانا کو مسٹر جناح کے اس رویہ سے سخت صدمہ پہنچا۔ مسلم لیگ کے رویہ کو دیکھتے ہوئے مولانا نے چھوٹے سیاسی گروہوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوششیں شروع کیں۔ چنانچہ انہوں نے ماسٹر تارا سنگھ کو کانگرس کے مکمل تعاون کی پیشکش کی بشرطیکہ سکھ کانگرس کے مشورہ سے متفقہ نام تجویز کریں۔ (ٹرانسفر آف پاور: جلد۵ ص۱۳۰۱)

9 جولائی 1945ء کو مسٹر جناح نے ڈیڑھ گھنٹہ وائسرائے سے ملاقات کی اس دوران میں ان کی ساری کوشش یہ تھی کہ وائسرائے ان کے اس مطالبہ کو تسلیم کر لے کہ تمام مسلمان ممبران کو نامزد کرنے کا مکمل اختیار صرف مسلم لیگ کو ہے۔ وائسرائے نے اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو مسٹر جناح نے مسلم لیگ کے ناموں کی فہرست دینے سے انکار کر دیا۔ مولانا نے اس تعطل کو دور کرنے کے لیے یہ تجویز کیا کہ مسٹر جناح ایسے دو قابل اور موزوں مسلمانوں کو نامزد کر دیں جو نہ لیگ میں شامل ہوں اور نہ کانگرس میں۔ تو اس صورت میں کانگرس کسی کانگرسی مسلمان کو شامل کرنے پر زور نہ دے گی۔ (روزنامہ تیج دہلی، ۲۷ جولائی ۱۹۴۵ء) لیکن مسٹر جناح نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ دراصل وہ مسلم لیگ کے واحد نمائندگی کے توسن پر سوار تھے اور کسی طور پر نیچے اترنے کو تیار نہ تھے، حالانکہ 1937ء کے انتخاب کی روشنی میں انہیں یہ دعویٰ کرنے کا کوئی حق حاصل نہ تھا کیونکہ اس میں مسلمان صوبوں کی حالت یہ تھی کہ سرحد میں ڈاکٹر خان کی قیادت میں کانگرسی وزارت قائم تھی، پنجاب میں ملک خضر حیات ٹوانہ کی یونینسٹ پارٹی کی حکومت تھی اور سندھ میں سر غلام حسین ہدایت اللہ کانگرس کی حمایت سے برسر اقتدار تھے اور بنگال میں خواجہ ناظم الدین کی لیگی وزارت دم توڑ چکی تھی اور گورنر راج قائم تھا۔

دراصل مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو مسلم لیگ سے کوئی سروکار نہ تھا۔

(ہماری آزادی: ص ۲۳۷)

یہ تھی وہ صورت حال جس نے اس شملہ کانفرنس کو ناکام بنا دیا کیونکہ اس میں مسلم لیگ کا رویہ غیر معقول اور غیر مفاہمانہ تھا۔ مولانا آزاد اس ساری صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کانگرس نے (ممبران کی) جو فہرست داخل کی تھی اس میں صرف دو نام ہندو تھے۔ (ایک نام پنڈت جواہر لعل نہرو کا اور دوسرا سردار پٹیل کا)۔ ان کے علاوہ ایک عیسائی اور ایک پارسی کو نامزد کیا گیا تھا۔ (ہماری آزادی ص ۲۳۰) اس سے ثابت ہو گیا کہ کانگرس ایک قومی جماعت ہے۔ یہ کہا جا سکتا تھا کہ ہندو جن کی ہندوستان میں اکثریت ہے، اس تجویز پر اعتراض کریں گے، مگر یہ تعریف کی بات ہے کہ ہندوؤں نے استقلال کے ساتھ کانگرس کی تائید کی۔ ان کے رویہ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہندو مہا سبھا نے کانگرس کے اس فیصلے کو اپنی ترقی کا زینہ بنانا چاہا لیکن وہ بری طرح ناکام ہوئی۔''

مولانا لکھتے ہیں کہ دس برس بعد بھی جب میں ان واقعات پر نظر ڈالتا ہوں تو اس صورت حال پر مجھے حیرت ہوتی ہے جو مسلم لیگ کے رویہ کی وجہ سے پیدا ہوئی۔''

مولانا مزید فرماتے ہیں:

''اگر کانفرنس مسٹر جناح کے رویہ کی وجہ سے ناکام نہ ہو جاتی تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کونسل کے چودہ ممبران میں سے سات مسلمان ہوتے۔ (مسلم لیگ کے نامزد + 5 کانگرس کے نامزد 1 + وائسرائے کا نامزد کردہ 1=7) اگر چہ پوری آبادی کے وہ صرف 25 فیصد تھے۔ یہ کانگرس کی فیاضی کا ثبوت ہے، اور اس سے مسلم لیگ کی حماقت پر ایسی روشنی پڑتی ہے جو خاصی بھیانک معلوم ہوتی ہے۔ مسلم لیگ مسلمانوں کے حقوق کی محافظ سمجھی جاتی تھی مگر اس کی

مخالفت کے سبب سے مسلمان غیر تقسیم شدہ ہندوستان کی حکومت میں ایک معقول حصہ حاصل کرنے سے محروم رہے۔ مسلم لیگ کی انتہاء پسندی کا انجام یہ ہوا کہ کانفرنس ناکامیاب قرار پا کر برخاست کر دی گئی۔" (ہماری آزادی: ص ۲۳۳)

مسلم لیگ کی زبان درازی اور دست درازی:

شملہ کانفرنس لیگی وڈیروں کی ضد بازی اور غیر معقول رویہ کے باعث ناکام ہوئی۔ لیکن مسلم لیگ کے راہ نما اس کی ذمہ داری دوسروں کے سر تھوپ رہے تھے۔ چنانچہ کوئٹہ میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر جناح نے قوم پرور مسلمانوں کے بارے میں کہا: "یہ مسلمان ہی نہیں ہیں، ہندوؤں کے زرخرید غلام ہیں۔" بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے مسٹر جناح نے مولانا ابوالکلام آزاد اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کو انگریزی زبان کی سب سے بڑی گالی دی اور انہیں "کوئز لنگ" کے مماثل قرار دیا۔ اور مسٹر چندریگر نے قوم پرور مسلم جماعتوں کو کانگرس کے اشاروں پر ناچنے والی طوائفیں تک کہا۔

(علمائے حق سید محمد میاں: جلد ۲ ص ۲۸۵)

یہ تھا مسلم لیگ کی اعلیٰ قیادت کا انداز تخاطب سراسر غیر اسلامی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے تو گالیاں سن کر بھی دعائیں دی تھیں۔ اسلام دل آزاری نہیں بلکہ دل داری کرتا ہے۔ لیکن لیگی وڈیروں نے اپنے قول وفعل کے تضاد کے باعث یہ ثابت کر دیا کہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کا دعویٰ بالکل غلط تھا بلکہ یہ ریاست لوگوں کو اسلام سے دور کرنے کے لیے بنائی گئی تھی، چنانچہ حال ہی میں بمبئی کا ایک باسی ایک پاکستانی دوست کی دعوت پر پاکستان آیا۔ اس کا نام وجے کمار تھا۔ اس نے پاکستان میں آکر جو کچھ اس کو اس نے اپنے ایک خط بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "ایشور کی لیلا، میں ہندوستان میں بیٹھا ساری عمر یہی سمجھتا رہا کہ پاکستان میں بہت زیادہ پابندیاں ہوں گی۔ پورے ملک میں شراب دیکھنے کو نہیں ملتی ہوگی۔ نماز کے وقت کاروبار بند ہو جاتے ہوں گے، عورتیں گھروں میں قید ہوں گی۔ ضرورت کے وقت نکلتی ہوں گی تو پوری

پردے میں لپٹی لپٹائی۔ تبھی تو اسے اسلام کا قلعہ کہتے ہیں۔ چاہے تمہیں برا لگے مگر میں تو آج سے اسے اسلام کا قلعہ نہیں بلکہ اسلام کے نام پر کلنک ہی کہوں گا۔ مجھ جیسا پاپی جو شراب کے بغیر ایک گھنٹہ نہیں گزار سکتا وہ بھی اس اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بہت خوش وخرم رہا۔ ایک دن بھی میری روٹین خراب نہیں ہوئی۔ نماز کے وقت اسی طرح کاروبار چلتا ہے۔ بازاروں میں اسی طرح ریل پیل۔ اتنی زیادہ اذانیں ہونے کے باوجود کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔'' پھر اس نے بسنت پر مسلمان قوم اور حکومت کو شرم دلائی ہے اور پھر آخر میں لکھا ہے:

''یہ منظر دیکھ کر بھگوان کی قسم، ہندو ہونے کے باوجود میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ مسلمانو! تم میں تو شاید غیرت نام کی کوئی چیز ہی باقی نہیں رہی۔ تم میں اگر رتی بھر بھی غیرت ہوتی تو چھوڑ دیتے ہمارے گانے سننا، چھوڑ دیتے ہماری فلمیں دیکھنا اور چھوڑ دیتے بسنت منانا، مگر نظر یہی آتا ہے کہ تم میں صرف غیرت ایمانی کا ہی نہیں غیرت انسانی کا بھی جنازہ نکل چکا ہے۔ الٹا پاکستان کی گولڈن جوبلی منا رہے ہو۔ شرم نہیں آتی۔ کس منہ سے جشن منا رہے ہو۔ پچاس سال بعد تمہاری جو حالت آج ہے مجھے تو وہ بیان کرتے ہوئے شرم آرہی ہے۔ تمہارا اب زمین کے اوپر رہنے سے زمین کے اندر جانا بہتر ہوگا۔ کیا تم وہی نہیں ہو؟ جو آج سے پچاس سال پہلے دن کو چیخ چیخ کر کہتے تھے: ''پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ ۔ اور راتوں کو سسکیاں بھر بھر کر اپنے خدا سے ایک اسلامی وطن کی بھیک مانگا کرتے تھے، آج کہاں ہے لا الٰہ الا اللہ۔ مجھ سے سنو۔ دھوکہ دیا تم نے اپنے خدا کو۔ اصل بات یہ تھی کہ ہندوستان میں تمہیں ہندو تنگ کرتے تھے۔ وہاں تمہاری دکانیں اور کارخانے نہیں تھے۔ تمہیں ملازمتیں نہیں ملتی تھیں۔ تمہاری عورتیں اس طرح بازاروں میں آوارہ گھوم پھر نہیں سکتی تھیں۔ کوئی

محبت نہیں تھی تمہیں اسلام سے۔ بند کرو یہ دھوکہ دینا اور یہ نعرہ لگانا۔ پھر تم اتنے ڈھیٹ ہو کہ ڈھاکہ گنوا کر بھی تم نے اپنے لچھن درست نہیں کیے۔ اب سناؤ، اب کیا دینے کا ارادہ ہے؟ میں تو ہندوستان پہنچتے ہی یہ اعلان کر دوں گا کہ ہندوستان والو! خوشیاں مناؤ، چھوڑ دو اسلحہ بنانا، گھٹا دو اپنے فوجی اخراجات۔ کم کر دو اپنی فوج۔ اب پاکستان تم سے کبھی جنگ نہیں کرے گا۔ تم نے ثقافتی جنگ میں مسلمانوں کو عبرت ناک شکست دے کر ان کے جذبہ جہاد کو خاک میں ملا دیا ہے۔ خوش ہو جاؤ، مسلمان اب جنگ کے قابل نہیں رہا۔''

یہ حالت ہے اس پاکستان کی جس میں ہم نے اسلام کو نافذ کرنا تھا، اور جس کے لیے ہم نے بڑے بڑے لیڈروں کو سب وشتم کیا، ان کی توہین کی۔

یہ تو جملہ معترضہ کے طور پر درمیان میں بات آ گئی تھی۔ بات شملہ کانفرنس کی ہو رہی تھی۔ شملہ کانفرنس کے اختتام کے بعد مولانا آزاد بذریعہ ریل کلکتہ جا رہے تھے کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں بذریعہ ٹیلی فون ان کی روانگی کی اطلاع دی گئی جس کے نتیجہ میں ''شریف زادوں'' کا ایک گروہ ریلوے اسٹیشن پر آ گیا اور گاڑی کو زبردستی روکے رکھا اور ایک گھنٹے تک وہ ننگا ناچ ناچے کہ شرم وحیا اور تہذیب وثقافت منہ چھپاتی پھر رہی تھیں۔ لیکن مولانا نے اس واقعہ کے بارے میں 28 اگست 1945ء کو اپنے ایک عقیدت مند کے خط کے جواب میں لکھا:

''علی گڑھ کے اسٹیشن پر چند طلباء کا جو طرزِ عمل رہا تھا، اسے ان کی نادانی پر محمول کیجیے اور انہیں بخش دیجئے۔ اس کی ذمہ داری خود ان پر نہیں ہے بلکہ ان نادانوں پر ہے جو ان بے خبروں کو اپنا آلۂ کار بناتے ہیں۔'' (ہفت روزہ چٹان، ۲۱۔۲۸ فروری ۱۹۸۳ء)

اس شرمناک واقعہ پر مسلم لیگی اخبار ڈان نے اپنے افتتاحیہ میں لکھا:

''جہاں تک اس سلوک کا تعلق ہے جو لیگ کی جانب سے مولانا کے ساتھ کیا گیا تو ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ گلدستہ کے مقابلہ

میں تو ان لوگوں کے حصہ میں اینٹ اور پتھر ہی آئیں گے جو شو
بوائے کا کام کرتے ہیں۔'' (ڈان، دہلی، ۲۷ ستمبر ۱۹۴۵ء)

آزادی کے بعد جب ہندو فرقہ پرستوں نے مسلم فرقہ پرستی کے ردِّعمل میں علی گڑھ کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنانا چاہا تو رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں مولانا آزاد ہی تھے جنہوں نے سرسید کی اس یادگار کو بچایا۔ وہ علیگڑھ کے عالم نزع میں دوسرے سرسید تھے۔'' مولانا کو اللہ تعالیٰ نے تحمل و بردباری اور صبر و برداشت سے حظ وافر عطا فرمایا تھا۔ چنانچہ رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ ''ہندوستانی قومیت کی حمایت میں جتنا ظلم وجور اپنے ملک میں مسلمانوں کے ہاتھوں مولانا ابوالکلام نے اٹھایا وہ شاید ہی کسی دوسرے مسلمان کے حصہ میں آیا ہو۔'' چنانچہ جب جناح صاحب نے مولانا کو ''شو بوائے آف کانگرس'' کہا تو یہ پھبتی مولانا تک بھی پہنچی۔ مولانا کے عقیدت مند نے مسٹر جناح کے بارے میں درشت لہجہ اختیار کرنا چاہا تو مولانا نے انہیں روک دیا اور صرف یہ کہنے پر اکتفا کیا:

''ہاں میرے بھائی، انہوں نے یہ کہہ کر اپنے مقام میں اضافہ نہیں کیا۔''

شملہ کانفرنس کے دوران مولانا نے قائداعظم سے مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو انہوں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ ڈاکٹر خان سرحد کے وزیراعلیٰ کے طور پر اس کانفرنس میں مدعو تھے۔ وہ قائداعظم سے الجھ پڑے اور جوش میں یہ تک کہہ دیا کہ ''ہم تم سے بہتر مسلمان ہیں۔'' (بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل، شورش کاشمیری: ص ۲۷۰)

وزارتی کمیشن کی آمد:

بین الاقوامی حالات نے برطانیہ کو مجبور کر دیا کہ وہ ہندوستان کی تمام طاقتوں کو ایک مضبوط مرکز پر اکٹھا کر کے ہندوستان کو اتنا مستحکم کر دے کہ وہ دنیا کی بڑی طاقتوں کا مقابلہ کر سکے اور ضرورت کے وقت برطانیہ کی بھی مدد کر سکے۔ کنزرویٹو پارٹی کی رائے اب بھی یہی تھی کہ تقسیم ہند اور ہندو مسلم منافرت کے جذبات سے کام لے کر برطانوی سامراج کو مضبوط اور مستحکم کیا جائے اور اس طریقہ سے بین الاقوامی حالات میں اپنی پہلی پوزیشن کو قائم رکھا جائے، لیکن انگلستان کے عوام کی اکثریت اور اس کی نمائندہ لیبر پارٹی

جو اس وقت برسر اقتدار تھی، اس کا نظریہ اس کے خلاف تھا۔ چنانچہ تقسیم ہند کے خود کاشتہ پودے کی جڑیں اکھاڑنے کی تدبیریں کی جانے لگیں اور دنیا کو حیرت ہوگئی جب یہ دیکھا گیا کہ برطانیہ کے مخصوص راز دار آغا خان متحدہ ہندوستان کے حامی بن کر گاندھی کے پاس حاضر ہونے لگے، اور پھر اپریل کے پہلے ہفتے میں نواب بھوپال بھی گاندھی کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔

ابھی صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن تمام ہندوستان میں مکمل نہیں ہوئے تھے کہ 24 مارچ 1946ء کو وزارتی مشن کراچی میں وارد ہوگیا۔ لارڈ پیتھک لارنس وزیر ہند، سر اسٹیفورڈ کرپس اور جنرل الیگزینڈر اس وفد کے ارکان تھے۔ وزیر اعظم برطانیہ مسٹر اٹیلی کے مطابق یہ مشن ہندوستان کی مختلف پارٹیوں کے لیڈروں سے صلاح ومشورہ کر کے ہندوستان کے آئندہ مستقبل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرے۔ مسٹر اٹیلی نے پارلیمنٹ میں مشن کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ''حکومت اقلیتوں کے حقوق سے غافل نہیں ہے۔ اقلیتوں کو ہر قسم کے خطرہ سے آزادی ملنی چاہیے لیکن کسی اقلیت کو یہ حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ اکثریت کی آزادی کا راستہ روک لے۔ مولانا آزاد نے کیبنٹ مشن کے تقرر پر بیان دیتے ہوئے لیبر گورنمنٹ کے اس اقدام پر مسرت کا اظہار کیا اور مشن میں مسٹر کرپس کی شمولیت پر بھی خوشی ظاہر کی۔

مولانا آزاد کے پیش نظر پہلی شملہ کانفرنس کے عوامل تھے لہٰذا اس بار آپ کی پوری کوشش یہ تھی کہ اس دفعہ ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑے اور کوئی ایسا پلان بنایا جائے جس سے مسلم لیگ اور اقلیتیں مطمئن ہوں۔ صرف اسی صورت میں مسلم لیگ کو مطالبہ پاکستان سے روکا جاسکتا ہے۔ کیونکہ مولانا کی مسلمانوں کے خیر خواہ ہونے کی حیثیت سے دیانت دارانہ رائے یہ تھی کہ تقسیم ہند مسلمانوں کے لیے باعث نقصان ہے۔ وہ اس حق سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہ تھے کہ پورے ہندوستان کو میدان عمل نہ سمجھیں اور اس کی سیاسی اور معاشی زندگی کی تشکیل میں شریک نہ ہوں۔ ان کے نزدیک یہ بزدلی کی بات تھی کہ اپنی آبائی جائداد سے دست بردار ہو کر اس کے ایک ٹکڑے پر قناعت کر لی جائے۔ یہ درست ہے کہ مسلمان بحیثیت مجموعی مسلم لیگ کے تقسیم ملک کے منصوبے کے

پیش نظر اپنے مستقبل کے بارے میں فکر مند تھے۔ بعض صوبوں میں اگرچہ مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ یہاں تو انہیں کوئی اندیشہ نہ تھا لیکن پورے ہندوستان میں وہ اقلیت میں تھے، لہٰذا وہ فکر مند تھے کہ آزاد ہندوستان میں ان کی حیثیت اور مرتبہ محفوظ نہیں رہے گا، لیکن نیشلسٹ مسلمانوں کا موقف یہ تھا کہ اگر مرکز کے پاس محدود اختیارات رہنے دیئے جائیں اور صوبے اپنے حقوق کے خود مالک اور خود مختار ہوں تو اس صورت میں مرکز کی صوبوں کے معاملات میں مداخلت کم سے کم ہو جائے گی۔ آئین مرکز کو اس کی اجازت ہی نہ دے گا لہٰذا مسلمانوں کو پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔ یہ درست ہے کہ مسلمان عددی لحاظ سے اقلیت میں ہیں لیکن دس کروڑ انسانوں کی اقلیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اتنے انسانوں کو صفحۂ ہستی سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ان کو اپنی ذات پر پورا بھروسہ کرنا چاہیے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے انگریزوں کی جابر و قاہر اور طاقتور حکومت کو ناکوں چنے چبا کر غلامی کی زنجیروں کو پاش پاش کیا ہے اس قوم کو کوئی اور قوم کیا غلام بنا سکتی ہے؟

6 اپریل 1946ء کو مولانا آزاد پہلی بار کیبنٹ مشن کو ملے اور مشن نے ان سے فرقہ واریت کی گتھی سلجھانے کی بابت پوچھا۔ آپ نے اس کا وہی جواب دیا جو پہلے سے ان کے ذہن میں تھا۔ 12 اپریل کو مولانا نے کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کو مشن سے اپنی گفتگو کی رپورٹ پیش کی۔ اور فرقہ وارانہ مسئلہ کا جو حل آپ نے تجویز کیا تھا وہ بھی کمیٹی کے سامنے رکھا، چنانچہ گاندھی جی اور ورکنگ کمیٹی نے اس سے پوری طرح اتفاق کیا بلکہ گاندھی جی نے اس مسئلہ اور اس حل پر مولانا کو مبارکباد دی۔

15 اپریل 1946ء کو مولانا نے تجاویز اب عوام پر بھی ظاہر کر دیں۔ مولانا نے صدر کانگرس کی حیثیت میں ملک کی اقلیتوں کے اندیشوں اور توہمات کو دور کرنے کی خاطر اپنی اسکیم کو ملک کے عوام کے سامنے پیش کیا۔ مولانا اس بارے میں لکھتے ہیں کہ

> ''ہندوستان کی تقسیم ایک حقیقت ہے اور اس کو دس سال ہو چکے ہیں۔ اب جو میں اپنے بیان پر دوبارہ نگاہ ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت میں نے جو کچھ کہا تھا وہی ہوا۔ یہ سب کچھ میں

نے اس وقت کہا تھا اور اب بھی کہوں گا۔

''مسلم لیگ نے پاکستان کی جو اسکیم تجویز کی ہے اس پر میں نے ہر پہلو سے غور کیا ہے، ایک ہندوستانی کی حیثیت سے میں نے سوچا ہے کہ پورے ہندوستان کے مستقبل پر اس کا کیا اثر ہو گا۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے میں نے دیکھا ہے کہ مسلمانوں کے مستقبل پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔''

''اسکیم کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ نہ صرف بحیثیت مجموعی پورے ہندوستان کے لیے بلکہ خاص طور پر مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہو گی، اور دراصل جتنے مسئلے اس کے ذریعہ حل ہوں گے اس سے زیادہ نئے مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ پاکستان کا نام ہی میری حلق سے نہیں اترتا، اس سے یہ خیال پیدا کیا جاتا ہے کہ دنیا کے کچھ حصے پاک اور کچھ ناپاک ہیں۔ پاک اور ناپاک علاقوں کی یہ تقسیم سراسر غیر اسلامی ہے بلکہ اسلام سے انحراف ہے۔ اسلام ایسی کسی تقسیم کو تسلیم نہیں کرتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''خدا نے پوری دنیا کو میرے لیے مسجد بنایا ہے۔''

''اس کے علاوہ معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کی اسکیم شکست کی علامت ہے، اور اس کا خیال اس طرح پیدا ہوا ہے جیسے یہودیوں میں قومی وطن کا خیال۔ یہ اس بات کا اعتراف ہے کہ ہندوستانی مسلمان ہندوستان میں اپنی حیثیت قائم نہیں رکھ سکتے اور اس پر راضی ہیں کہ ایک کونے میں جو ان کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہو، سمٹ کر بیٹھ جائیں۔

''یہودیوں کی اس آرزو سے ہمدردی کی جا سکتی ہے کہ ان کا ایک قومی وطن ہو، کیونکہ وہ پوری دنیا میں منتشر ہیں کہ کسی ایک علاقے

میں بھی وہ حکومت کے انتظامات پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی تعداد نو کروڑ سے اوپر ہے اور کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے وہ ہندوستانی زندگی کا اتنا اہم عنصر ہیں کہ حکومت کے انتظامات اور پالیسی پر فیصلہ کن حد تک اثر ڈال سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ قدرت نے ان کو چند مخصوص علاقوں میں بڑی تعداد میں یک جا بھی کر دیا ہے اور اس طرح انہیں تقویت پہنچائی ہے۔"

"ان حالات میں پاکستان کے مطالبہ میں کوئی جان نہیں رہتی۔ کم از کم میں ایک مسلمان کی حیثیت سے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے اس حق کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوں کہ پورے ہندوستان کو میدان عمل سمجھوں اور اس کی سیاسی اور معاشی زندگی کی تشکیل میں شرکت کروں، میرے نزدیک بزدلی کی بات ہے کہ میں اپنی آبائی جائداد سے دست بردار ہو جاؤں اور اس کے ایک ٹکڑے پر قناعت کروں۔"

"جب کہ سب کو معلوم ہے مسٹر جناح کی پاکستان کی اسکیم دو قومی نظریہ پر مبنی ہے۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہندوستان میں بہت سی قومیں آباد ہیں جن کے درمیان مذہب بنائے امتیاز ہے۔ ان میں جو دو بڑی قومیں ہیں یعنی ہندو اور مسلمان، ان کی اس اعتبار سے کہ وہ دو الگ قومیں ہیں دو الگ ریاستیں ہونی چاہئیں۔ ڈاکٹر ایڈرورڈ ٹامس نے ایک مرتبہ مسٹر جناح سے کہا کہ "ہندو اور مسلمان ہندوستان کے ہزاروں شہروں، قصبوں اور گاؤں میں مل جل کر رہتے ہیں۔" تو مسٹر جناح نے جواب دیا کہ اس کا ان کی جداگانہ قومیت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ مسٹر جناح کے رویئے کے مطابق چونکہ یہ دونوں قومیں ہر بستی، ہر گاؤں اور ہر شہر میں ایک دوسرے سے دوچار ہوتی رہتی ہیں۔ اسی وجہ سے وہ چاہتے ہیں کہ ان کو دو ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے۔"

''میں اس کے لیے تیار ہوں کہ اس مسئلہ کے باقی تمام پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا جائے اور اس پر صرف مسلمانوں کے مفاد کے نقطۂ نظر سے غور کیا جائے۔ میں اس سے بھی آگے جانے اور یہ کہنے کے لیے تیار ہوں کہ اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ پاکستان کی اسکیم سے مسلمانوں کو کسی طرح سے بھی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو میں خود اس کو منظور کر لوں گا اور دوسروں کو اسے منظور کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر میں اس اسکیم کا خود مسلمانوں کے جماعتی مفاد کے نقطۂ نظر سے جائزہ لوں، تو مجبوراً اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ اس میں ان کو ذرا بھی فائدہ نہیں ہو سکتا اور ان کے جائز اندیشے دور نہیں ہو سکتے۔

''آیئے ذرا ٹھنڈے دل سے ان نتائج پر غور کریں جو پاکستان بن جانے سے برآمد ہوں گے۔ ہندوستان دو ریاستوں میں تقسیم ہو جائے گا جن میں سے ایک میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گی اور دوسری میں ہندوؤں کی۔ ہندوستان میں ساڑھے تین کروڑ مسلمان باقی رہ جائیں گے جو پورے ملک میں چھوٹی چھوٹی اقلیتوں کی شکل میں بکھرے ہوئے ہوں گے۔ وہ یو۔ پی میں اٹھارہ فیصد، بہار میں 12 فیصد اور مدراس میں 9 فیصد ہوں گے یعنی آج کل کے مقابلہ میں وہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں اور زیادہ کمزور ہوں گے۔ انہوں نے قریباً ایک ہزار سال سے ان علاقوں کو اپنا وطن سمجھا ہے اور ان میں اسلامی تہذیب اور تمدن کے مشہور مرکز تعمیر کیے ہیں۔ ان لوگوں کی ایک روز صبح کو آنکھ کھلے گی تو وہ دیکھیں گے کہ راتوں رات اجنبی اور پردیسی بن گئے ہیں۔ وہ صنعتی، تعلیمی اور معاشی لحاظ سے پسماندہ ہوں گے اور ایسی حکومت کے رحم و کرم پر ہوں گے جو خالص ہندو راج بن گئی ہو گی۔'' دوسری

طرف خود ریاست پاکستان میں وہ غیر محفوظ اور کمزور ہوں گے۔
پاکستان کے اندر کہیں بھی ان کی اتنی بڑی اکثریت نہیں ہوگی جتنی
ہندوستان کی ریاست میں ہندوؤں کی۔ دراصل مسلمانوں کی
اکثریت اتنی کم ہوگی کہ ان علاقوں کے غیر مسلموں نے جو تعلیمی اور
سیاسی سبقت حاصل کرلی ہے وہ اس کو بے اثر کردے گی۔ اگر ایسا نہ
ہوتا اور پاکستان میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہوتی تب بھی ان
کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ تو حل نہ ہوتا۔

''اس بات سے کہ دو ملک ایک دوسرے کے مدمقابل ہوں، ان
دونوں کی اقلیتوں کا مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ اس سے صرف یہ ہوسکتا
ہے کہ اقلیتوں کو یرغمال سمجھنے کا طریقہ جاری ہوجائے اور سزا دینے اور
بدلہ لینے کی کاروائیاں ہونے لگیں۔ اس وجہ سے پاکستان کی اسکیم
مسلمانوں کی کسی دشواری کا علاج نہیں ہے۔ جہاں وہ اقلیت میں
ہیں وہاں وہ ان کے حقوق کا تحفظ نہیں کرتی اور پاکستان کے شہری
ہوتے ہوئے انہیں ہندوستانی یا بین الاقوامی امور میں وہ حیثیت
حاصل نہیں ہوسکتی جو کہ انڈین یونین جیسی کسی بڑی ریاست کے شہری
بن کر وہ حاصل کرسکتے ہیں۔'' (ہماری آزادی: ص ۳۸۷_۲۹۱)

مسلمانوں کے بارے میں یہ تو مولانا کا نظریہ تھا، لیکن قائداعظم کا نظریہ اس
بارے میں کچھ اور تھا، چنانچہ آپ نے ایک نمائندہ پریس کے سوال کے جواب میں فرمایا:

''جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں ان کے لیے تین
صورتیں ہیں۔ ایک غریب الوطن غیر ملکی کی طرح زندگی بسر کریں
(جن کا کوئی حق یا کوئی حصہ حکومت میں نہ ہوگا اور وہ اپنے آبائی
وطن میں رہتے ہوئے اسی طرح غریب الوطن، اجنبی اور حق
حکومت سے محروم رہیں گے جیسے کوئی افریقہ، نیپال، سری لنکا کا
باشندہ) یا ہندو نیشن اختیار کرلیں۔ (معاذ اللہ! جس کے معنی یہ

ہیں کہ ہندو ہو جائیں کیونکہ نظریہ ''نیشن'' کی بنیاد ہی اس پر ہے کہ نیشن کو مذہب کے ہم معنی قرار دیا جائے۔) تیسری صورت یہ ہے کہ پاکستان تشریف لے آئیں وہاں ان کا استقبال کروں گا۔''

درحقیقت یہ اسی مضمون کا اعادہ تھا جو مسٹر جناح 16 مارچ 1946ء کو کوئٹہ میں تقریر کرتے ہوئے فرما چکے تھے کہ آزادی کے بعد ہندو مسلمانوں کو یہودیوں کی طرح مٹا دیں گے۔'' (مدینہ، ۱۳ اپریل ۱۹۴۶ء)

ٹو نیشن اور تقسیم ہند کے نظریہ کے بموجب مسٹر جناح کا یہ خطرہ صحیح ہے کیونکہ جب مسٹر جناح نیشن کا مدار مذہب پر مانتے ہوئے مسلمانوں کو دو قومیں قرار دیتے ہیں اور پھر تقسیم ہند کا مطالبہ بھی کرتے ہیں تو لامحالہ اپنے ان دو نظریوں کے مطابق وہ ہندو کو اس بات کا حق دے رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو اپنی اکثریت کے صوبوں سے اسی طرح نکال دیں جس طرح ہٹلر نے یہودیوں کو جرمنی سے نکال دیا تھا۔ جس طرح کانگرس نے غیر ملکی حکومت سے ''ہندوستان خالی کرو'' کا مطالبہ کر لیا ہے کیونکہ یہ مسلمان نہ ان کے نیشن میں شریک ہیں نہ ان کے وطن کے باشندے۔ (علمائے حق: جلد ۲ ص ۵۸۸)

اپریل 1946ء کے تین ہفتے وزارتی مشن کی ملاقاتوں میں گذر گئے۔ مشن کے اراکین نے دونوں جماعتوں کے نمائندوں کو درخواست کی کہ دونوں جماعتیں مشترک کانفرنس کر کے تمام مشکلات اور پیچیدگیوں کو حل کریں۔ چنانچہ دونوں جماعتوں نے مشن کی تجویز کو منظور کر لیا۔ مولانا آزاد، خان عبدالغفار خان اور پنڈت نہرو کانگرس کی طرف سے اور مسٹر جناح نے اپنے ساتھ نواب اسماعیل خان، نوابزادہ لیاقت علی خان اور سردار عبدالرب نشتر مسلم لیگ کی طرف سے کانفرنس کے لیے نامزد ہوئے اس کانفرنس کے آٹھ ممبران میں سے چھ مسلمان اور صرف دو ہندو تھے۔

اس کانفرنس کے مباحثوں سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وزارتی مشن کو بندر بانٹ کے لیے اور اگر حسن ظن سے کام لیا جائے تو درمیانی فیصلہ کے لیے رہنمائی حاصل ہو گئی۔ دوسرا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مسٹر جناح اور ان کی لیگ مطالبۂ پاکستان سے کسی قدر نیچے اتری یعنی پورے ہندوستان کے لیے ایک مرکز پر آمادہ ہو گئے، لیکن کوئی متفقہ فیصلہ پھر بھی نہ

ہو سکا اور کئی اصول ونظریات الجھے رہ گئے۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ مسلم لیگ نے وزارتی مشن کے پلان کو منظور کر لیا اور قائداعظم نے یہ کہہ کر اس پلان کے لیگی مخالفین کو چپ کرا دیا کہ چونکہ عبوری حکومت میں لیگ اور کانگرس کو مساوی نمائندگی مل گئی ہے اس لیے اس طویل المیعاد اسکیم کو منظور کر لینا چاہیے۔ لیگ کی اس تجویز نے تقسیم ہند اور مطالبہ پاکستان کو ختم کر دیا۔ چنانچہ روزنامہ انقلاب نے مسٹر جناح کے ان تمام اقوال وارشادات کو جو متحدہ ہندوستان کی مخالفت اور پاکستان کی حمایت میں چار سال متواتر اپنی زبان اور قلم سے صادر کرتے رہے، نقل کرنے کے بعد لکھا تھا:

> ''اگر مرکز کو کسی شکل میں بھی قبول کرنا مسلمانوں کی سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، تعلیمی اور ثقافتی بے بسی کا سرچشمہ اور ہندو راج کے قیام کا مقدمہ تھا، اب اس میں سے پاکستان پیدا کرنے کی امیدیں کیونکر صورت پذیر ہوں گی۔ ہائی کمان کے موجودہ فیصلے کے حامیوں کو یا تو یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ مسٹر جناح نے پہلے جو فرمایا تھا وہ صحیح نہ تھا یا پھر یہ ماننا چاہیے کہ لیگ ہائی کمان نے اب جو فیصلہ کیا ہے، صحیح ہے۔ دونوں چیزیں بیک وقت درست نہیں ہو سکتیں۔''
>
> (روزنامہ انقلاب ۲۰ جولائی ۱۹۴۶ء بحوالہ علمائے حق)

ہم اس گفتگو کو زیادہ طویل نہیں کرنا چاہتے کیونکہ یہ سب کچھ اب قصہ پارینہ اور داستان ماضی ہو چکا ہے۔ پاکستان لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے آخری وائسرائے کے پلان کے مطابق بن گیا جس کو مسلم لیگ نے لولا لنگڑا پاکستان سمجھ کر قبول کر لیا۔ 3 جون 1947ء کو مسٹر ایٹلی وزیراعظم برطانیہ نے ہاؤس آف کامنز میں ماؤنٹ بیٹن کے اس منصوبہ کا اعلان کیا۔ اس پر حزب اختلاف (کنزرویٹو پارٹی) نے محتاط انداز میں منظوری کا اظہار کیا۔ مسلم لیگ کے بعض سرکردہ لوگوں نے اگرچہ اس پلان کی 9 جولائی 1947ء کی آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں سخت مخالفت کی جن میں پروفیسر عبدالرحیم (بنگال) ظہیر الحسن لاری (یو۔پی)۔ پروفیسر عبدالرحیم نے کہا کہ یہ پلان ہندوستان کے مسلمانوں کو تباہ کر دے گا۔ اس کے نتیجہ میں ملک میں کبھی پائیدار امن قائم

نہیں ہو سکے گا۔ یہ کٹا پھٹا پاکستان جواب پیش کیا جا رہا ہے، یہ کانگرس کے لیڈروں نے چار سال قبل پیش کیا تھا۔ اگر مسلمان اسے قبول کرنے کے خواہش مند ہیں تو یہ جو خون بہایا گیا ہے یہ ہوش مندی نہ تھی۔ اسی قسم کے جذبات کا اظہار ظہیر الحسن لاری نے بھی کیا۔

پاکستان بن گیا اور برصغیر پاک و ہند میں فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دس لاکھ کے قریب مسلمان شہید ہوئے۔ ساٹھ ہزار عورتیں غیر مسلموں کے قبضہ میں چلی گئیں۔ لاکھوں مسلمان نقل مکانی کر کے پاکستان میں داخل ہوئے جن کی بحالی کا محکمہ ابھی تک پاکستان میں قائم ہے۔ مولانا آزاد کی دوربین نگاہیں، دور اندیشی اور سیاسی بصیرت یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ پاکستان کے ایک وزیر اعظم محمد علی بوگرا نے ہندوستان کے دورہ کے دوران مولانا سے استفسار کیا:

''مولانا! پاکستان معرض وجود میں آچکا ہے۔ اب آپ کی کیا رائے ہے؟''

''مولانا نے جواب میں فرمایا: ''میرے بھائی! پاکستان ایک سیاسی تجربہ ہے اسے کامیاب بنائیں۔'' (ابوالکلام، شورش کاشمیری: ص ۲۰۹)

چوہدری فضل الٰہی نے بھی مولانا آزاد کے ساتھ اپنی ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے یہی الفاظ دہرائے: ''پاکستان ایک تجربہ ہے اسے کامیاب بناؤ۔''

(قومی ڈائجسٹ نومبر ۱۹۸۷ء)

پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے قبل ہندوستان کے شعلہ نوا خطیب سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے متنبہ کیا کہ کانگرس اور مسلم لیگ کو وزارتی مشن کے منصوبہ پر عمل درآمد کے لیے مفاہمت کی راہ اختیار کرنی چاہیے بصورت دیگر ہلاکت خیزیوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ملک تقسیم ہوا تو پھر تقسیم در تقسیم کا چکر بھی چلے گا۔ ملک ہی نہیں صوبے، اضلاع اور تحصیل تک تقسیم کی زد سے بچ نہ سکیں گے۔ (چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ صوبے اور اضلاع بھی تقسیم ہوئے اور خود پاکستان بھی دولخت ہوا) اور اس تقسیم سے جو تباہی مچے گی اس کی نقشہ کشی کرتے ہوئے شاہ جی نے فرمایا:

''میں آج جہاں کھڑا ہو کر بول رہا ہوں ایک ویرانہ بننے والا ہے۔

مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے۔
قافلے آ رہے ہیں اور قافلے جا رہے ہیں۔ ہندوستان مسلمانوں
کے لیے ایک زندہ قبرستان ہوگا۔

''یاد رکھو! تقسیم اگر ہوئی تو امرتسر تک کا علاقہ ہندوستان لے جائے
گا اور پاکستان پر رفتہ رفتہ وہی لوگ قابض ہو جائیں گے جو آج
بھی انگریز کے غم خوار اور نمک خوار ہیں۔ یہ امراء کی ایک جنت ہو
گی۔ ننانوے فیصد عوام کے لیے یہی شب و روز ہوں گے اور
اسلام ایک مسافر کی طرح ہوگا۔''

قیام پاکستان سے قریباً ایک سال قبل 26 اپریل 1946ء کو ایک بہت بڑے
جلسۂ عام میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''اس وقت آئینی اور غیر آئینی دنیا میں یہ بحث چل رہی ہے کہ آیا
ہندوستان میں ہندو اکثریت کو مسلم اقلیت سے جدا کر کے برعظیم کو
دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے؟ قطع نظر اس کے کہ اس کا انجام کیا
ہوگا مجھے پاکستان بن جانے کا اتنا ہی یقین ہے جتنا اس بات پر کہ
صبح کو سورج مشرق سے طلوع ہوگا، لیکن وہ پاکستان نہیں بنے گا جو
دس کروڑ مسلمانان ہند کے ذہنوں میں موجود ہے اور جس کے لیے
آپ بڑے خلوص سے کوشاں ہیں۔ ان مخلص نوجوانوں کو کیا معلوم
کہ کل ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟''

''بات جھگڑے کی نہیں سمجھنے اور سمجھانے کی ہے لیکن تحریک (مسلم
لیگ) کی قیادت کرنے والوں کے قول و فعل میں بلا کا تضاد اور
بنیادی فرق ہے۔ اگر مجھے آج کوئی اس بات کا یقین دلا دے کہ
کل کو ہندوستان کے کسی قصبہ کی گلی میں یا کسی شہر کے کسی کوچہ میں
حکومت الٰہیہ کا قیام اور شریعت اسلامیہ کا نفاذ ہونے والا ہے تو
رب کعبہ کی قسم! میں آج ہی اپنا سب کچھ چھوڑ کر آپ کا ساتھ

دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"لیکن یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ جو لوگ اپنی اڑھائی من کی لاش اور چھ فٹ کے قد پر اسلامی قوانین نافذ نہیں کر سکتے۔ جن کا اٹھنا بیٹھنا، جن کا سونا، جن کا جاگنا، جن کی وضع قطع، جن کا رہن سہن، بول چال، زبان و تہذیب، کھانا پینا اور لباس وغیرہ غرضیکہ کوئی چیز بھی اسلام کے مطابق نہ ہو، وہ دس کروڑ کی انسانی آبادی کے ایک قطعۂ زمین پر اسلامی قوانین کس طرح نافذ کر سکتے ہیں۔ یہ ایک فریب ہے اور میں یہ فریب کھانے کے لیے تیار نہیں۔

"ہندو اپنی مکاری اور عیاری سے پاکستان کو ہمیشہ تنگ کرتا رہے گا۔ اسے کمزور بنانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ اس تقسیم کی بدولت آپ کے دریاؤں کا پانی روک لے گا۔ آپ کی معیشت تباہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ آپ کی یہ حالت ہوگی کہ بوقت ضرورت مشرقی پاکستان مغربی پاکستان کی اور مغربی پاکستان مشرقی پاکستان کی کوئی سی مدد کرنے سے قاصر ہوگا۔

"اندرونی طور پر پاکستان میں چند خاندانوں کی حکومت ہوگی اور یہ خاندان زمینداروں، صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کے ہوں گے۔ انگریز کے پروردہ فرنگی سامراج کے خود کاشتہ پودے سروں، نوابوں اور جاگیرداروں کے خاندان ہوں گے جو اپنی من مانی کاروائیوں سے محبِّ وطن اور غریب عوام الناس کو پریشان کر کے رکھ دیں گے۔ غریب کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ ان کی لوٹ کھسوٹ سے پاکستان کے کسان نان شبینہ کو ترس جائیں گے۔ امیر دن بدن امیر تر اور غریب دن بدن غریب تر ہوتا چلا جائے گا۔

"فرنگی دونوں مملکتوں کے درمیان کبھی نہ ختم ہونے والا فساد پیدا کر کے جائے گا جس سے دونوں قیامت تک چین سے نہ

بیٹھ سکیں گے۔ آئندہ بھی آپس کا کوئی سا تنازعہ باہمی گفتگو سے کبھی طے نہیں ہو سکے گا۔ آج انگریز کے فیصلے سے تلواروں اور لاٹھیوں سے لڑتے ہو تو آئندہ توپ اور بندوق سے لڑو گے۔ اس نادانی اور من مانی سے برصغیر میں انسانیت کی جو تباہی ہوگی، عورت کی جو بے حرمتی ہوگی، اخلاق و شرافت کی تمام قدریں جس طرح پامال ہوں گی تم اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے، لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ یہاں وحشت و درندگی کا دور دورہ ہوگا، بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہوگا، انسانیت اور شرافت کا گلہ گھونٹ دیا جائے گا، نہ کسی کی عزت محفوظ ہوگی، نہ جان و مال اور نہ ایمان۔ اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟''

(دہلی جامعہ مسجد کے سامنے اردو پارک میں تقریر، روزنامہ الجمعیۃ ۲۸ اپریل ۱۹۴۶ء)

اس تقریر کے الفاظ کو دو تین بار پڑھیں اور شاہ جی کی سیاسی بصیرت کی داد دیں یوں پتہ چلتا ہے کہ وہ حالات کا تجزیہ نہیں کر رہے بالکل مستقبل کے پردہ کو پھاڑ کر مسلمانوں کو دکھا رہے ہیں کہ تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے، اور جو کچھ تمہیں بتایا جا رہا ہے وہ حقیقت نہیں بلکہ سراب ہے۔ یہ لوگ تم سے جھوٹ بول رہے ہیں۔ یہ تمہارے لیے کچھ نہیں کر رہے بلکہ سب کچھ اپنے لیے کر رہے ہیں۔ اب بھی خواب غفلت سے بیدار ہو جاؤ، جذبات کو ترک کر کے ہوش مندی اور عقل و خرد سے کام لو حقیقت کی دنیا میں لوٹ آؤ۔ لیکن ان کی دردمند صدائیں مسلمانوں کے بہرے کانوں سے ٹکرا کر واپس آ گئیں۔ کسی نے ان کی آواز پر کان نہ دھرا حالانکہ ان کی ایک ایک بات درست تھی اور مستقبل نے اس کی درستی کی تصدیق کر دی۔ وہی لوگ جنہوں نے قوم کے سامنے غفلت اور خود فراموشی کے جام لنڈھائے تھے اور ان کے کانوں کو سرمستی اور سرشاری کی پیہم دعوتیں دی تھیں، اب وہ ہندوستان کے گلی کوچوں میں نہیں مل رہے تھے بلکہ قوم کو بے یار و مددگار چھوڑ کر فرار کر آئے تھے۔ اور قوم انہیں وہاں ڈھونڈتی رہ گئی۔ یہ پاکستان دراصل ان کے لیے بنا تھا۔ اسلام کے لیے نہیں بنا تھا، یہ تو ایک دھوکہ تھا جو قوم کو دیا گیا۔

☆ ☆ ☆

جمعیت علمائے اسلام کا قیام اور مطالبۂ پاکستان

23 نومبر 1919ء کو دہلی میں خلافت کانفرنس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ خلافت کے اس جلسہ میں علماء نے اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ انہیں ایک رابطہ میں منسلک کیا جائے جن کی اجتماعی قوت کو 1857ء کی جنگ آزادی نے بالکل منتشر کر دیا تھا۔ چنانچہ جمعیت العلماء ہند کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جمعیت متحدہ قومیت کی قائل تھی جس کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ اس زمانہ میں ہندوستان کے کسی عالم نے اس کی تردید نہ کی۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے اپنے میرٹھ کے جمعیت کے اجلاس میں اپنے خطبہ صدارت میں متحدہ قومیت کے مسئلہ کو واضح کرتے ہوئے فرمایا:

> ''ہم باشندگان ہندوستان بحیثیت ہندوستانی ہونے کے ایک اشتراک رکھتے ہیں جو کہ اختلاف مذاہب اور اختلاف تہذیب کے ساتھ ہر حال میں باقی رہتا ہے۔ جس طرح ہماری صورتوں کے اختلافات، ذاتوں اور صنعتوں کے تبائن، رنگوں اور قامتوں کے اختلافات ہمارے وطنی اشتراک میں خلل انداز نہیں ہیں۔ ہم سب وطنی حیثیت سے ہندوستانی ہیں، لہٰذا وطنی منافع کے حصول اور مضرتوں کے ازالہ کی فکر اور اس کے لیے جدوجہد مسلمانوں کا بھی اسی طرح فریضہ ہے جس طرح دوسری ملتوں اور غیر مسلم قوموں کا۔ اس کے لیے سب کو مل کر پوری طرح کوشش کرنی از بس ضروری ہے۔ اگر آگ لگنے کے وقت تمام گاؤں کے

باشندے آگ نہ بجھائیں گے، سیلاب آنے کے وقت تمام گاؤں کے بسنے والے بند نہ باندھیں گے تو تمام گاؤں برباد اور تباہ ہو جائے گا اور سبھی کے لیے زندگی وبال ہو جائے گی۔ اسی طرح ایک ملک کے باشندوں کا فرض ہے کہ خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا پارسی، ملک پر جب کوئی عام مصیبت پڑ جائے تو مشترکہ قوت سے اس کے دور کرنے کی جدوجہد کریں۔ اس اشتراک وطن کے فرائض سب پر یکساں عائد ہوتے ہیں۔ مذاہب کے اختلاف سے اس میں کوئی رکاوٹ یا کمزوری نہیں ہوتی۔ ہر ایک اپنے مذہب پر قائم رہ کر ایسے فرائض کو انجام دے سکتا ہے۔ یہی اشتراک میونسپل بورڈوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، کونسلوں اور اسمبلیوں میں پایا جاتا ہے اور مختلف المذاہب ممبر فرائض شہر یا ضلع یا صوبہ یا ملک کو انجام دینے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ یہی معنی اس جگہ "متحدہ قومیت" کے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے معنی جو لوگ سمجھ رہے ہیں وہ غلط اور ناجائز ہیں۔ اس معنی کی بنا پر کانگرس نے فنڈامینٹل (Fundamental) میں ہر مذہب اور ہر تہذیب اور ہر زبان اور رسوم و رواج کے تحفظ کا التزام کیا تھا۔ اس کے خلاف یورپین لوگ "متحدہ قومیت" کے جو معنی مراد لیتے ہوں اور کانگرسی اشخاص انفرادی طور پر کانگرس کے فنڈامینٹل کے مفہوم خلاف معنی بیان کرتے ہوں، ان سے یقیناً جمعیۃ علماء بیزار ہے اور خلاف کرتی ہے۔"

(خطبہ متحدہ قومیت: ۴۵۔۴۶)

جمعیۃ علمائے ہند اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ حضرات کے نزدیک متحدہ قومیت کا یہی مفہوم تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی مفہوم نہیں تھا جیسا کہ حضرت مدنیؒ نے اپنے اس خطبہ میں بیان فرمایا۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں سے حکومت چھیننے کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں سے انتقام لینے کی خاطر اور انہیں ذلیل اور رسوا

کرنے کے لیے ہر جگہ دبایا، لیکن ہندو نے انگریز سے سازگاری اور خوشامد اور چاپلوسی کر کے اس سے مراعات حاصل کر لیں۔ چنانچہ ولیم ہنٹر نے لکھا ہے

''حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت کلکتہ کا شاید ہی کوئی سرکاری دفتر ہو جس میں کوئی مسلمان چپڑاسی یا نائب قاصد سے اوپر کے کسی عہدے کی تمنا کر سکے۔'' (ہمارے ہندوستانی مسلمان: ص ۱۶۷)

اسی کتاب میں ایک اور مقام پر ہندو اور مسلمان کا موازنہ کرتے ہوئے ہنٹر نے لکھا ہے:

''اس ملک کی عنان اقتدار جب ہمارے ہاتھ میں آئی تو اس وقت مسلمان ایک اعلیٰ ترین قوم تھے۔ نہ صرف دل کی مضبوطی اور زور بازو کی وجہ سے بلکہ سیاسی تنظیم کی قوت کے باعث بھی اور عملی حکمرانی کی سائنس میں بھی ایک اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔''

لیکن جونہی انگریز کے منحوس قدم اس ملک میں آئے تو

''ہر قسم کی چھوٹی بڑی ملازمتیں بتدریج مسلمانوں سے چھین چھین کر دوسروں بالخصوص ہندوؤں کو دے دی گئیں۔''

(اخبار دوربین، فارسی، کلکتہ، مؤرخہ ۱۴ جولائی ۱۸۶۹ء بحوالہ ہنٹر)

ایک اور جگہ پر یہ انگریز ہنٹر لکھتا ہے کہ

''اب سے سو سال پہلے بنگال میں یہ بات قریباً ناممکن تھی کہ کوئی مسلمان غریب ہو اور اب صورت حال یہ ہے کہ یہ چیز کم و بیش ناممکن ہے کہ کوئی مسلمان خوش حال رہ سکے۔''

(ہمارے ہندوستانی مسلمان: ص ۱۰۵)

''وہ ہر قسم کی سرکاری سرپرستی سے محروم ہی نہیں کر دیئے گئے تھے بلکہ انہیں بے دخل کر کے رکھ دیا گیا۔'' (ایضاً: ص ۱۵۰)

اس سلسلہ میں مولانا محمد علی جوہرؒ نے بھی اپنے اخبار ''ہمدرد'' میں لکھا:

''غدر'' کیا تو تھا ہندو اور مسلمان دونوں نے، لیکن اس کی پاداش

اٹھانی پڑی تقریباً تمام کی تمام فقط مسلمانوں کو، اور جو ''انقلاب عظیم'' دہلی اور صوبہ جات متحدہ میں ''غدر'' کے بعد واقع ہوا، اس کا جو اثر شرفائے اہل اسلام پر ہوا وہ فرانس کے انقلاب سے کسی طرح کم نہ تھا۔ جو اونچے گنے جاتے تھے وہ نیچے ہو گئے اور جو نیچے سمجھے جاتے تھے وہ اونچے ہو گئے۔ گویا یہ ایک عذاب الٰہی تھا، اور اس وقت کے لوگ اس آیۂ کریمہ کے مصداق تھے ''**فجعلنا عالیھا سافلھا**'' یقیناً ملکہ سبا کا کہنا سچ نکلا اور ''کمپنی بہادر'' نے جس وقت حکومت کو وکٹوریہ کے سپرد کیا تو دہلی اور صوبجات متحدہ کی حالت بعینہ یہ تھی کہ ''**ان الملوک اذا دخلوا قریة افسدوھا وجعلوا اعزة اھلھا اذلة**'' (بے شک جب پادشاہ کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو فساد پھیلاتے ہیں اور عزت دار اہالی شہر کو ذلیل وخوار کیا کرتے ہیں) ''غدر'' کے بعد یہی حالت مسلمانوں کی ہوئی۔ آبرودار ذلیل کیے گئے اور بے آبرو معزز قرار پائے۔ سر سید احمد مرحوم کے خاندان کا قلعہ معلیٰ سے دیرینہ تعلق تھا، لیکن باوجود اس تعلق کے انہوں نے فرنگی کے پیسے کو مردار نہ سمجھ کر انگریزوں کی نوکری کی تھی جس کے باعث ان کے گھر کی ایک بڑی بوڑھی نے مرتے دم تک ان کی صورت دیکھنا گوارا نہ کیا۔ غدر میں انہوں نے نہ صرف یہ کیا کہ باوجود انگریزوں کے فرار اور روپوش ہو جانے کے اپنے فرائض منصبی اسی طرح ادا کیے گویا حکومت بدستور قائم ہے اور کاروبار سلطنت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

(ہمدرد، ۵ جون ۱۹۲۷ء)

سر سید نے ہندوؤں کی عددی اکثریت کا ہوا کھڑا کر کے مسلمانوں کو خوف زدہ کرنے اور خود اعتمادی سے محروم کرنے کی جو تخم ریزی کی تھی ''الہلال'' نے اس تصور کو پاش پاش کرنے میں بڑا کامیاب کردار ادا کیا۔ یہ الہلال کی دعوت اور تعلیم کا اعجاز تھا کہ

مسلمانوں نے کانگرس میں دلچسپی لینا شروع کیا اور کانگرس کے 35ویں سالانہ اجلاس ناگپور (1920ء) میں 1582 ڈیلی گیٹس شریک ہوئے جن میں مسلمانوں کی تعداد 1050 تھی۔ تحریک عدم تعاون (22-1920ء) میں20ہزار افراد نے رضا کارانہ گرفتاریاں پیش کیں جن میں مسلمانوں کی تعداد آٹھ ہزار تھی۔ تحریک نمک سازی میں 78000افراد کوسزائیں ہوئیں ان میں تیرہ ہزار مسلمان تھے۔

سرسید کے وقت مسلمانوں کا یہ انداز دفاعی تھا کیونکہ انہیں انگریزوں کے عتاب سے بچنے کے لیے کوئی منصوبہ بندی کرنی تھی۔ ویسے سرسید خود متحدہ قومیت کے اس وقت حامی تھے، لیکن پھر اچانک سرسید کے نظریہ میں تبدیلی آئی اور اس نے متحدہ قومیت کے نظریہ کوترک کرکے مسلم قومیت کا نعرہ لگایا۔ چنانچہ سرسید نے کہا:

> ''فرض کروتمام انگریز اور انگریزوں کی تمام فوج ہندوستان کو چھوڑ کر چلی جائے تو ہندوستان میں کون حاکم ہوگا؟ کیا ایسی حالت میں بھی ہندو اور مسلمان دونوں قومیں ایک گدی پر بیٹھ کر برابر درجے پر رہ سکیں گی؟'' (تقریر میرٹھ مؤرخہ ۱۶ مارچ ۱۸۸۸/ ۳۰۷)

سرسید کا یہ بیان دراصل دوسرے لفظوں میں انگریزوں کی حمایت تھا۔ سرسید تو اس وقت بھی انگریزوں کی حمایت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے جب پورا ہندوستان (جس میں ہندو اور مسلمان دونوں تھے) بہادر شاہ کی بادشاہت کو بچانے اور مسلمانوں کی حکومت کے تحفظ کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اب یکا یک اسلامی قومیت ان کے ذہن میں آ گئی؟ اس کا سبب یہ ہے کہ کانگرس متحدہ قومیت کے ساتھ کام کر رہی تھی جس کی وجہ سے اس کامیابی کی منزل قریب معلوم ہوتی تھی۔ سرسید نہیں چاہتے تھے کہ انگریز اس ملک سے جائیں لہٰذا انہوں نے ''ٹونیشن'' تھیوری نکالی، اور انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی۔

جنگ عظیم کی تحریکات میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن قدس سرہ نے اگرچہ متحدہ قومیت کے نظریہ کے تحت سیاست میں حصہ لیا۔ چنانچہ تحریک ترک موالات کے زمانے میں جب کہ بڑے بڑے لیڈر جذبات کی رو میں بہ کر اپنے عمل میں حدود

شریعت سے تجاوز کر رہے تھے، اس وقت میں حضرت شیخ الہندؒ شریعت کے کسی حکم میں کسی حالت میں بھی کسی طرح کی نرمی برتنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ جب آپ مالٹا کی اسارت سے واپس ہندوستان تشریف لائے تو بمبئی کی بندرگاہ پر ہندو مسلمان دونوں نے آپ کے استقبال میں ایک بہت بڑا جلوس نکالا۔ حضرت شیخؒ ایک گاڑی پر سوار تھے۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خان وغیرہ آپ کے ساتھ تھے۔ جلوس میں سے کسی شخص نے نعرہ لگایا: ''محمود الحسن کے جے ہووے۔'' جونہی حضرت شیخ الہندؒ کے کانوں میں اس نعرہ کی آواز پہنچی تو آپ نے فرمایا: ''مولانا محمد علی! اس جلوس کو کھڑا کرو۔'' جلوس کھڑا ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: ''محمد علی! میں تو نعرۂ تکبیر چھوڑ کر گیا تھا یہ جیکارے کب سے بجنے لگے؟'' مولانا محمد علی نے عرض کی: ''حضرت! محمود الحسن کی جے ہووے کا مطلب یہ ہے کہ محمود الحسن کی فتح ہو۔'' فرمایا: ''معنی مجھے بھی آتے ہیں لیکن اگر معنوں پر جانا ہے تو پھر اللہ کو بھی رام رام کہہ لیا کرو، معنی دونوں کے ایک ہی ہیں۔''

اسی طرح ایک زمانہ میں حکیم اجمل خان نے اپنے ہاں علماء کا ایک اجلاس بلایا جس میں کہا گیا کہ اس وقت ملک میں تحریک آزادی وطن زوروں پر ہے۔ اور ہندو مسلم دونوں اس میں نہایت دل جمعی اور ایثار کے ساتھ حصہ لے رہے ہیں۔ لیکن بعض علاقوں میں مسلمان گائے کو ذبح کر کے ملک کے امن و امان اور سکون کی فضا میں تشتت و انتشار کا زہر گھول دیتے ہیں کیونکہ ہندو اس کو اپنی ماتا سمجھتے ہیں اور وہ اس کو ذبح ہوتے برداشت نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اگر وقتی طور پر مسلمان ذبیحہ گاؤ ترک کر دیں تو ہندو مسلم اتحاد میں کوئی فرق نہیں آ سکتا اور تحریک استخلاص وطن میں تیزی بھی آئے گی اور آزادی کی منزل بھی قریب تر ہو جائے گی۔ پھر ذبیحہ گاؤ نہ فرض ہے اور نہ واجب وسنت۔ علماء کی اس مجلس میں حکیم صاحب نے حضرت شیخ الہند کو بھی دعوت دی تھی لیکن آپ مالٹا سے واپسی کے بعد صاحب فراش تھے، اس لیے آپ نے شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کو اپنا نمائندہ بنا کر اس میٹنگ میں بھیجا ہوا تھا۔ میٹنگ میں موجود کچھ علماء نے حکیم صاحب کی تجویز سے اتفاق کیا لیکن محفل کا رنگ دیکھ کر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحبؒ اٹھے اور حکیم صاحب کی تجویز کے خلاف عقلی و نقلی دلائل دینا شروع کیے جس سے پوری محفل کا

رنگ بدل گیا۔ آخر میں آپ نے فرمایا کہ جس ہستی نے مجھے اپنا نمائندہ بنا کر یہاں بھیجا ہے یعنی میرے استاذ حضرت شیخ الہند، انہوں نے مجھے فرمایا تھا کہ تمام حاضرین کانفرنس کو میرا یہ پیغام پہنچا دینا کہ "آج اگر تم لوگوں نے کسی وقتی مصلحت کے تحت دین کی دیوار میں معمولی سا سوراخ بھی کر دیا تو آنے والی نسلیں وہاں پھاٹک بنا دیں گی۔" حضرت شیخ الہندؒ کے اس جملہ نے تمام حاضرین پر بہت زیادہ اثر کیا، اور نتیجہ یہ ہوا کہ حکیم اجمل خان کی تجویز بالاتفاق ردّ ہو گئی۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے تھے کہ حکیم صاحب کو اس بات کا بڑا دکھ تھا۔ چنانچہ اس کے بعد انہوں نے جب بھی مجھے کوئی لکھا تو لکھتے: "ایھا العدو الحبیب" یعنی اے میرے پیارے دشمن۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ حکیم صاحب مجھے اس طرح مخاطب کیوں کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ حکیم صاحب سے ایک مجلس میں ملاقات ہو گئی اور میں نے انہیں پوچھا کہ آپ اپنے خطوط میں مجھے اس طرح کیوں مخاطب کرتے ہیں؟" یعنی مجھے دشمن بھی کہتے ہیں اور حبیب یعنی دوست بھی کہتے ہیں حکیم صاحب نے فرمایا دشمن تو میں آپ کو اس لیے لکھتا ہوں کہ آپ نے اس مجلس میں میری تجویز کو تمام حاضرین سے اپنے دلائل کی وجہ سے مسترد کروا دیا، اور دوست میں آپ کو اس لیے لکھتا ہوں کہ آپ نے اسلام کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا۔

اوپر کے دونوں واقعات سے آپ اندازہ فرمائیں متحدہ قومیت کے تحت ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام بھی کیا، دامن شریعت پر کوئی دھبہ نہیں آنے دیا اور شریعت کے کسی حکم میں کسی حالت میں بھی کسی طرح کی نرمی نہیں برتی۔ چنانچہ جمعیۃ علمائے ہند کے سالانہ جلسہ میں حضرت شیخ الہند کی طرف سے جو خطبہ صدارت پڑھا گیا، اس میں ذیل کے الفاظ بھی اس حقیقت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ آپ نے تمام حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا:

> "اسلام نے احسان کا بدلہ احسان قرار دیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ احسان اس کا نام ہے کہ آپ اپنی چیز کسی کو دے دیں۔ کسی دوسرے کی چیز اٹھا کر دینے کو احسان نہیں کہتے، اس لیے آپ برادران وطن (ہندوؤں اور سکھوں) کے احسان کے بدلے میں

وہی کام کر سکتے ہیں جو اخلاقی اور شریفانہ طور پر اپنے اختیارات
سے کر سکتے ہیں۔ مذہبی احکام خدا کی امانت ہیں، اس پر تمہارا
اختیار نہیں ہے، اس لیے لازم ہے کہ حدود مذہب کے اندر رہ کر تم
احسان کے بدلے احسان کرو اور دونوں قومیں مل کر ایک ایسے
زبردست دشمن کے مقابلہ کے لیے کھڑے ہو جاؤ جو تمہارے
مذہب اور تمہاری آزادی کو پامال کر رہا ہے۔" (خطبہ صدارت: ص ۳۰)

آپ کے صدارتی خطبہ کے اس اقتباس سے آپ کا یہ نظریہ واضح ہو جاتا ہے کہ "احکام اللہ کی امانت" ہیں، اس لیے اپنی رواداری اور احسان اور جدوجہد کو حدود مذہب کے اندر رکھنے کی تلقین فرما رہے ہیں اور تحریک استخلاص وطن میں کسی ایسی روش اور طریقہ کو ہرگز پسند نہیں فرماتے جو حدود مذہب سے ادھر ادھر ہو، اور کوئی بھی مسلمان ہوش کو چھوڑ کر جذبات کی رو میں بہہ کر کسی غیر اسلامی حرکت یا شعار کو اختیار کرنے لگے۔ حضرتؒ کے نزدیک یہ سراسر احکام خداوندی کے خلاف ہے۔ چنانچہ اسی تحریک ترک موالات کے زمانہ میں جب بعض مسلمانوں نے بھی ہندوؤں کے ساتھ اتحاد کے جوش میں آ کر حدود مذہب سے تجاوز کرتے ہوئے اپنی پیشانیوں پر قشقے لگائے اور ایسی باتوں میں ملوث ہونے لگے جو شریعت کی نگاہ میں قطعاً حرام تھیں یا تشبہ بالکفار تھیں تو حضرت شیخ الہند نے خطبہ ترک موالات میں اس پر سخت نکیر فرمائی۔ چنانچہ فرمایا:

"بہت سے خیر خواہ ہندو مسلم اتفاق کے عواقب اور عوام الناس اور
بعض لیڈروں کی ان غلط کاریوں پر تنبہ فرما رہے ہیں جو اس اتفاق
کے جوش سے پیدا ہوتی ہیں، مثلاً قربانی گاؤ میں بعض جگہ تشدد و
مزاحمت کیا جانا، یا قربانی کے جانور کو سجا کر رضا کارانِ خلافت کا گاؤ
شالہ میں پہنچانا، یا قشقہ لگانا، یا ہندوؤں کی ارتھیوں کے ساتھ خصوصاً
"رام رام ست" کہتے ہوئے جانا، یا یہ کہنا کہ امام مہدی کی جگہ امام
گاندھی تشریف لائے ہیں، یا یہ کہ اگر نبوت ختم نہ ہوگئی ہوتی تو مہاتما
گاندھی نبی ہوتے، یا قرآن و حدیث میں بسر کی ہوئی عمر نثار بت

پرستی کرنا، یا یہ دعا کرنا کہ اگر میں کوئی مذہب تبدیل کروں تو سکھوں کے مذہب میں داخل ہوں وغیرہ وغیرہ۔ بلاشبہ میں بھی جب اپنی قوم کے بڑے سربرآوردہ افراد کو سنتا ہوں کہ وہ اس قسم کے محرمات یا کفریات کے مرتکب ہوئے ہیں اور وہ باتیں زبان سے بے دھڑک نکال دیتے ہیں جن کو سن کر ایک سچے مسلمان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، تو میرا دل پاش پاش ہو جاتا ہے، اور قصد کرتا ہوں کہ اس طوفان بے تمیزی کا روکنا جب اپنی قدرت میں نہیں تو ان معاملات سے بالکل یکسوئی بہتر ہے۔'' (خطبہ ترک موالات: ص۲۲)

حضرت شیخ الہند کا یہ خطبہ اس بات کا بین ثبوت اور شاہد عادل ہے کہ اس وقت ہندو مسلم اتحاد کے جوش میں حدود شریعت کو بری طرح پامال کیا جانے لگا تھا، اور عوام الناس ہی نہیں بلکہ بعض لیڈروں اور قوم کے سربرآوردہ حضرات بھی اس قسم کے محرمات بلکہ کفریات کا ارتکاب کر رہے تھے جن کو سن کر بقول حضرت شیخ الہند ایک سچے مسلمان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، تو پھر اس قسم کے محرمات اور کفریات پر حضرت شیخ الہند کا دل کیوں پاش پاش نہ ہو جاتا اور وہ کیوں اس طوفان بدتمیزی سے یکسوئی کا قصد نہ فرماتے۔ اس خطبہ سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ حضرت شیخ الہند ہندو مسلم اتحاد میں مسلمانوں کی کسی ایسی بات سے ہرگز متفق نہیں تھے جس میں مسلمان جذبات سے مغلوب ہو کر شعائر اسلامی اور قانون شریعت سے ایک قدم بھی ادھر ادھر ہٹ جائیں۔

مسلم لیگ کا علماء کی طرف رجحان:

جمعیۃ علمائے ہند اور دوسری دینی جماعتیں کانگرس کے موقف کی تائید کر رہی تھیں اور وہ متحدہ قومیت کے نظریہ کے تحت کانگرس کے ساتھ تحریک استخلاص وطن میں پورا پورا تعاون کر رہی تھیں۔ اس وجہ سے ان صوبوں میں بھی کانگرس یا اس کی ہم نوا جماعتیں کامیاب ہو رہی تھیں جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی جیسے پنجاب، سندھ اور سرحد وغیرہ۔ اس لیے مسلم لیگ کی ضرورت تھی کہ علماء کا ایک گروہ ان کے ساتھ ضرور ہو

وگرنہ ان کی تحریک میں وہ تیزی (Momentum) نہیں آ سکتی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں علماء تک پہنچ کی گئی اور اس کے نتیجہ میں جمعیت علمائے اسلام کا قیام عمل میں آیا۔ اور دوسری بات یہ کی گئی کہ پاکستان کی تجویز کا ریزولیشن مسلم لیگ نے اپنے 27ویں اجلاس میں پیش کیا۔ چنانچہ 22-23-24 مارچ 1940ء کو لاہور میں مسلم لیگ کا ستائیسواں اجلاس ہوا جس کی صدارت آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر قائداعظم محمد علی جناح نے کی۔ اس اجلاس میں مندرجہ ذیل تجویز پاس ہوئی جس کو "تجویز پاکستان" کہا جاتا ہے۔

مسلم لیگ کی یہ پختہ رائے ہے کہ کوئی دستور حکومت بغیر اس کے کہ وہ ذیل کے اصول پر مبنی نہ ہو، نہ قابل قبول ہو سکتا ہے اور نہ ہی مسلمانوں کے لیے قابل قبول۔

1- یہ کہ جغرافیائی حیثیتوں سے متصل وحدتوں کی ایسے علاقوں میں حد بندی کر دی جائے جو اس طرح بنائے جائیں کہ ان میں ضرورت کے مطابق ایسی سرحدی تبدیلیاں کی جائیں کہ وہ رقبے جہاں مسلمانوں کی عددی اکثریت سے مثلاً ہندوستان کے شمالی مغربی اور مشرقی منطقے ایک مستقل ریاست بن جائیں اور اس ریاست کے اجزاء ترکیبی اندرونی طور پر خودمختار اور مطلق العنان ہوں۔

2- یہ کہ ان علاقوں اور منطقوں کے اجزاء ترکیبی اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، اسلامی اور دوسرے حقوق و مفاد کے تحفظ کے لیے اس میں معقول اور مؤثر اور واجب التعمیل تحفظات درج کیے جائیں۔ نیز ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی تعداد کم ہے، مسلمانوں کے لیے ایسے معقول اور مؤثر اور واجب التعمیل تحفظات اور سیاسی اور دوسرے حقوق و مفاد کی حفاظت ہو جائے۔

3- یہ اجلاس ورکنگ کمیٹی کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ دستور کی ایک اسکیم مرتب کر لے جو ان بنیادی اصول پر مبنی ہو، اور وہ اس قسم کی ہو کہ اس میں یہ گنجائش ہو کہ ان علاقوں کو اس قسم کے اختیارات مل جائیں جیسے دفاع، امور خارجہ، رسل و رسائل، اور نیز ایسے ہی دوسرے امور جو ضروری ہوں۔

(اجمل ۳۰ مئی ۱۹۴۴ء)

مولانا سید طفیل احمد نے اس اجلاس کے بارے میں لکھا:

یہ اجلاس مجمع کے اعتبار سے نہایت کامیاب رہا، اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں پچاس ہزار سے زیادہ مجمع تھا، مگر نوعیت کے اعتبار سے ہندوستان کے تمام جلسوں سے اس وجہ سے بالکل مختلف تھا کہ اس میں یورپ کی موجودہ جنگ اور انگلستان اور ہندوستان کے باہمی سمجھوتہ کا یا ہندوستان کی آزادی کا کوئی تذکرہ نہ تھا جبکہ آزاد خیال مسلمان ملک کی آزادی کے لیے جیلوں میں جا رہے تھے، اور فارورڈ بلاک اور کانگرس سول نافرمانی کی تیاریاں کر رہی تھی۔ مسلم لیگ نے مسٹر جناح کی قیادت میں ہندوستان کو مسلم اور غیر مسلم حصوں میں تقسیم کرانے کا نظریہ پیش کر کے ملک کو حیرت میں ڈال دیا، بالخصوص اس وجہ سے کہ 1916ء میں خود مسٹر جناح نے کانگرس اور مسلم لیگ کے سمجھوتہ کے وقت پنجاب اور بنگال کی کونسلوں میں مسلم اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کر دیا تھا جس کا خمیازہ وہاں کے مسلمان آج تک اٹھا رہے ہیں، اور 1939ء میں کلکتہ کے اجلاس کنونشن میں صاف اور واضح الفاظ میں فرمایا تھا کہ اکثریت کے صوبوں میں مسلمان ممبروں کی تعداد بڑھانے کے یہ معنی ہوں گے کہ امیر لوگوں کو زیادہ امیر بنایا جائے۔ بہتر یہ ہوگا کہ مسلم اقلیت کے صوبوں میں مسلمان ممبروں کی تعداد اور زیادہ بڑھا دی جائے۔''

(روشن مستقبل: ص ۱۳۸)

بہر حال قائداعظم اور مسلم لیگ نے لفظ پاکستان سے مسلمانوں کو مسحور کر لیا۔ وارفتگی کی اس سے زیادہ بدتر مثال دنیا میں نہیں مل سکتی کہ ایک ایسے لفظ کو شرط اسلام اور جزو ایمان کی حیثیت دے دی گئی جس کے نہ معنی واضح اور نہ اس کی تفسیر معین تھی۔ جب اپنا دامن عمل سے خالی ہو تو مصنوعی سرخروئی کی آسان صورت یہ ہے کہ دوسرے کے عمل کو کج عملی اور ظلم وستم کہا جائے۔ مسلم لیگ نے اس زریں اصول سے پوری طرح کام لیا۔ وہ اپنی کسی وزارت کی کوئی اسلامی خدمت پیش نہیں کر سکتی تھی۔ اقتدار کے وڈیروں کی کٹ پتلی بن کر اپنے ہم مذہب انسانوں کو برطانوی اغراض کے مندر پر بھینٹ چڑھانا اس کا ایک معمول تھا، مسلم لیگی وزارت کی موجودگی میں سندھ میں حرون کی تباہی و بربادی، ان کے راہ نما ''پیر پگاڑو'' کی پھانسی، لیگی وزارت کے حکم سے پنجاب میں

خاکساروں کا قتل عام، لیگی وزارت کے زیر سایہ بنگال میں لاکھوں فاقہ زدہ انسانوں کی دردناک موت لیگی وزارت کے نمایاں کارنامے ہیں۔

اس ریزویشن کے پاس ہونے کے بعد مسلم لیگ کا رویہ تبدیل ہوگیا۔ چنانچہ کانگرسی مظالم کی داستانیں تصنیف کی گئیں اور قوم کے ذہنوں میں یہ بات ڈالی گئی کہ مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن ہندو ہے۔ ہندو اور مسلمان دو قومیں (نیشن) ہیں، لہٰذا ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ ان سلوگن کو سرکار پرست اور ملازمت پیشہ طبقہ نے لبیک کہا اور عام مسلمان ان نعروں سے مسحور ہو گئے گلی گلی قریہ قریہ "پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ" کے نعروں سے گونجنے لگا اور ہر جلسہ اور اجلاس میں "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ" کا ترانہ گایا جانے لگا۔ گویا مسلم ہونے کے لیے مسلم لیگ میں آنا شرط تھا۔ چنانچہ جو لوگ مسلم لیگ میں نہیں تھے، ان کو کوسا گیا، سب وشتم کیا گیا، ان کی داڑھیاں نوچی گئیں۔ بہرحال مسلم لیگ کو قائداعظم جیسا وکیل اور بیرسٹر ہاتھ لگ گیا۔ ان ساری باتوں کا نتیجہ یہ ہوا مسلم لیگ کی اکثریت انگریز کے وجود کو اپنی پناہ گاہ سمجھنے لگی اور کانگرس اور اس کی پالیسیوں سے عوام مسلمانوں کو نفرت ہو گئی بلکہ کانگرس کی آزادی وطن کی جدوجہد سے ہی نفرت پیدا ہوگئی۔ وہ تمام لیڈر جو بیس پچیس سال بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصہ سے نہایت اخلاص کے ساتھ تحریک استخلاص وطن کے لیے اپنا تن من دھن قربان کر چکے تھے، یک قلم دشمن اسلام اور دشمن ملک وملت قرار پائے۔ ان کو ہندو پرست اور کانگرس کا "شوبوائے" کہا گیا اور وہ لوگ جو اندر سے انگریز کے ایجنٹ تھے اور سن چھیالیس میں جب قائداعظم نے اپنے اپنے خطابات حکومت کو واپس کرنے کے لیے کہا تھا، اور انہوں نے وہ خطابات واپس نہ کیے۔ پھر انہیں میں سے ایک صاحب نے تو قائداعظم کا جنازہ بھی نہ پڑھا تھا، اور شرابی اور فسق وفجور میں ملوث، اور قوم وملت کے پرانے غدار اور آج کل کی اصطلاح "لوٹے" جو کبھی یونینسٹ اور کبھی مسلم لیگی، بڑے بڑے نواب اور نواب زادے، جاگیردار، زمیندار، انگریزوں کے پرانے ٹوڈی حامیان دین، خادمان اسلام، قائدین ملک وملت اور اسلام اور مسلمانوں کے سچے خیر خواہ قرار پائے۔ پھر پاکستان بننے کے بعد ملک کی عنان اقتدار بھی انہی لوگوں کے ہاتھوں میں دی

گئی جن میں سے بعض لوگ وہ بھی تھے جنہوں نے ایک روز بھی تحریک آزادی وطن کا ساتھ نہ دیا تھا، وزارتوں کی کرسیوں پر براجمان ہو گئے بلکہ ملک کی کلیدی وزارتیں ان کے سپرد کر دی گئیں۔ گویا ''منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے۔'' پھر انہوں نے پاکستان کی جو درگت بنائی، اس کی تفصیل سے اکثر حضرات آشنا ہیں۔ لوگوں سے کہا گیا تھا کہ پاکستان میں اسلامی قانون نافذ ہوگا اور شریعت اسلامیہ کی ہر طرف حکمرانی ہوگی لیکن افسوس اس بات کا کہ پاکستان کا سب سے پہلا وزیر قانون جوگندر ناتھ منڈل ہندو بنایا گیا جو ایک سال کے بعد رات کی تاریکی میں ہندوستان بھاگ گیا، اس سے پتہ چلا کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کا جو نعرہ لگایا گیا تھا وہ صرف قوم کو پھانسنے کے لیے تھا، وگرنہ بات وہی تھی جس کو سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے 1946ء میں جامع مسجد دہلی کے باہر میدان میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ سب آپ کے ساتھ دھوکہ ہو رہا ہے۔ جو لوگ اپنے اڑھائی من کے جسم اور چھ فٹ کے وجود پر اسلام نافذ نہیں کر سکتے وہ 10 کروڑ عوام پر بھی اسلام نافذ نہیں کریں گے۔

پاکستان کی تجویز اور اس کا پس منظر:

23 مارچ 1940ء کو لاہور کے منٹو پارک (اور موجود اقبال پارک) میں پاکستان کی جو تجویز پاس کی گئی تھی، اس کے بارے میں ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اس نام کے مصنف چوہدری رحمت علی ہیں۔ وہ اس وقت یورپ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، ان کے نام سے پاکستان میں ایک پمفلٹ شائع کیا گیا تھا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس تجویز سے دو تین سال قبل علامہ اقبال مرحوم نے اپنے خطبۂ الٰہ آباد میں پاکستان کا یہ تصور دیا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے اور معلوم نہیں کہ یہ کہاں تک درست ہے کہ پاکستان انگریزی دماغ کی تصنیف ہے۔ چنانچہ اخبار مدینہ، بجنور، مورخہ 21 اگست 1931ء نے اپنی اشاعت میں ایک شذرہ میں اس حقیقت کی ان الفاظ میں پردہ دری کی۔ لکھا ہے:

''گذشتہ اخبار میں ہم نے یہ خبر لکھی تھی کہ ہز ہائینس سر آغا خان

ایک کروڑ روپے کے سرمایہ سے بدیسی پارچہ بافوں کوفروغ دینے کی غرض سے ایک کمپنی قائم کرنے والے ہیں۔ اخبار ''الامان'' سے اب معلوم ہوا کہ نہ صرف آغا خان نے بلکہ ملاسیف الدین طاہر صاحب بوہرہ قوم کے مقتداءاور اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کے اکثر ممبروں نے دس کروڑ روپے کے سرمایہ سے ایک کمپنی قائم کی ہے جس کا صدر دفتر دہلی ہوگا۔ اس کمپنی کے قیام کا اصل محرک کون ہے اور اس کے اصل مقاصد کیا ہیں؟ اس کے صحیح حالات اب تک صیغہ راز میں ہیں۔ تاہم اس کے قیام پر اس خط سے کسی قدر روشنی پڑتی ہے جو مسٹر پلوڈن جج ممالک متحدہ نے کسی مستفسر (سائل) کے جواب میں لندن بھیجا تھا، اور اتفاقاً سنڈے گرافک کے ہاتھ چڑھ جانے کی وجہ سے شائع ہوگیا، اور اسی غرض سے ہم اس خط کا متن ذیل میں درج کرتے ہیں۔

''مدت سے ہندوستان کی صورتحال قابو سے باہر ہو رہی ہے۔ ہم نیم پارلیمنٹری حکومت کا حتمی وعدہ کر چکے ہیں جو برطانوی افسروں کے بغیر نہیں چل سکتی۔ برطانوی افسر زیادہ عرصہ نہیں رہیں گے۔ سول سروس کے تمام شعبے یہاں تک ہندوستانیوں سے بھر دیئے گئے ہیں یا بھرے جا رہے ہیں کہ آئندہ چند سال میں ان میں ڈھونڈنے سے بھی انگریز کا نام نہیں ملے گا۔ میں ان حالات میں ہندوستان کے مسئلہ کا ایک ہی حل دیکھتا ہوں کہ اسے ہندو اور مسلمانوں کے دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ آئرلینڈ میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کا تنازعہ ختم کرنے کے لیے 35 سال کی مسلسل پارلیمنٹری جنگ کے بعد ایسا ہی کرنا پڑا تھا۔ ہندوؤں نے ہمیں ہندوستان کے ساتھ کاروبار کرنے سے روک دیا ہے اب ہمیں مالیہ معاف کرنا پڑا ہے تاکہ کاشتکار زندہ رہ سکیں۔ یہ ایک

نہایت ہی یاس انگیز صورت حالات ہے، اور اس کا ایک ہی علاج ہے کہ اس تعفن کو پھیلنے سے روکا جائے، اور قدرتی تقسیم کے مطابق ملک کے حصے بخرے کر دیئے جائیں۔ اگر ہندو کاروبار تجارت نہیں کریں گے تو بمبئی کی جگہ کراچی شہر بندرگاہ کا کام دے سکتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ مزید 25یا 30حال کے لیے ہندوستان پر ہمارا اثر و اقتدار قائم رہے۔ اب برطانوی حکومت کے پرانے طریقہ کار کی طرف عود کرنا ناممکن ہے۔ ہمارے پاس اب کارکن اصحاب موجود نہیں ہیں۔ اب دور ماضی کو قائم نہیں کر سکتے۔ نیز ہم نے اپنا کام بھی کر لیا کیونکہ ہندوستان میں ریلیں اور نہریں قائم کر دی ہیں۔ اب اسے ایسا طرز حکومت دے دو جو اس کے لیے قدرتی اور موزوں ہو، لیکن جب تک ہندوستان میں ہمارا اثر و اقتدار قائم ہے ہمیں تحریک مقاطعہ (ترک موالات) کو پورے زور سے روکنا چاہیے۔''

مختصر یہ کہ ایک طرف تو مسلم لیگ نے پاکستان کا تصور دیا اور لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات ہر طریقہ سے ڈال دی کہ پاکستان کی اسلامی ریاست میں شریعت کا قانون نافذ ہوگا۔ یہ لوگوں اور علماء دونوں کے لیے ایک نہایت جاذب چیز تھی۔ چنانچہ عواقب اور نتائج پر نگاہ ڈالتے ہوئے کئی علمائے کرام جن میں اچھے خاصے جید عالم بھی تھے، تحریک پاکستان کی حمایت کرنے لگے بلکہ بعض تو اس میں باقاعدہ شامل ہو گئے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا سیاسی مسلک:

حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے خطبہ ترک موالات میں فرمایا تھا

''اس طوفان بدتمیزی کو روکنا جب اپنی قدرت میں نہیں تو ان معاملات سے یکسوئی بہتر ہے۔'' (خطبہ ترک موالات: ص ۳۰)

اس یکسوئی کا طبعی میلان اس وقت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی

تھانویؒ میں پایا جاتا تھا۔ آپ کا رجحان تصنیف و تالیف، تعلیم و تربیت اور اصلاح امت کی طرف تھا، اس لیے آپ عرصہ سے اپنے اس فرض منصبی کی ادائیگی میں ہمہ تن مصروف تھے، اور آپ کو عملی طور پر سیاست اور ملکی تحریکات میں براہ راست حصہ لینے کی نوبت نہیں آئی تھی اور نہ ہی آپ نے کسی سیاسی جماعت میں باقاعدہ شرکت فرمائی تھی۔ لیکن ملک میں جب کوئی تحریک شروع ہوتی تو آپ ایک ماہر شریعت ہونے کے ناطے اپنی فقیہانہ بصیرت سے اس کے عواقب و نتائج کے بارے میں ملت کی راہنمائی فرماتے۔ ملک کے گوشے گوشے سے آپ کے معتقدین کے استفسارات آتے اور آپ ایک ماہر مفتی کی حیثیت سے اس کے جوابات اپنی تحریر و تقریر سے دیتے چنانچہ مختلف سیاسی مسائل کے بارے میں آپ کے کئی رسائل بوادر النوادر وغیرہ میں موجود ہیں۔

تحریک خلافت، کانگرس اور مسلم لیگ میں شرکت اور اس قسم کے کئی مسائل آپ کے سامنے پیش ہوتے اور آپ اپنی سیاسی بصیرت کی روشنی میں اس کا جواب دیتے اور مسلمانوں کے لیے صحیح راہ عمل تجویز فرماتے۔ 1918ء کی خلافت کمیٹی کی تحریک میں بعض اکابر کی شرکت بھی آپ کے علم میں تھی۔ حضرت تھانویؒ کو ان حضرات کے مقصد سے اتفاق تھا لیکن طریق کار سے اختلاف تھا۔ ہندوؤں کی عددی اکثریت اور ان کی معاندانہ ذہنیت کا بھی آپ کو پورا پورا احساس تھا۔ آپ کا سیاسی نقطۂ نظر شروع ہی سے یہ تھا کہ ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کا اشتراک عمل مسلمانوں کے لیے مضر ہے۔ اس وجہ سے آپ ہندوؤں کے ساتھ مل کر تحریک چلانے کے مخالف تھے کیونکہ ان کے نزدیک ہندوؤں کے اشتراک سے جو حکومت قائم ہوگی اس سے مسلمانوں کا اصل مقصد یعنی اسلامی حکومت کا قیام حاصل نہیں ہوسکتا، لیکن جہاں تک کافرانہ حکومت سے گلوخلاصی اور آزادی کا تعلق ہے آپ اس میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ آپ کے نزدیک چونکہ ہندو مسلم اتحاد کے ذریعہ اسلامی حکومت قائم نہیں ہوسکتی تھی اس وجہ سے آپ متحدہ قومیت کے سخت خلاف تھے اور مسلم اور غیر مسلم دو قومی نظریہ کے بڑے زبردست حامی تھے۔ آپ اس وقت سے اس دو قومی نظریہ کے حامی تھے جب مسلم لیگ نے ابھی اس نظریہ کو لوگوں کے سامنے پیش نہیں کیا تھا۔ دوسری بات یہ کہ حضرت تھانویؒ انگریز حکومت کے مخالف اس

وجہ سے نہ تھے کہ وہ بدیشی ہیں بلکہ کافر ہونے کی وجہ سے اس کی حکومت کے مخالف تھے۔ چنانچہ مشہور عالم دین حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ جو شروع میں حضرت تھانویؒ کے سیاسی مسلک کے ہم نوا نہ تھے بلکہ مخالف تھے اور کانگرس کی حامی جماعت خلافت کمیٹی سے ان کا خصوصی تعلق تھا، اپنے ''نقوش وتاثرات'' میں لکھتے ہیں:

> ''نفس مقصد یعنی حکومت کافرانہ سے گلو خلاصی اور دارالاسلام کے قیام میں تو حضرت ہم لوگوں سے کچھ پیچھے نہ تھے، عجب نہیں کہ کچھ آگے ہی ہوں۔ حضرت کی گفتگو میں یہ جز بالکل صاف تھے۔ حضرت کو حکومت وقت سے جو مخالفت تھی وہ اس کے کافرانہ ہونے کی بناپر تھی نہ کہ اس کے بدیسی یا غیر ملکی ہونے کی بناپر۔''
>
> (نقوش وتاثرات: ص ۲۳)

علامہ اقبالؒ اور چوہدری رحمت علی مرحوم نے تو بہت بعد میں پاکستان کا تصور پیش کیا ان دونوں سے بہت پہلے مولانا تھانویؒ کئی دفعہ مختلف لوگوں کے سامنے مسلمانوں کی ایک ایسی الگ سلطنت قائم ہونے کا اظہار کر چکے تھے جس کے ہر شعبہ میں اسلامی شریعت کے قوانین کو اپنایا جائے۔ آپ کو بعض معاصر علماء کی طرح جنگ آزادی، حقوق آزادی اور تحریک استخلاص وطن سے سیاسی لحاظ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ آپ کے سامنے یہ مسائل سیاسی نہ تھے بلکہ تمام تر دینی تھے۔ ان کے دل میں حکومت الٰہیہ کی آرزو کروٹ لے رہی تھی۔ چنانچہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی لکھتے ہیں کہ

> ''1928ء میں جب پہلی مرتبہ حاضری ہوئی تو اس ملاقات میں حضرت نے دارالاسلام کی اسکیم خاصی تفصیل سے بیان فرمائی کہ جی یوں چاہتا ہے کہ ایک خطہ پر خالص اسلامی حکومت ہو۔ سارے قوانین تعزیرات وغیرہ کا اجراء احکام شریعت کے مطابق ہو، بیت المال ہو، نظام زکوٰۃ رائج ہو، شرعی عدالتیں قائم ہوں وقس علی ھذا۔ دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کام کرتے ہوئے یہ نتائج کہاں حاصل ہو سکتے ہیں؟ اس مقصد کے لیے

صرف مسلمانوں ہی کی جماعت ہونی چاہیے اور اس کو یہ کوشش کرنی چاہیے۔'' (سیرت اشرف منشی عبدالرحمٰن)

یہ تصور چوہدری رحمت علی نے 1930ء میں پیش کیا جب کہ چند نوجوانوں کو لندن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شمالی ہند کے ایک حصہ کو ہندوستان سے الگ کیا جائے۔ اور علامہ اقبالؒ نے اسلامی ریاست کے قیام کا خیال 29 دسمبر 1930ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الہ آباد میں اپنے خطبۂ صدارت کے دوران میں ظاہر کیا، جس کا 23 مارچ 1940ء کو لاہور کے تاریخی اجلاس میں ملی نصب العین کے طور پر ایک قرارداد کے ذریعہ باقاعدہ مطالبہ کیا گیا۔ لیکن ان دونوں حضرات سے بہت پہلے حضرت تھانویؒ اپنی خصوصی اور عام مجالس میں کئی بار اس تصور کا اظہار کر چکے تھے۔ گویا حضرت تھانویؒ کے یہاں حصول اور بقائے پاکستان کا لائحہ عمل اور پروگرام اور نظام پاکستان کا پورا خاکہ اس وقت پیش ہوا جب کہ پاکستان کا مطالبہ کرنے والوں کو ابھی اس کا خواب و خیال بھی نہ تھا۔

حضرت تھانویؒ کے اس سیاسی مسلک کو سمجھنے میں بعض حضرات نے بڑی غلطی کھائی چنانچہ تحریک خلافت میں جب کہ ہندوستان کے اکثر و بیشتر علماء اس میں شریک تھے۔ تو مولانا تھانویؒ کی اس تحریک خلافت سے علیحدگی کو بعض لوگوں نے اصل مقصد کے خلاف سمجھتے ہوئے آپ کے خلاف بڑی شورش برپا کر دی یہاں تک کہ تھانہ بھون کے بعض لوگ یہ کہنے لگے کہ خانقاہ امدادیہ کو مولانا تھانویؒ سے خالی کرا لیا جائے، لیکن اللہ تعالیٰ کی خاص نصرت کے باعث وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے اور انہیں بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ حضرت تھانویؒ کے سیاسی مسلک کے بارے میں غلط فہمی بلکہ بدگمانی کا شکار ہونے والوں میں خلافت کمیٹی کے اہم رکن اور مولانا محمد علی جوہر کے اخبار ''ہمدرد'' کے ڈائریکٹر مولانا عبدالماجد بھی شامل تھے جس کا اعتراف مولانا دریابادی نے مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے ہمراہ اپنی پہلی ملاقات میں خود حضرت تھانویؒ سے ان الفاظ میں کیا فرماتے ہیں:

''1928ء تھا اور مخاطب روزنامہ ''ہمدرد'' کا ڈائریکٹر تھا۔ صبح اور

دوپہر کی طویل صحبت میں سیاسی پہلوؤں پر گفتگو آ جانا ناگزیر سا تھا۔ گفتگو آئی۔ حضرت نے اتنی معقولیت سے کی کہ ساری بدگمانیاں کافور ہو کر رہیں۔ کون کہتا ہے کہ حضرت "گورنمنٹی" آدمی ہیں، لاحول ولا قوۃ۔ جس نے بھی ایسا کہا جان کر یا انجانے، بہرحال جھوٹ ہی کہا۔ یہ تو خالص مسلمان کی گفتگو تھی۔ مسلمان بھی ایسا جو جوشِ دینی اور غیرتِ ملی میں کسی خلافتی سے ہرگز کم نہیں۔ پاکستان کا تخیل، خالص اسلامی حکومت کا خیال یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں۔ پہلے پہل اس قسم کی آواز یہیں کان پڑی۔ بس صرف حضرت کو ہم لوگوں کے اس وقت طریق کار سے پورا اختلاف تھا، لیکن یہ اختلاف کچھ ایسا بڑا اختلاف نہیں۔"

(نقوش وتاثرات: ص۲۳)

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ تھانہ بھون میں:

اسی زمانہ میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، صدر جمعیت علمائے ہند جو اپنی فقیہانہ بصیرت اور علمی ثقاہت میں یدطولیٰ رکھتے تھے، حضرت تھانویؒ سے مسائل حاضرہ پر گفتگو کرنے کے لیے تھانہ بھون تشریف لائے۔ دونوں حضرات میں کیا گفتگو ہوئی یہ تو کسی کتاب میں نہیں ملی۔ البتہ آپ سے گفتگو سے فارغ ہو کر حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے حضرت تھانویؒ کے بھانجے حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ سے پوچھا کہ مولانا تھانویؒ جو ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے کراہت کرتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ حالانکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کو بھی اپنے ساتھ جہاد میں لیا ہے؟ حضرت مولانا ظفر احمد صاحبؒ نے جواب دیا کہ کفار اور مشرکین کو جہاد میں اس وقت لے سکتے ہیں جب جھنڈا مسلمانوں کا رہے اور کفار ہمارے حکم کے ماتحت ہو۔ اس وقت حالت برعکس ہے۔ کانگرس میں ہندوؤں کا غلبہ ہے اور انہی کا حکم غالب ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ حضرت

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ سیاسی مسلک میں حضرت تھانویؒ کے بالکل ہم نوا تھے۔ آپ بھی تحریک خلافت کے طریق کار اور کانگرس کی متحدہ قومیت کے خلاف تھے۔ حضرت تھانوی کے ہم مسلک اور ہم نوا ہونے کی وجہ سے علمی اور تحریری خدمات میں بھی آپ کے شریک کار بلکہ دست راست تھے اور حضرت تھانویؒ کے مسلک کی توضیح وتفصیل میں بڑھ چڑھ کر مولانا ظفر احمد ہی زیادہ تر حصہ لے رہے تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنی مشہور کتاب ''اعلاء السنن' جلد۱۲ص۵۰۲ میں کانگرس کی متحدہ قومیت پر بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے جس سے تھانوی سیاسی مسلک کی تشریح وتوضیح ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ تحریک پاکستان کے دوران حضرت تھانویؒ کا عزیز اور رفیق کار اور سیاسی مسلک میں آپ کا ہم نوا ہونے کی حیثیت سے، تحریری اور تقریری خدمات آپ ہی انجام دیتے رہے۔ حضرت تھانویؒ کو بھی آپ کی علمی ثقاہت پر پورا اعتماد تھا۔ حضرت مولانا ظفر احمد صاحبؒ نے اس زمانہ میں تحذیر الناس وغیرہ رسائل بھی لکھے تھے اور خلافت کمیٹی کے بعض لیڈروں کی محرمات اور خلاف شرع حرکات پر انہیں متنبہ فرمایا تھا۔ آپ حق بات کو برملا کہنے کے حامی تھے اور کسی ملامت کرنے والی کی ملامت کی ملازمت کی بالکل پروانہ کرتے تھے۔

حضرت مولانا تھانویؒ شروع ہی سے نہ تو متحدہ قومیت کے قائل تھے اور نہ ہی ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے کے حامی تھے، اور نہ ہی جمہوری نظام کے قائل تھے جس کا اس زمانہ میں چلن تھا۔ پھر وہ جمہوری نظام جس میں عددی اکثریت ہندوؤں کی ہو، اس کو تو وہ اور بھی مسلمانوں کے لیے مضر سمجھتے تھے۔ اس میں آپ اور آپ کے ساتھ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ کسی دور میں بھی مسلمانوں کے لیے کانگرس میں شرکت کے لیے متفق نہیں رہے تھے۔ چنانچہ جب تک مسلم لیگ نے کانگرس کا ساتھ دیا اور یہ دونوں سیاسی جماعتیں آپس میں متفق ومتحد رہیں، اس وقت تک ان دونوں حضرات نے مسلم لیگ کا بھی ساتھ نہیں دیا۔ پھر جب مسلم لیگ نے کانگرس سے علیحدگی اختیار کی تو اس وقت ان حضرات نے مسلم لیگ میں شمولیت تو اختیار نہیں کی البتہ مسلم لیگ کا قیام پاکستان کا مطالبہ منوانے میں ہر ممکن ساتھ دیا۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ جداگانہ قومیت یا اسلامی قومیت کا مسئلہ مسلم لیگ سے پہلے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا

مسلک ہے کیونکہ آپ کو انگریز کی حکومت سے نفرت اور ناپسندیدگی بدیسی اور اجنبی ہونے کی وجہ سے نہ تھی بلکہ ان کے کافر ہونے کی وجہ سے تھی، اور کفر کی علت جیسی انگریز میں تھی ویسی ہی ہندو میں بھی تھی۔ لہٰذا آپ کے نزدیک انگریز اور ہندو دونوں برابر تھے۔ اس لیے متحدہ قومیت کا آپ کے ہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگرچہ آپ کا یہ مسلک درست اور صحیح تھا لیکن جن لوگوں کا آپ نے ساتھ دیا تھا وہ اپنے اس دعویٰ میں کہ پاکستان ایک ایسی اسٹیٹ ہوگا جس میں نظام شریعت نافذ ہوگا، غلط تھے اور پوری مسلمان قوم سے جھوٹ بول رہے تھے۔ حضرت تھانویؒ اپنے اس سیاسی مسلک میں بالکل درست تھے لیکن آپ کو مسلم لیگی لیڈروں کے اخلاص کو پہچاننے میں غلطی لگی۔

مسلم لیگ اور کانگرس پہلے دونوں کا نصب العین قریباً ایک ہی تھا۔ لیکن پھر بعد میں یہ دونوں الگ الگ ہوگئیں۔ علیحدگی کے بعد ان دونوں نے پہلا الیکشن جھانسی کے علاقہ میں لڑا۔ جھانسی کے مسلمانوں نے بذریعہ تار حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے دریافت کیا کہ مسلم لیگ اور کانگرس دونوں میں سے کس کو ووٹ دیا جائے؟ ابھی تک حضرت تھانویؒ کا ذہن مسلم لیگ کے بارے میں صاف نہیں تھا۔ خدشہ تھا کہ کہیں یہ لوگ بھی مصطفیٰ کمال پاشا کی طرح دین کو مسخ کر کے ملک میں الحاد نہ پھیلائیں کیونکہ مسلم لیگ کے اکثر و بیشتر وڈیروں کے نام مسلمانوں کے تھے لیکن ان کی عملی زندگیوں میں خوردبین لگا کر بھی اسلام کا کوئی جراثیم نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ اس لیے ان لوگوں کے تار کا جواب دینے کے لیے آپ نے اپنے اہل علم حضرات کو طلب فرمایا تاکہ اس بارے میں ان سے مشورہ کیا جا سکے۔ اس پر حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے یہ مشورہ دیا کہ ''آپ کانگرس کی حمایت کے تو خلاف ہیں ہی صرف آپ کو تامل مسلم لیگ کی حمایت کرنے میں ہے۔ اس لیے آپ صرف اتنا جواب دے دیں کہ کانگرس کو ووٹ نہ دیا جائے۔'' مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کا یہ جواب حضرت تھانویؒ کو پسند آیا اور اس مضمون کا ایک تار دے دیا گیا جس کے نتیجہ میں مسلم لیگ کامیاب ہوگئی اور کانگرس یہ الیکشن ہار گئی۔ اب یہ الیکشن کی جیت سے مسلم لیگ کو علماء کی طاقت کا احساس ہوا۔ اس زمانے میں لوگ دین کی طرف زیادہ راغب تھے۔ ابھی دینی اقدار اتنی پامال نہیں ہوئی تھیں جتنی پاکستان بننے کے بعد

ہوئی ہیں۔ اب تو حکومت نے ایک بین الاقوامی سازش کے تحت دین کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا ہوا ہے اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر علی الاعلان کہا جاتا ہے کہ ہمارا آئیڈیل مصطفیٰ کمال پاشا ہے اور یہاں پاکستان میں روشن خیال اسلام چلے گا، علماء کا دقیانوسی اسلام نہیں چلے گا۔ اصل میں ان لوگوں نے کسی سے وہ داستان غم نہیں سنی اور ان میں سے کسی نے ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتل عام کا وہ منظر نہیں دیکھا جس نے ہلاکو خان اور چنگیز خان کے وحشیانہ قتل عام کو بھی شرما دیا تھا۔ انہوں نے اردو ہندی، سلام اور نمستے اور اللہ اکبر اور بندے ماترم کی جنگ نہیں دیکھی۔ انہوں نے پر امن اور پر عافیت ماحول میں آنکھ کھولی ہے۔ انہوں نے ہندو سکھ کی جگہ آپس میں مسلمانوں کو ایک دوسرے کو قتل کرتے دیکھا، گھروں کو آگ لگاتے دیکھا، اردو بنگالی کی لڑائی اور پنجابی سندھی کی جنگ دیکھی، صوبائی اور علاقائی کشمکش دیکھی، اسلامی تہذیب کی جگہ فرنگی تہذیب دیکھی، فواحش و منکرات اور عریانی کو دیکھا، نوجوان نسل کو ٹیلی ویژن پر ناچتے تھرکتے دیکھا، لیکن پاکستان کے پس منظر کو نہ انہوں نے دیکھا اور نہ ہی انہیں بتایا گیا۔ بعض لوگوں نے اشتراکیت اور سوشلزم کا نعرہ لگا کر قوم کو سبز باغ دکھائے، اور قوم بھی عجیب ہے کہ ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اللہ تعالیٰ نے پاکستان کی شکل میں ہمیں ایک دارالاسلام عطا کیا تا کہ ہم اسلام کے سیاسی اور معاشی نظام کو قائم کر سکیں اور دنیا کو ایک نمونہ دکھائیں، لیکن یقین جانئے اٹھاون سال کے بعد بھی اسلامی نظام کی منزل دور ہوئی ہے قریب نہیں ہوئی۔ پہلے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم آئیڈیل تھے اب مصطفیٰ کمال پاشا آئیڈیل ہے۔ گویا چمن اسلام کی پامالی کا مرثیہ ہے کہ ؎

اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑیں گے
تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

صرف یہی نہیں کہ اسلام کے سیاسی و معاشی نظام کو نظر انداز کیا جاتا رہا بلکہ

قائداعظم کے بعد اس دارالاسلام پر ان سرکاری ملازمین اور نوکر شاہی نے غاصبانہ قبضہ کر لیا جو ایک روز بھی تحریک پاکستان کے پلیٹ فارم پر کہیں نظر نہیں آئے بلکہ وہ تحریک پاکستان کے سخت مخالف تھے۔ مسٹر غلام محمد، سر ظفر اللہ، مشتاق احمد گورمانی، سکندر مرزا اور ایوب خان، یحییٰ خان۔ یہ پوری ٹیم اسلام اور پاکستان کے خلاف ایک جمگھٹا تھی۔ انہوں نے داخلہ کے ذریعہ جمہوریت اور اسلام دونوں کا گلا گھونٹا، سیاسی اور مذہبی جماعتوں میں انتشار پیدا کیا۔ اسلامی قومیت کے نازک شیشے کو پاش پاش کر کے علاقائی اور لسانی عصبیتوں کو جنم دیا۔ مذہبی فرقہ واریت کی آگ دھکائی جس سے قومی اتحاد کا ذخیرہ جل کر خاک ہو گیا۔ انہوں نے پرمٹوں اور لائسنسوں کے ذریعہ اہل دولت کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا اور سرمایہ دارانہ نظام کو چلا کر معاشی بحران پیدا کیا، ملک سے اسلام کو دیس نکالا دینے کے لیے سوشلزم کے لادینی نظام اور مصطفیٰ کمال پاشا کے الحاد کا فتنہ کھڑا کیا گیا۔

انہی سب باتوں کا خطرہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کو تھا، اس وجہ سے انہوں نے جھانسی کے الیکشن میں کھل کر مسلم لیگ کی حمایت نہ کی بلکہ صرف یہ کہا کہ کانگرس کو ووٹ نہ دیا، جس کے نتیجہ میں مسلم لیگ کامیاب ہو گئی۔ اس سے مسلم لیگ کے وڈیروں کو علماء کی قوت اور طاقت کا پتہ چل گیا۔

تھانہ بھون میں مولانا شوکت علی کی آمد:

صرف اتنے سے فتوے پر مسلم لیگ کی کامیابی کی خوشخبری سنانے کے لیے مولانا شوکت علیؒ اور ان کے چند رفقاء تھانہ بھون آئے۔ انہوں نے بتایا کہ ہم نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے جوابی تار کو حضرت تھانویؒ کے فتوے کی صورت میں بڑی تعداد میں چھپوا کر تقسیم کرایا اور اس کو جگہ جگہ دیواروں پر چسپاں بھی کیا۔ اس تار کا اثر یہ ہوا کہ جو لوگ کانگرس کو ووٹ دینے کے لیے آئے تھے، وہ بھی اس فتویٰ کو دیکھ کر مسلم لیگ کو ووٹ دے کر گئے جس کی وجہ سے مسلم لیگ فتح سے ہمکنار ہوئی۔ مولانا شوکت علی نے تھانہ بھون میں ایک جلسہ بھی کیا۔ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے حکیم الامت مولانا تھانویؒ کی نمائندگی کرتے ہوئے آپ کی طرف سے تقریر کی اور فرمایا:

''جب تک مسلم لیگ کانگرس کے ساتھ ساتھ تھی، حضرت تھانویؒ اس سے علیحدہ رہے کیونکہ کانگرس پر آپ کو کوئی بھروسہ اور اعتماد نہیں ہے۔ ہندو ایک غدار قوم ہے کیونکہ 1857ء میں یہ ہمیں دھوکہ دے چکی ہے، اور حدیث میں ہے کہ مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا۔ مسلم لیگ بھی تجربہ کے بعد کانگرس سے الگ ہوگئی۔ اب ہم اس کے ساتھ ہیں، مگر جب تک لیگ کے عہدہ داران دین و مذہب کے پورے پابند نہ ہو جائیں گے، ان پر بھی پورا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے مسلم لیگ کے ارکان کے لیے ضروری اور لازمی ہے کہ وہ دین دار بنیں، اور نماز کی پابندی کریں کہ قرآن نے اسلامی حکومت کا آئیڈیل بھی بتلا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مسلمان بندے وہ ہیں کہ جب ان کو دین پر اقتدار دیا جائے تو وہ نماز قائم کریں، زکوۃ دیں، نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں۔''

آپ کی تقریر کو دہلی کے اخبار ''الامان'' نے بھی شائع کیا۔

رمضان 1356ھ میں ایک شخص بشارت اللہ خان صاحب امروہی نے مولانا تھانوی سے ایک سوال کیا:

''کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ آج کل سہارنپور میں اسمبلی کی ایک نشست کے لیے دو امیدوار کھڑے ہیں۔ ایک مولوی منفعت علی وکیل جن سے جناب خود ذاتی طور پر بھی واقف ہیں، اور دوسرے چوہدری ظفر احمد صاحب جو مولوی صاحب سے قابلیت میں ہر طرح سے کم ہیں۔ اور مولوی صاحب موصوف ہی کی برادری کے ہیں۔ مولوی منفعت علی صاحب مسلم لیگ کی طرف سے کھڑے ہوئے ہیں اور دوسرے صاحب کانگرس کی طرف سے۔ بعض مولوی صاحبان یہ فرماتے ہیں کہ کانگرس کے

امیدوار کو ووٹ دینا ضروری بلکہ واجب ہے، اور نجات اخروی کا مدار بھی کانگرس ہی کے امیدوار کو ووٹ دینے میں بتاتے ہیں، اور مسلم لیگ کو ووٹ دینا ناجائز اور موجب عذاب بتاتے ہیں، لہٰذا سوال یہ ہے

1- جناب کے نزدیک کانگرس کے امیدوار کو ووٹ دینا جائز بھی ہے یا نہیں؟

2- اور کیا مسلم لیگ کے امیدوار کو ووٹ دینا جائز ہے؟

''اور چونکہ مولوی منفعت علی صاحب سے جناب ذاتی طور پر بھی واقف ہیں، اس لیے اگر خلاف مصلحت نہ ہو تو اس سے بھی مطلع فرمائیں کہ آپ مولوی صاحب موصوف کو اسمبلی کی ممبری کے لیے موزوں اور مناسب خیال فرماتے ہیں یا نہیں؟ اگر ایسے دیندار لوگ اسمبلی میں جائیں تو مسلمانوں کی نمائندگی بہت بہتر طریق سے ہو۔ کیا ہمارا یہ خیال صحیح ہے؟ والسلام

الملتمس سید ریاض الحسن وکیل وقاضی محمد حنیف گنگوہی

حضرت تھانویؒ نے اس استفتاء جو جواب ارشاد فرمایا وہ حسب ذیل ہے:

''اس سوال کے دو جزو ہیں۔ ایک عام کہ مسلم لیگ اور کانگرس میں سے کس کے امیدوار کو ممبری کا ووٹ دینا جائز ومفید اور کس کے لیے ناجائز اور مضر۔ دوسرا خاص ایک صاحب کے متعلق کہ ان کو ووٹ دینا میرے نزدیک بہتر ہے یا نہیں؟ سو پہلے جزو کے متعلق تو کانگرس کے حالات کو معلوم ہونا کافی ہے جو یقیناً اس آیت کے مفہوم میں داخل ہے۔

﴿یاایها الذین آمنوا لاتتخذوا بطانة من دونکم لا یألونکم خبالاً، ودوا ما عنتم، قد بدأت البغضاء من افواههم وماتخفی صدورهم اکبر﴾

''اے ایمان والو! نہ ٹھہراؤ بھیدی اپنے غیر کو، وہ کمی نہیں کرتے تمہاری خرابی میں ان کی خوشی ہے، تم جس قدر تکلیف پاؤ، نکلی پڑتی ہے دشمنی ان کی زبان سے، اور جو چھپا ہے ان کے سینوں میں سو وہ اس سے بہت زیادہ ہے۔''

''اس لیے موجودہ حالت میں جزم و یقین کے ساتھ میری رائے ہے کہ جو شخص کانگرس کی موافقت میں ممبری کا ساعی ہے وہ مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں ہو سکتا۔ اور اس کی موافقت اور اس کے لیے سعی کرنے کو میں اہل اسلام کے لیے مضر سمجھتا ہوں۔ رہی مسلم لیگ جماعتی حیثیت سے تو اس میں کوئی وجہ مضرت اور عدم جواز نہیں معلوم ہوتی۔ اب صرف اشخاص کے حالات پر حکم دائر ہوگا۔ پس اگر کوئی شخص دین دار، تجربہ کار اور مسلمانوں کا خیر خواہ مسلم لیگ کی طرف سے ممبری کا امیدوار ہو تو بلاشبہ اس کو ووٹ دینا جائز بلکہ افضل و بہتر ہے۔ اور یہ کہنا کہ کانگرس کو ووٹ دینا موجب ثواب اور مسلم لیگ کو ووٹ دینا موجب عذاب ہے، محض دعویٰ بے دلیل بلکہ خلاف دلیل اور سخت جسارت و بے باکی ہے، جس سے توبہ واجب ہے۔

یہ پہلے جزو کا جواب تھا۔ اور دوسرے کے متعلق یہ جواب ہے کہ مولوی منفعت علی صاحب وکیل سے احقر کو ذاتی واقفیت حاصل ہے۔ وہ ایک دین دار، تجربہ کار، خوش فہم، نیک نیت، قانون دان، مسلمانوں کے سچے خیر خواہ اور ہمدرد مسلمان ہیں، ان کو ووٹ دینا میرے نزدیک ہر طرح افضل و بہتر ہے۔'' **واللہ اعلم وھو المستعان.** (کتبہ اشرف علی عفی عنہ ۲۵ رمضان المبارک ۱۳۵۶ھ)

مولانا تھانویؒ کو کانگرس سے طبعی اور شرعی طور پر ایک نفرت پیدا ہو گئی تھی اور وہ کانگرس میں شمولیت یا اس کے ساتھ کسی قسم کی ہمدردی کو مسلمانوں مہلک اور مضر سمجھتے تھے

چنانچہ 1939ء کو جمعیۃ علمائے ہند کا جو اجلاس دہلی میں ہوا تھا، اس کا دعوت نامہ 26 فروری 1939ء کو حضرت مولانا احمد سعید کے دستخطوں سے حضرت تھانویؒ کی خدمت میں پہنچا۔ اس دعوت نامہ کے ساتھ مولانا احمد سعید کا ایک خط بھی تھا۔ مولانا تھانویؒ نے اس کا خود جواب تحریر کیا۔ اس خط سے بھی حضرت تھانویؒ کا مسلک واضح ہوتا ہے

﴿الجمعیة المرکزیة العلماء الهند، بازار بلی ماراں دہلی نمبر ۲۷﴾

حضرت اقدس زاد اللہ مجدکم

السلام علیکم۔ دعوت نامہ ارسال خدمت ہے۔ اگر سفر کا تحمل نہ ہو تو حضرت کسی کو بطور نمائندہ روانہ فرمادیں۔ معاملات کی نوعیت حضور کے پیش نظر ہے۔

(من یدکم الاحقر الفقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ 26 فروری 1939ھ)

اس خط کے جواب میں حضرت تھانویؒ نے تحریر فرمایا:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ.......... آپ کا دعوت نامہ آیا۔ میرا عذر سفر تو آپ کو معلوم ہی ہے، اس لیے خود تو حاضری سے قاصر ہوں۔ اگر دعوت نامہ کچھ پہلے آتا تو ممکن تھا کہ اس کے متعلق کچھ خط و کتابت کر کے کسی کو بھیجنے کا انتظام کرتا۔ اب عین وقت پر اس کا انتظام بھی مشکل ہے، اس لیے شرعی حیثیت سے صرف اپنی ایک رائے کا اظہار کرتا ہوں جس کے متعلق مولانا کفایت اللہ صاحب سے زبانی گفتگو بھی ہو چکی ہے، اور اب تو واقعات نے مجھ کو اس رائے پر بہت ہی پختہ کر دیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا خصوصاً حضرات علماء کا کانگرس میں شریک ہونا میرے نزدیک مذہباً مہلک ہے بلکہ کانگرس سے بیزاری کا اعلان کر دینا نہایت ضروری ہے۔ علماء کو خود مسلمانوں کی تنظیم کرنا چاہیے تاکہ ان کی تنظیم خالص دینی اصول پر ہو اور مسلمانوں کو کانگرس میں داخل ہونا میرے نزدیک ان کی دینی موت کے مترادف ہے۔ والسلام اشرف علی۔

مسلم لیگ سے چند سوالات:

حکیم الامت مولانا تھانویؒ مسلم لیگ کی اصلاح کے لیے بھی کوشاں رہتے اور اکثر و بیشتر مسلم لیگ کے زعماء سے مختلف قسم کے سوالات کرتے رہتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی کی معرفت مسلم لیگ کے زعماء کو مندرجہ ذیل سوالات لکھوا کر بھیجے۔

1- آپ کے نزدیک کانگرس میں مسلمانوں کی شرکت سیاسی حیثیت سے کیوں مضر ہے اور اس سے علیحدگی کیوں ضروری ہے۔ اکثر لوگ پوچھتے ہیں تم ہم ناواقفیت کے سبب جواب نہیں دے سکتے۔

2- کیا بدون کانگرس کے تعاون کے ہندوستان کو آزادی مل سکتی ہے؟ اگر مل سکتی ہے تو اس کی جو صورت آپ کے ذہن میں ہے، اس کو واضح فرمایا جائے۔

3- کیا کانگرس سے مسلمانوں کی علیحدگی آزادئ ہندوستان کے مسئلہ میں باعث تعویق و تاخیر نہ ہوگی۔

4- کیا مسلم لیگ تمام مسلمانوں کو یا ان کی زیادہ تعداد کو کانگرس میں شمولیت سے روک سکتی ہے؟ بظاہر یہ امر مستبعد ہے۔ کانگرس میں پہلے ہی سے مسلمان بہت ہیں اور جب سے وزارت قبول کر کے وہ برسر اقتدار ہوئی ہے، زیادہ تعداد اس میں شریک ہو رہی ہے۔ پس اگر مسلم لیگ نے تھوڑے سے مسلمانوں کو کانگرس سے روک لیا تو کیا نفع کی امید ہے جب کہ زیادہ حصہ اس میں شریک ہوگا؟

5- کیا مسلم لیگ کے زیادہ تر ارکان انگریزوں کے حامی اور اندرونی طور پر ان کے بہی خواہ ہیں؟ اور کیا بقول سر اکبر حیدری مسلم لیگ ایک برطانوی زہر ہے۔ (اخبار مدینہ بجنور ۱۳ دسمبر ۱۹۳۷ء) اگر نہیں تو اس اعتراض کا اطمینان بخش جواب دیا جائے۔

6- مخالفین کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ مسلم لیگ بے عمل جماعت ہے۔ کانگرس کی طرح اس نے کوئی عملی قدم اب تک نہیں اٹھایا۔ نہ مسلمانوں کے فائدے کے لیے کوئی کام کیا، اور اس وقت کانگرس کے مقابلہ پر جو جدوجہد الیکشن لڑانے میں صرف کر رہی ہے۔ مسلمانوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ انگریزوں کا نفع ہے کہ کانگرس کی قوت کمزور ہو کر آزادئ ہندوستان کا مسئلہ

تعویق میں پڑ جائے۔ اس اعتراض کا کیا حل ہے؟

7- مسلم لیگ نے اب تک مسلمانوں کی تنظیم اور اس کی مذہبی، تمدنی اور اقتصادی ترقی کے لیے کیا طریق عمل اختیار کیا؟ اور اس کے لیے کون سا عملی قدم اٹھایا یا آئندہ کیا ارادہ اور ذہن میں اس کی کیا صورت ہے؟

8- اگر کسی وقت ہر طرح سے اطمینان حاصل کر کے مسلم لیگ کو کانگرس میں شامل ہونے کی ضرورت ہوئی تو کیا مسلم لیگ کو توڑ کر اس میں شامل ہونے کی رائے ہے؟ یا مسلم لیگ کو قائم رکھ کر مسلمانوں کے اقتدار کو برقرار رکھتے ہوئے شرکت کی رائے ہے؟

9- اگر علماء مسلم لیگ کا ممبر بننا چاہیں تو ان کو بھی الیکشن ہی کے ذریعہ مسلم لیگ کا کوئی حق حاصل ہوگا جس سے ان کو مسلم لیگ کے اجلاس اور مجلس عامہ وغیرہ میں اپنی رائے پیش کرنے کا حق ہو، یا اگر وہ اس ذریعہ کو پسند نہ کریں تو ان کو بدون اس ذریعہ کے بھی ایسا درجہ مل سکے گا۔

10- مسلم لیگ میں علماء کی وقعت کس درجہ کی ہوگی اور بصورت اختلاف علماء کے کسی مسئلہ مختلف فیہا کو کس طرح طے کیا جائے گا؟ کیا اس کے لیے کوئی قاعدہ ذہن میں ہے؟

11- جمعیت علمائے ہند، دہلی اور مسلم لیگ کے تصادم سے جو مسلمانوں میں تشتت و افتراق پیدا ہو رہا ہے، مسلم لیگ نے اس کے ضرر کو محسوس کیا ہے یا نہیں؟ اگر کیا ہے تو اس ضرر کے انسداد کی کوئی صورت باہمی اتفاق کی سوچی ہے یا سوچنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟

12- مسلم لیگ نے اچھوت قوموں میں تبلیغ اسلام کی ضرورت کو محسوس کیا ہے یا نہیں؟ (جو نہ صرف مذہباً بلکہ سیاستاً بھی نہایت اہم ہے) اگر کیا ہے تو اس کے لیے عملی قدم اٹھایا گیا ہے یا نہیں؟ اور اس کا نتیجہ کیا ظاہر ہوا؟ اگر اب تک نہیں کیا تو آئندہ کیا رائے ہے۔

جوابات زعمائے مسلم لیگ کی طرف سے:

حضرت تھانویؒ کے ان بارہ سوالات کے جوابات زعمائے مسلم لیگ یعنی نواب محمد اسماعیل خان صاحب، ایم اے بیرسٹر صدر مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ، سید حسن ریاض صاحب اور دیگر اراکین کے باہمی مشورہ سے 25 دسمبر 1937 کو حسب ذیل دیئے گئے۔

1- بحث یہ ہے کہ مسلمان اجتماعی حیثیت سے کانگرس کے ساتھ تعاون کرے یا انفرادی حیثیت سے کانگرس میں داخل ہو جائیں۔ ہمارے خیال میں سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کی انفرادی شرکت اس لیے مضر ہے کہ مسلمان اقلیت میں ہونے کی وجہ سے کانگرس میں ہمیشہ اس قدر کم تعداد میں رہیں گے کہ کانگرس کے مسلک اور عمل پر ان کی رائے کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ نیز مسلمان ارکان کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے مسلمان آل انڈیا کانگرس کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی میں کانگرس کے واقعی بااختیار ادارے میں شاذ و نادر ہی منتخب ہو سکیں گے۔ کانگرس کی ان دونوں بااختیار کمیٹیوں میں اس وقت تک مسلمانوں کا جو تناسب رہا ہے، اس سے یہ اچھی طرح ثابت ہو رہا ہے کہ یہ اندیشہ بالکل صحیح اور درست ہے۔ غالباً آل انڈیا کانگرس ورکنگ کمیٹی کے 21 ارکان میں سے صرف دو مسلمان ہیں، اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے قریباً تین سو ارکان میں سے سات یا آٹھ مسلمان ہیں۔ انتخاب مخلوط نشستوں کا یقین نہیں۔ کانگرس میں ہندو ووٹروں کی تعداد زیادہ۔ اس صورت میں کبھی توقع نہیں کی جا سکتی کہ مسلمان بااختیار کمیٹیوں میں اتنے ہو سکیں گے کہ وہ کانگرس کے فیصلوں اور طرز عمل پر کوئی اثر ڈال سکیں۔ اس سلسلہ میں کانگرسی خیال کے مسلمان کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ کثیر تعداد میں کانگرس کے ممبر بنیں اور اس طرح کانگرس پر قبضہ کر لیں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ ہندو مسلمانوں کے مقابلہ میں باعتبار تعداد میں آگے ہیں اور ہندو عورتیں بھی کانگرس کی ممبر بنتی ہیں اور اس میں شریک ہوتی ہیں۔ مسلمان عورتیں اگر ممبر

بھی بن جائیں تو پردے کی وجہ سے شریک نہیں ہوسکتیں۔ مسلمان زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ اپنی ساری آبادی کو کانگرس کا ممبر بنوا دیں۔ ہندو بھی یہی کریں گے۔ اس صورت میں ہندو مرد اور عورتیں مل کر مسلمان مرد ممبروں سے قریباً پانچ گناہ ہو جائیں گے، اور کانگرس کی ہر کمیٹی کا فیصلہ انہیں کی رائے پر منحصر ہوگا۔ مسلمان کبھی یہ توقع نہیں کر سکتے کہ ان کی کوئی تجویز کانگرس میں منظور ہو سکے گی۔ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ ان چار صوبوں کی کانگرس میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے یعنی صوبہ سرحد، پنجاب، سندھ اور بنگال، کی ہر کمیٹی میں مسلمانوں کی اکثریت رہے گی۔ یہ ٹھیک ہے مگر دشواری یہ ہے کہ کانگرس کے نظام میں دونوں کو موجودہ انگریزی نظام حکومت کی صوبجاتی خود اختیاری حاصل نہیں ہے۔ کانگرس اسی وجہ سے یہ چاروں صوبوں میں مسلمانوں کو با اختیار اکثریت نہ ہو، صوبجاتی خود اختیاری کے خلاف ہے اور مرکزی وحدانی طرز انتظام پر مصر ہے۔ کامل آزادی کے مسلک میں متفق نہ ہونے کے باوجود مسلمانوں اور کانگرس کے درمیان یہ مسلسل اختلاف رہا ہے۔ مسلمان اپنی اکثریت کے صوبوں میں جو بات طے کریں گے وہ مرکزی وحدانی طرز حکومت ہونے کی صورت میں کانگرس یعنی آل انڈیا کانگرس کے اجلاس کانگرس کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی میں نامنظور ہو جائیں گی جہاں مسلمان ارکان کا تناسب چوتھائی سے زیادہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ اگر مسلمان اس طرح کانگرس میں شریک ہو گئے تو ان کی یہ حیثیت ہوگی کہ ان کی موجودگی میں ان کے مفاد کے خلاف فیصلے ہوں گے اور آئینی اصول کے مطابق ان کو اکثریت کے فیصلوں کو ماننا پڑے گا، اور اس کے باوجود کہ وہ سکوت کریں یا اختلاف کریں وہ ان مخالف فیصلوں کے ذمہ دار تصور کیے جائیں گے، اور کانگرس کے باہر بھی ان کو اختلاف کا کوئی حق نہ رہے گا۔ لیکن اگر مسلم لیگ کے ماتحت اپنی علیحدہ سیاسی تنظیم کریں تو وہ ہندوستان میں ایک دوسری طاقت ہوں گے جو تعداد کے اعتبار سے اگرچہ کم ہو مگر دوسری حیثیتوں سے اکثریت کے مقابلہ

میں زیادہ طاقتور ہو سکتی ہے۔ یقیناً ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد اور اشتراک کے بغیر ہندوستان کا آزاد ہونا بظاہر ممکن نہیں، لیکن یہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا مشترکہ مفاد اور مقصد ہے، لہٰذا مسلمانوں کو ہندوؤں سے ملنے کی جتنی طلب ہے اتنی ہی ہندوؤں کو بھی ہونی چاہیے، لہٰذا اگر کانگرس اخلاص کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کی طالب ہو تو اس کو مسلم لیگ کے جائز مطالبات طے کرنے پڑیں گے، اور ہر اہم معاملہ میں مسلمانوں سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہو گی۔ انفرادی حیثیت سے کانگرس میں شرکت سے مسلم اقلیت ہندو اکثریت میں گم ہو جاتی ہے اور جداگانہ تنظیم کی صورت میں مسلمانوں کی اجتماعی قومی انفرادیت قائم رہتی ہے۔ کانگرس میں شریک ہو کر مسلمان جو بات کہیں وہ اکثریت کی طاقتور آواز سے دب جائے گی، اور جو بات مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے کہیں وہ جداگانہ ہونے کی وجہ سے ساری دنیا میں سنی جائے گی۔ کانگرس میں شریک ہو کر مسلمان اپنے خاص مفاد کے لیے کوئی جداگانہ عمل نہ کر سکیں گے، اور جداگانہ اسلامی تنظیم کے ماتحت ہر عمل ان کے اختیار میں ہو گا۔

-2 کانگرس کے تعاون کے بغیر یا دوسرے لفظوں میں ہندوؤں کے تعاون کے بغیر مسلمان یقیناً ہندوستان کو آزاد نہیں کرا سکتے، لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ کانگرس کا تعاون انہیں شرائط پر حاصل کیا جائے جو کانگرس پیش کرے یعنی ہر مسلمان چار آنہ کا ابتدائی ممبر بنے اور انفرادی حیثیت سے بلا مسلم فساد کے تحفظ کی شرائط منوائے ہوئے کانگرس میں داخل ہو کر اپنی اسلامی حیثیت کو گم کر دے اور محض ہندوستانی رہ جائے۔ اس طرح کیوں نہ ہو کہ مسلمان مسلم لیگ کے تحت اپنی تنظیم کریں اور مسلمانوں کی انجمن مسلم لیگ اور ہندوؤں کی انجمن کانگرس کے درمیان تمام مشترکہ مفاد کے حصول کے لیے اور نیز آزادی حاصل کرنے کے لیے بشرائط اس قسم کے معاہدہ اتحاد ہو جیسا دو حلیف قوموں کے درمیان ہوتا ہے۔ اہم معاملات کے تصفیہ کے لیے کانگرس کی مجلس عاملہ

اور مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے اجلاس ہوں اور ان اجلاسوں میں جو فیصلے ہوں، ان پر دونوں انجمنیں اور دونوں قومیں کاربند ہوں۔ کیا انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اپنی اپنی قومی انفرادیت کو مٹائے بغیر جرمنوں کے خلاف جنگ نہیں کی۔ کانگرس کا تعاون حاصل کرنے کی دوسری اور مسلمانوں کے حق میں بہتر صورت ہے۔ اگر مسلمان مسلم لیگ کو مستحکم اور مضبوط کر لیں اور کانگرس میں شریک نہ ہوں تو یقیناً کانگرس اس طریقہ پر مسلمانوں سے اتحاد کرنے پر مجبور ہوگی۔

3- کانگرس میں مدغم ہونے کے بعد جب مسلمان یہ دیکھیں گے کہ ان کی رائے اور آواز بے اثر ہے اور وہ اپنے قومی مفاد کے خلاف ہندوؤں کے پیچھے پیچھے چلنے پر مجبور ہیں، تو آزادی حاصل کرنے کا جذبہ ان کے دلوں میں سرد ہو جائے گا اور آزادی کی تحریک بعد جنگ مسلمانوں کی ہمت اور عمل سے اسی طرح محروم ہو جائے گی جس طرح کہ انگریزی حکومت ہندوستان کے تحفظ کے لیے جنگوں میں ہندوستانیوں کے طبعی جوش، مدافعت وطن اور جوش ملک گیری سے محروم ہے، اور صرف روپیہ دے کر ان کو لڑنے پر آمادہ کرتی ہے، لہٰذا اس طرح حصول آزادی میں تعویق اور تاخیر زیادہ ہوگی، لیکن اگر مسلم لیگ میں مسلمان رہے اور کانگرس میں ہندو رہے اور دونوں کے درمیان اس طرح اتحاد قائم ہو جیسا کہ دونوں کے درمیان ہوتا ہے، اور مسلمانوں کو اس کا اطمینان ہو گیا کہ ان کی اسلامیت اور قومی انفرادیت محفوظ ہے اور آزاد ہندوستان میں وہ بھی ایک آزاد قوم کی حیثیت سے رہیں گے تو مسلمان اپنے مفاد کے لیے اور ہندو اپنے مفاد کے لیے حلیفوں کی حیثیت سے خالص وطنی آزادی کے جذبہ میں جنگ کریں گے۔ یہ جنگ جس قسم کی بھی ہو زیادہ طاقتور ہوگی اور اس سے آزادی جلد حاصل ہو سکے گی۔

4- یقیناً مسلم لیگ مسلمانوں کو کانگرس میں شریک ہونے سے روک سکتی ہے اور اس کے باوجود کہ کانگرس برسر اقتدار اور اس کی وزارت قائم ہے، تجربہ سے

ظاہر ہو گیا ہے کہ کانگرس کی حکومت قائم تھی۔ مسلم لیگ نے کانگرس کے مقابلہ میں پانچ الیکشن لڑے، ان میں سے چار میں مسلم لیگ کامیاب ہوئی اور صرف ایک بجنور میں ناکامی ہوئی۔ اس ناکامی کی وجہ بھی حافظ ابراہیم صاحب کا ذاتی اثر اور مسلم لیگ کے کام کرنے کی کم مہلت تھی۔ نیز یہ کہ ابھی تک مسلم لیگ کی تنظیم مکمل اور طاقتور بھی نہیں ہے۔ پھر تاریخی تجربہ یہ بھی بتا رہا ہے کہ اقوام کی اکثریت اپنے مفاد اور وجود کے تحفظ کے حق میں رہتی ہے۔ حکومت کے مؤید صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے مفاد براہ راست حکومت سے وابستہ ہوں، مثال کے طور پر کانگرس کی سابقہ تحریکات کو لے لیجئے۔ انگریزوں کی حکومت قائم تھی۔ ہزار ہا ہندو ملازم سرکار تھے، زمیندار، خطاب یافتہ اور ٹھیکدار اور اجارہ دار وغیرہ تھے، مگر قوم کی آواز وہی سمجھی گئی جو کانگرس کے پلیٹ فارم سے بلند ہوئی۔ حکومت کے مؤید ہندوؤں یا ہندوستانیوں کی تائید ہندوستانیوں یا ہندو قوم کی تائید نہیں سمجھی گئی، لہٰذا جو لوگ ذاتی اغراض کے لیے یا کانگرس کے اقتدار سے مرعوب ہو کر مسلم مفاد کے خلاف کانگرس میں شریک ہوں گے وہ بھی انگریزی حکومت کے پرستار ہندوؤں کی طرح بے اثر ہو کر رہ جائیں گے۔ نیز یہ کہ جب مسلم لیگ کا نظام مضبوط ہو جائے گا اور یہ ناممکن ہو جائے گا کہ کوئی مسلمان انفرادی حیثیت سے کانگرس کی طرف سے کھڑا ہو کر مجالس واضعانِ قانون کا ممبر منتخب ہو سکے اور مسلم رائے عامہ کانگرس کا ممبر ہونا عیب اور مسلم لیگ کا ممبر ہونا اچھا سمجھنے لگے گی تو مسلمان کانگرس کا ممبر بننا پسند نہ کرے گا اور اس طرح مسلم لیگ مسلمانوں کو کانگرس میں جانے سے روک دے گی۔ اور بالفرض اگر کوئی چھوٹی سی بے اثر جماعت کانگرس میں رہی بھی تو کانگرس کی نظر میں اس کی کوئی وقعت نہ ہو گی۔ چنانچہ 1929ء سے 1935ء تک یہی ہوا۔ کانگرس ہندوؤں اور مسلمانوں کے فرقہ وارانہ معاملات کے متعلق کانگرسی مسلمانوں سے کوئی گفتگو نہیں کرتی تھی بلکہ ہر معاملہ میں ان کو نظر انداز کر کے کانگرس کو مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس سے رجوع کرنا پڑتا تھا۔

آخر میں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ کانگرس میں مسلمانوں کی بڑی تعداد ہرگز شریک نہیں۔ اس قسم کے تمام اعلانات جھوٹے اور بے بنیاد ہیں۔ بعض چند افراد ہیں جو کانگرس میں شریک ہیں۔

-5 اکتوبر 1937ء سے مسلم لیگ میں مکمل انقلاب ہوا۔ کامل ذمہ وار حکومت کے بجائے پورا استقلال یا پوری خودمختاری مطمح نظر قرار پایا ہے۔ محدود رکنیت کی جگہ دو جنس کی شرط پر رکنیت عام کی گئی ہے۔ گویا اب مسلم لیگ کانگرس سے زیادہ جمہوری انجمن ہے۔ ابتداء سے انتہا تک جتنی کمیٹیاں بنیں گی اور جتنے عہدے دیئے جائیں گے، وہ انتخاب کے ذریعہ ہوں گے۔ اس صورت میں انگریزوں کے خوشامدیوں کے دخل کا مسلم لیگ میں کوئی امکان نہیں، لیکن بالفرض اگر تمام مسلمان انگریزوں کے حامی واقع ہوئے ہیں، اور وہ ایسے لوگوں ہی کو منتخب کرنا چاہتے ہیں جو انگریزوں کے حامی ہیں تو ان کو کون روک سکتا ہے، مگر یہ واقعہ کے خلاف ہے۔ مسلم لیگ کے تمام موجود ارکان کی رکنیت کی معیاد فروری میں ختم ہو جائے گی۔ نئے انتخابات ہر امیر وغریب کو ممبر بننے کے وقت اس عہد نامہ پر دستخط کرنا پڑیں گے کہ وہ کامل آزادی کا طالب ہے، اس کے بعد وہ انتخاب میں آئے گا۔ اس کے بعد بھی اگر وہ منافقت کرے اور دل میں انگریزوں کا حامی رہے تو اس پر کسی کو قابو نہیں جیسے کوئی شخص توحید و رسالت وغیرہ کا اقرار کرے ہم اس کو مسلمان ماننے پر مجبور ہیں۔ اس کے دل میں کیا ہے اس پر سوال کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ اس طرح کے منافق لوگ خود کانگرس میں بھی موجود ہیں اور کانگرس ان کو اندر آنے سے نہیں روک سکتی۔ سر اکبر حیدری نے مسلم لیگ کو جو برطانوی زہر کہا ہے، اس کے معنی بالکل اور ہیں۔ کیا سر اکبر حیدری نے حیدر آباد میں کانگرس قائم کرنے کی اجازت دے دی ہے، اور کیا وہ کانگرس کو تریاق سمجھتے ہیں۔ ہر ہندوستانی ریاست سیاسی تحریکات کو اپنے حدود کے اندر داخل ہونے سے روکتی ہے خواہ وہ قومی ہو یا فرقہ وارانہ۔ صاف بات ہے حیدر آباد میں مسلمانوں کو

سیاسی استیلا حاصل ہے۔ وہاں مسلمانوں کے حقوق، مفاد اور آزادی آخری خطرہ میں نہیں۔ حکومت انجمن سے کہیں زیادہ طاقتور ہوئی ہے۔ حیدر آباد میں مسلم حکومت موجود ہے۔ اس صورت میں یقیناً وہاں مسلم لیگ کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور اگر حیدر آباد میں مسلم لیگ قائم کی جائے گی تو وہ بجائے سیاسی انجمن کے خالص فرقہ وارانہ انجمن بن کر رہ جائے گی جو حکومت اور ہندوؤں کے درمیان تصادم کا باعث ہوگی۔

6- غلط ہے کہ مسلم لیگ بے عمل جماعت ہے۔ مسلم لیگ ابتداء یعنی 1907ء میں اس غرض سے قائم ہوئی تھی کہ برطانیہ سے ہندوستان کو جو مراعات ملیں، ان میں سے مسلمانوں کو پورا حصہ دلائے۔ نیز مزید مراعات حاصل کرنے میں اکثریت کے ساتھ تعاون کرے۔ چنانچہ اس نے یہ کیا کہ کانگرس نے ہندوستان کے لیے سیاسی اختیارات حاصل کرنے کی جب کوئی تحریک شروع کی، مسلم لیگ نے اس کی تائید کی۔ مسلم لیگ اور کانگرس کے متحدہ مطالبہ پر مانٹگو چیمسفورڈ اصطلاحات ہندوستانیوں کو دی گئی، اور مسلم لیگ کے ذریعہ مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو محسوس کر کے کانگرس 1916ء میں فرقہ وارانہ معاملات میں مسلم لیگ سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہوئی جو 1935ء تک بلا تغیر جاری رہا۔ چونکہ مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد ابتداءً محض ہندوستان کے اندرونی سیاسی امور تک محدود تھے، اس لیے جب جنگ عظیم ہوئی اور خلافت اور اماکن مقدسہ کا مسئلہ سامنے آیا تو انہیں مسلمانوں نے جو مسلم لیگ کے بانی اور رکن تھے خلافت کمیٹی قائم کی۔ خلافت کمیٹی نے جو کچھ کیا اس سے دنیا واقف ہے۔ عملاً اگر غور سے دیکھا جائے تو خلافت کمیٹی حقیقت میں مسلم لیگ کا شعبہ امور خارجہ تھا۔ 1929ء سے جب نہرو رپورٹ کا فتنہ اٹھا، نئے دستور موسومہ قانون حکومت ہند 1935ء کے بننے تک مسلم لیگ نے ہندوستان کے سیاسی اختیار کی ترقی اور اس میں مسلمانوں کے حق کے تعین میں جو کچھ کیا اس قانون کے اندر موجود ہے۔ البتہ یہ صحیح کہ مسلم لیگ نے کانگرس کے ساتھ

مل کر قانون کی خلاف ورزی (Disobedience) نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے معاملہ میں کانگرس نے مسلم لیگ کو اطمینان نہیں دلایا تھا بلکہ مسلمانوں کے علی الرغم سول نامتابعت شروع کر دی۔ کانگرس کی یہ سول نامتابعت کس مقصد کے لیے تھی، یہ مسئلہ اختلافی ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ یہ کامل آزادی حاصل کرنے کے لیے کی گئی تھی، مگر یہ غلط ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب وائسرائے نے نہرو رپورٹ منظور کرنے سے انکار کر دیا جو مسلمانوں کے مفاد کے لیے سخت مضر تھی تو کانگرس نے اس ضد میں سول نافرمانی شروع کر دی۔ مسلمان اس سول نافرمانی کو اپنے خلاف ہندوؤں کی طرف سے اس بات کا مظاہرہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں اصل طاقت ہندوؤں کی ہے اور ہندو قابل اعتبار بھی نہیں ہوتا، اور مسلمانوں کا یہ خیال صحیح تھا، چنانچہ ثبوت میں پنڈت جواہر لعل نہرو کا یہ متکبرانہ قول پیش کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں صرف دو طاقتیں ہیں: ایک کانگرس اور دوسری برطانوی حکومت۔ نیز یہ کہ مسلم لیگ جو کانگرس سے الیکشن لڑ رہی ہے، اس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مخلصین کی طرف سے مسلم لیگ پر ایک بے مغز اعتراض ہے کہ اگر یہ عہد ے لے کر مجلس واضعان قانون کا ممبر منتخب کرنا مسلمانوں کے لیے مفید نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے حقوق و مفاد کا تحفظ کرے گا جن کے وہ آئین مروجہ کی رو سے مستحق ہیں جو تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمانوں کو مجالس واضعان قانون (قانون ساز اسمبلی) میں بھیجنا ہی مسلمانوں کے حق میں مفید نہیں۔ مسلم لیگ صرف اس غرض کے لیے الیکشن میں جدوجہد کر رہی ہے کہ صرف ان لوگوں کو اسمبلی میں بھیجے جو قانون کے سیاسی اختیار کی ترقی کے ساتھ مسلمانوں کے مذہبی، تمدنی اور سیاسی حقوق کی پوری حفاظت کریں۔ اس کے برخلاف ان مسلمانوں کو کونسل میں بھیجنا چاہتی ہے جو خاص مسلم حقوق کے تحفظ کے خلاف کانگرس کی اطاعت کریں۔ اگر یہ بات کہ مسلمان کسی عہد کے ساتھ قانون ساز اسمبلیوں میں جائیں، اس قدر

غیر اہم ہے کہ اس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تو کانگرس اپنے قدیم دستور کے خلاف اس مرتبہ الیکشن لڑانے میں اس قدر کیوں مصر ہے کہ اس کو کمزور ہونا منظور اور کمزور ہو کر آزادی ہندوستان کی تحریک کو تعویق میں ڈالنا منظور، مگر مسلم لیگ کے مقابلہ میں الیکشن لڑانا ضرور۔ واضح رہے کہ اس معاملہ میں کانگرس کا عمل جارحانہ ہے یا کہ مسلم لیگ کا۔

اس اعتراض کا صرف حل یہ ہے کہ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کا مطمح نظر کامل آزادی، مفاد عامہ کے کاموں میں مسلم لیگ کی پارٹی کانگرس کی کوئی مخالفت نہیں کرتی، البتہ مسلم اقلیت کے حقوق و مفاد کا تحفظ اس کا رضائی عمل ہے، لہٰذا کانگرس کو مسلم لیگ کے مقابلہ میں کوئی الیکشن نہ لڑنا چاہیے۔ پھر نہ وہ کمزور ہوگی اور نہ آزادی کی تحریک (اگر کہیں اس کا وجود ہے) تعویق میں پڑے گی۔

7- مسلم لیگ نے 17 اکتوبر 1937ء سے قبل ہندو اکثریت کے اپنے جارحانہ اقدامات کے مقابلہ میں مدافعت کر کے مسلمانوں کو دینی، مذہبی، اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی تنظیم کی حفاظت کی ہے۔ اکتوبر 1937ء سے اس کا نیا دور شروع ہوا ہے۔ اب وہ عام مسلمانوں کو مسلم لیگ کی تنظیم میں داخل کر کے مسلمانوں کے اجتماعی اور سیاسی خلفشار کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ رائے عامہ کی تربیت کر کے ہندوستان کے مسلمانوں کو آزادی کامل اور آزاد ہندوستان میں مسلم اور دوسری اقلیتوں کے لیے جمہوری تحفظ یعنی اکثریت کے فرقہ وارانہ جبر و استبداد کے امکان کے انسداد کے مقصد پر ہم خیال کرنا چاہتی ہے، اور ان مقاصد کے حصول کے لیے جس طاقت کی ضرورت ہے وہ تنظیم کے ذریعہ پیدا کر رہی ہے، اسی غرض کے لیے ہر ہر شہر قصبے اور موضع میں مسلم لیگ قائم کی جا رہی ہے۔ ہر خاص و عام مسلمان اس کا رکن بنایا جا رہا ہے۔ نوجوانوں کی ایک بہت بڑی جمعیت بھرتی کی جا رہی ہے۔ اقتصادی خوشحالی کے لیے مسلمان دست کاروں کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزوں کے رواج کی کوشش ہے، سود منسوخ کرانا مدّنظر ہے اور مسلم لیگ کا جو ارادہ ہے وہ اس کے سالانہ

اجلاس کی قراردادوں سے مفصل معلوم ہوگا۔

8- اگر کانگرس سے سمجھوتہ ہوگیا اور اکثریت کے جبر و استبداد کا کوئی خطرہ نہ رہا۔ مسلم لیگ اس وقت بھی قائم رہے گی، اور اشتراک عمل مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان ہوگا۔ مسلمان منتشر ہوکر کانگرس میں کبھی شریک نہ ہوں گے۔ مسلم لیگ کی یہ قطعی رائے ہے۔

9- اگر علماء مسلم لیگ کے ممبر بننا چاہیں تو ان کو الیکشن کے ذریعہ مسلم لیگ کی بااختیار کمیٹیوں میں آنے سے گریز کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ یہ تو بہترین صورت ہے، لیکن خاص حالات میں بہت سے مقتدر علماء کے لیے جو الیکشن کے ذریعہ نہ آسکیں، ایک صورت اور بھی ہے جس کو انگریزی میں کوآپشن (Coaption) کہتے ہیں یعنی بطریق اضافہ آسکتے ہیں۔

10- مسلم لیگ میں دینی امور کے متعلق علماء کی رائے کو وہی وقعت حاصل ہوگی جو اب مسلمانوں میں ان کی رائے کو حاصل رہی ہے۔ ان معاملات میں اگر علماء کے درمیان کوئی اختلاف ہو تو اس کے لیے وہی طریقہ اختیار کیا جائے گا جو قرآن وحدیث کی رو سے صحیح ہو۔

11- یقیناً مسلم لیگ نے جمعیۃ العلماء اور مسلم لیگ کے تصادم کو ضرور محسوس کیا ہے اور اس کے انسداد کی اس کے ذہن میں یہ صورت ہے کہ جمعیۃ العلماء اور مسلم لیگ کے درمیان تقسیم عمل ہو جائے یعنی خالص دینی امور کا انصرام جمعیۃ العلماء اپنے ذمہ لے لے، اور مذہبی، تمدنی، سیاسی اور دوسرے شعبہ ہائے حیات کے انصرام میں شرکت کے لیے حضرات علماء مسلم لیگ میں بحیثیت مسلمان شریک رہیں۔

12- بے شک راجپوتوں اور غیر مسلموں میں تبلیغ اسلام مسلم لیگ کے نزدیک ایک اہم فریضہ ہے اور سیاسی حیثیت سے بھی یہ بہت ضروری ہے، مگر اس اہم اسلامی خدمت کے اہل صرف حضرات علماء ہیں۔ بدنصیبی سے مسلم لیگ کو ان کا پورا تعاون حاصل نہیں رہا ہے، اس لیے وہ اس خدمت سے قاصر رہی

ہے۔ اگر علماء اس کام کو شروع کریں تو مسلم لیگ ان کے ساتھ پورا تعاون کرے گی۔

حضرت تھانویؒ کی طرف سے 12 سوالات کی ایک فہرست اور زعمائے لیگ کی طرف سے ان کے جوابات ہم نے اس لیے نقل کیے تا کہ پتہ چل جائے کہ مولانا تھانویؒ نے صرف اس لیے مسلم لیگ کی حمایت نہیں کی تھی کہ اس کے نام میں ''مسلم'' کا لفظ آتا تھا بلکہ آپ نے مختلف سوالات کر کے مسلم لیگ کے نصب العین اور اس کے طریق کار اور نظریہ کی تحقیق کرنے کی حتیٰ الامکان پوری کوشش کر لی۔ چنانچہ اس بارے میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے حضرت تھانویؒ کے وہ تمام سوالات، مضامین اور مقالات اپنے ایک 98 صفحات پر مشتمل رسالہ ''افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ'' میں جمع کر دیئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مسلم لیگ کے وڈیروں نے اپنے جوابات میں مغالطہ سے کام لیا ہے۔ علاوہ ازیں پاکستان بن جانے کے بعد مسلم لیگ کے زعماء اپنے ان تمام وعدوں سے منحرف ہو گئے جو انہوں نے تحریک آزادی وطن کے دوران مسلم امت سے کیے تھے۔ ایک طرف تو 14 اگست کو قائداعظم نے پاکستانی علم لہرانے کے لیے شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کے ہاتھوں کو ترجیح دی۔ کراچی میں حضرت مولانا شبیر احمد نے اور ڈھاکہ میں حضرت مولانا ظفر احمد صاحب نے پاکستانی علم فضا میں لہرا کر پاکستانی حکومت کے قیام کا افتتاح فرمایا، لیکن بعد میں جب ان بزرگوں اور حضرت تھانویؒ متبعین کے یعنی حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ، خطیب پاکستان حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی وغیرہ نے پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ کیا تو اس مطالبہ کو لیاقت علی خان سے لے کر آج تک کے صاحبانِ اقتدار ٹالتے چلے آ رہے ہیں اور نوجوان نسل میں بے دینی والحاد کے نظریات کی آبیاری کر کے یہ کوشش کر رہے ہیں کہ اسلامی نظام کا مطالبہ کرنے والا ہی کوئی نہ رہے۔ الیکٹرانک میڈیا، پرنٹ میڈیا اور دوسرے تمام ذرائع سے نوجوان نسل کے اندر کانوں، آنکھوں اور دوسرے حواس کے ذریعہ سے الحاد و زندقہ کے جراثیم ٹھونسے جا رہے ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے پاکستان بننے سے قبل لوگوں سے اسے اسلامی ریاست بنانے کا وعدہ

کیا تھا اور اس اسلام کے نام پر ہی ان علمائے کرام کے کہنے پر ان لوگوں نے بھی مسلم لیگ کو ووٹ دیئے جن کو یقین تھا کہ ہمارا علاقہ پاکستان میں نہیں آئے گا۔ 10 اگست 1947ء کو متحدہ ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ہدایت پر ایک اجلاس منعقد کیا گیا تاکہ دستور ساز اسمبلی کے افراد منتخب کیے جاسکیں جو قیام پاکستان کے بعد پاکستان کا آئین اور دستور مرتب کریں گے۔ ان دستور ساز اسمبلی کے افراد میں ان حضرات کو نہیں لیا گیا جو مسلم اقلیت کے علاقوں سے الیکشن (1946ء) میں کامیاب ہوئے تھے جیسے لیاقت علی خاں (جو ضلع مظفر نگر سے کامیاب ہوئے تھے) شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ (جو سہارنپور سے کامیاب ہوئے تھے) اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی جو دہلی سے کامیاب ہوئے تھے۔ اس طرح یہ حضرات دستور ساز اسمبلی کے رکن بننے سے رہ گئے۔ صرف قائداعظم، خواجہ ناظم الدین، سردار عبدالرب نشتر اور غالباً راجہ غضنفر علی بھی اور مسٹر جوگندر ناتھ منڈل دستور ساز اسمبلی کے اراکین منتخب ہوئے۔ چونکہ دستور ساز اسمبلی کا چیئرمین ایک ہندو جوگندر ناتھ منڈل کو بنایا گیا تھا، اس لیے اس اجلاس کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے نہ ہو سکا۔ اس اجلاس میں یہ بھی فیصلہ ہوا کہ پاکستان کے مستقل آئین اور دستور بننے تک امور مملکت گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے تحت چلائے جائیں گے۔ چنانچہ قیام پاکستان کے بعد اسی کے مطابق امور سلطنت چلائے گئے (جس کے اثرات اب تک پاکستان میں موجود ہیں) پاکستان کے قیام کے بعد اسلام کے ساتھ ان لوگوں نے کیا کچھ کیا اس کا تذکرہ اس کتاب کے آخر میں اجمالی طور پر بیان کیا جائے گا۔ اور آج تو ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ پاکستان امریکہ کی ریاستوں میں سے ایک ریاست محسوس ہو رہی ہیں۔

حضرت شیخ الہند کا نظریہ:

بعض حضرات کی طرف سے حضرت تھانویؒ پر یہ اعتراض ہوتا کہ آپ تو کانگرس کے ساتھ اشتراک عمل کو درست نہیں سمجھتے لیکن آپ کے استاد بلکہ تحریک استخلاص وطن کے سب سے بڑے قائد حضرت شیخ الہندؒ کانگرس کے ساتھ اشتراک عمل کو

جائز سمجھتے تھے۔ اس کے جواب میں حضرت تھانویؒ فرماتے کہ تحریک خلافت کے ابتدائی دور میں کانگرس کے ساتھ اشتراک عمل جس میں حضرت شیخ الہندؒ کی مشروط تائید شامل رہی ہے، اپنی اصل اور بنیاد کے اعتبار سے حدودِ شرعیہ کے مطابق جائز اور صحیح تھا، اسی لیے اس وقت علمائے حق میں سے کسی نے اصل مسئلہ میں اختلاف نہیں کیا اور جن افعال پر کسی نے خدشات وخطرات کا اظہار کیا، وہ ایسے افعال تھے کہ جن پر خود حضرت شیخ الہند نے شدت کے ساتھ نکیر فرمایا ہے جیسا کہ آپ کے خطبۂ صدارت کے حوالہ سے گذشتہ صفحات میں بتایا جا چکا ہے۔ چنانچہ مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا (شیخ الہند) کا اشتراک مصالحت ھ نہ کہ مطابقت یعنی اس وقت تحریک خلافت نہایت قوت پر تھی جس سے حضرت مولانا کو توی امید تھی کہ حکم اسلام کا غالب ہوگا، اور ہم لوگوں کا خیال آئین ووجدان سے اس کا عکس تھا۔ سو یہ اختلاف محض رائے کا اختلاف تھا اور مثل اختلاف حنفی اور شافعی کے اجتہادی تھا۔ اس اشتراک میں متابعت کے شائبہ کا وہم بھی نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی وقت کسی شعار اسلامی کے ضعف یا کسی شعائر کفر کی قوت کا اندیشہ ہوتا تھا تو فوراً اس پر نکیر شدید فرماتے تھے'' (بوادر النوادر: ص ۹۶٦)

آپ کے اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ تحریک خلافت کے زمانہ میں کانگرس کے ساتھ مسلمانوں کا اشتراک عمل مصالحت کی جائز صورت میں تھا اور اسی جائز صورت پر حضرت شیخ الہندؒ کا عمل تھا جس سے اصولی طور پر حضرت تھانویؒ کو اختلاف نہ تھا، البتہ آپ کی سیاسی بصیرت یہ بتا رہی تھی کہ اس اشتراک کے عواقب ونتائج بھی مسلمانوں کے حق میں کچھ مفید ثابت نہ ہوں گے بلکہ معاملہ برعکس ہوگا۔ چنانچہ مولانا تھانویؒ کے خدشات درست ثابت ہوئے اور کانگرس کے اشتراک عمل کے نتیجہ میں اسلام غالب نہ آسکا اور مسلمانوں کی آواز ہندوؤں کی عددی اکثریت کے نیچے دب کر رہ گئی۔

پھر کانگرس میں ایک انقلاب یہ بھی آیا کہ انہوں نے کانگرس کو خالص ہندو ذہنیت اور ہندوانہ خیالات کی بنیاد پر اٹھایا اور یہ اصول بنا دیا کہ کانگرس میں داخل ہونے

والا ہر شخص انفرادی اور شخصی حیثیت سے داخل ہو، جماعت کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے داخل نہ ہو۔ اس انقلاب کا منشا یہ تھا کہ مسلمانوں کی حیثیت کانگرس میں ایک مستقل قوم کی نہ مانی جائے اور اس طریقہ سے مسلم قومیت کو فنا کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ کانگرس میں انفرادی داخلہ کی شرط کو علماء اور زعماء کی ایک جماعت نے مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی حیثیت کے لیے نہایت مضر سمجھا اور بہت سے ماہرین سیاست کانگرس سے الگ ہو گئے۔ کانگرس کے اس دور میں ہندوؤں کو ہندوانہ خیالات اور تصورات کو بروئے کار لانے کا خوب موقع ملا۔ چنانچہ کانگرسی جھنڈے کو ہندووانہ سلامی اور بندے ماترم کے ترانے کو اپنا لیا گیا۔ پھر واردھا اسکیم، ودھیا اسکیم اور دہات اسکیم کے نام سے پورے ہندوستان میں ایسے قانون جاری کیے گئے جن کا سیاست اور آزادی کے مطالبہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان کا مطلب صرف اور صرف یہ تھا کہ ہندوانہ طرز معاشرت اور مشرکانہ رسم و رواج کا مسلمانوں کو عادی بنایا جائے چنانچہ اس پر بھی مسلمانوں کی سیاسی جماعتوں نے سخت احتجاج کیا اور مسلمانوں کو ہندوؤں میں جذب کرنے کی ایک کوشش قرار دیا، لیکن کانگرس پر اس احتجاج کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ان حالات میں مولانا تھانویؒ کے نزدیک کانگرس کے ساتھ اشتراک عمل حد جواز سے نکل کر صریح طور پر ناجائز ہو گیا تھا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:۔

> ”بخلاف اس وقت کی حالت کے کہ اب کانگرس کی قوت سے کفر د شرک کا حکم غالب ہے۔ اس کی ہر تجویز سے موافقت و مداہنت کی بو آتی ہے۔ اس وقت کا اشتراک بصورت ادغام بالکل متابعت ہے جو کہ ناجائز ہے۔ مسلمانوں کو اپنی تقویت و تنظیم مستقل لازم ہے۔“ (بوادر النوادر: ص ۹۶۷)

آپ نے اس بارے میں مزید فرمایا:

> ”حامیان کانگرس میں سے بعض حضرات اس اشتراک کو استاذی حضرت مولانا دیوبندی (حضرت شیخ الہندؒ) کا اتباع سمجھتے ہیں اور بعض اصحاب اس اختلاف کو مثل حنفی و شافعی کے خیال کرتے ہیں۔

سو میرے نزدیک یہ دونوں خیال محض غلط ہیں۔ حضرت مولاناؒ کا اشتراک مصالحت تھا نہ کہ متابعت۔" (بوادر النوادر: ص ۹۶۷)

ان حالات میں مولانا تھانویؒ نے کانگرس کی شرکت کے عدم جواز کا فتویٰ صادر فرمایا لیکن عام فتویٰ صادر فرمانے سے قبل متعدد بار جمعیۃ علمائے ہند سے اس بارے میں گفتگو فرمائی اور کانگرس کی شرکت میں جو شرعی قبائح اور مسلم امت کے قومی نقصانات تھے ان کا حل ان حضرات نے تلاش فرمایا لیکن کوئی شافی حل نہ مل سکا۔ اس تمام تحقیق کے بعد آپ نے رسالہ "تنظیم المسلمین" لکھا جس میں مسلمانوں کو اپنی علیحدہ تنظیم اور جماعت بنانے اور باہم منظّم ہونے کا مشورہ دیا۔ اور چونکہ اس وقت ہندوستان میں مسلم لیگ کے سوا اور کوئی ایسی جماعت نہ تھی جس کو مسلمانوں کی جمہوری طاقت حاصل ہو، اس لیے مسلم لیگ کی شرکت اور حمایت کی رائے دی گئی کیونکہ اگر کانگرس سے علیحدہ ہو کر مسلمان تشتت وافتراق میں مبتلا ہو جاتے تو یہ ان کی سیاسی موت تھی۔

مسلم لیگ کی اصلاح کی کوشش:

ایک طرف تو آپ نے مسلمانوں کو کانگرس کی شرکت سے منع فرمایا اور دوسری طرف مسلم لیگ کی دینی حالت درست کرنے کے لیے مولانا تھانویؒ مختلف اوقات اور مختلف مقامات میں زعماء مسلم لیگ کے پاس اپنے وفود بھیجتے رہے۔

قائداعظم سے ملاقات:

26 دسمبر 1938ء کو پٹنہ میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا۔ اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے مولانا تھانویؒ نے اس اجلاس میں ایک تبلیغی وفد بھیجا۔ اس وفد نے قائداعظم اور تمام زعماء لیگ کو نماز اور دینی اصول کو اپنانے کی تبلیغ اور تلقین کی۔ اور اس اجلاس میں مولانا تھانویؒ نے جو تاریخی بیان بھیجا اس کو عام اجلاس میں پڑھ کر سنانے کی خدمت حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے ہی انجام دی تھی۔

اجلاس پٹنہ سے ایک روز قبل مولانا تھانویؒ کے اس وفد نے قائداعظم سے ملاقات کی۔ مولانا ظفر احمد عثمانی نے قائداعظم سے فرمایا کہ مسلمان ایک مذہبی قوم ہے۔

جب تک سیاست کو مذہب کے ساتھ نہ ملایا جائے گا اس وقت تک آپ کی مسلم لیگ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوگی۔ آپ بھی مسلم لیگ میں مذہب کو شامل کرلیں۔ قائداعظم نے پہلے تو اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ سیاست کو مذہب سے الگ رکھا جائے لیکن اس پر جب مولانا ظفر احمد نے فرمایا کہ یہ تو یورپ کی سیاست ہے۔ یہ سیاست نہیں بلکہ چنگیزی ہے اسلامی سیاست یہ ہے کہ خلیفۂ اسلام قائد جنگ بھی ہو اور نماز کا امام بھی ہو۔ جب تک مسلمان اس طرح رہے تو ہر صورت میں کامیابی ان کے قدم چومتی تھی۔ وہ دنیا میں باکردار اور معزز تھے لیکن جب سے سیاست نے مذہب کو چھوڑا اس وقت سے مسلمان رو بہ تنزل ہونا شروع ہوگئے۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے مذہب کو چھوڑا تو اس کی سلطنت مختصر ہو کر رہ گئی۔ جب تک مذہبی شان تھی خلیفۂ اسلام کی بڑی سلطنت تھی، ہر طرف اس کا رعب تھا۔ امان اللہ خان نے بھی مذہب کو چھوڑا تو قوم نے اسے مسند حکومت سے علیحدہ کر دیا اور آج اٹلی وغیرہ میں ''یوسف بے کارواں'' ہوکر آوارگی کی زندگی گزار رہا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی مثالیں آپ نے قائداعظم کو پیش کیں کہ جب بھی سیاست سے مذہب کو الگ کیا گیا تو نہ صرف مسلمانوں کو اس کا نقصان ہوا بلکہ مذہب کو الگ کر کے سیاست کرنے والے بھی اس کا نشانہ بنے۔

قائداعظم پر مولانا ظفر احمد صاحب کی تقریر کا یہ اثر ہوا کہ اگلے روز آپ نے مسلم لیگ کے کھلے اجلاس میں اعلان کر دیا کہ

> ''اسلام عقائد و عبادات، معاملات اور اخلاق و سیاست کا مجموعہ ہے۔ قرآن حکیم نے سب کو ساتھ ساتھ بیان کیا ہے، اس لیے سیاست کے ساتھ مذہب کو بھی لینا چاہیے۔''

قائداعظم کی اس تقریر کو اخبار ''الامان'' میں اس عنوان کے ساتھ شائع کیا گیا۔ ''مولانا حکیم الامت کی روحانیت کی تاثیر اور قائداعظم کی تقریر۔''

اسی ملاقات میں مولانا تھانویؒ کے اس وفد نے مسلم لیگ کے زعماء اور ذمہ دار ارکان کو نماز پڑھنے کی بھی تلقین کی اور اسلام میں نماز کی اہمیت واضح کی، اور ان سے درخواست کی کہ وہ نماز پڑھا کریں۔ اس تلقین کا یہ اثر ہوا کہ مسلم لیگ کے اجلاس میں

پہلی دفعہ 2 بجے یہ کہہ کر اجلاس ملتوی کر دیا گیا کہ سب حضرات نماز ادا کریں۔ قاضی شہر نے امامت کرائی اور قائداعظم سمیت تمام حاضرین نے جن کی تعداد ایک لاکھ سے بھی زیادہ تھی، قاضیٔ شہر کے پیچھے نماز ادا کی۔

آرمی بل کے بارے میں وفد:

انگریزی حکومت نے آرمی بل کے نام سے ایک بل پاس کیا۔ کانگرس نے بظاہر اس بل کی مخالفت کی لیکن اس کے علی الرغم مسلم لیگ نے اس بل کی حمایت کی، اور بظاہر مسلم لیگ کی یہ حمایت مسلمانوں کے مفاد میں نہیں تھی۔ اس بل کی مسلم لیگ نے کیوں حمایت کی جب کہ کانگرس نے اس کی مخالفت کی، اس کی تحقیق کے لیے مولانا تھانویؒ نے ایک وفد قائداعظم کے پاس بھیجا۔ اس وقت بھی حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ وفد میں شامل تھے۔ چنانچہ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کے استفسار پر قائداعظم نے کہا کہ اس کی مخالفت تو کانگرس نے بھی نہیں کی بلکہ وہ یہ مطالبہ کر رہی ہے کہ فوج میں تناسب آبادی کی رعایت رکھی جائے۔ اس وقت فوج ساٹھ فی صد سے زیادہ مسلمان ہیں۔ ہندو چالیس فیصد سے بھی کم ہیں۔ کانگرس کا مطالبہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو فوج میں ہندوستان میں ان کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے 25 فیصد رکھا جائے تو ہم آرمی بل مان سکتے ہیں ورنہ نہیں۔ قائداعظم نے کہا کہ ملکی انقلاب آنے والا ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ فوج میں مسلمانوں ہی کی اکثریت قائم رہے، اس لیے مسلم لیگ کی طرف سے میں نے آرمی بل کی حمایت کی تھی، مگر اس شرط پر کہ مسلمان فوج کو مسلمانوں کے مقابلہ میں نہ بھیجا جائے اور جو مسلمانوں کا تناسب ہے اس کو برقرار رکھنے کا حکومت نے وعدہ کیا ہے۔

مستقبل کا مؤرخ جب بھی پاکستان کی تاریخ لکھے گا تو اس میں ایک اہم باب علمائے دیوبند کی عملی جدوجہد کا بھی ہوگا وہ نہایت اہم باب ہوگا۔ کیونکہ اس زمانہ میں دیوبندیوں کے مقابلہ میں بریلوی مکتب فکر کے علماء تو سراسر تحریک پاکستان کے مخالف تھے۔ چنانچہ قائداعظم نے جب تحریک پاکستان شروع کی تو مولانا احمد رضا خان صاحب تو انتقال کر چکے تھے، لیکن ان کے حلقہ کے لوگ مسلم لیگ اور قائداعظم کی مخالفت میں

پیش پیش تھے، چنانچہ مارہرہ شریف اور مولانا احمد رضا خان کے خلفاء مولانا حشمت علی خان قادری، مولانا سید ابوالبرکات سید احمد، ناظم حزب الاحناف لاہور، یہ سب مسلم لیگ اور پاکستان کے سراسر مخالف تھے۔ چنانچہ مولانا سید ابوالبرکات قادری کا فتویٰ ہے کہ

''لیگ کی حمایت کرنا اور اس میں چندے دینا اور اس کا ممبر بننا، اس کی اشاعت اور تبلیغ کرنا منافقین اور مرتدین کی جماعت کو فروغ دینا دین اسلام کے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔''

(الجوابات السنیہ: ص ۳۲)

مسلم لیگ کے خلاف ایک اور کتاب جس کا نام ''مسلم لیگ کی زریں بخیہ دری'' ہے، اس کے آخر میں بریلویوں کے بڑے بڑے علماء کی تصدیقات بھی ہیں مولانا ابوالبرکات صاحب کے فتویٰ میں بھی اس کتاب کی تائید کی گئی ہے۔ مسلم لیگ کے ارکان کے لیے یہ کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔

(ملاحظہ ہو مسلم لیگ کی زریں بخیہ دری، شائع کردہ خانقاہ برکاتیہ مارہرہ ضلع ایٹہ)

مختصر یہ کہ مسلم لیگ کو حضرت تھانویؒ اور ان کے متوسلین کی ایک اچھی خاصی تعداد مل گئی جو نظریہ پاکستان میں ان کے ہم نوا تھی اور ان کی وجہ سے مسلم لیگ جو الیکشنوں میں بہت کم جیتی تھی، اب ان علمائے کرام کی برکت اور ان کی جدوجہد اور کد و کاوش سے 1945ء کے الیکشنوں میں کثرت سے جیتی یہاں تک کہ انگریز پاکستان کا مطالبہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ درست ہے کہ اس وقت جمعیۃ علمائے ہند اکثر معاملات میں کانگرس کا ساتھ دے رہی تھی اور وہ پاکستان کے مطالبہ کے حق میں نہ تھی۔ کیونکہ ان کی سیاسی بصیرت یہ بتا رہی تھی کہ مسلم لیگ پاکستان بننے کے بعد اسلام کو نہ صرف پاکستان میں نافذ نہیں کرے گی بلکہ اسلام کو پاکستان سے دیس نکالا دے دے گی اور مصطفےٰ کمال پاشا کی طرح اسلام کو ایسا بنانے کی کوشش کرے گی جس سے امریکہ اور یورپ کی عیسائی حکومتیں خوش ہوں کہ جو کام ہم نہیں کر سکے وہ پاکستان کے حکمران کر رہے ہیں۔ اور وہ اسلام کو ایسا ترقی پسند بنا دیں گے کہ اسلام کا نام صرف رہ جائے گا باقی سب کچھ ترقی پسند ہو جائے گا۔ لیکن مولانا اور ان کے متوسلین نے قائد اعظم اور لیگ کے

دوسرے زعماء کی یقین دہانی پر نہایت دھڑلے سے مطالبہ پاکستان اور مسلم لیگ کی حمایت کی بلکہ ''جمعیۃ علمائے ہند'' کے مقابلہ میں ''جمعیت علمائے اسلام'' کو قائم کر کے قائداعظم کے ساتھ مل کر ہندوستان کے قریہ قریہ اور بستی بستی میں مسلم لیگ کو روشناس کرایا اور آسام اور سرحد کے ریفرنڈم میں وہ کام کیا کہ تاریخ پاکستان میں وہ سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد مسلم لیگ پر ان لوگوں کا غاصبانہ قبضہ ہو گیا جو ایک روز بھی تحریک آزادی وطن میں شریک سفر نہ تھے۔ اور ''منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے۔''

جمعیۃ علمائے اسلام کا قیام:

پاکستان کے نام پر لڑے جانے والے الیکشن قریب آ گئے تھے اور مسلم لیگ کے بارے میں یہ پراپیگنڈہ زوروں پر تھا کہ مسلم لیگ بے دین امراء، وڈیروں اور جاگیرداروں کی جماعت ہے کیونکہ اس کے منتظم اور کلیدی عہدوں پر قابض وہی لوگ ہیں جو انگریز کے ٹوڈی اور نوابزادے اور خوانزادے ہیں۔ جب فضا میں اس قسم کا پراپیگنڈہ ہو رہا ہو اور اس میں کچھ حقیقت بھی ہو اور دوسری سب سے بڑی بات یہ کہ دعویٰ اسلامی ریاست قائم کرنے کا ہو اور علماء کی تائید حاصل نہ ہو، اور یہ حقیقت بھی ہے کیونکہ دین کو جانچنے والے دین کے جاننے والے اور ماہر علماء ہی تو ہیں۔ ان حالات میں اگر مسلم لیگ کو بااثر اور مقتدر علماء کی تائید اور حمایت حاصل نہ ہو تو الیکشن کا جیتنا نہ صرف محال بلکہ ناممکن ہے۔ وقت کی اس نزاکت کا احساس کرتے ہوئے حضرت مولانا ظفر احمد عثانی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی اور مولانا تھانویؒ کے دیگر متوسلین اور مقتدر علماء کرام نے باہم یہ تجویز کیا کہ مطالبہ پاکستان کو پروان چڑھانے کے لیے اور مسلم لیگ کو الیکشن میں کامیاب کروانے کے لیے جمعیۃ علمائے ہند کی طرح علماء کی ایک مستقل جماعت ہونی چاہیے۔ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اکتوبر 1945ء کو محمد علی پارک کلکتہ میں حضرت مولانا ظفر احمد عثانیؒ کی زیر صدارت 26، 27، اور 28 اکتوبر کو علماء کے اجلاس ہوتے رہے۔ جن میں شرکت کرنے والے علماء اور مشائخ کی تعداد پانچ سو

سے زائد تھی جو ملک کے کونے کونے سے اس کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ اس کانفرنس میں علماء کی تعداد کو دیکھ کر عام تأثر یہ تھا کہ خلافت کانفرنس کلکتہ کے بعد علماء اور مشائخ کی اتنی بڑی کانفرنس منعقد نہیں ہوئی۔ اس کانفرنس میں جمعیۃ علمائے اسلام کی بنیاد رکھی گئی اور مولانا ظفر احمد عثمانی کی زیر صدارت کچھ اور قرار دادیں بھی پاس ہوئیں جن میں مسلم لیگ حمایت کا اعلان کیا گیا اور ووٹر حضرات سے پر زور اپیل کی گئی کہ وہ مسلم لیگ کو جو اس وقت پورے ہندوستان میں مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے، ووٹ دیں اور کسی اور جماعت کو ووٹ نہ دیں اور کانگرس کی بڑے شد و مد کے ساتھ مخالفت کی گئی اور انہیں کسی صورت بھی ووٹ نہ دینے کے لیے کہا گیا۔

جمعیت علمائے اسلام کا قیام تو عمل میں آ گیا۔ اب مسئلہ تھا صدارت کا۔ جمعیت علمائے ہند کے پہلے صدر تو حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ تھے اور موجودہ صدر شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ تھے۔ اب علمی دنیا میں اسی قسم کے قد کاٹھ والی شخصیت جمعیت علمائے اسلام کی صدارت کے لیے مطلوب تھی۔ اگرچہ مولانا ظفر احمد عثمانی بھی ایک بہت بڑی علمی شخصیت کے حامل تھے اور آپ کی کتاب اعلاء السنن اس دعویٰ کی بین دلیل تھی لیکن آپ ہی کی تحریک پر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کو اس کی صدارت کے لیے منتخب کیا گیا اور مولانا ظفر احمد صاحب کو نائب صدر مقرر کیا گیا۔ اس کی دو بڑی وجوہات تھیں۔ ایک تو حاضرین علماء میں سے اکثریت مولانا شبیر احمد عثمانی کی شاگرد تھی اور دوسری بڑی وجہ حضرت مولانا عثمانیؒ کی طاقت لسانی بھی تھی۔ آپ تقریر و تحریر دونوں کے شہنشاہ تھے۔ فتح الملہم اور فوائد عثمانی دونوں آپ کے علم اور تحریر کے شاہد تھے، اور آپ کی تقریر اور سحر بیانی پر تو اکثر علماء حضرات نے انہیں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ''لسان'' کہا ہے۔ جیسے حضرت نانوتویؒ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ کی ''لسان'' تھے ایسے ہی حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ''لسان'' تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اپنی علالت کے باعث سیاست کی دنیا سے علیحدگی اختیار کر چکے تھے اور علالت ہی کے باعث اس کانفرنس میں بھی شریک نہ ہو سکے تھے۔ ان کی صدارت کا فیصلہ ان کی غیر حاضری میں کیا گیا۔ اگرچہ

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن قدس سرہ کا خطبہ صدارت جو آپ نے جمعیت علمائے ہند کے اجلاس منعقدہ دہلی کے لیے لکھا تھا، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ہی نے آپ کی طرف سے پڑھا تھا، لیکن حضرت شیخ الہند کے انتقال کے بعد آپ جمعیت علمائے ہند کے طریق کار اور اس کی پالیسیوں سے اختلاف رکھتے تھے، لیکن آپ نے اس اختلاف کا اظہار ابھی تک برملا طریقہ سے نہیں کیا تھا۔ چنانچہ جب اس صدارت کی قرارداد کو لے کر مولانا ظفر احمد دیوبند مولانا شبیر احمد صاحبؒ کے پاس پہنچے تو مولانا شبیر احمد عثمانیؒ آبدیدہ ہو گئے اور انہی نمناک آنکھوں سے فرمایا کہ بھئی! میں تو پندرہ سولہ ماہ سے صاحب فراش ہوں، اور مجھ میں سفر کی ہمت کہاں؟ اور سیاست میں تو سفر اولین چیز ہے۔ کیوں کہ صدر کو ملک کے کونے کونے میں جلسے کرنے پڑتے ہیں اور علالت کی وجہ سے مجھ میں یہ ہمت نہیں۔ اور ویسے حضرت مولانا شبیر احمد صاحبؒ طبعی طور پر بڑے نازک مزاج بھی تھے۔ لہٰذا آپ مجھے صدارت سے معذور فرمائیں۔ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب نے مولانا عثمانیؒ کی معذرت کے جواب میں فرمایا کہ ''حضرت! صدارت آپ قبول فرمالیں اور کام کی ذمہ داری میں لیتا ہوں۔'' مولانا شبیر احمد صاحبؒ نے اس بات سے مطمئن ہو کر جمعیت علمائے اسلام کی صدارت کو قبول فرمالیا۔

سید مودودی کا کردار:

یہ زمانہ تحریک پاکستان کا ایک نازک ترین دور تھا۔ کانگرس تو ویسے ہی مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے خلاف تھی اور وہ کسی صورت ہندوستان کا بٹوارہ ہونے کے حق میں نہیں تھی، کیونکہ اس کے نزدیک بٹوارہ کا مطلب بھارت ماتا کو دو ٹکڑے کرنا تھا جو ہندوؤں کے دھرم میں ایک بہت بڑا پاپ تھا لیکن کانگرس کے علاوہ جمعیت علمائے ہند، مجلس احرار، اسلام، جماعت اسلامی، خدائی خدمت گار اور دوسری چھوٹی بڑی سب مسلم جماعتیں بعض وجوہات کی بنا پر پاکستان کے خلاف متحد تھیں اور یہ بھی گویا کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ کانگرس کی تائید کر رہی تھیں۔ لیکن مودودی صاحب کا کردار کچھ عجیب تھا۔ پہلے پہل تو آپ نے اپنے مضامین مندرجہ ''سیاسی کشمکش'' حصہ دوم میں کانگرس کے

استعمار پرستانہ عزائم پر بھر پور تنقید کی تھی جس سے کانگرسی حلقوں میں کافی پریشانی پیدا ہوئی تھی اورانہی تحریروں کی وجہ سے 1941ء میں جماعت اسلامی کا قیام عمل میں آیا تھا، لیکن پھر نامعلوم اسباب اور وجوہات کی بناپر مودودی صاحب کے موقف میں یک دم تبدیلی آ گئی اوران کے خیالات ونظریات میں انقلاب آ گیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کا سارا زورقلم اپنی ہی کہی ہوئی باتوں کی تردید پر صرف ہونے لگا،اوراب انہوں نے کانگرس کے ساتھ مسلم لیگ اورتحریک پاکستان کی پرزور مخالفت شروع کردی۔تحریک پاکستان کی مخالفت کی واحد وجہ ''جمہوریت'' تھی۔ کیونکہ وہ جمہوریت کوایک کافرانہ نظام سمجھتے تھے۔

چنانچہ انہوں نے اپنی کتاب ''مسلمان اورموجودہ سیاسی کشمکش'' میں لکھا ہے:

''ایک حقیقی مسلمان ہونے کی حیثیت سے جب دنیا پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اس امر پر اظہار مسرت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ترکی پر ترک، ایران پر ایرانی اور افغانستان پر افغانی حکمران ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں ''حکم الناس للناس علی الناس'' کے نظریہ کا قائل نہیں ہوں،اوراس اعتبار سے میرے نزدیک انگلستان پر انگریزوں کی حاکمیت اورفرانس پر اہل فرانس کی حاکمیت جس قدر غلط ہے اسی قدر ترکی اور دوسرے ملکوں پر ان کے اپنے باشندوں کی حاکمیت بھی غلط ہے، بلکہ اس سے زیادہ غلط، اس لیے کہ جو قومیں اپنے آپ کومسلمان کہتی ہیں، ان کا خدا کی حاکمیت کے بجائے انسانوں کی حاکمیت اختیار کرنا اور بھی زیادہ افسوس ناک ہے۔غیر مسلم اگر ''ضالین'' کے حکم میں ہیں تو یہ ''مغضوب علیھم'' کی تعریف میں آتے ہیں۔''

(مسلمان اورموجودہ سیاسی کشمکش: جلد۳ص ۱۲۵)

پھراسی کتاب میں دوصفحوں کے بعد لکھتے ہیں:

''مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے نزدیک یہ امر بھی کوئی قدرو قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کوانگریزی امپریلزم سے آزاد کرایا

جائے۔ انگریز کی حاکمیت سے نکلنا تو صرف ''لا الٰہ'' کا ہم معنی ہو گا۔ فیصلہ کا انحصار محض اس نفی پر نہیں، اس پر ہے، اور ''مجاہدین حریت'' میں سے کون صاحب یہ جھوٹ بولنے کی ہمت رکھتے ہیں کہ اس لیے نہیں ہے کہ امپریلزم کے ''الٰہ'' کو ہٹا کر ''ڈیموکریسی'' کے ''الٰہ'' کو بت خانہ حکومت میں جلوہ افروز کیا جائے، تو مسلمان کے نزدیک درحقیقت اس سے کوئی بھی فرق نہیں ہوتا۔ لات گیا منات آ گیا۔ ایک جھوٹے خدا نے دوسرے جھوٹے خدا کی جگہ لے لی۔ باطل کی بندگی جیسی تھی ویسی ہی رہی۔ کون مسلمان اس کو آزادی کے لفظ سے تعبیر کر سکتا ہے؟''**ان اللہ لا یمحو السئی بالسئیی، ولکن یمحو السئیی بالحسن، ان الخبیث لایمحوا الخبیث**'' (سیاسی کشمکش: جلد۳ ص ۱۲۷)

اس اقتباس میں مودودی صاحب نے ڈیموکریسی (جمہوریت) کو ''لات و منات'' سے تشبیہ دی ہے۔ مسلم لیگ اس زمانہ میں تحریک آزادی وطن کے ذریعہ انگریز کے اقتدار سے ملک کو آزادی کروا کر پاکستان کو ایک اسلامی جمہوری ریاست بنانا چاہتی تھی، لیکن مودودی صاحب نے اس بات کی بھی مخالفت کی۔ دوسرے لفظوں میں یہ تحریک آزادی وطن کی مخالفت تھی۔ چنانچہ مودودی صاحب نے خود تسلیم کیا:

''اس موقع پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسلم لیگ کے کسی ریزولیشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی حکومت قائم کرنا ہے۔ برعکس اس کے ان کی طرف سے بصراحت اور بتکرار جس شے کا اظہار کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ ان کے پیش نظر ایک ایسی جمہوری حکومت ہے جس میں دوسری غیر مسلم قومیں بھی حصہ دار ہوں، مگر اکثریت کے حق کی بنا پر مسلمانوں کا حصہ غالب ہو۔''

(سیاسی کشمکش: ۱۷۳/۳)

جمہوریت مولانا مودودی کے نزدیک ایک بدترین شے ہے اور آپ نے جس قدر اس کی مخالفت ہوسکتی تھی کی، کیونکہ جمہوریت میں حاکمیت (Sovereignty) اللہ کے بجائے جمہور کی ہوتی ہے جس کی اسلام کسی حالت میں بھی اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت پر بحث کرتے ہوئے مودودی صاحب لکھتے ہیں:

> ''دعوت کے باب میں اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کی حاکمیت اور اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرنے کی طرف بلایا جائے، مگر یہ تقسیم سے قبل جمہوریت چاہنے والے ہندوستان کے باشندوں کو اس طرف بلاتے ہیں کہ تم خود مالک الملک بنو۔ یہ غیر الٰہی اقتدار اعلیٰ کی نفی نہیں کرتے بلکہ صرف انگریزی اقتدار اعلیٰ کی نفی کرتے ہیں۔ یہ الٰہی اقتدار اعلیٰ کا اثبات بھی نہیں کرتے بلکہ اس کی جگہ باشندگان ملک کی خوداقتداری اور جمہوری اقتدار اعلیٰ کا اثبات کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شرک ہونے کی حیثیت سے انگریزی اقتدار اعلیٰ اور جمہوری اقتدار اعلیٰ میں فرق نہیں، لہٰذا ان لوگوں کی دعوت سراسر غیر اسلامی بلکہ مخالف اسلام دعوت ہے۔''
>
> (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش: جلد۳ ص ۱۶۲)

مودودی صاحب کی اس تنقید میں اشارہ مسلم لیگ کی طرف سے ہے جو پاکستان کو ایک اسلامی جمہوری ریاست بنانا چاہتی تھی۔ ایک اور مقام پر سید مودودی لکھتے ہیں:

> ''مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لیے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ہندوستان کے جس حصے میں مسلمان کثیر التعداد ہیں، وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔ میرے نزدیک جو سوال سب سے اقدم ہے، وہ یہ ہے کہ آپ کے اس ''پاکستان'' میں نظام حکومت کی اساس خدا کی حاکمیت (Sovereignty) پر رکھی جائے گی یا مغربی نظریہ جمہوریت کے مطابق عوام کی حاکمیت پر؟ اگر پہلی صورت ہے تو یقیناً یہ

پاکستان ہو گا بصورت دیگر یہ ویسا ہی ''ناپاکستان'' ہو گا جیسا ملک کا وہ حصہ ہو گا جہاں آپ کی تقسیم کے مطابق غیر مسلم حکومت کریں گے، بلکہ خدا کی نگاہ میں یہ اس سے زیادہ ناپاک، اس سے زیادہ مبغوض وملعون ہو گا کیونکہ یہاں اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے وہ کام کریں گے جو غیر مسلم کرتے ہیں۔''

اسلام میں حاکمیت اللہ رب العزت کی ہے اور دوسرے طاغوتی نظاموں مثلاً اشتراکیت، ڈکٹیٹرشپ، امپریلزم اور جمہوریت وغیرہ میں حاکمیت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی ہوتی ہے۔ چنانچہ سید مودودی لکھتے ہیں:

''دنیا میں جہاں جو خرابی پائی جاتی ہے اس کی جڑ صرف ایک چیز ہے، اور وہ ہے اللہ کے سوا کسی اور کی حاکمیت تسلیم کرنا یہی ام الخبائث ہے۔ یہی اصل بس کی گانٹھ ہے۔ اسی سے وہ شجر خبیث پیدا ہوتا ہے جس کی شاخیں پھیل پھیل کر انسانوں پر مصیبتوں کے زہریلے پھل ٹپکاتی ہیں۔ یہ جڑ جب تک باقی ہے آپ شاخوں کی جتنی چاہیں قطع و برید کرلیں بجز اس کے کچھ بھی حاصل نہ ہو گا کہ ایک طرف سے مصائب کا نزول بند ہو جائے اور دوسری طرف سے شروع ہو جائے۔''

''ڈکٹیٹرشپ یا مطلق العنان پادشاہی کو مٹایا جائے گا تو حاصل کیا ہو گا؟ یہی نا کہ ایک انسان یا ایک خاندان خدائی کے مقام سے ہٹ جائے گا اور اس کی جگہ پارلیمنٹ خدا بن جائے گی، مگر کیا فی الواقع اس طریقہ سے انسانیت کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے؟ کیا ظلم اور بغی اور فساد فی الارض سے وہ ممالک خالی ہیں جن میں پارلیمنٹ کی خدائی ہے۔ (سیاسی کشمکش: جلد ۳ ص ۱۱۴، ص ۱۱۶)

ایک اور مقام پر مودودی صاحب لکھتے ہیں:

''اسلام براہِ راست غیر اسلامی نظام اطاعت پر حملہ کرتا ہے اور

اس کا تقاضا یہ ہے کہ تمام مساعی کو حاکمیت رب العالمین کے قیام و اثبات پر مرکوز کر دیا جائے، لیکن اس کے برعکس یہ لوگ اپنی سعی و جہد کا رخ برطانوی نظام اطاعت کی تخریب اور حاکمیت عوام کے قیام کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ یہ صریح انحراف ہے صراط مستقیم سے۔ اس انحراف پر جب اعتراض کیا جاتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ برطانوی اطاعت اسلامی نصب العین کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ تنہا ہم اس رکاوٹ کو دور نہیں کر سکتے۔ اس لیے پہلے دوسروں کی مدد سے اس کو دور کر لیں پھر اصل منزل مقصود کی طرف بڑھنے کے لیے راستہ آسان ہو جائے گا، مگر میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ راستہ آسان کیسے ہو جائے گا۔ ظاہر بات یہ ہے کہ ایک نظام اطاعت یا دین کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا نظام اطاعت یا دین کبھی قائم نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ نفوس انسانی میں پہلے نظام کی تخریب اور دوسرے نظام کی تعمیر کا خیال اور ارادہ کمال درجہ قوت کے ساتھ مستحکم نہ کر دیا جائے۔ اگر ہندوستان کے موجودہ انگریزی نظام اطاعت کی جگہ آپ جمہوری نظام اطاعت قائم کرنا چاہیں تو یہ انقلاب صرف اسی طرح ممکن ہے کہ آپ باشندگان ہند کے دلوں میں حاکمیت انگریز کے بجائے خود اپنی حاکمیت کے برحق ہونے کا تخیل اور عملاً مالک الملک بن جانے کا عزم پوری شدت کے ساتھ پیدا کر دیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کا آخری مقصد الٰہی نظام اطاعت کا قیام ہے وہ کس طرح بحالت ہوش و حواس اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے ذریعہ کے طور پر یہ تدبیر اختیار کر سکتے ہیں کہ عوام الناس کے دل میں خود اپنی حاکمیت کا عقیدہ اور ارادہ اتنی قوت کے ساتھ بٹھا دیں کہ اس کے زور سے دین انگریزی کی مضبوط جمی ہوئی جڑیں اکھڑ جائیں اور دین جمہور کی

جڑیں زمین جگہ پکڑ لیں۔ جہاں عامۂ خلائق کے دلوں میں اپنی حاکمیت کا عقیدہ اور عزم اتنی قوت کے ساتھ جم گیا ہو، کیا وہاں لوگوں کو خداوند عالم کے آگے اپنی حاکمیت سے دست بردار ہو جانے پر آمادہ کرنا موجودہ انگریزی حاکمیت کی جڑیں اکھاڑنے سے کچھ کم مشکل ہے؟ کیا امریکہ، جاپان، جرمنی اور انگلستان جیسے اصطلاحاً آزاد ممالک میں حکومت کا قیام اس سے کچھ کم دشوار ہے جتنا ہندوستان جیسے اصطلاحاً غلام ملک میں دشوار نظر آتا ہے۔ اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں دیا جا سکتا ہے، تو میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ برطانوی اقتدار کی جگہ ہندوستانی اقتدار کا قیام آخر کس معنی میں حکومت الٰہی کے قیام کی طرف ایک گونہ پیش قدمی ہے۔

''تاہم اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ تدبیر عملاً کارگر ہو سکتی ہے تب بھی میں اس کے صحیح ہونے سے انکار کرتا ہوں۔ لازم نہیں کہ ہر تدبیر جو کارگر ہو وہ صحیح بھی ہو۔ دراصل یہ سخت ناپاک تدبیر ہے جسے اختیار کرنے کا خیال بھی ایک مسلمان دل میں نہیں لا سکتا۔'' (سیاسی کشمکش: جلد۳ ص ۱۶۵)

جمہوری نظام کے ذریعہ اس وقت تک کبھی بھی اسلام نہیں آ سکتا جب تک کہ عوام الناس اخلاقی اور دینی قدروں سے واقف نہ ہوں اور غلط اور صحیح کے درمیان فرق نہ کر سکیں۔ کریکٹر کے اتنے مضبوط ہوں کہ کسی کے ہاتھ اپنے ضمیر کی آواز (ووٹ) کو نہ فروخت کریں، مگر یہاں تو حال یہ ہے کہ

''یہ انبوہ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے 999 فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں اور نہ حق و باطل کی تمیز سے آشنا ہیں، نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے

پوتے کو بس اسلام کا نام ملتا چلا آ رہا ہے، اس لیے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق کو جان کر اسے قبول کیا ہے نہ باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ ان کی کثرت رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاؤں اسلام کے راستہ پر چلے گا تو اس کی خوش فہمی قابل داد ہے۔

جب پاکستان کی آبادی میں سے 999 فی ہزار ''اصلی مسلمان'' نہیں بلکہ ''نسلی مسلمان'' ہوں، لہٰذا ان نسلی مسلمانوں سے نظام اسلام قائم ہوگا سعی لا حاصل نہیں تو اور کیا ہے؟ اور ان کے دامن میں پاکستان کے اسلامی نظام کے مستقبل کو باندھنا کہاں کی عقل مندی ہے؟ اور یہ کہہ دینا کہ اگر ملک کا نظام جمہوری ہو جائے تو اسلام بہت جلد آ سکتا ہے، پگلہ پن کی ایک زندہ مثال نہیں تو اور کیا ہے؟

1940-39ء میں مودودی صاحب نے لکھا تھا:

''جو لوگ روح اور اخلاق کے اعتبار سے مسلمان نہ ہوں بلکہ محض اصطلاحی و نسلی حیثیت سے مسلمان ہوں، ان کو اگر بیرونی اثر و اقتدار سے کامل آزادی نصیب ہو بھی جائے اور اگر ان کے جمہور کو خود اپنی پسند کے مطابق نظام حکومت قائم کرنے کا پورا اختیار بھی حاصل ہو، تب بھی حکومت الٰہی وجود میں نہیں آ سکتی۔ وہ اپنے دنیوی مفاد کے پرستار ہوتے ہیں، نہ صرف یہ کہ ان میں حق و صداقت کے لیے اپنے مفاد کو قربان کرنے کی طاقت نہیں ہوتی بلکہ اس کے برعکس جب کبھی ان کی اغراض دنیوی سے حق اور صداقت کا تصادم ہوتا ہے، وہ حق کو چھوڑ کر ہمیشہ اس طرف جاتے ہیں جس طرف ان کی اغراض پوری ہوتی ہوں۔ جہاں ایسے لوگوں کی اکثریت ہو وہاں کبھی یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ عام انتخاب میں ان کے ووٹوں سے وہ صالحین منتخب ہوں گے جو منہاج نبوت پر

حکومت کرنے والے ہوں۔ جمہوری انتخاب کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے دودھ کو بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے۔ اگر دودھ زہریلا ہو تو اس سے جو مکھن نکلے گا قدرتی بات ہے کہ وہ دودھ سے زیادہ زہریلا ہوگا۔ اسی طرح سوسائٹی اگر بگڑی ہوئی ہو تو اس کے ووٹوں سے وہی لوگ منتخب ہو کر برسر اقتدار آئیں گے جو اس سوسائٹی کی خواہشات نفس سے سند قبولیت حاصل کر سکیں گے۔ پس جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو جائے گی، ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔'' (سیاسی کشمکش: جلد۳ص ۱۷۵۔۱۷۶)

اسی کتاب میں ایک دوسرے مقام پر مودودی صاحب لکھتے ہیں:

''جمہوری حکومت میں اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں آتا ہے جن کو ووٹروں کی پسندیدگی حاصل ہو۔ ووٹروں میں اگر اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر نہیں ہے، اگر وہ صحیح اسلامی کریکٹر کے عاشق نہیں ہیں۔ اگر وہ اس بے لاگ اور بے لچک اصولوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جن پر اسلامی حکومت چلائی جاتی ہے تو ان کے ووٹوں سے کبھی ''مسلمان'' قسم کے آدمی منتخب ہو کر پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں آسکتے۔ اس ذریعہ سے تو اقتدار انہی لوگوں کو ملے گا جو مردم شماری کے رجسٹر میں چاہے مسلمان ہوں مگر اپنے نظریات اور طریق کار کے اعتبار سے جن کو اسلام کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔ اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اسی مقام پر کھڑے ہیں جس مقام پر غیر مسلم حکومت میں تھے بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر۔'' (سیاسی کشمکش: جلد۴ص ۴۹)

اسی کتاب میں ایک اور جگہ مودودی صاحب لکھتے ہیں:

''خواہ مغربی تعلیم وتربیت پائے ہوئے سیاسی لیڈر ہوں یا علمائے دین ومفتیانِ شرع مبین، دونوں قسم کے راہ نما اپنے نظریہ اور اپنی پالیسی کے لحاظ سے یکساں گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں راہِ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ دونوں اپنے اصلی اہداف کو چھوڑ کر ہوا میں تیر چلا رہے ہیں۔ ایک گروہ کے دماغ پر ہندو کا ہوا سوار ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ہندو امپریلزم کے چنگل سے بچ جانے کا نام نجات ہے۔ دوسرے گروہ کے سر پر انگریز کا بھوت مسلط ہے اور وہ امپریلزم کے جال سے بچ نکلنے کو نجات سمجھ رہا ہے۔ ان میں سے کسی کی نظر بھی مسلمان کی نظر نہیں''۔ (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش جلد۳ ص ۷۸)

پھر پاکستان کے معرض وجود آنے سے کوئی ڈیڑھ سال قبل مودودی صاحب نے لکھا:

''جنت الحمقاء میں رہنے والے لوگ اپنے خوابوں میں خواہ کتنے ہی سبز باغ دیکھ رہے ہوں لیکن آزاد پاکستان اگر فی الواقعہ وہ بنا بھی، تو لازماً جمہوری لادینی اسٹیٹ ہوگا''۔

(ترجمان القرآن فروری ۱۹۴۶ء ص ۵۴۔۵)

یہ چند اقتباسات مودودی صاحب کی کتاب سیاسی کشمکش جلد۳ سے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مودودی صاحب ہندوستان کی آزادی کے خواہاں نہیں تھے کیونکہ آزادی کے بعد جمہوری نظام نافذ ہونا تھا جو کہ ان کے نزدیک ''لات ومنات'' تھا اور سراسر کفری نظام تھا۔ چنانچہ آپ کی یہ تحریریں جن کو انہوں نے اسلام کوٹڈ (Islam Coated) کیا تھا۔ (اگرچہ قیام پاکستان کے بعد خود مودودی صاحب اور ان کی جماعت جمہوریت کا مطالبہ کرنے لگی جب کہ مودودی صاحب نے فرمایا تھا کہ جمہوریت سے کبھی اسلام نہیں آسکتا۔) چنانچہ جب آپ کی کتاب کا تیسرا حصہ چھپا تو آپ کی ان اسلامی تحریروں نے صالح رنگ میں مسلمانوں کے قومی مفاد کو جس قدر نقصان پہنچایا اتنا نقصان کانگرس اور مسلم جماعتوں نے بھی نہیں پہنچایا تھا۔ چنانچہ 1945ء کے تاریخی الیکشن کے موقع پر بھی جس میں مسلمانوں نے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ اکھنڈ ہندوستان چاہتے یا ہندوستان کا بٹوارہ کرکے پاکستان بنانا چاہتے ہیں۔ اس نازک موقع پر جماعت اسلامی نے صاف اعلان کر دیا کہ:

''ووٹ اور الیکشن کے معاملہ میں ہماری پوزیشن صاف صاف ذہن نشین کر لیجئے۔ پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنے والے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جیسا بھی اثر ہماری قوم پر پڑتا ہو، بہرحال ایک بااصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ کسی مصلحت کی بنا پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ایمان لائے ہیں۔''

(روزنامہ کوثر: ۱۲۸ کتوبر ۱۹۴۵ء)

جماعت اسلامی کی طرف سے مسلم لیگ اور مطالبہ پاکستان کی یہ صرف عملی مخالفت ہی نہ تھی بلکہ درحقیقت کانگرس کی خاموش تائید اور اکھنڈ ہندوستان کی حمایت تھی بلکہ انگریزی حکومت کی حمایت تھی۔ چنانچہ اس کا فائدہ کانگرس ہی کو ہوا۔ جس زمانہ میں دارالاسلام پٹھان کوٹ سے مودودی صاحب کا یہ فتویٰ جاری ہوا کہ مطالبہ پاکستان کے نام پر لڑے جانے والے الیکشن میں جماعت اسلامی عملی طور پر کوئی حصہ نہ لے گی، اسی زمانہ میں جمعیت علمائے ہند کی کانفرنس منعقدہ سہارنپور میں مسلمانوں کو مسلم لیگ کی تائید کے بجائے کانگرس کی تائید کرنے کا مشورہ دیا گیا اور کانگرس کے ساتھ اشتراک عمل کو اس وجہ سے جائز قرار دیا گیا کہ جب کونسلوں، میونسپلٹیوں میں ہندوؤں سے اشتراک عمل جائز ہے تو پھر دوسرے معاملات میں کیوں نہیں؟

جمعیت علمائے ہند کے اس مشورہ کا جواب:

جمعیت علمائے ہند کا مسلمانانِ ہندوستان کو یہ مشورہ نہایت مغالطہ آمیز تھا اور اس سے مطالبہ پاکستان کو بڑا نقصان پہنچ سکتا تھا۔ لہٰذا حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی نے اپنی اولین فرصت میں اس بارے میں ایک زوردار بیان دیا۔ مولانا نے فرمایا:

''مسلمانوں کا مشرکین (ہندوؤں وغیرہ) کے ساتھ جہاد آزادی میں اشتراک عمل اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ حکم اہل شرک غالب نہ ہو۔ مسلمان مشرکین کے جھنڈے تلے جمع نہ ہوں بلکہ

مشرکین اسلامی جھنڈے کے نیچے ہوں۔ چنانچہ شرح سیر کبیر جلد ۳ ص ۲۴۱ میں یہ مسئلہ مذکور ہے۔ اب فیصلہ اہل انصاف کے ہاتھ میں ہے کہ کانگرس میں اس وقت حکم شرک غالب ہے یا حکم اسلام؟ رہا مطالبہ پاکستان، سو جب کہ تمام ہندوستان کو اسلامی حکومت بنانا بحالت موجودہ کسی طرح ممکن نہیں تو کم از کم ان اصولوں کو جہاں مسلم اکثریت ہے اسلامی حکومت لینا کہ وہاں اسلامی سلطنت اسلامی اصولوں پر قائم کی جا سکے، لازم اور ضروری ہے۔''

(حیات محمد علی جناح: ص ۴۵۳)

کونسلوں اور میونسپلٹیوں میں اشتراک عمل کا جواب دیتے ہوئے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی نے فرمایا کہ ان محکموں میں اشتراک عمل صرف حقوق غلامی میں اشتراک ہے۔ حکومت نے غلاموں کے سامنے روٹیوں کے چند ٹکڑے ڈال دیئے ہیں کہ ان کو حصہ رسدی تقسیم کر لو۔ ہندو مسلم اس کو حصہ رسدی تقسیم کرتے ہیں۔ اگر کوئی فریق اپنا حصہ نہ لے تو بھوکا مرے گا۔ اس کو اس اشتراک عمل سے جس کا نام آزادی رکھا گیا ہے، دور کی بھی نسبت نہیں۔ کانگرس کے ساتھ اشتراک عمل جہاد آزادی میں اشتراک عمل ہے جس پر مذہبی حیثیت سے ہندوستانی مسلمانوں کی موت و حیات کا دار و مدار ہے۔

جمعیت علمائے اسلام کے علماء کے طوفانی دورے:

جمعیت علمائے اسلام کے قائدین خانقاہوں اور مدارس میں کام کرنے والے تھے۔ ان حضرات نے اس سے قبل کبھی سیاست میں حصہ نہیں لیا تھا، لیکن اب وقت آ گیا تھا کہ یہ باہر نکلیں اور مطالبہ پاکستان کو کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار کریں۔ چنانچہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور ان کے علاوہ دوسرے تمام علماء جو جمعیت علمائے اسلام سے وابستہ تھے، اگرچہ وہ اس سے قبل الیکشنوں کے اس طوفان سے یک قلم یکسو ہوتے تھے، مطالبہ پاکستان کی حمایت اور مسلم لیگ کی امداد کے لیے ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گئے۔ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ

نے اس الیکشن کے سلسلہ میں قریباً چار ماہ تک پورے ہندوستان کا دورہ کیا۔ جلسوں کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ ہر روز جلسہ ہوتا بلکہ بعض دفعہ دو دو تین تین جلسے بھی ہوتے تھے۔ بعض مقامات پر آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ گئے اور بعض جگہ تنہا گئے۔ جہاں بھی گئے ہوا کا رخ بدل دیا۔ لوگوں کے ذہنوں میں پاکستان کی اہمیت اتاری اور لوگوں کے قلوب کو کانگرس اور اس کی حلیف جماعتوں سے متنفر کر کے مسلم لیگ کی طرف مائل کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جمعیت علمائے اسلام کے قائدین کی چار ماہ کی شبانہ روز سعی و جہد اور تگ و دو سے متحدہ قومیت کا بت پاش پاش ہو گیا اور مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت صرف ان علماء کی وجہ سے جن کو آج پاکستان میں مطعون کیا جاتا ہے، مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو گئی۔ یہاں تک کہ ان علاقوں میں بھی مسلم لیگ کا طوطی بولنے لگا جہاں مسلمانوں کی اقلیت تھی اور اکثر و بیشتر لوگ کانگرس کے حامی تھے۔ ان حضرات کے ان طوفانی دوروں، بیانات اور تقریروں سے ہوا کا کچھ ایسا رخ بدلا کہ جو لوگ ابھی تک مسلم لیگ کی حمایت کے لیے تیار نہ تھے، وہ نہ صرف مسلم لیگ میں شامل ہوئے بلکہ اپنی جان و مال کی قربانی سے بھی دریغ نہ کرنے لگے۔ چنانچہ علماء کی ان کامیابیوں کا اعتراف قائداعظم کے ایک رفیق نے اپنے ایک مکتوب مؤرخہ 16 جنوری 1946 میں ان الفاظ میں کیا ہے:

> ”کل سے یہاں (لاہور میں) جمعیت علمائے اسلام کی کانفرنس ہو رہی ہے۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی مدظلہ، حضرت مولانا ظفر احمد تھانوی، حضرت مولانا قاری محمد طاہر صاحب، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، مفتی دیوبند اور دوسرے بیسیوں حضرات علمائے کرام تشریف لائے ہوئے ہیں، اور مسلم لیگ کی بڑے شد و مد سے حمایت کر رہے ہیں۔ ان بزرگوں کی آمد سے ہوا کا رخ بدل گیا ہے۔ (مشاہدات و واردات: ص ۲۰۹)

لیاقت علی خان کا الیکشن:

27 نومبر 1945ء کے انتخابات برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے لیے

ایک فیصلہ کن حیثیت رکھتے تھے۔ چنانچہ ضلع مظفر نگر اور ضلع سہارنپور سے ضمنی انتخاب کے لیے کانگرس کی طرف سے ایک امیدوار محمد احمد کاظمی الیکشن لڑنے کے لیے منتخب ہوا۔ کاظمی نہایت قابل شخصیت کے حامل تھے اور میدان سیاست میں ان کی کچھ نمایاں خصوصیات بھی تھیں جیسے کاظمی ایکٹ 1930ء میں حصہ لینے کی وجہ سے سیاسی اور مذہبی حلقوں میں ان کا ایک خاص مقام تھا۔ علاوہ ازیں کاظمی صاحب کی امداد کے لیے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ بھی اس حلقہ میں دورہ کے لیے تشریف لائے۔ مسلم لیگ نے اس حلقۂ انتخاب کے لیے نوابزادہ لیاقت علی خان کو نامزد کیا، لیکن حریف کے بااثر ہونے کی وجہ سے اس حلقہ میں مسلم لیگ کی کامیابی کی امید موہوم تھی۔ اس لیے لیاقت علی خان نے سردار امیر اعظم خان سابق مرکزی وزیر کو تھانہ بھون بھیجا۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ کانگرس کے امیدوار محمد احمد کاظمی حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ کے قریبی رشتہ دار تھے، لیکن مولانا ظفر احمد صاحبؒ نے دین کے معاملہ کو رشتہ داری اور قرابت داری پر ترجیح دی اور رشتہ داروں کے مقابلہ میں نظریہ پاکستان اور تحریک پاکستان کی حمایت کے لیے لیاقت علی خان کی حمایت کا اعلان فرمایا اور سہارنپور، ڈیرہ دون، مظفر نگر اور بلند شہر کے اضلاع میں مسلم لیگ کے امیدوار لیاقت علی خان کی تائید اور حمایت کے لیے دورہ کیا۔ آپ کا وہ دورہ اللہ کے فضل و کرم سے نہایت کامیاب رہا جس کے نتیجہ میں محمد احمد کاظمی ہار گیا اور لیاقت علی خان جیت گیا۔ اس بارے میں مولانا انیس احمد صدیقی نے لکھا ہے:

> ''حضرت (مولانا ظفر احمد عثمانیؒ) نے بہت سے اضلاع اور مقامات پر تشریف لا کر مسلمانوں کو مسلم لیگ کے ساتھ وابستہ رہنے اور پاکستان کے قیام میں جدوجہد کرنے کی تلقین فرمائی۔ حضرت اس سلسلہ میں قصبہ کھاتولی ضلع مظفر نگر میں تشریف لے گئے۔ سردار امیر اعظم خان جو خان لیاقت علی خان کے منیجر کے صاحبزادے ہونے کے علاوہ خود پاکستان کے معروف آدمی ہیں۔ آٹھ دس سال مرکزی وزارت میں شامل رہے اور اب کراچی میں بہت بڑے کاروباری ''الاعظم لمیٹڈ'' کے روحِ رواں ہیں۔ سردار

صاحب نے آپ (مولانا ظفر احمد صاحب) کی خدمت میں کچھ روپے (قریباً دوسوروپے) پیش کیے کہ آپ کرایہ وغیرہ میں صرف فرمائیں، اور ہماری طرف سے یہ ہدیہ قبول فرمائیں۔ حضرت نے یہ رقم لینے سے انکار کر دیا کہ مسلم لیگ یا پاکستان کا کام تمہارا یا تمہارے والد یا لیاقت علی خان کا کام نہیں، میرا اور میری قوم کا کام ہے۔ مجھے اس سلسلہ میں نذرانہ قبول کرنے سے معذور فرمائیں۔ آپ نے اصرار کے باوجود اس ہدیہ کو قبول نہیں فرمایا۔"

لیاقت علی خان نے اپنے کامیاب ہونے کا سب سے پہلے مبارکباد کا تار حضرت مولانا ظفر احمد کے نام بھیجا اور اس میں بتایا کہ انہوں نے تین ہزار ووٹوں سے جناب محمد احمد کاظمی صاحب کو شکست دی ہے، پھر لیاقت علی خان نے حضرت مولانا ظفر احمد صاحب کے نام مسلم لیگ کی طرف سے ایک خط ڈھاکہ روانہ کیا۔

دفتر آل انڈیا مسلم لیگ، دریا گنج دہلی

چھٹی نمبر 5050 مؤرخہ 17 دسمبر 1945ء

محترم المقام زاد اللہ مکارمکم ...... السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں انتہائی مصروفیتوں کے باعث اس سے قبل آپ کو خط نہ لکھ سکا۔ مرکزی اسمبلی کے انتخاب میں اللہ پاک نے ہمیں بڑی نمایاں کامیابی عطا فرمائی ہے اور اس سلسلہ میں آپ جیسی ہستیوں کی جدوجہد باعث برکت رہی۔ آپ حضرات کا اس نازک موقع پر گوشۂ عزلت سے نکل کر میدان عمل میں سرگرمی کے ساتھ جدوجہد کرنا بے حد مؤثر ثابت ہوا۔ اس کامیابی پر میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں خصوصاً اس حلقۂ انتخاب میں جہاں ہماری لیگ نے مجھے کھڑا کیا تھا، آپ کی تحریروں اور تقریریوں نے باطل کے اثرات بڑی حد تک ختم کر دیئے۔

بہرحال اب اس سے بھی سخت تر معرکہ سامنے ہے، لیکن ہمیں اللہ تعالیٰ کے فضل سے قوی امید ہے کہ دشمنان ملت اس معرکہ میں بھی خاسر و نامراد رہیں گے۔ امید ہے کہ اس عرصہ کے لیے آپ کو رخصت مل جائے گی اور آپ کی تحریریں اور تقریریں اور

مجاہدانہ سرگرمیاں آنے والی منزل کی دشواریوں کو بھی معتد بہ حد تک ختم کر سکیں گی۔

(دستخط) لیاقت علی خان

قائد ملت لیاقت علی خان کا یہ خراج تحسین اور اعتراف حقیقت ان لوگوں کے لیے جو یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کے لیے قربانیاں کرنے والوں میں ملا کہیں نظر نہیں آیا، اور آج ان میں سے کئی جو اقتدار کی مسند پر براجمان ہو کر اپنی، علماء اور اللہ تعالیٰ کی حقیقت ہی کو فراموش کر چکے ہیں، ان میں سے اکثر تو اس وقت اپنی ماؤں کے رحموں میں بھی نہیں آئے تھے جو آج علماء کو جاہل، دقیانوس، ملک اور ملت کے دشمن کے ناموں سے پکارتے ہیں۔ مستقبل کا مؤرخ انہیں بتائے گا کہ علماء نے اس تحریک میں کیا کردار ادا کیا۔ اگر علمائے کرام مسلم لیگ کی اس آڑے وقت میں حمایت نہ کرتے تو مسلم لیگ 1945ء کا الیکشن کسی صورت میں نہیں جیت سکتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور ان کے متوسلین کی حمایت و تائید بلکہ مدرسوں اور خانقاہوں سے باہر نکل کر جو رسم شبیری انہوں نے ادا کی، اس نے مسلم لیگ میں ایک نئی روح پھونک دی تھی جس کا اعتراف اس وقت کے مسلم لیگ کے تمام عمائدین اور زعماء کو تھا۔ اگر یہ حضرات علمائے کرام مسلم لیگ کی حمایت نہ کرتے تو جمعیت علمائے ہند کے مقابلہ میں جس میں امت کے مشاہیر علماء کی ایک بہت بڑی تعداد شامل تھی اور وہ کانگرس کا ساتھ دے رہی تھی، تو ان حالات میں مسلم لیگ کا کامیاب ہونا نہ صرف محال بلکہ ناممکن تھا۔

حضرت مولانا ظفر احمد تھانوی کے دوروں اور جلسوں کی خبریں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ جو جمعیت کے صدر تھے، کو اخبارات، خطوط اور مختلف لوگوں کے ذریعہ پہنچتی رہتی تھیں جس کی وجہ سے آپ نہایت خوش ہوتے تھے کیونکہ مسلم لیگ کی کامیابی مطالبہ پاکستان کی کامیابی تھی۔ چنانچہ اس دوران حضرت مولانا ظفر احمد ایک مرتبہ دیوبند تشریف لے گئے تو انہیں دیکھ کر علامہ عثمانیؒ نے خوش ہو کر فرمایا: ہمیں یہ امید نہیں تھی کہ آپ اس جفاکشی اور محنت سے کام لیں گے۔ واقعی آپ تو بڑے بڑے باہمت لوگوں کے حوصلے بھی پست کر دیتے ہیں۔

مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں علمائے کرام کی جدوجہد اور اللہ کے فضل و کرم

سے سو فیصد کامیابی ہوئی۔ اس کامیابی کے نتیجہ میں ملک کے مختلف شہروں میں بڑے بڑے جلسے ہوئے، ان میں سے ایک جلسہ کلکتہ میں ہوا جو کثرت تعداد اور حسن انتظام اور مقررین کے لحاظ سے ایک نہایت عظیم الشان جلسہ تھا۔ اخبارات کی رپورٹ کے مطابق حاضرین کی تعداد دس لاکھ کے قریب تھی۔ مسلمانوں کے الیکشن میں کامیاب ہونے کی خوشی میں دور دور سے لوگ جوق در جوق اس جلسہ میں آئے۔ اس عظیم الشان جلسہ سے حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ نے بھی خطاب فرمایا۔

8 مارچ 1946ء میں ڈھاکہ کے ایک شخص محی الدین کے استفسار پر حضرت مولانا ظفر احمد تھانوی عثمانی نے بعض دوسرے علماء کرام کے ساتھ جن میں سے ایک علامہ سید سلیمان ندویؒ بھی تھے، مسلم لیگ کے حق میں ایک فتویٰ لکھا کہ اس وقت ہندوستان کے مسلمان کانگرس اور اس کی امدادی اور حلیف جماعتوں سے یک قلم علیحدہ رہ کر صرف اور صرف مسلم لیگ کی حمایت کریں۔ اس فتویٰ کی وجہ مسلم لیگ کے ساتھ بے شمار لوگوں کی ہمدردیاں ہوگئیں اور الیکشن میں یہ مسلم لیگ کی کامیابی کا باعث بنیں۔

پیچیدہ صورت حال اور اس کا حل:

جمعیت علمائے اسلام کے قائدین کا نظریہ تھا کہ اس وقت برصغیر پاک و ہند کی جو پیچیدہ صورت حال ہے، اس کا واحد حل صرف اور صرف یہ ہے کہ پاکستان حاصل کیا جائے وگرنہ ہندو اکثریت سے بچنا نہایت مشکل ہوگا۔ چنانچہ پشاور کے ایک عظیم الشان جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی نے فرمایا کہ سیاسی طور پر بھی اور شرعی طور پر بھی ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنی قومی جماعت جو اس وقت مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے، کا ساتھ دے اور دامے، درمے، سخنے قدمے اس کی ہر ممکن امداد کرے تاکہ پاکستان کا حصول آسان اور ممکن ہو سکے۔ یہی امت مسلمہ کے لیے مفید ہے اور موجودہ ہندوستان کی پیچیدہ صورت حال کا حل صرف اور صرف پاکستان ہے۔

ایک اور بیان میں حضرت مولانا ظفر احمد صاحب نے فرمایا کہ خدانخواستہ اگر مسلم لیگ بحیثیت جماعت پیچھے بھی رہ جائے تو اتنی پریشانی کی بات نہیں کیونکہ اب

ہندوستان کے ہزاروں علماء اور مشائخ جمعیت علمائے اسلام کے پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو چکے ہیں۔ پاکستان کے حصول میں اگر ہماری جانیں بھی کام آ جائیں تو ہم اس سے دریغ نہیں کریں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ 1945ء کے الیکشن میں تو جمعیت علمائے اسلام کے قائدین میں سے ہر ایک نے اپنی جگہ بہت کام کیا لیکن حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ نے اپنی بساط اور طاقت سے زیادہ جدوجہد کی اور آپ کی کدوکاوش سے مسلم لیگ کئی حلقوں میں کامیاب ہوئی۔ قائدین جمعیت نے نہ صرف تقریری اور تحریری طور پر مسلم لیگ کی حمایت کی بلکہ حصول پاکستان کے لیے مسلمانانِ پاکستان پر زور دیا کہ ان پر شرعی طور پر مسلم لیگ کو ووٹ دینا ضروری ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی نے جب کانگرس اور مسلم لیگ کے بارے میں شرعی فیصلہ شائع کیا تو اس پر منجملہ دیگر اکابر دیوبند کے حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ کی تصدیق بھی ان الفاظ میں ثبت ہے:

> ''بعد الحمد والصلوٰۃ اس احقر نے بھی فتویٰ مذکورہ کا حرفاً حرفاً مطالعہ کیا۔ اللہ تعالیٰ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ کو جزائے خیر عطا فرمائیں کہ سیاست حاضرہ کا شرعی حکم اچھی طرح واضح فرما دیا، اور بڑی محنت سے قرآن وحدیث اور فقہ کی جزئیات احکام کو تلاش کر کے جمع فرما دیا ہے۔ امید ہے کہ اس کے بعد مسائل حاضرہ میں کسی اور فتوے کی حاجت باقی نہ رہے گی۔ **هذا تكون همة الرجال وعزيمة الابطال كثر الله فينا امثاله۔**
>
> والسلام
>
> ظفر احمد عثمانی عفی اللہ عنہ

کیبنٹ مشن کے نام تار:

ابھی صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات تمام ہندوستان میں مکمل نہ ہوئے تھے کہ 22 مارچ 1946ء کو وزارتی مشن کراچی میں وارد ہو گیا۔ اس وفد کے تین ارکان تھے۔

(1) لارڈ پیتھک لارنس، وزیر ہند۔ (2) سر اسٹیفورڈ کرپس اور (3) جنرل الیگزینڈر۔ ایک ہفتہ آرام کرنے کے بعد یکم اپریل سے انہوں نے ہندوستانی لیڈروں سے ملاقات شروع کردی۔ کل ہند مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے صدر کی حیثیت سے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کو بھی ملاقات کی دعوت دی گئی، اور چونکہ آزاد مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے ساتھ دوسری جماعتیں بھی اشتراک عمل کیے ہوئے تھیں، لہٰذا جناب صدر کو اجازت دی گئی کہ وہ مزید تین حضرات کو اپنے ساتھ لے آئیں۔ چنانچہ عبدالمجید صاحب خواجہ صدر آل انڈیا مسلم مجلس، شیخ حسام الدین صدر آل انڈیا مجلس احرار اسلام اور شیخ ظہیر الدین صاحب آل انڈیا مومن کانفرنس اور بحیثیت ترجمان جناب حافظ محمد ابراہیم صاحب وزیر صوبہ یو۔ پی حضرت شیخ الاسلام کے ساتھ تشریف لے گئے۔ 16 اپریل 1946ء کو 4 بجے شام سے سوا پانچ بجے تک یعنی سوا گھنٹہ وزارتی مشن سے ملاقات ہوئی۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی کی طرف سے حافظ محمد ابراہیم صاحب نے جمعیۃ علماء ہند کا فارمولا وزارتی مشن کے سامنے پیش کیا۔ مشن کے ارکان نے اس فارمولہ کے بارے میں خاصی دلچسپی لی یہاں تک کہ ملاقات کے مقررہ وقت سے 45 منٹ زائد ہو گئے۔ ارکان مشن اس فارمولا کے مضمرات اور اس کے مختلف پہلوؤں سے متعلق سوالات کرتے رہے۔

بین الاقوامی صورت حالات کے پیش نظر اور کچھ ہندوستان کے اندرونی حالات کو سامنے رکھ کر، اور ان انقلاب انگیز چنگاریوں کی وجہ سے جو ہندوستان کے مختلف علاقوں کے زیر خاک سلگ رہی تھیں اور کسی بھی وقت ہندوستان کو آتش فشاں بنا سکتی تھیں، مشن کے ان ارکان کو کانگرس کی طرف دست تعاون بڑھانے پر مجبور کیا۔ یہ بات مسلم لیگ کے لیے ایک اندوہ ناک حادثہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس وقت لیگ کے سامنے صرف دو راستے تھے ایک حصول پاکستان کے لیے انگریزی حکومت کا مقابلہ یا برطانوی نظریہ کی اطاعت اور مطالبہ پاکستان کی تاویل۔

مسلم لیگ نے پہلے راستہ کو اختیار کیا کیونکہ مسلمانوں کے جذبات کو فرد کرنے کے لیے اس کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ 8-9 اپریل کو جب کہ وزارتی مشن

ہندوستانی لیڈروں سے ملاقاتیں کر رہا تھا، مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے اراکین کا کنونشن بلایا گیا اور ہندوستان کے طول وعرض میں مسلم لیگ کے اثر ورسوخ کا مظاہرہ بھی اس کنونشن کا مقصد تھا۔ چنانچہ نہایت شان وشوکت کے ساتھ دہلی میں یہ کنونشن ہوا۔

دو روز کے اجلاس میں ایک طویل تجویز پاس کی گئی جس کا ضروری اقتباس درج ذیل ہے:

''چونکہ مسلمانانِ ہند کا یقین ہے کہ اسلامی ہند کو ہندوؤں کے تسلط اور غلبہ سے محفوظ رکھنے اور ذاتی شعور وصلاحیتوں کی بنا پر اپنے آپ کے لیے ارتقاء کے مکمل بہترین مواقع پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک آزاد خود مختار حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے۔ بنگال اور آسام جس کا شمال مشرقی جزو ہوں، اور پنجاب شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان شمال مغرب میں۔''

''لہٰذا ہندوستان کی مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے مسلم لیگی ممبران کی کنونشن عمیق غور وفکر کے بعد اعلان کرتی ہے کہ اسلامی ہند ہرگز ہرگز ایسے اعلان کو تسلیم نہیں کرے گا جو ''اکھنڈ ہندوستان'' کی بنیادوں پر وضع کیا گیا ہو۔ نہ ہی وہ کسی ایسے واحد آئین ساز مشینری میں شرکت کریں گے جو اس سلسلہ میں قائم کی گئی ہو۔

''نیز اگر حکومت برطانیہ نے انگریزوں کے بجائے ہندوستانی عوام کے نام اختیارات حکومت منتقل کرنے کے سلسلہ میں ہندوستان کے داخلی نظم ونسق اور امن کی بحالی کے لیے کوئی ایسا فارمولا وضع کیا جو مندرجہ ذیل اصولوں کے معیار پر پورا نہ اترتا ہو تو اسلامی ہندوستان سیاسی مسئلہ کے تصفیہ کے لیے اپنی اعانت وتعاون پیش نہیں کرے گا۔''

جمعیت علمائے اسلام کے کسی ممبر کو وزارتی مشن نے نہیں بلایا تھا۔ وجہ تو معلوم نہیں لیکن مسلم لیگ کو وزارتی مشن پر زور دینا چاہیے تھا کہ وہ جمعیت کے نمائندے کو بھی

بلائے اور ان کا پلان سنے اور اس پر غور وخوض کرے۔ لیکن چونکہ مسلم لیگ خود وزارتی مشن سے ناراض تھی، اسی وجہ سے تو انہوں نے ارکان اسمبلی پر مشتمل ایک کنونشن بلایا۔ جمعیت علمائے اسلام برطانوی لیڈروں کے بیانات پڑھتی اور سنتی تھی۔ چنانچہ جب انہوں نے دیکھا کہ بعض برطانوی لیڈروں کے بیانات سے یہ تاثر ملتا ہے کہ برطانوی حکومت اب مسلم لیگ کو نظر انداز کرنے کا عزم کیے ہوئے ہے، جس سے قدرتی طور پر مسلمانوں اور مسلم لیگ میں ایک اضطراب پیدا ہوا۔ حضرت مولانا ظفر احمد تھانوی نے 18 اپریل 1946ء کو ایک ٹیلیگرام وزارتی مشن کے وفد کے نام دہلی ارسال فرمایا جس میں مرقوم تھا کہ مسلم لیگ مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ سیاسی تنظیم ہے لہٰذا کل ہند جمعیت علمائے اسلام متفقہ طور پر مسلم لیگ کی پشت پر ہے۔ پاکستان مسلمانوں کا قومی ملی مطالبہ ہے۔ اس مطالبہ کے انکار کا تصور کسی صورت میں نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمان اس سوال پر کمی بیشی کر کے کوئی مصالحت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ مسلمان اس مطالبہ ملی کے حصول کے لیے ہر قربانی کے لیے تیار ہیں۔"

اس تار سے وزارتی مشن کو پتہ چل گیا کہ مسلم لیگ کے ساتھ بھی علماء کی ایک بہت بڑی تعداد ہے اور وہ بھی مطالبہ پاکستان میں اس کے ہم نوا ہے۔

پنجاب اور بنگال کی تقسیم:

2 مارچ 1947ء کو خضر حیات خان ٹوانہ کی وزارت مستعفی ہوئی اور پنجاب میں ہندو مسلم فسادات کا آغاز ہو گیا اور 6 مارچ 1947ء کو آل انڈیا کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس دہلی میں ہوا جس میں پنجاب کے سکھوں اور ہندوؤں کے اس مطالبہ کی تائید کر دی گئی کہ پنجاب کو دو حصوں میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ اسی اثناء میں بنگال کے ہندوؤں کی طرف سے تقسیم بنگال کا مطالبہ شروع ہو گیا اور وہی دلائل جو مسلم لیگی راہ نما تقسیم ہند کے لیے پیش کرتے تھے، تقسیم پنجاب اور تقسیم بنگال کے لیے بھی پیش کیے جانے لگے۔ قائداعظم اور لیگی زعماء نے یہ مطالبہ کر دیا کہ ملک کی تقسیم کے ساتھ فوجیں بھی تقسیم ہونی چاہئیں۔ اس کے جواب مجلس دستور ساز کے صدر بابو راجندر پرشاد نے 30 اپریل

1947ء کو ایک بیان میں کہا کہ تقسیم ہندوستان ہر حیثیت سے مکمل ہونی چاہیے اور صوبہ پنجاب اور صوبہ بنگال کو بھی دو حصوں میں تقسیم کرنا چاہیے، اور اگر اس تقسیم میں ہندوستان کی فوجوں کا بانٹنا بھی ضروری سمجھا جائے تو ایسا بھی کر دینا چاہیے۔ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا مطالبہ مسلم لیگ کے لاہور والے ریزولیشن سے مطابقت رکھتا ہے کیونکہ اس میں کہا گیا تھا کہ وہ علاقے جہاں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے، ان کو الگ ریاست بنایا جائے۔ اس ریزولیشن کی روشنی میں مسلمان ایسے علاقوں کو پاکستان میں داخل نہیں کر سکتے جو جغرافیائی اعتبار سے ملحق ہیں اور جہاں مسلمانوں کی آبادی اکثریت میں نہیں ہے۔''

(انجام ۳ مئی ۱۹۴۷ء)

پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے مطالبہ پر مسلم لیگ اور دوسرے مسلمان نہایت مضطرب اور پریشان ہوئے۔ قائداعظم نے اس بارے میں ایک طویل بیان دیا جس میں اس مطالبہ کو ناجائز اور کانگرس کی ہٹ دھرمی قرار دیا گیا اور بتایا کہ اگر ایسا کیا گیا تو ان صوبوں کے انتظامی معاملات پر برا اثر پڑے گا جو ایک صدی سے ایک حالت پر قائم ہیں۔ یہی نہیں بلکہ باشندوں کی سیاسی اور اقتصادی زندگی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے گی، پاکستان کے مطالبہ کے اصول اور تمام صوبوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے مطالبہ کا مقابلہ کرنا غلطی ہے۔ مجھے امید ہے کہ وائسرائے اور برطانوی حکومت اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوں گے اور ایسی فاش غلطی نہ کریں گے۔

قائداعظم کے اس بیان کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ انگریز اور کانگرس کو انتخابات میں مسلم لیگ کی نمایاں کامیابی نے مطالبہ پاکستان کے ماننے پر مجبور کر دیا لیکن بنگال اور پنجاب کی تقسیم پر کانگرس اڑ گئی۔

9 جون 1947ء کو مسلم لیگ ہائی کمان کا دہلی میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں اس طرح کا پاکستان جس میں بنگال اور پنجاب کی تقسیم ہو، منظور کرنے یا نہ کرنے پر غور کیا گیا۔ اس جلسہ میں شرکت کے لیے شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی اور حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی کو خصوصی دعوت دی گئی۔ جلسہ میں مختلف نقطۂ نظر کے تحت تقاریر ہوئیں۔ قائداعظم کی رائے یہ تھی کہ ''پنجاب اور بنگال کی تقسیم کو اگر منظور نہ کیا گیا تو

پاکستان نہیں بن سکے گا۔ میری رائے یہ ہے کہ اس کو منظور کر لیا جائے۔'' چنانچہ ایک اسلامی ریاست پاکستان بنانے کے لیے ان دونوں صوبوں کی تقسیم کو مان لیا گیا۔

ریفرنڈم کا مسئلہ:

اب ایک اور مسئلہ درپیش ہو گیا۔ سلہٹ اور سرحد میں کانگرس کو ریفرنڈم پر اصرار تھا کہ وہاں کے باشندوں کی رائے الگ معلوم کی جائے کہ وہ پاکستان میں رہنا چاہتے ہیں یا ہندوستان کے ساتھ الحاق کرنا چاہتے ہیں۔ قائداعظم نے اس کو بھی منظور کر لیا۔ قرارداد پاکستان منظور ہو گئی تو 11 جون 1947ء کو شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کے ساتھ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی قائداعظم سے ملاقات کرنے کے لیے ان کی کوٹھی پر تشریف لے گئے اور قائداعظم سے ان مسلمانوں کے بارے میں جو تقسیم ملک کے بعد بھارت میں رہ جائیں گے، اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

دوران گفتگو قائداعظم نے کہا کہ مجھے سرحد اور سلہٹ کے ریفرنڈم کی بہت فکر ہے۔ کیونکہ قائداعظم کی نگاہ میں سرحد پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی ہے، اور سلہٹ کا علاقہ اگر پاکستان میں نہ آیا تو آسام کی بہت سی چیزوں سے پاکستان محروم رہ جائے گا۔

جمعیت علمائے اسلام کے ان دونوں راہ نماؤں نے قائداعظم کو تسلی دی اور انہیں یقین دلایا کہ ہم انشاء اللہ دونوں صوبوں کا دورہ کریں گے اور اس ریفرنڈم میں انشاء اللہ مسلم لیگ ہی کامیاب ہو گی، لیکن آپ اس بات کا اعلان کر دیں کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہو گا۔ اس پر قائداعظم نے کہا کہ جب پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گی تو آئین اسلامی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ قائداعظم کا یہ جواب سن کر ان دونوں حضرات نے اس کے جواب میں ترکی کا ذکر کیا کہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت کے باوجود حکومت نے اسلامی قانون نافذ نہیں کیا، اس لیے بعض لوگوں کو مسلم لیگ سے بھی ایسا ہی خطرہ ہے۔ اس پر قائداعظم نے کہا کہ آپ میری طرف سے اس کا اعلان کر دیں کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہو گا۔ اس کے بعد طے ہوا کہ سلہٹ کے ریفرنڈم کے لیے مولانا ظفر احمد صاحب کام کریں گے اور سرحد کے لیے مولانا علامہ شبیر احمد عثمانی۔ چنانچہ

مولانا ظفر احمد صاحبؒ نے اپنے احباب کو ڈھاکہ خطوط لکھے کہ سہلٹ جا کر اس بات کی کوشش کرو کہ مسلمان مسلم لیگ کو ووٹ دیں، مگر سلہٹ میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے شاگرد اور مرید بہت زیادہ تھے۔ مولانا مدنی ہر سال رمضان وہیں جا کر گزارتے تھے، اس لیے وہاں جمعیت علمائے ہند کا پورا پورا تسلط تھا۔ مولانا ظفر احمد صاحب کے احباب کے خطوط آئے کہ آپ کو خود یہاں پہنچنا چاہیے۔ زمین بہت سخت ہے۔ ادھر ڈھاکہ یونیورسٹی میں لیاقت علی خان کا تار مولانا ظفر احمد صاحب کے سلہٹ پہنچنے کے لیے آیا۔ مولانا ان دنوں تھانہ بھون تشریف لائے ہوئے تھے۔ وہاں پر بہت سے تار آئے۔ چنانچہ مولانا ظفر احمد صاحب تھانہ بھون سے ڈھاکہ اور وہاں سے سلہٹ پہنچے۔ اس وقت ریفرنڈم میں صرف پانچ روز باقی تھی، اور لیاقت علی خان ان دنوں سلہٹ اور آسام کا دورہ کر رہے تھے۔ واپسی میں غفر گاؤں میں مخالف لوگوں نے جلسہ میں گڑبڑ مچا دی۔ اب مولانا عثمانی کے پاس ایک آدمی بھیجا گیا کہ جلدی سے غفر گاؤں آئیں۔ چنانچہ مولانا غفر گاوں کے لیے روانہ ہوئے۔ میمن سنگھ اسٹیشن سے سید حسین شہید سہروردی بھی اس گاڑی میں سوار ہو گئے جو غفر گاؤں میں گڑبڑ کی وجہ رات کو وہاں سے میمن سنگھ آ گئے تھے اور اب دوسرے جلسہ میں شرکت کے لیے پھر غفر گاؤں جا رہے تھے۔ اس جلسہ کی صدارت حضرت مولانا ظفر احمد صاحب نے کرنی تھی۔ جب آپ غفر گاؤں پہنچے تو مسلم لیگ نیشنل گارڈ نے آپ کا استقبال کیا۔ ظہر کی نماز کے بعد جلسہ شروع ہوا۔ مولانا نے اپنے خطاب میں دلائل شرعیہ سے پاکستان کی تائید و حمایت کی ضرورت اور مخالفین کے شبہات کے جوابات بیان فرمائے۔ یہ جلسہ بڑے سکون و آرام سے ہوا اور شروع سے آخر تک کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔ اس کے بعد آپ نے حضرت مولانا سہول صاحب کو ساتھ لیا اور سلٹ کے مضافات میں ان مقامات کا دورہ کیا جن میں پاکستان مخالف عنصر موجود تھا۔ اب ریفرنڈم میں صرف دو دن باقی تھے۔

اس کے بعد حضرت مولانا نے حضرت شاہ جلال کی مسجد میں ایک بہت بڑے جلسے کو خطاب کیا اور وہاں دارالاسلام اور دارالحرب کا فرق بیان کر کے پاکستان کو دارالاسلام اور ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا۔

سہلٹ کے خطابات کے دوران لوگوں نے آپ سے اپنے کچھ شبہات کا بھی اظہار کیا جس کا جواب آپ نے اپنے خطابات میں دیا۔ اس میں سب سے بڑا شبہ یہ تھا کہ پاکستان اسمبلی میں ہندو بھی ہوں گے تو وہاں اسلامی حکومت کس طرح ہوگی؟ مولانا نے فرمایا کہ اکثریت مسلمانوں کی ہوگی۔ غیر مسلم ہمارے تابع ہوں گے تو اسلامی حکومت ہونے میں کیا شبہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاہدہ یہود مدینہ سے کیا تھا اس میں صراحت موجود تھی کہ ہم سب مل کر ایک ہیں اور بصورت اختلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ سب کو ماننا پڑے گا۔ تو کیا یہ اسلامی سلطنت نہ تھی؟

آپ نے ان پانچ روز میں سہلٹ کے کئی مقامات کا دورہ کیا۔ اس دورہ میں حضرت مولانا کے ساتھ حضرت مولانا محمد سہول عثمانی بھی تھے۔ جس روز پولنگ شروع ہوا مولانا نماز فجر کے بعد معمولات سے فارغ ہو کر لیٹ گئے تو غنودگی کی حالت میں مولانا نے دیکھا کہ مسلم لیگ اور جمعیت علمائے ہند دونوں پولنگ میں ساتھ ساتھ ہیں اور کوئی اختلاف نہیں ہے، ناشتہ سے فارغ ہو کر مولانا پولنگ اسٹیشن پر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ واقعی جمعیت علمائے ہند اور مسلم لیگ کے جھنڈے ساتھ ساتھ ہیں، اور لوگ نعرے لگا رہے ہیں کہ جمعیت علمائے ہند اور مسلم لیگ بھائی بھائی۔

شام کو اس ریفرنڈم کا نتیجہ نکلا تو پتہ چلا کہ سہلٹ کی ایک عظیم اکثریت نے پاکستان کے حق میں رائے دی اور مسلم لیگ سلہٹ کا یہ ریفرنڈم نہایت اکثریت سے جیت گئی۔ اسی طرح سرحد میں بھی علامہ شبیر احمد عثمانی اور ان کے رفقاء اور تلامذہ نے دن رات کوشش کی اور باچا خان کے اس قلعہ کو سر کیا اور یہاں بھی مسلم لیگ ایک واضح اکثریت کے ساتھ ریفرنڈم میں کامیاب ہوگئی، اور یہ دونوں علاقے پاکستان میں شامل ہو گئے۔

قیام پاکستان اور پرچم کشائی:

27 رمضان المبارک / 14 اگست 1947ء کو پاکستان عالم وجود میں آیا۔ قوم کی محنت ٹھکانے لگی۔ جو قرارداد 23 مارچ 1940ء کو لاہور کے اقبال پارک میں لفظوں میں بیان کی گئی اس کو 7 سال کے قلیل عرصہ میں مجسم صورت میں پوری قوم نے دیکھ لیا۔

دن بھی بہت مبارک تھا یعنی رمضان کی 27 تاریخ۔ کراچی میں قائداعظم موجود تھے۔ وہ پاکستان کے گورنر جنرل تھے یعنی سب سے بڑا عہدہ انہی کا تھا۔ انہی کا استحقاق تھا کہ پاکستانی حکومت کی پرچم کشائی کریں، لیکن انہیں اس بات کا علم تھا کہ اگر علماء کی جماعت میرے ساتھ نہ ہوتی تو نہ تو میں پاکستان حاصل کر سکتا تھا اور نہ ہی سلہٹ اور سرحد کا ریفرنڈم جیت سکتا تھا۔ میری جیب میں تو سب کھوٹے سکے تھے جو اپنی اپنی اغراض کے بندے تھے۔ اخلاص اور دل کی اتھاہ گہرائیوں سے جدوجہد کر کے جس جماعت نے پاکستان کے حصول کے لیے کام کیا وہ صرف علماء کی یہ جماعت تھی جنہوں نے جمعیت علمائے ہند، مجلس احرار اسلام، سرخ پوش تحریک اور دوسری اسلامی جماعتوں کا مقابلہ کیا چنانچہ قائداعظم نے خود پرچم کشائی کی رسم ادا نہیں کی بلکہ کراچی میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کے مبارک ہاتھوں سے پرچم کشائی کی یہ رسم ادا کروائی۔ اور پاکستان کے دوسرے حصہ یعنی مشرقی پاکستان کے دارالحکومت ڈھاکہ میں پرچم کشائی کے لیے قائداعظم کی ہدایت کے مطابق خواجہ ناظم الدین نے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی کی تحریک پاکستان میں ان کی عظیم الشان خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ کو دعوت دی۔ مولانا ظفر احمد عثمانی نے نہ صرف پرچم کشائی کا اعزاز حاصل کیا بلکہ تمام وزراء اور زعمائے مسلم لیگ کے سامنے اس فتح مبین کے بارے میں ایک وعظ بھی فرمایا۔ خوشی میں توپیں داغی گئیں۔ پھر وزراء نے اسمبلی ہال میں اپنے عہدوں کا حلف اٹھایا۔ چیف جسٹس مشرقی پاکستان سے آپ نے حلف لیا اس کے بعد چیف جسٹس نے گورنر، وزیراعلیٰ اور دوسرے وزراء سے حلف لیا۔



پاکستان بننے کے بعد علماء کا کردار

تحریک پاکستان کا پس منظر صرف اتنا ہی نہیں کہ ہندو مسلمان مل کر نہ رہ سکے اس لیے گھر بٹ گیا۔ یہ تو نظریہ زندگی نہ ہوا حادثہ ہوا، اور پاکستان بطور حادثے کے وجود میں نہیں آیا بلکہ اجتماعیات کے اسلامی فلسفہ کی بنیادوں پر ایک تعمیری تحریک کے ساتھ وجود میں آیا ہے۔ پاکستان منفی محرکات کے عارضی وجود کا نام نہیں بلکہ مثبت حقائق ابدی وجودی کا نام پاکستان ہے۔

انگریزوں کے اقتدار کے خلاف آزادئ ہند کی تحریک کے اصل علمبردار مسلمانوں کے علماء اور مشائخ تھے کیونکہ انگریزوں نے اقتدار مسلمانوں سے چھینا تھا اور جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ سیاسی مصلحت سے وہ مسلمانوں کو پیچھے رکھنا چاہتے تھے۔ تعلیم میں ملازمت میں، تجارت میں اور زندگی کے تمام شعبوں میں صرف یہی نہیں کہ ہندو قوم کو مسلمانوں سے آگے کیا بلکہ ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کی نفرت کے جراثیم داخل کیے، ان کے قلوب میں نفرت بٹھائی۔ گاندھی جی نے مسلمانوں کے سہارے ہندو قوم کو بڑی چالاکی سے اٹھایا اور آزادئ ہند کی تحریک کے نتیجے میں جب اصلاحات ملنے لگیں اور یہ یقین ہو گیا کہ انگریز اب اپنا بوریا بستر باندھ کر چلا جائے گا تو گاندھی جی کی نیت بدل گئی، اس میں فتور آ گیا اور انہوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ انگریز کے جانے کے بعد نہ صرف یہ کہ اقتدار ہندو قوم کے ہاتھ میں آئے بلکہ دس کروڑ مسلمانوں کی خصوصیات، ان کی تہذیب، ان کی ثقافت، ان کی معاشرت اور معیشت اور ان کی روایات کو تیس کروڑ ہندوؤں کی اکثریت میں گم کر دیا جائے۔ چنانچہ ودیا مندر اسکیم جو ملک کے لیے ایک

تعلیمی اسکیم تھی، وہ خالص ہندو قوم یا متحدہ قومیت کے تقاضوں پر مبنی تھا۔ سلام کی جگہ اسکولوں میں نمستے کے لیے بچوں کو مجبور کیا جاتا تھا۔ اللہ اکبر کے بجائے بندے ماترم نے جگہ لے لی تھی، اردو کی جگہ ہندی اور سنسکرت کو جاری کیا جاتا تھا۔ دس کروڑ مسلمانوں کی مؤثر اقلیت کو ہضم کرنے کا طریقہ اختیار کیا تھا کہ یورپ کے فلسفۂ قومیت کے مطابق قومیں ملک اور وطن سے بنتی ہیں، لہٰذا ہندوستان ایک ملک ہے اور یہاں کی چالیس کروڑ آبادی ایک قوم ہے۔ اگرچہ مذہب جدا جدا ہیں، مگر بت پرست، عیسائی، پارسی، یہودی اور مسلمان سب ایک قوم ہیں، کیونکہ ان کا ملک ایک ہے۔ اس ایک قوم کا نام ہندوستانی یا ہندو ہے۔ اس خطرناک بلکہ مہلک تصور کے پیچھے ہندوستان کے مسلمانوں کی تباہی و بربادی اور صفحۂ ہستی سے ان کا نام مٹانے کی اس قدر گہری سازش تھی کہ اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ پہلی مرتبہ مسلمانوں کو یہ احساس ہوا کہ آزادئ ہند کی کوشش جو کانگرس کے مشترکہ پلیٹ فارم سے ہوئی ہے، وہ بالکل غلط اور امت مسلمہ کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے، اور اگر اسی پلیٹ فارم کو ہندوستان کی آزادی کی عنان اقتدار مل جاتی تو مسلم قوم کی نسل باقی رہتی لیکن مذہب فنا ہو جاتا۔ اور حقیقت میں مسلمانوں کے لیے یہ آزادی نہ ہوتی بلکہ بردباری ہوتی۔

ان نازک حالات میں ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کو ہندو کی غلامی سے بچانے اور اسلام کے تحفظ کے لیے اللہ تعالیٰ نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، علامہ اقبالؒ، قائداعظم محمد علی جناح، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد تھانوی عثمانیؒ کو کھڑا کر دیا اور متحدہ قومیت کا جو جال بنایا گیا تھا اس کی سازش کا تار و پود بکھر گیا۔ قائداعظم نے کانگرس کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی اور مسلم لیگ کو منظم اور مضبوط کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ مسلم قوم کو ہضم کرنے کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو گا۔ انہوں نے متحدہ قومیت کی سخت مخالفت کی اور پاکستان کے مطالبہ کی بنیاد ''ٹو نیشن تھیوری'' پر رکھی، اور کہا کہ اسلام میں قومیت کا تصور ملک و وطن، رنگ و نسل اور تہذیب ولسان پر مبنی نہیں بلکہ مذحب و دین پر مبنی ہے، چونکہ ہمارا دین الگ ہے لہٰذا ہماری قومیت بھی الگ ہے۔ ہندوستان میں ایک قوم نہیں بلکہ

دو قومیں بستی ہیں لہٰذا دونوں قوموں کو انگریز کی غلامی سے آزادی ملنی چاہیے۔ اس لیے ہندوستان کو تقسیم کر کے مسلمانوں کو الگ وطن اور الگ ملک دیا جائے جس کا نام ''پاکستان'' ہے تاکہ مسلمان اپنے مذہب اور دین اسلام کے مطابق اپنا نظام حکومت اور نظام معیشت قائم کریں۔ دنیا کی دوسری قومیں ممکن ہے کہ خطۂ زمین اور ملک کے بغیر اپنا مذہب قائم کرسکتی ہوں لیکن اسلام خطۂ زمین اور دارالاسلام کے بغیر اپنا نظام قائم نہیں کرسکتا۔

علامہ اقبالؒ بھی اس متحدہ قومیت کے سخت خلاف تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنے مشہور خطبہ الٰہ آباد میں فرمایا:

> ''ایک سبق جو میں نے تاریخ اسلام سے سیکھا ہے، یہ ہے کہ صرف اسلام تھا جس نے آڑے وقتوں میں مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا نہ مسلمان۔ اگر آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جمادیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سر نو جمع ہو جائیں گی اور آپ کا وجود ہلاکت و بربادی سے محفوظ ہو جائے گا۔'' (خطبات اقبال: ص ۶۴)

21 مارچ 1931ء میں لاہور کے اجلاس میں حضرت علامہ نے نیشنلزم پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

> ''میں نیشنلزم کے خلاف ہوں جیسا کہ یورپ میں اس سے مفہوم لیا جاتا ہے، اس لیے نہیں کہ اس تخیل کو ہندوستان میں نشو ونما پانے کی اجازت دے دی گئی تو اس سے مسلمانوں کو کم مادی فائدہ پہنچے گا، میں اس لیے اس کے خلاف ہوں کہ میں اس کے اندر ملحدانہ مادیت کے جراثیم دیکھتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ جدید دور کی انسانیت کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ حب الوطنی صحیح طور پر ایک قدرتی نیکی ہے اور انسان کی اخلاقی زندگی میں وہ خاص درجہ رکھتی ہے، تاہم جو چیز دراصل اہمیت رکھتی ہے وہ انسان کا عقیدہ

ہے، اس کی تہذیب ہے، اس کی تاریخی روایت ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کے لیے انسان کو زندہ رہنا چاہیے اور جن کے لیے انسان کو اپنی جان تک قربان کر دینا چاہیے۔" (خطبات اقبال: ص ۶۸)

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں حضرت علامہ نے ایک خطاب "ملت بیضا پر ایک نظر" میں اپنے نظریہ قومیت کی ان الفاظ میں وضاحت کی:

"مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراک زبان، نہ اشتراک وطن، نہ اشتراک اغراض اقتصادی ہے بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی، اس لیے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے، اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں پہنچی ہیں وہ بھی سب کے لیے یکساں ہیں۔ اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور اس کی قومیت کا دارومدار ایک خاص تنزیہی تصور ہے جس کی تجسیمی شکل وہ جماعت اور اشخاص ہیں جس میں بڑھتے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت طبعاً موجود ہے۔ اسلام کی زندگی کا انحصار کسی خاص قوم کے خصائص مخصوصہ اور شمائل مختصہ پر نہیں ہے۔ غرض اسلام زمان و مکان کی قیود سے مبرا ہے۔"

(خطبات اقبال: ص ۹۸)

قائداعظم بھی اسی دوقومی نظریہ کے تحت کانگرس سے الگ ہو کر مسلم لیگ میں شامل اور اسی نظریہ کو پروان چڑھایا۔ چنانچہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میرے اور علامہ اقبال مرحوم کے خیالات میں کاملاً ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ہندوستان کے دستوری مسائل کے گہرے مطالعہ کے بعد انجام کار یہی نتائج اخذ کرنا پڑے اور بالآخر انہی خیالات نے

مسلم ہندوستان کے متحدہ عزم کی صورت میں جنم لیا جس کو کل ہند لیگ کے اجلاس منعقدہ 23 مارچ 1940ء میں متشکل کیا گیا جو عام طور پر قرارداد پاکستان کے نام سے موسوم ہے۔"

(اقبال کے خطوط جناح کے نام: ص ۵۵)

نومبر 1945ء میں گاندھی کے نام اپنے ایک خط میں آپ نے لکھا:

"ہم (ہندو اور مسلمان) ہر چیز میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ہم مذہب میں مختلف ہیں، تہذیب و تمدن میں مختلف ہیں، تاریخ میں، زبان میں، طرز تعمیر میں، موسیقی میں، قانون اور اصول قانون میں، کھانے پینے میں، معاشرت میں، لباس میں غرض ہر چیز میں ان سے مختلف ہیں۔ صرف ووٹ ڈالنے کی صندوقچی میں وہ اور ہم یک جا نہیں ہو سکتے۔" (گاندھی جناح مراسلت: ص ۴۰)

جمعیت علمائے اسلام نے قائداعظم کے اس وعدہ پر مسلم لیگ کی اس طرح برملا اور کھلم کھلا حمایت کی تھی کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہوگی اور اس میں اسلامی نظام نافذ ہوگا۔ چنانچہ پاکستان کے پہلے روز حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی نے مولانا شمس الحق فرید پوری کے مدرسہ عربیہ لال باغ ڈھاکہ کی جامع مسجد میں جمعہ سے قبل خطاب فرمایا۔ اس میں آپ نے حصول پاکستان پر شکر خداوندی کی ترغیب دی، اور اس کا طریقہ یہ بتایا کہ پاکستان جس مقصد کے لیے حاصل کیا گیا ہے اس کو پورا کیا جائے۔

مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ نے اپنے خطاب میں ارباب حکومت پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ وہ پاکستان میں حسب وعدہ اسلام کا آئین اور دستور نافذ کریں اور عوام اور ارباب حکومت نماز وغیرہ تمام شعائر اسلام کی پابندی کریں، پاکستان کو شراب خانوں، کلبوں، قحبہ خانوں، جوا خانوں، سود اور سٹے وغیرہ کی لعنت سے پاک کریں، اور اتفاق و اتحاد کے ساتھ پاکیزہ اسلامی معاشرہ قائم کریں۔ فوج اور پولیس کو نماز روزے کا پابند بنائیں اور انہیں خدمت قوم اور پاکستان کی حفاظت کے لیے جان توڑ کوشش کرنے کی ہدایت کریں۔ خفیہ پولیس مستحکم ہو کیونکہ جس حکومت کے پاس یہ خفیہ ایجنسیاں مستحکم

نہ ہوں وہ کمزور حکومت ہوتی ہے۔ خواجہ ناظم الدین وزیراعلیٰ مشرقی پاکستان حضرت مولانا کی اس تقریر کو بڑے غور سے سنتے رہے اور بڑے متاثر ہوئے۔

مشرقی پاکستان میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی کی زیرِ قیادت علمائے اسلام نے پاکستان میں اسلام نظام کے نافذ کرنے کا مطالبہ شروع کر دیا گیا اور مغربی پاکستان میں علامہ شبیر احمد عثمانی اس مطالبہ کی روح رواں تھے۔ حضرت علامہ دستور ساز اسمبلی کے ممبر بھی تھے۔ 10 اگست 1947ء کو متحدہ ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ہدایت پر ایک اجلاس منعقد کیا گیا تا کہ دستور ساز اسمبلی کے افراد منتخب کیے جا سکیں جو قیام پاکستان کے بعد پاکستان کا آئین اور دستور مرتب کریں گے۔ اس دستور ساز اسمبلی کے افراد میں ان حضرات کو نہیں لیا گیا جو مسلم اقلیت کے علاقوں سے 1946ء کے الیکشن میں کامیاب ہوئے تھے۔ جیسے لیاقت علی خان (جو ضلع مظفر نگر سے کامیاب ہوئے تھے) علامہ شبیر احمد عثمانی (جو سہارنپور سے کامیاب ہوئے تھے) اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی (جو دہلی سے کامیاب ہوئے تھے) اس طرح یہ تینوں حضرات دستور ساز اسمبلی کے رکن بننے سے رہ گئے۔ صرف قائداعظم، خواجہ ناظم الدین، سردار عبدالرب نشتر، اور غالباً راجہ غضنفر علی اور جوگندر ناتھ منڈل دستور ساز اسمبلی کے اراکین منتخب ہوئے۔ اور غضب یہ کہ دستور ساز اسمبلی کا چیئرمین جوگندر ناتھ منڈل ہندو کو بنایا گیا اس لیے اجلاس کا آغاز بھی تلاوت قرآن حکیم سے نہ ہو سکا۔ گویا چیئرمین نے اپنے پورے ہندوانہ اختیارات استعمال کیے۔ پھر اس سے بڑا غضب یہ ہوا کہ پاکستان بننے کے بعد پاکستان کی جو پہلی کابینہ بنائی گئی اس میں مسٹر جوگندر ناتھ منڈل کو وزیر قانون بنایا گیا۔ گویا پاکستان کا اسلامی قانون وہ شخص بنائے گا جس نے اپنی چیئرمین شپ میں تلاوت قرآن حکیم نہ ہونے دی۔ قیام پاکستان کے بعد دستور ساز اسمبلی کے افراد کے علاوہ سابقہ عبوری حکومت میں شامل تمام ممبران کی رکنیت اسمبلی ختم ہو گئی تھی، اس لیے اسمبلی میں خلا پیدا ہو گیا تھا۔ علاوہ ازیں دستور ساز اسمبلی کے افراد میں اضافہ بھی ضروری سمجھا گیا۔ اس زمانہ میں صوبائی اسمبلیوں کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ اپنے اپنے علاقوں سے دستور سازی اسمبلی کے لیے ارکان نامزد کر کے مرکز کو بھیجیں۔ چنانچہ اس حق کے تحت مشرقی پاکستان کی اسمبلی

نے بنگال کے کوٹے سے لیاقت علی خان، شیخ الاسلام علامہ عثمانی اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کو منتخب کر کے مرکزی دستور ساز اسمبلی میں رکن کے طور پر نامزد کیا۔ اور اس طرح یہ تینوں حضرات دستور ساز اسمبلی کے ممبر بن گئے۔

اب علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد عثمانی نے پاکستان میں اسلامی دستور نافذ کرانے کے لیے کوششیں کرنے لگے۔ چنانچہ مارچ 1948ء میں قائداعظم گورنر جنرل کی حیثیت سے مشرقی پاکستان کے دورے پر گئے تو مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے تین مرتبہ قائداعظم سے اس بارے میں ملاقات کی۔ پہلی ملاقات آپ نے ڈھاکہ کے مشہور عالم دین مفتی دین محمد خان، مفتی اعظم ڈھاکہ کے ہمراہ گورنر ہاؤس میں صبح 11 بجے کی۔ اس ملاقات میں مولانا ظفر احمد صاحب نے فرمایا کہ جون 1947ء میں مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ دہلی کے موقع پر ہم نے جن خدشات کا اظہار کیا تھا وہ سب درست نکلے کہ پاکستان بنتے ہی ہندوستان میں مسلمانوں پر ظلم وستم اور ان کا قتل عام شروع ہو گیا، اور پاکستان کے پاس فوج تھی اور نہ اسلحہ جس سے اس ظلم کی مدافعت ہو سکتی۔ ہم نے پاکستان اس لیے نہیں بنایا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان اس طرح ہندوؤں کے ظلم کا نشانہ بنتے رہیں۔ پھر اگر پاکستان میں اسلامی آئین بھی نافذ ہو جاتا تو ہم ان سب قربانیوں کو گوارا کر لیتے، کیونکہ

متاع جان جانان جان دینے پر بھی سستی ہے

لیکن حالت یہ ہے کہ آئین اسلام بھی نافذ نہیں ہوا جس کا وعدہ ہم نے مسلمانوں سے کیا تھا اور آپ نے اس اسلامی دستور کا ہم سے وعدہ کیا تھا، اور اسی اسلامی دستور کے لیے ہندوستان کے ان علاقوں کے لوگوں نے بھی مسلم لیگ کو ووٹ دیئے تھے جن کو یقین تھا کہ ہمارا علاقہ پاکستان میں نہیں آئے گا، لیکن ہمارے ووٹ سے کم از کم اسلام کا وطن تو بن جائے گا۔ اسی وعدہ کی بنا پر بہار، یوپی، دہلی یہاں تک کہ مدارس وغیرہ کے مسلمانوں نے پاکستان کے لیے مسلم لیگ کو ووٹ دیئے تھے۔ لیاقت علی خان مظفر نگر سے اشتیاق حسین قریشی دہلی سے ووٹ لے کر رکن اسمبلی منتخب ہوئے۔ ورنہ ان علاقوں کے لوگ بخوبی جانتے تھے کہ پاکستان بن جانے سے ان کو کوئی مادی اور



دنیوی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ ہندوستان کی حکومت ہی کے تحت اپنی زندگی گزاریں گے۔ مگر انہوں نے اس خوشی میں ووٹ دیئے تھے کہ ایک مدت کے بعد ایک نئی اسلامی نظریاتی مملکت دنیا کے نقشہ پر نمودار ہوگی جس کا دستور اور آئین اسلامی ہوگا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ مولانا مظفر احمد عثمانی دستور اسلامی کے بارے میں دوسرے تمام علماء سے زیادہ جدوجہد کر رہے تھے کیونکہ مطالبۂ پاکستان کی حمایت کے لیے انہوں نے ہندوستان کے علماء کو ایک پلیٹ فارم جمعیت علمائے اسلام کے نام پر اکٹھا کیا تھا اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کو بھی یہی میدان سیاست میں لائے تھے اور انہوں نے ہی انہیں جمعیت کی صدارت قبول کرنے پر مجبور کیا تھا۔

قائداعظم نے مولانا ظفر احمد صاحب کی یہ باتیں سن کر کہا کہ ہندوستانی حکومت نے ایک کروڑ کے قریب مسلمانوں کو پاکستان کی طرف دھکیل دیا ہے تا کہ پاکستان کی معیشت پر بار پڑے اور سرمایہ دار ہندوؤں کو یہاں سے بلا لیا تا کہ پاکستان کی اقتصادی قوت مفلوج ہو کر رہ جائے، لیکن پاکستان اللہ کے فضل سے ان مصائب سے دو چار ہونے کے باوجود قائم رہا۔ دستور اسلامی کے نافذ ہونے میں اس لیے دیر ہوئی کہ پاکستان بنتے ہی ان مسلمانوں کی آبادکاری اور بحالی پر زیادہ توجہ دینی پڑی جو ہندوستان سے یہاں آرہے تھے۔ اب ذرا اس طرف سے اطمینان ہوا ہے تو انشاء اللہ بہت جلد پاکستان میں آئین اسلامی نافذ ہو جائے گا۔

ہندوستان سے ایک کروڑ افراد کا پاکستان میں مہاجر بن کر آنا میں سمجھتا ہوں کہ لیگی زعما اور قائدین کے ذہنوں میں پہلے ہی تھا اور انہیں اس کا بندوبست پہلے ہی سے کرنا چاہیے تھا۔ چنانچہ مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری نواب زادہ لیاقت علی خان نے ملک کی تقسیم مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا:

> ''ہندو بھی آزاد ہوں اور مسلمان بھی آزاد ہوں۔ ہندوؤں کی حاکمانہ اور خودمختارانہ حیثیت ہو۔ ہندو اپنی تمناؤں اور اپنی روایات کے مطابق ترقی کر سکیں اور مسلمان اپنی روایات اور تمناؤں کے مطابق۔ دونوں منقسم حصوں میں داخلی طور پر خودمختار اور آزاد حکومتیں

قائم کی جائیں۔ ان کے خودمختار اور آزاد علیحدہ علیحدہ مرکز ہوں۔“

(خطبہ صدارت پولیٹکل کانفرنس شاہجہان پور: مئی ۱۹۴۰ء)

اور قائداعظم نے بھی 11 نومبر 1945ء کو اپنی ایک تقریر میں کہا تھا:

”مسلمانوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ جہاں انہیں اکثریت حاصل ہے وہ وہاں، اور جہاں ہندوؤں کو اکثریت حاصل ہے وہ اپنے رنگ میں اپنی مرضی کے مطابق عمل پیرا رہیں۔ ہر قوم اپنے فلسفہ، اپنے اعتقاد اور اپنے کلچر کے مطابق کام کرے۔ اقلیتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جائے گا خواہ وہ ہندو حلقہ کے مسلمان ہوں یا مسلم حلقوں کے ہندو ہوں۔ جو کچھ ہندو صاحبان مسلم حلقوں میں ہندو اقلیتوں کے لیے طلب کریں گے وہی ان کو اپنے حلقوں کی اقلیتوں کو دینا ہوگا۔“ (اخبار منشور مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۴۵ء)

ان تصریحات کے بعد جب کہ مسلمان ان غیر پاکستانی صوبوں میں ایسی غیر مؤثر اقلیت رکھتے ہیں کہ جذب و ادغام یا بالفاظ دیگر شدھی اور ارتداد سے محفوظ رہ سکیں گے؟ اور کیا ہندو ہندوستان میں ہندوؤں کی تمنائیں اور روایات پوری طرح سے بارآور نہ ہوں گی؟ اور کیا ان کے برلانے کے زیادہ سے زیادہ امکانات ان کو نہ حاصل ہو جائیں گے؟ ہندو اپنی متعصبانہ روش اور اپنے قدیمی میلانات کے لیے پورا آزاد نہ ہوگا؟ خصوصاً لیگ کے وڈیروں کی تصریحات کے مطابق جب کہ ”اپنی تمناؤں، اپنی روایات، اپنے رنگ میں اپنی مرضی کے مطابق حکومت کرنا“ یہ اصول تسلیم کرلیا گیا، اور یہی تقسیم ملک کی بنیادی شرط قرار پا گئی۔ مسلم اقلیت کے برعکس ہندو پاکستانی علاقوں میں اول تو مؤثر عددی اقلیت یعنی 44 فیصد سے زائد رکھتا ہے اور ثانیاً دولت و سرمایہ، تجارت اور تعلیم و تنظیم اور قوت کا ایسا جامع ہے کہ اس کو تحفظ کی ضرورت اور حاجت نہ ہوگی۔ وہ بغیر تحفظ کے نہ صرف خود کو زندہ رکھ سکے گا بلکہ وہ برابر وہاں ترقی بھی کر سکے گا اور جب چاہے گا حکومت میں ڈیڈ لاک اور جمود بھی پیدا کر سکے گا۔ بخلاف غیر پاکستانی علاقہ کی مسلم اقلیت کے کہ وہ ہر طرح عاجز اور مجبور اور اکثریت سے متاثر بلکہ ان کے رنگ سے رنگین

نظر آئے گی، اور یہی وجہ ہے کہ قائداعظم نے کانپور میں مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"میں مسلم اکثریت کے ساڑھے سات کروڑ مسلمانوں کی آزادی کی خاطر مسلم اقلیت والے صوبوں کے اڑھائی کروڑ مسلمانوں کو قربان کر کے ان کے مراسم تجہیز و تکفین ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

(مدینہ بجنور: ۹ جولائی ۱۹۴۴ء)

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ قائداعظم نے جو یہاں اعداد دیئے ہیں وہ درست نہیں ہیں۔ پاکستان میں آنے والے مسلمانوں کی تعداد ساڑھے سات کروڑ نہیں تھی بلکہ پانچ کروڑ اکیانوے لاکھ تھی، اور اقلیت والے صوبوں کے مسلمانوں کی تعداد اڑھائی کروڑ نہیں بلکہ قریباً ساڑھے تین کروڑ تھی، اس سے معلوم ہوا کہ وہ تو پہلے ہی روز سے ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کو موت کے منہ میں اتار کر ان کی تجہیز و تکفین کرنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔

پھر احمد آباد میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے ارشاد فرمایا:

"اقلیت والے صوبوں پر جو گزرتی ہے گزر جانے دو لیکن آؤ ہم اپنے ان بھائیوں کو آزاد کرالیں جو اکثریت کے صوبوں میں ہیں تاکہ شریعت اسلامی کے مطابق وہاں آزاد حکومت قائم کرسکیں۔"

(ایمان، لاہور ۲۸ فروری ۱۹۴۰ء پاکستان نمبر)

غرض کہ پاکستانی فارمولا میں اقلیت والے صوبوں کی مسلم آبادی کو جو مردم شماری کے مطابق قریباً ساڑھے تین کروڑ تھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ان کی زبان، جان، مال، مذہب، کلچر، تجارت اور صنعت وغیرہ سب کے سب خطروں میں ڈال دیئے گئے۔ اور صاف کہا گیا کہ پاکستانی مسلمانوں کی آزادی کے لیے ہندوستان میں رہ جانے والے تین کروڑ انتیس لاکھ مسلمانوں کو ہندوؤں کی بھینٹ چڑھا دو۔ ہندوؤں کو اپنے دیرینہ مقاصد اور دلی تمنائیں اور آرزوئیں پورا کرنے کا پورا موقع فراہم کرو یعنی وہ ان مسلمانوں کو اندلس کے عیسائیوں کی طرح مظالم کا شکار کر کے یا ان

کو شدھی کر لیں یا پھر ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں۔ غرض کہ پاکستانی فارمولا میں اقلیت والے صوبوں کی مسلم آبادی کو جو کہ قریباً ساڑھے تین کروڑ مسلمانوں پر مشتمل تھی، موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

پھر 10 اپریل 1946ء کو مسلم لیگ کے ایک کنونشن کے بعد ایک نمائندہ پریس کے ایک سوال کے جواب میں کہ اقلیت والے صوبوں کی مسلم آبادی کا کیا حال ہو گا، قائداعظم نے فرمایا:

''جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہے ان کی تین صورتیں ہیں: ایک غریب الوطن غیر ملکی زندگی بسر کریں۔ یا پھر ہندو نیشن اختیار کریں (یعنی مرتد ہو کر ہندو بن جائیں) اور تیسری صورت یہ ہے کہ پاکستان تشریف لے آئیں، وہاں ان کا میں استقبال کروں گا۔''

یہ تین آپشن خود قائداعظم نے دیئے تھے، لہٰذا اب یہ کہنا کہ ہندوستانی حکومت نے ایک کروڑ مسلمانوں کو پاکستان میں دھکیل دیا ہے تاکہ پاکستان کی معیشت تباہ ہو، زیادتی ہے۔ آپ کے اپنے فارمولے کے مطابق ایسا تو ہونا ہی تھا۔

یہ بات تو جملہ معترضہ کے طور پر درمیان میں آ گئی۔ قائداعظم نے ایک کروڑ مہاجرین کی پاکستان آمد کا کہہ کر دراصل مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ کو اسلامی نظام کے نافذ کرنے کے بارے میں ٹال دیا تھا۔

دوسری ملاقات مولانا ظفر احمد صاحب کی قائداعظم سے اس وقت ہوئی جب وہ چٹاگانگ کا دورہ کرنے کے لیے ڈھاکہ آئے۔ ایک وفد کا امیر ہونے کی حیثیت سے مولانا نے پھر ملاقات کی اور فرمایا کہ آپ نے حصول پاکستان سے قبل وعدہ کیا تھا کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہو گی اور اس کا دستور کتاب و سنت کے مطابق ہو گا۔ یہ وعدہ جلد پورا کیا جائے کیونکہ ہم نے آپ کے کہنے پر لوگوں سے وعدہ کیا تھا اور اب لوگ ہم سے پوچھتے ہیں کہ پاکستان تو بن گیا اور وہ آپ کا اسلامی نظام کہاں گیا؟

چنانچہ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے اپنی روئیداد ملاقات میں لکھا ہے کہ

''میں نے (قائداعظم سے) کہا کہ مجھے سب سے پہلے یہ عرض

کرنا ہے کہ پاکستان اس لیے نہیں بنا تھا کہ ہندوستان کے لاکھوں مسلمان قتل اور کروڑوں مسلمان خانماں برباد ہو جائیں۔ ہم نے اس خطرہ کو دہلی میں پہلے ہی آپ پر ظاہر کیا تھا مگر آپ نے ہم کو یقین دلایا تھا کہ ایسا نہیں ہوگا، مگر جو خطرہ ہم نے ظاہر کیا تھا وہ پیش آ کر رہا۔ پھر یہ سلسلہ ہنوز ختم نہیں ہوا۔ آپ نے اس کا کیا انتظام کیا؟ پھر اگر پاکستان میں نظام اسلام جاری ہو گیا ہوتا تو ہماری اشک شوئی ہو جاتی اور ہم سمجھتے کہ ان قربانیوں کی تلافی نظام اسلامی جاری ہونے سے ہو گئی ہے۔ جو بہت بڑی نعمت ہے۔ افسوس وہ بھی اب تک نہ ہوا۔ تو ہم قوم کو کیا منہ دکھلائیں کہ جس مقصد کے لیے پاکستان بنا تھا وہ بھی حاصل نہ ہوا اور نقصان حد سے زیادہ ہو گیا۔ قائداعظم نے وفد کو اطمینان دلایا اور کہا کہ چند ناگہانی آفات کی وجہ سے دیر ہو گئی ہے۔ اب زیادہ دیر نہ ہوگی۔

قیام پاکستان کے بعد شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی اور مولانا احتشام الحق تھانوی وغیرہ حضرات اس کوشش میں مصروف ہو گئے کہ دستور پاکستان کی ترتیب کے لیے ماہرین فن کی ایک کمیٹی کی تشکیل ہونی ضروری ہے جو کتاب وسنت کے مطابق پاکستان کا آئین مرتب کر کے دستور ساز اسمبلی کے سامنے پیش کرے۔ چنانچہ دستور ساز اسمبلی نے یہ اختیار علامہ شبیر احمد عثمانی کو دیا۔ علامہ نے اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق قرآن وسنت کے مطابق دستور مرتب کرنے کے لیے، مولانا ظفر احمد عثمانی اور مولانا احتشام الحق کے مشورہ سے ایک کمیٹی تشکیل دی جو مندرجہ ذیل مشاہیر علماء اور فضلاء پر مشتمل تھی۔

1- حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی
2- مفتی اعظم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، دیوبندی
3- ڈاکٹر حمید اللہ پیرس
4- ڈاکٹر عبدالحمید حیدر آبادی

5- علامہ سید سلیمان ندوی

بعد میں یہ کمیٹی سب کمیٹی یا دستور ساز کمیٹی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اتفاق سے اس وقت علامہ عثمانیؒ کے علاوہ باقی تمام افراد پاکستان میں نہ تھے، اس لیے ضرورت اس بات کی تھی کہ دستوری خاکہ مرتب کرنے کے لیے باقی افراد بھی پاکستان لائے جائیں۔ یہ خدمت حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی نے مولانا احتشام الحق صاحب کے سپرد کی۔ چنانچہ حضرت علامہ عثمانی کی ہدایت کے مطابق مولانا احتشام الحق صاحب انڈیا تشریف لے گئے اور تمام حضرات کو دعوت دے کر پاکستان لے آئے، البتہ علامہ سید سلیمان ندویؒ بروقت نہ آسکے، وہ بعد میں تشریف لائے۔ اس طریقہ سے علامہ عثمانیؒ اور مولانا احتشام الحق صاحب نے اتمام حجۃ کے لیے سب حضرات کو جمع کر لیا تاکہ حکومت کوئی بہانہ تلاش نہ کر سکے۔ مذکورہ بالا حضرات نے تین ماہ کی قلیل مدت میں ایک دستوری خاکہ مرتب کر لیا جو ہر اعتبار سے جامع اور قابل عمل تھا۔

ابھی یہ دستوری خاکہ تکمیل کے مراحل طے کر کے دستور ساز اسمبلی میں پیش ہونے والا تھا کہ 11 ستمبر 1948ء کو قائداعظم کی وفات کا سانحہ پیش آ گیا جس کی وجہ سے دستور کا کام تعطل کا شکار ہو گیا اور سیکولر ذہن کے لوگ جو ایک سازش کے تحت پاکستان کے اقتدار پر پاکستان بنتے ہی چھا گئے تھے، آڑے آ گئے۔ جب علامہ عثمانیؒ اور مولانا احتشام الحقؒ نے یہ صورت حال دیکھی تو انہیں احساس ہو گیا کہ یہ لوگ آسانی سے اسلامی دستور اسمبلی میں پاس نہیں ہونے دیں گے۔ چنانچہ علامہ عثمانیؒ نے 10-9 فروری 1949ء کو ڈھاکہ میں جمعیت علمائے اسلام کی ایک کانفرنس طلب فرمائی تاکہ ارباب اقتدار کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جا سکے۔

ڈھاکہ کانفرنس میں علماء اور عوام و خواص کی ایک کثیر تعداد شریک ہوئی۔ حضرت علامہ عثمانیؒ کو اللہ تعالیٰ نے تقریر کے ملکہ کا حظ وافر عطا فرمایا تھا۔ حضرت علامہ نے نہایت زوردار الفاظ میں خطبۂ صدارت پڑھا اور حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی اور حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی نے اپنی سحر انگیز خطابت اور دلائل سے حاضرین کو گرمایا۔ ڈھاکہ کے علاوہ میمن سنگھ اور چٹاگانگ وغیرہ میں بھی بڑے بڑے جلسے ہوئے جن میں

لاکھوں کا اجتماع ہوتا تھا۔ ان تمام اجلاسوں میں یہ طے ہوا کہ پاکستان کا دستور اسلامی ہو گا اور کوئی بھی غیر اسلامی آئین پاکستان کے عوام کے لیے قابل قبول نہ ہو گا۔

مولانا ظفر احمد عثمانی چونکہ آٹھ نو سال سے ڈھاکہ میں مقیم تھے اور تحریک پاکستان میں آپ نے ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ نیز ڈھاکہ اور اس کے اطراف میں حضرت مولانا کا بہت اثر و رسوخ تھا اور آپ کا علمی اور روحانی فیض دور دراز کے علاقوں تک پھیلا ہوا تھا اس لیے پاکستان میں دستور اسلامی کے حق میں رائے عامہ کو ہموار کرنے میں آپ کا اور آپ کے رفقاء کا بہت ہاتھ ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی دین محمد خان اور حضرت مولانا شمس الحق فرید پوری کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ان حضرات کی کوششوں اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے عام جلسوں میں زور دار اور ولولہ انگیز خطابات و بیانات سے رائے عامہ خاصی ہموار ہوئی اور حالت یہ ہو گئی کہ پورا مشرقی پاکستان آئین اسلامی اور دستور شریعت کی صدا سے گونج اٹھا۔

علامہ شبیر احمد عثمانی نے اپنے صدارتی خطبہ میں فرمایا:

''حصول پاکستان کے بعد علماء و مشائخ کی ان مساعی جلیلہ کو ارباب اقتدار نے قطعاً فراموش کر دیا ہے۔ مذہبی طبقہ کی خدمات جلیلہ کا اعتراف تو درکنار نشر و اشاعت کے ان تمام ذرائع سے جو حکومت کے دامن سے وابستہ ہیں، اس کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے کہ مذہبی عنصر زیادہ چمکنے یا ابھرنے نہ پائے، اور جہاں تک ہو سکے اس کو خمول اور کس مپرسی کی حالت میں ہی چھوڑ دیا جائے۔ مطلب یہ ہوا کہ وقت پڑنے پر علماء کو احمق بنا لیا جاتا ہے۔ جب کام نکل گیا تو ان سے کوئی تعلق نہیں۔''

علامہ عثمانیؒ نے پوری ذمہ داری سے ارباب اختیار کو چیلنج کیا کہ

''میں بالکل صفائی سے بتلا دینا چاہتا ہوں کہ یہ صورت حال ہمارے لیے کوئی غیر متوقع چیز نہیں۔ ہم یقیناً پہلے سے جانتے تھے کہ ایسا ہو گا اور پاکستان کی زمام اقتدار کا بحالت موجودہ جن

ہاتھوں میں پہنچنا ناگزیر تھا، ان سے اس کے سوا کوئی اور توقع کی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ ہم ان کی نسبت بحمد اللہ کسی فریب میں مبتلا نہ تھے۔ ہم نے یہ سب کچھ جانتے اور سمجھتے ہوئے جداگانہ قومیت اور حصول پاکستان کی مخلصانہ حمایت مذہبی نقطۂ نظر سے حق اور صحیح سمجھ کر کی، اور آئندہ بھی انشاء اللہ اس کی حفاظت کے معاملہ میں رجال حکومت کی کوئی ناپسندیدہ روش ہماری جدوجہد پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ خواہ ارباب اقتدار ہمارے ساتھ کچھ ہی برتاؤ کریں۔ ہم خالص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اسلام اور اہل اسلام کی برتری اور بہتری کے لیے اپنی اس نئی مملکت کو مضبوط اور محفوظ بنانے میں امکانی کوشش کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں گے۔ ساتھ ہی ہم اس کوشش سے بھی کبھی دست بردار نہیں ہو سکتے کہ مملکت پاکستان میں اسلام کا وہ دستور و آئین اور وہ نظام حکومت تشکیل پذیر ہو جس کی رو سے اس بات کا مؤثر انتظام کیا جائے کہ مسلمان اپنی زندگی اسلام کے انفرادی اور اجتماعی تقاضوں اور اسلامی تعلیمات کے مطابق جو قرآن و سنت سے ثابت ہوں، مرتب اور منظم کر سکے، اور کوئی ایسا قانون، بل اور آرڈیننس جاری یا نافذ نہ ہو سکے جو احکام اسلام کے خلاف ہو۔''

(تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی: ص۱۵۴۔۱۵۵)

اس کامیاب دورہ کے بعد علامہ شبیر احمد عثمانی کراچی تشریف لے آئے۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ پاکستان میں دستور اسلامی نافذ کرانے کی جدوجہد میں مولانا ظفر احمد عثمانی کا ایک خاص حصہ ہے۔ قائداعظم سے ملاقات کے لیے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے جتنے وفد بھیجے ان سب میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ ضرور شامل ہوتے تھے۔ آپ تقسیم ملک سے پہلے ہی پاکستان کے لیے اسلامی دستور بنانے کے لیے مسلم لیگ کے قائدین کو آمادہ کرتے رہے اور مسلم لیگ کے عمائدین سے اس

سلسلہ میں گفتگو کر کے ان سے پاکستان میں دستور اسلامی نافذ کرنے کا وعدہ لیتے رہے، اور اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ بھی ہمیشہ اس پر زور دیتے رہے۔ چنانچہ بٹوارہ سے قبل 11 جون 1947ء کو مولانا مرحوم کی قائداعظم سے جو ملاقات ہوئی تھی اس میں بھی قائداعظم سے پاکستان میں آئین اسلامی نافذ کرنے کے اعلان کے لیے کہا تھا۔ 1948ء میں قائداعظم کو ان کے دورہ مشرقی پاکستان کے موقع پر پھر اس کی طرف توجہ دلائی اور پھر 1949ء میں حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کے ساتھ مشرقی پاکستان کے جلوس میں بھی آپ شرکت کرتے رہے اور اپنی تقاریر میں دستور اسلامی کے جلد نافذ کیے جانے کی حکومت پاکستان کو تاکید فرماتے رہے۔

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا احتشام الحق تھانوی اور ان کے دوسرے رفقاء کے کامیاب جلسوں کا جب ارباب اقتدار کو احساس ہوا تو وزیراعظم لیاقت علی خان نے علامہ عثمانیؒ سے سابقہ تیار شدہ دستوری مسودہ کو آخری شکل دینے کی درخواست کی تاکہ پھر اس کو اسمبلی میں پیش کر کے منظور کروایا جا سکے۔ چنانچہ علامہ عثمانیؒ نے اپنے سابق رفقاء کار اور مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اور مولانا ظفر احمد عثمانیؒ وغیرہ کے تعاون سے سابقہ دستوری خاکہ کو آخری شکل دی جسے دستور ساز اسمبلی میں پیش کیا گیا۔ اس دستوری خاکہ کے ساتھ جو کہ خالص قرآن وسنت پر مبنی تھا، اسمبلی کے سیکولر ذہن رکھنے والے ارکان نے اپنے اختلاف کا ہدف بنایا۔ آخر علامہ عثمانیؒ اور لیاقت علی خان کی کوششوں سے وہ 12 مارچ 1949ء کو پاس کر لیا گیا۔ اب یہ دستوری خاکہ قرار داد مقاصد کے نام سے مشہور ہے۔ اس قرار داد مقاصد کو بھی بعض اضافہ و ترمیم اور ردوبدل کے بعد منظور کیا گیا۔

قرار داد مقاصد کی منظوری کے تاریخی موقع پر لیاقت علی خان نے دستور ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''جناب والا! میں ملی تاریخ میں حصول آزادی کے بعد اس موقع کو سب سے اہم خیال کرتا ہوں۔ حصول پاکستان کی بنیاد اور مقصد اسلامی تعلیمات اور روایات کا نفاذ تھا۔ یہ قرار داد مقاصد اب آئین کا حصہ بن گیا ہے۔ اگر اس کی روح اور منشاء کے مطابق دستور (بقیہ حصہ) مرتب کیا جائے تو اس میں ریاست کے

قانون کا ماخذ کتاب وسنت کے علاوہ کسی اور چیز کو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سیکولرازم، سوشلزم اور دوسرے جتنے لادین ازم ہیں سب کا راستہ خود بخود بند ہو جائے گا۔ بلاشبہ اس قرار داد مقاصد کی ترتیب اور منظوری شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا احتشام الحق تھانوی اور دوسرے علمائے ربانیین کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ مگر یہ قوم وملت کی بدقسمتی تھی کہ قرار داد مقاصد کے اگلے مراحل مکمل ہونے اور دیگر بنیادی اصول طے ہونے سے قبل علامہ شبیر احمد عثمانیؒ 21 صفر المظفر 1369 / 13 دسمبر 1949ء کو بہاولپور میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ یوں یہ کام تشنۂ تکمیل رہ گیا جسے بعد میں مولانا احتشام الحق تھانویؒ نے 22 نکات کی شکل میں پایۂ تکمیل تک پہنچایا، لیکن ارباب اقتدار کے سیکولر ذہن نے گذشتہ اٹھاون برسوں میں دستور اسلامی کو نافذ ہونے نہیں دیا۔

گورنر پنجاب سردار عبدالرب نشتر نے بحیثیت چانسلر پنجاب یونیورسٹی شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی گراں قدر خدمات پاکستان کا اعتراف کرتے ہوئے 9 دسمبر 1949ء کو انہیں ''ڈاکٹر آف اورینٹل لرننگ'' یعنی علوم مشرقیہ کی ڈاکٹریٹ کی ڈگری پیش کی۔

حکومت پاکستان نے آپ کی آخری یادگار قائم کرنے کے لیے ایک وسیع ٹکڑا اراضی الاٹ کر دیا جس پر ایک شاندار مسجد اور ایک دارالعلوم قائم کرنے کا فیصلہ ہوا لیکن یہ فیصلہ کاغذوں تک ہی رہا اور دنیا کے اتنے بڑے مفسر اور محدث کو جس نے پاکستان کے لیے اپنی جان تک کی بھی پروانہ کی، پاکستان کے ارباب اقتدار نے گلدستۂ طاق نسیان بنا دیا۔

قرار داد مقاصد کو غیر مؤثر کرنے کی کوشش:

دستور ساز اسمبلی نے قرار داد مقاصد کی منظوری تو دے دی لیکن بعض بے دین اور سیکولر ذہن کے حامل افراد کو اس کے پاس ہونے سے بڑی تکلیف ہوئی۔ چنانچہ ایک طرف تو وہ عنصر علامہ عثمانی کے سخت خلاف ہو گیا، لہٰذا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت علامہ کو زہر دے کر مارا گیا، اور دوسری طرف ان لوگوں نے اسے ناکام بنانے یا غیر مؤثر بنانے میں اپنی کوششیں تیز کر دیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ ملک غلام محمد نے علامہ عثمانیؒ سے کہا:

''مولانا! آپ کو یہ اپنی روش بدلنا پڑے گی ورنہ نوجوان بھڑک اٹھیں گے، اور کہیں پاکستان کا بھی اسپین والا معاملہ نہ ہو۔'' علامہ عثمانیؒ نے فرمایا: ''ملک صاحب! مجھے اسپین سے نہ ڈرایئے بلکہ افغانستان کے حالات سے عبرت حاصل کیجیے۔ جہاں کے بادشاہ امان اللہ خان نے خلاف اسلام سرگرمیاں شروع کیں تو اسے ملک چھوڑنا پڑا''

انہی لادین اور سیکولر ذہن رکھنے والے افراد کی کارستانیوں سے یہ قرار داد مقاصد دستور کا دیباچہ بن کر رہ گئی، یہاں تک کہ ڈاکٹر نسیم حسن شاہ کی سربراہی میں سپریم کورٹ آف پاکستان نے اس نقطۂ نظر کو بھی مسترد کر دیا کہ اس قرار داد کو دستور سازی میں کوئی مؤثر حیثیت حاصل ہے۔ اس بارے میں عدلیہ اور پارلیمنٹ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ دستوری دفعات کے تصادم و تضاد کی صورت میں جسے چاہیں ترجیح دیں۔ بعد میں جنرل ضیاء الحق نے اس کو دستور کے دیباچہ کے بجائے اس کو دستور کا حصہ بنا دیا۔

تعلیمات اسلامی بورڈ کا قیام:

قرار داد مقاصد کے بعد پاکستان کا دستور کتاب و سنت کے مطابق بنانا ضروری اور لازمی ہو گیا تھا۔ اس عظیم الشان کام کے لیے ماہرین کی ضرورت تھی۔ علامہ عثمانیؒ نے 1949ء میں جس بورڈ کی تجویز پیش کی تھی حکومت نے اس کی منظوری دے دی تھی۔ اس بورڈ کی صدارت کے لیے علامہ سید سلیمان ندویؒ کا نام پیش ہوا لیکن سید صاحبؒ اس وقت ریاست بھوپال میں قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) تھے۔ انہیں وہاں سے لانے کی ذمہ داری حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ پر ڈالی گئی مولانا تھانویؒ نے سید صاحب کو پاکستان آنے پر آمادہ کر لیا۔

یہ تعلیمات اسلامی بورڈ بھی علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی تجویز پر قائم ہوا۔ اس بورڈ کی صدارت کے لیے سید سلیمان ندویؒ کا نام پیش ہوا کیونکہ سید صاحب اپنے وقت کے جامع علوم جدید و قدیم تھے۔ چنانچہ اس کے بارے میں ایک مرتبہ علامہ اقبال نے تحریر فرمایا تھا:

''آج سید سلیمان ندویؒ ہماری زندگی کے سب سے اونچے زینے

پر ہیں۔ وہ عالم ہی نہیں، امیر العلماء ہیں، مصنف ہی نہیں رئیس المصنفین ہیں۔ ان کا وجود علم و فضل کا ایک دریا ہے جس سے سینکڑوں نہریں نکلتی ہیں اور ہزاروں سوکھی کھیتیاں سیراب ہوتی ہیں۔''

(معارف، سلیمان نمبر: ص ۲۸)

نواب زادہ لیاقت علی خان نے سید صاحب اور ڈاکٹر حمید اللہ سے خط و کتابت شروع کی۔ ڈاکٹر صاحب تو پیرس سے آ گئے لیکن سید صاحب بھوپال سے نہ آئے۔ جس کی وجہ سے بورڈ نے بلا صدر اگست 1949ء میں اپنا کام شروع کر دیا۔

مودودی صاحب کا خیال تھا کہ شاید صدارت کا یہ عہدہ مجھے تفویض ہو۔ ان کی جماعت اسلامی نے بھی اس کے لیے بڑی کوشش کی، لیکن جب نوابزادہ لیاقت علی خان نے مولانا احتشام الحق صاحب کو سید صاحب کے پاس بھیجا تو انہوں نے انہیں لاہور آنے پر آمادہ کر لیا۔ سید صاحب جون 1950ء کو لاہور پہنچے۔ مودودی صاحب کو جب سید صاحب کے لاہور آنے کی اطلاع ملی تو انہوں نے سید صاحب سے مل کر ان سے پوچھا:

''کیا آپ نے تعلیمات اسلامی بورڈ کی صدارت کی پیش کش قبول فرمالی ہے۔''

سید صاحب نے نہایت متانت لیکن ظرافت سے مودودی صاحب کو جواب دے کر مایوس کر دیا کہ ''ایجاب ہو چکا ہے قبول باقی ہے۔''

سید صاحب لاہور پہنچے تو ان کے پاس زاد راہ ختم ہو چکا تھا لہٰذا انہوں نے دارالمصنفین کے مقامی ایجنٹ سے مبلغ دو سو روپے ادھار لیے اور چند کپڑوں کے جوڑوں کے ساتھ 14 جون 1950ء کو کراچی پہنچے اور اپنے بڑے داماد سید ابو عاصم صاحب ایڈووکیٹ کے ہاں قیام فرمایا۔

مختصر یہ کہ سید صاحب جون 1950ء کو پاکستان تشریف لائے۔ اس بورڈ کے اراکین میں مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب اور مولانا احتشام الحق تھانویؒ بھی تھے۔ بعد میں اس بورڈ نے ''تعلیمات اسلامی بورڈ'' کے نام سے شہرت پائی۔

سید سلیمان ندوی ارباب اقتدار کے اسلام کے بارہ میں رویہ سے مطمئن نہ تھے لہٰذا انہوں نے واپس ہندوستان جانے کا ارادہ کرلیا، لیکن آپ کے احباب نے واپس جانے سے روک دیا۔ وزیراعظم نے اگرچہ ڈیڑھ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ کی پیش کش کی۔ سید صاحب نے کہا کہ سب سے پہلے شرائط تقرر طے ہونی چاہیے۔ یہ بعد کی چیزیں ہیں۔ یہ سید صاحب کی شان استغنا تھی۔ وزیراعظم نے کہا: کہ نہیں، آپ پہلے شرکت قبول کریں پھر سب کچھ طے ہو جائے گا لیکن سید صاحب نے نوابزادہ صاحب کے اصرار کے باوجود طریق کار کا تصفیہ کیے بغیر بورڈ میں شرکت قبول نہ کی کیونکہ انہیں احتمال تھا کہ جو کچھ علماء اور عوام چاہ رہے ہیں، وہ ارباب اقتدار نہیں چاہتے۔ اس لیے انہوں نے قومی مفاد پر ذاتی مفاد کو قربان کرتے ہوئے گراں قدر پیش کش کو ٹھکرا دیا، اور ''مکتبۃ الشرق'' قائم کر کے کتب فروشی کرنے لگے، اور اس طرح دو سوا دو سال معاشی پریشانی میں گزار دیئے لیکن عالمانہ وقار اور اپنی شان استغنا کو مجروح نہ ہونے دیا۔

اسی کے ساتھ لیاقت علی خان نے مروجہ قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے یا تعلیمات اسلامی بورڈ کی سفارشات کو پرکھنے کے لیے 1950ء میں ایک لاء کمیشن مقرر کیا جس میں جسٹس رشید، جسٹس میمن اور علامہ سید سلیمان ندویؒ وغیرہ شامل تھے۔ بعد میں سید صاحبؒ کے مشورہ سے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع بھی اس کے رکن بنے تھے۔ تعلیمات اسلامی بورڈ کی ذمہ داری میں یہ بات تھی کہ ملک میں کوئی قانون قرآن وسنت کے منافی نہ ہونے پائے اور ہر آئین سازی اور قانونی مسئلہ کو قرآن وسنت کی روشنی میں پرکھ کر پاس کیا جائے گا۔ شبانہ روز محنت کے بعد تعلیمات اسلامی بورڈ نے سفارشات مرتب کیں جو حکومت کے لیے ناقابل قبول تھیں، اس لیے انہیں منظر عام پر لانے کے بجائے چھپا دیا گیا، بلکہ غضب یہ ہوا کہ اغیار کا مرتب شدہ ایک دستور لیاقت علی خان نے 1950ء میں پیش کیا جسے غیر اسلامی ہونے کی وجہ سے علماء نے مسترد کردیا۔

یہاں میں ایک بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ نے اپنے ایک انٹرویو میں کہی تھی۔ آپ نے عام سیاسی لیڈروں کے بارے

میں اپنا تاثر بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اندر سے یہ سب اصلی اسلام کے خلاف ہوتے ہیں کیونکہ حقیقی اسلام ان کی خواہشات کا ساتھ نہیں دیتا۔ اس سلسلہ میں آپ نے فرمایا کہ لیاقت علی خان ہمارے علاقے کے تھے۔ ہم لوگوں کا بہت احترام کرتے تھے۔ ہمیں چھوڑنے کے لیے دروازے تک آتے تھے، لیکن نئی دہلی میں میں نے اور میرے ماموں زاد بھائی مولانا شبیر علی صاحب تھانویؒ نے اسمبلی میں ان سے ملاقات کی۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ پاکستان کے اندر تو اسلامی نظام نافذ ہوگا۔ کہنے لگے ہاں ہوگا، قرآن وسنت کے مطابق ہوگا، لیکن چلتے چلتے ایک بات ایسی کہہ دی کہ مجھے (مولانا احتشام الحق) بہت تکلیف پہنچی۔ کہنے لگے: ''مولانا! ٹخنے کٹا پاجامہ نہیں پہنا جائے گا۔ (ٹخنے کھلے ہوئے ہوں یہ شرعی پاجامہ کہلاتا ہے کیونکہ اسلام میں شلوار، پاجامہ یا پینٹ ٹخنوں سے نیچے رکھنے کی اجازت نہیں) اس کا مذاق اڑایا۔ اسلامی نظام تو ہوگا لیکن ٹخنے کٹا پاجامہ نہیں پہنایا جائے گا۔ یہ ارباب اقتدار اپنے اقتدار کے نشہ میں کچھ ایسے مبہوت ہو جاتے ہیں کہ اسلام کا وہ احترام جو ہونا چاہیے وہ ان کے دلوں میں نہیں ہوتا، خواہ وہ خواجہ ناظم الدین ہوں یا کوئی اور۔ خواجہ صاحب اگرچہ دیندار تھے، تہجد پڑھتے تھے، لیکن ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اگر کہیں شریعت کے مطابق قانون نافذ کر دیا گیا تو ملک کا اللہ ہی حافظ ہے۔ تمام انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کو یہ خیال ہے کہ انفرادی زندگی کے لیے اسلام ایک بہترین مذہب ہے لیکن اجتماعی زندگی کے لیے وہ کامیاب نہیں ہے۔ یہ سبھی سرسید کی اولاد ہیں۔ سب ایک ہی ذہن رکھتے ہیں۔ ان کو مولوی کا اسلام نہیں چاہیے۔ چنانچہ جنرل چشتی اور دوسرے لوگوں نے بیانات دیئے اور وہ بھی جنرل ضیاء الحق کے زمانہ میں جو بڑا نمازی اور پرہیزگار تھا کہ ''پاکستان میں اسلام ہوگا ملاازم نہیں ہوگا'' اور اب تو وہ اسلام ہوگا جو مصطفیٰ کمال کا تھا یا جو امریکہ چاہتا ہے۔ یعنی روشن خیال پاکستان جس میں شراب پینا بھی جائز ہو، رقص وسرور بھی جائز ہو، موسیقی کا دور دورہ ہو۔ وعدہ کر کے مکر جانا بھی جائز ہو اور عورتوں کا نیم برہنہ ہو کر مردوں کی مجلسوں اور ٹی وی پر آنا بھی جائز ہو۔ یعنی وہ تمام پاپ (Pop) ہوں گے جن کو اسلام روکتا ہے لیکن لیبل اس پر اسلام کا ہوگا۔

22 نکاتی دستور کی ترتیب:

قرار داد مقاصد کے پاس ہونے کے بعد 1950ء میں لیاقت علی خان نے اغیار کا مرتب کردہ ایک دستور پیش کیا جسے غیر اسلامی ہونے کی وجہ سے علماء نے مسترد کر دیا۔ اس کے بعد مولانا احتشام الحق اور دوسرے اکابر علماء نے جب لیاقت علی خان سے یہ کہا کہ اسلامی دستور (سفارشات تعلیمی اسلامی بورڈ) کی منظوری دے دی جائے تو اس پر لیاقت علی خان نے کہا: ''آپ لوگوں نے میرا دستور تو مسترد کر دیا، اب آپ خود بتائیں کہ کون سا دستور بنایا جائے؟ بریلوی دستور، شیعہ دستور یا دیوبندی دستور یعنی سفارشات تعلیمی اسلامی بورڈ دیوبندی ہیں اس لیے ناقابل قبول ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ قیام پاکستان سے لے کر اب تک جو شخص بھی مسند اقتدار پر بیٹھا اس نے اسلام کے نفاذ میں کوئی نہ کوئی اڑچن پیدا کر کے اس کے نافذ نہ کرنے کا جواز پیدا کر لیا۔ لیاقت علی خان کو سب کچھ پتہ تھا کہ قائداعظم نے علماء سے دستور اسلامی کے بارے میں کیا کیا وعدے کیے، لیکن ان سب وعدوں کے باوجود لیاقت علی خان کا خود اپنا دل نہیں چاہتا تھا کہ اسلام نافذ ہو کیونکہ اسلام ان لوگوں کی خواہشات کا ساتھ نہیں وہ شراب پینے پر پابندی لگاتا ہے، بے پردگی پر پابندی لگاتا تھا، رقص وسرور کے خلاف ہے، موسیقی اور مجسمہ سازی پر پابندی عائد کرتا ہے، ان لوگوں کی بدقماشیوں پر قدغن لگاتا ہے، لہٰذا ان کا اپنا دل نہیں چاہتا کہ اس ملک میں اسلام نافذ ہو۔ انہوں نے اس وقت بھی عوام کو دھوکہ دیا تھا اور آج تک اپنے بیانات اور رویہ سے دھوکہ دیتے چلے آرہے ہیں، اور ہماری اسلامی جماعتیں دھوکہ کھاتی چلی آرہی ہے کیونکہ وہ یاد رکھ لیں کہ اس ملک میں جمہوریت سے کبھی اسلام نہیں آسکتا، اور نہ ہی کوئی اسمبلی اسلام کو نافذ کر سکتی ہے۔ پاکستان بننے کے بعد پاکستان کی سب سے پہلی اسمبلی نے قرار داد مقاصد کو پاس نہ ہونے دیا۔ آخر بڑی مشکلوں سے اس میں کچھ اضافہ وترمیم کر کے پاس تو کر دیا لیکن اس کو پاکستان کے آئین کا دیباچہ بنا دیا۔ بہرحال لیاقت علی خان نے علماء کو اس اڑچن میں پھنسا دیا کہ کون سا اسلام نافذ کیا جائے۔ اس پر حضرت مولانا احتشام الحق

تھانویؒ نے جو ان لوگوں کے مزاج اور ان کی رگ رگ کے واقف و آشنا تھے، لیاقت علی خان کو یہ بتانے کے لیے کہ پاکستان میں کون سا اسلام نافذ کیا جائے، شب و روز محنت کر کے کراچی میں مختلف مکاتب فکر کے علماء کا ایک نمائندہ اجتماع منعقد کرایا۔ یہ اجتماع 23,22,21 اور 24 جنوری 1951 / 14,13,12 اور 15 ربیع الثانی 1370 کو کراچی میں منعقد ہوا جس میں پاکستان کے دونوں بازوؤں سے 31 اکابر اور جید علماء اکٹھے ہوئے جنھوں نے چار روز کے طویل بحث و مباحثہ اور باہمی گفت و شنید کے بعد 22 نکات پر مشتمل اسلامی دستور بنا کر حکومت کے سامنے پیش کر دیا اور حکومت کو بتا دیا کہ یہ تمام مکاتب فکر کا متفقہ قابل عمل اسلامی دستور ہے۔ آپ اس کو اسمبلی سے منظور کروا کر نافذ کر دیں۔

مختلف مکاتب فکر کے علماء کا یہ نمائندہ اجتماع سید سلیمان ندوی کی صدارت میں ہوا۔ اس نمائندہ اجتماع سے قبل اکابر علمائے کرام کا ایک اور خصوصی اجتماع ہوا۔ اس اجلاس میں جس لائحہ عمل اور متفقہ فیصلہ کا اعلان ہوا وہ درج ذیل ہے:

> "اس اجتماع کی خواہش تھی کہ اس موقع پر اسلامی اصولوں کے مطابق ایک تفصیلی خاکہ بھی مرتب کر دیا جائے۔ چنانچہ اس غرض کے لیے مجلس دستور ساز پاکستان کے صدر سے درخواست کی گئی کہ وہ تعلیمات اسلامیہ بورڈ کی سفارشات کا نسخہ اس اجتماع کو مہیا کریں تاکہ اگر وہ اسلامی اصولوں کے مطابق درست ہو تو اس کی توثیق کر دی جائے، یا اگر اس میں کچھ کمی ہو تو اسے پورا کر دیا جائے، اور نئے سرے سے ایک چیز مرتب کرنے میں محنت صرف نہ کرنی پڑے، لیکن صاحب موصوف نے بعض وجوہ سے اس درخواست کو قبول نہ کیا اور سفارشات کا وہ مسودہ نہ دیا۔ اب یہ اجتماع سر دست ملتوی کیا جاتا ہے اور تمام اسلامی فکر رکھنے والے اصحاب اور اداروں سے درخواست کی جاتی ہے کہ ان متفقہ اصولوں کی روشنی میں دستور اسلامی کے متعلق اپنی اپنی تجاویز ماہ

فروری (1951ء) کے اختتام تک حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی، مسجد جامع جیکب لائن کے پاس بھیج دیں۔ اس کے بعد جلدی ہی یہ اجتماع دوبارہ منعقد کیا جائے گا اور تمام تجاویز پر غور کر کے ایک تفصیلی خاکہ مرتب کر دیا جائے گا۔'' انشاء اللہ العزیز

22 نکاتی دستور کی اشاعت:

مذکورہ اجتماع میں 22 نکاتی دستور کا خاکہ مرتب ہوا اور اجتماع بھی اختتام پذیر ہوا۔ اجتماع کے اختتام پر جو متفقہ دستور (22 نکات پر مشتمل) اجتماع کی طرف سے شائع ہوا، وہ درج ذیل ہے:

ایک مدت دراز سے اسلامی دستور مملکت کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں کہ اسلام کا کوئی دستور مملکت ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کے اصول کیا ہیں؟ اور اس کی عملی شکل کیا ہو سکتی ہے؟ اور کیا اصول اور عملی تفصیلات میں کوئی چیز بھی ایسی ہے جس پر مختلف اسلامی فرقوں کے علماء متفق ہو سکیں۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن کے متعلق عام طور پر ایک ذہنی پریشانی پائی جاتی ہے اور اس ذہنی پریشانی میں ان مختلف دستوری تجویزوں نے اور بھی اضافہ کر دیا ہے جو مختلف حلقوں کی طرف سے اسلام کے نام پر وقتاً فوقتاً پیش کی گئیں۔ اس کیفیت کو دیکھ کر یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ تمام اسلامی فرقوں کے چیدہ اور معتمد علیہ علماء کی ایک مجلس منعقد کی جائے اور وہ بالاتفاق صرف اسلامی دستور کے بنیادی اصول ہی بیان کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ ان اصولوں کے مطابق ایک ایسا دستوری خاکہ بھی مرتب کر دے جو تمام اسلامی فرقوں کے لیے قابل قبول ہو۔

اس غرض کے لیے ایک اجتماع 21 تا 24 جنوری 1951ء کو بصدارت علامہ سید سلیمان ندویؒ کراچی میں منعقد ہوا۔ اس اجتماع میں اسلامی دستور کے جو بنیادی اصول بالاتفاق طے ہوئے ہیں، انہیں فائدہ عام کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔

مجلس دستور ساز پاکستان کی مقرر کردہ کمیٹیوں نے بنیادی حقوق اور بنیادی

اصولوں کے متعلق جو سفارشات پیش کی ہیں، ان کے بارے میں اس اجتماع کی یہ متفقہ رائے ہے کہ یہ سفارشات اسلامی اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتیں۔

اسلامی مملکت کے بنیادی اصول:

اسلامی مملکت کے دستور میں حسب ذیل امور کی تشریح لازمی ہے:

1- اصل حاکم تشریعی وتکوینی حیثیت سے اللہ رب العالمین ہے۔

2- ملک کا قانون کتاب وسنت پر مبنی ہوگا اور کوئی ایسا قانون نہ بنایا جا سکے گا اور نہ کوئی ایسا انتظامی حکم دیا جائے گا جو کتاب وسنت کے خلاف ہو۔

(تشریحی نوٹ) اگر ملک میں پہلے سے کچھ ایسے قوانین جاری ہوں جو کتاب وسنت کے خلاف ہوں تو اس کی تشریح ضروری ہے کہ وہ بتدریج ایک معینہ مدت کے اندر منسوخ یا شریعت کے مطابق تبدیل کر دیئے جائیں گے۔

3- مملکت کسی جغرافیائی، نسلی، لسانی یا کسی اور تصور پر نہیں بلکہ ان اصول مقاصد پر مبنی ہوگی جن کی اساس اسلام کا پیش کیا ہوا ضابطۂ حیات ہے۔

4- اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ قرآن وسنت کے بتائے ہوئے معروفات کو قائم کرے، منکرات کو مٹائے اور شعائر اسلامی کے احیاء و اعلاء اور مسلمہ اسلامی فرقوں کے لیے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے۔

5- اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ مسلمانان عالم کے رشتہ اتحاد واخوت کو قوی سے قوی تر کرنے اور ریاست کے مسلم باشندوں کے درمیان عصبیت جاہلیہ کی بنیادوں پر نسلی اور لسانی، علاقائی یا دیگر مادی امتیازات کے ابھرنے کی راہیں مسدود کر کے ملت اسلامیہ کی وحدت کے تحفظ واستحکام کا انتظام کرے۔

6- مملکت بلا امتیاز مذہب ونسل وغیرہ تمام ایسے لوگوں کی لابدی انسانی ضروریات یعنی غذا، لباس، مسکن، معالجہ اور تعلیم کی کفیل ہوگی جو اکتساب رزق کے قابل نہ ہوں، یا نہ رہے ہوں یا عارضی طور پر بے روزگاری، بیماری، یا

دوسرے وجوہ سے فی الحال سعی اکتساب پر قادر نہ ہوں۔

7- باشندگان ملک کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو شریعت اسلامیہ نے ان کو عطاء کیے ہیں یعنی حدود قانون کے اندر تحفظ جان و مال اور عزت و آبرو، آزادی مذہب و مسلک، آزادی عبادت، آزادئ ذات، آزادی اظہار رائے، آزادئ نقل و حرکت، آزادئ اجتماع، آزادئ اکتساب رزق، ترقی کے مواقع میں یکسانی اور رفاہی ادارت سے استفادہ کا حق۔

8- مذکورہ بالا حقوق میں سے کسی شہری کا کوئی حق اسلامی قانون کی سند جواز کے بغیر کسی وقت سلب نہ کیا جائے گا، اور کسی جرم کے الزام میں کسی کو بغیر فراہمی موقع صفائی وفیصلۂ عدالت کوئی سزا نہ دی جائے گی۔

9- مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدود قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ انہیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہوگا۔ وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کر سکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے، اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہوگا کہ انہی کے قاضی یہ فیصلے کریں۔

10- غیر مسلم باشندگان مملکت کو حدود قانون کے اندر مذہب و عبادت، تہذیب وثقافت، اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی حاصل ہو گی، اور انہیں اپنے شخصی معاملات کا فیصلہ اپنے مذہبی قانون یا رسم و رواج کے مطابق چلانے کا حق حاصل ہوگا۔

11- غیر مسلم باشندگان مملکت سے حدود شرعیہ کے اندر جو معاہدات کیے گئے ہوں، ان کی پابندی لازم ہو گی، اور جن حقوق شہری کا ذکر (دفعہ نمبر 7) میں کیا گیا ہے، ان میں غیر مسلم باشندگان ملک سب برابر کے شریک ہوں گے۔

12- رئیس مملکت کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے جس کے تدین، صلاحیت اور اصابت رائے پر جمہور یا ان کے منتخب نمائندوں کو اعتماد ہو۔

13- رئیس مملکت ہی نظم مملکت کا اصل ذمہ دار ہوگا، البتہ وہ اپنے اختیارات کا کوئی

جزوکسی فرد یا جماعت کو تفویض کرسکتا ہے۔

14- رئیس مملکت کی حکومت مستبدانہ نہیں بلکہ شورائی ہوگی یعنی وہ ارکان حکومت او، منتخب نمائندگان جمہور سے مشورہ لے کر اپنے فرائض انجام دے گا۔

15- رئیس مملکت کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ دستور کو کلاً یا جزاً معطل کر کے شوریٰ کے بغیر حکومت کرنے لگے۔

16- جو جماعت رئیس مملکت کے انتخاب کی مجاز ہوگی وہی کثرت آراء سے اسے معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی۔

17- رئیس مملکت شہری حقوق میں عامۃ المسلمین کے برابر ہوگا اور قانونی مواخذہ سے بالاتر نہ ہوگا۔

18- ارکان وعمال حکومت اور عام شہریوں کے لیے ایک ہی قانون اور ضابطہ ہوگا، اور دونوں پر عام عدالتیں ہی اس کو نافذ کریں گی۔

19- محکمہ عدلیہ محکمہ انتظامیہ سے علیحدہ اور آزاد ہوگا تاکہ عدلیہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہیئت انتظامیہ سے اثر پذیر نہ ہو۔

20- ایسے افکار ونظریات کی تبلیغ واشاعت ممنوع ہوگی جو مملکت اسلامی کے اساسی اصول ومبادی کے انہدام کا باعث ہوں۔

21- ملک کے مختلف ولایات واقطاع مملکت واحدہ کے اجزاء اسلامی متصور ہوں گے۔ ان کی حیثیت نسلی، لسانی یا قبائلی واحدہ جات کی نہیں بلکہ محض انتظامی علاقوں کی ہوگی جنہیں انتظامی سہولتوں کے پیش نظر مرکزی سیادت کے تابع انتظامی اختیارات سپرد کرنا جائز ہوگا، مگر انہیں مرکز سے علیحدہ کا حق نہ ہوگا۔

22- دستور کی کوئی ایسی تعبیر معتبر نہ ہوگی جو کتاب وسنت کے خلاف ہو۔

اسمائے گرامی حضرات شرکائے مجلس:

کراچی کے اس اجتماع میں جو علمائے کرام شریک ہوئے ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

-1 علامہ سید سلیمان ندوی، صدر مجلس
-2 مولانا محمد ظفر احمد انصاری، سیکرٹری بورڈ آف تعلیمات اسلام، مجلس دستور ساز پاکستان۔
-3 مولانا عبدالحامد قادری بدایونی، صدر، جمعیۃ علمائے پاکستان، سندھ
-4 مفتی محمد صاحب داد، سندھ مدرسۃ الاسلام، کراچی
-5 پیر صاحب محمد ہاشم مجددی، ٹنڈو سائیں داد، سندھ
-6 مولانا شمس الحق افغانی، سابق وزیر معارف، ریاست قلات
-7 مولانا محمد داؤد غزنوی، صدر جمعیت اہل حدیث، مغربی پاکستان
-8 قاضی عبدالصمد سربازی، قاضی قلات، بلوچستان
-9 مولانا محمد اسماعیل، ناظم جمعیت اہل حدیث پاکستان، گوجرانوالہ
-10 مولانا محمد صادق، مہتمم مدرسہ مظہر العلوم، کھڈہ، کراچی
-11 مولانا احمد علی، امیر انجمن خدام الدین، لاہور
-12 مفتی حافظ کفایت حسین مجتہد، ادارۂ عالیہ تحفظ حقوق شیعہ پاکستان، لاہور
-13 مفتی جعفر حسین مجتہد، رکن بورڈ تعلیمات اسلام، مجلس دستور ساز، پاکستان
-14 مولانا حبیب اللہ، جامعہ دینیہ دارالہدیٰ، ٹھیڑی، خیر پور
-15 مولانا راغب احسن، نائب صدر جمعیۃ علمائے اسلام، مشرقی پاکستان
-16 مولانا محمد حبیب الرحمٰن، نائب صدر جمعیۃ المدارسین، سرسینہ شریف، مشرقی پاکستان
-17 مولانا ابوجعفر محمد صالح، نائب صدر جمعیت حزب اللہ، مشرقی پاکستان
-18 مولانا شمس الحق فرید پوری، صدر مہتمم مدرسہ اشرف العلوم، ڈھاکہ
-19 مولانا احتشام الحق تھانوی، مہتمم دارالعلوم الاسلامیہ، اشرف آباد، سندھ
-20 مولانا سید محمد بدر عالم، استاذ الحدیث، دارالعلوم الاسلامیہ، اشرف آباد، سندھ
-21 مولانا محمد یوسف بنوری، شیخ التفسیر، دارالعلوم الاسلامیہ، اشرف آباد، سندھ
-22 مفتی محمد شفیع، رکن بورڈ تعلیمات اسلام، مجلس دستور ساز پاکستان

23- مولانا محمد ادریس کاندھلوی، شیخ الجامعہ، جامعہ عباسیہ، بہاولپور

24- حاجی خادم الاسلام محمد امین، خلیفہ حاجی ترنگ زئی، پشاور

25- مولانا خیر محمد جالندھری، مہتمم مدرسہ خیر المدارس، ملتان

26- مولانا مفتی محمد حسن امرتسری، مہتمم جامعہ اشرفیہ، لاہور

27- سید ابوالاعلیٰ مودودی، امیر جماعت اسلامی، پاکستان

28- پروفیسر عبدالخالق رکن بورڈ تعلیمات اسلام، مجلس دستور ساز پاکستان

29- مولانا اطہر علی، صدر جمعیۃ علمائے اسلام، مشرقی پاکستان

30- پیر صاحب محمد امین الحسنات، مانکی شریف، سرحد

31- مولانا محمد علی جالندھری، مجلس احرار اسلام پاکستان

32- مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی، جمعیت اہل حدیث

33- مولانا مفتی دین محمد خان صاحب، مفتی اعظم ڈھاکہ

جس کام کو ارباب اقتدار چار سال کے عرصہ میں نہ کر سکے اور وہ کرنا بھی نہیں چاہتے تھے، وہ مختلف الخیال علماء نے صرف چار دن کے اندر مکمل کر کے دنیا کے سامنے رکھ دیا جس پر ہر طرف سے تحسین و آفرین کے پیغام علامہ سید سلیمان ندویؒ کو موصول ہونے لگے، یہاں تک کہ وہ ارباب اقتدار جو علمائے کرام کو سیاست سے بے بہرہ سمجھتے تھے، انہوں نے بھی اس بے مثال کارنامہ پر مبارک باد دی۔ اس طرح سے علماء نے اسلامی بنیادی اصولوں کو دنیا میں آشکارا کر دیا۔ جن کی تعلیمات اسلامی بورڈ نے بھی سفارش کی تھی اور جنہیں حکومت نے پردۂ اخفاء میں رکھا ہوا تھا اور حکومت نے صدر مجلس کی درخواست کے باوجود بھی دکھلانے سے انکار کر دیا تھا۔ علماء کے اس متفقہ فارمولا نے حکومت کے شائع کردہ بنیادی اصولوں کے پرخچے اڑا دیئے اور ان کا حشر وہی ہوا جو نہرو رپورٹ کا ہوا تھا۔

پاکستان کے سب سے بڑے وکیل مسٹر بروہی نے جو اپنی غلط فہمی کی وجہ سے اپنے کو دین میں بھی اتھارٹی سمجھ بیٹھا تھا، علماء کو یہ چیلنج کیا کہ قرآن حکیم میں دستور مملکت کے بارے میں ایک لفظ بھی موجود نہیں۔ اس کے جواب میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ نے ایک رسالہ ''دستور قرآنی'' لکھا۔ اس رسالہ میں انہوں نے

حکومت کے اغراض و مقاصد، طرز حکومت، فرائض حکومت اور اوصاف صدر مملکت وغیرہ کے متعلق 18 دستوری دفعات کو قرآن حکیم سے پیش کر کے ثابت کیا کہ جس دستور اسلامی کا مطالبہ پاکستان کے مسلمانوں کی طرف سے کیا جا رہا ہے، وہ صرف ماہرین شریعت، علماء وفقہاء کے اجتہادات و قیاسات پر مبنی نہیں بلکہ کتاب اللہ میں موجود ہے۔ یہ رسالہ انہوں نے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں کثیر تعداد میں شائع کر کے ارکان اسمبلی اور ارباب حکومت اور ملک کے تعلیم یافتہ حضرات میں مفت تقسیم کیا۔ وہی مسٹر بروہی جو قرآن میں دستور مملکت کی موجودگی کے منکر تھے، اولین دستوریہ میں بطور وزیر قانون آئین مملکت پیش کرتے ہیں۔

ڈھاکہ کانفرنس:

16 اکتوبر 1951ء کو لیاقت علی خان، وزیر اعظم پاکستان کو راولپنڈی کے ایک جلسۂ عام میں خطاب کرنے کے لیے اٹھتے ہی گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔ لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد خواجہ ناظم الدین ملک کے وزیر اعظم اور ملک غلام محمد گورنر جنرل بنا دیئے گئے۔ میرے خیال میں یہ سب کچھ دستور اسلامی کو سبوتاژ کرنے کے لیے کیا گیا۔ اب حکومت کو مزید پس و پیش کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نازک حالت کا ادراک کرتے ہوئے مولانا احتشام الحق تھانوی نے مولانا ظفر احمد عثمانی کے مشورے سے ڈھاکہ میں ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد کرنے کا اعلان فرمایا۔ اس سے قبل ملک غلام محمد ڈھاکہ گئے تو مولانا ظفر احمد عثمانی نے علماء کی ایک جماعت کے ساتھ ان سے ملاقات کی اور اسلامی دستور جلد از جلد نافذ کرنے پر زور دیا۔ ملک غلام محمد تو ان لوگوں میں سے تھا جو قرارداد مقاصد کی بھی مخالفت کر چکا تھا۔ وہ بھلا اسلامی نظام کیسے نافذ کرا سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے حسب معمول زبانی وعدہ پر علماء کی جماعت کو ٹال دیا۔ بہرحال حسب اعلان ڈھاکہ میں ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد ہوئی جہاں پچاس ہزار علماء اور ایک لاکھ سے زائد عام مسلمانوں نے شرکت کی۔ یہ کانفرنس 14-15 نومبر 1952ء کو منعقد ہوئی۔ کانفرنس میں اور علماء کے علاوہ حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی نے بھی بڑے جذباتی

انداز میں خطاب فرمایا جس سے عوام میں ایک جوش اور ولولہ پیدا ہوا اور آپ نے حکومت کو آخری مہلت دی اور فرمایا کہ ایسا کوئی دستور قبول نہیں کیا جائے گا جو اسلام کے نام پر بنایا گیا ہو مگر اس کی روح اسلام سے خالی ہو۔

اس کانفرنس میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی نے بھی خطاب فرمایا اور حکومت کو اس کے وعدے یاد دلائے۔ آپ اس سے قبل صدر جمعیت علمائے اسلام ہونے کی حیثیت سے ایک بیان میں لیاقت علی خان سے بھی ان الفاظ میں احتجاج کر چکے تھے۔ آپ نے ان بیان میں فرمایا تھا:

> ''میں ان کے (قائداعظم کے) جانشین جناب لیاقت علی خان، وزیراعظم حکومت پاکستان سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ بنیادی حقوق اور بنیادی اصولوں کی کمیٹیوں کی سفارشات قرآن وحدیث کو سامنے رکھ کر تیار کی گئی ہیں یا برطانیہ اور امریکہ کے قوانین کو، میں مسٹر لیاقت علی کو قائداعظم کے اور خود ان کے وہ اعلانات اور وعدے یاد دلانا چاہتا ہوں جن میں بار بار یہ کہا گیا تھا کہ دستور پاکستان، آئین قرآن اور نظام اسلام کے مطابق ہوگا۔ جمعیت علمائے اسلام ایسی سفارشات ہرگز قبول نہیں کرے گی جن میں قرارداد مقاصد اور آئین اسلامی کو نظر انداز کیا گیا ہو۔ اس لیے جمعیت کے تمام ارکان کو اپنی اپنی جگہ ان سفارشات کے خلاف برابر احتجاج کرتے رہنا چاہیے تاآنکہ ان کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے۔'' (دستوری سفارشات اور ان پر تنقید وتبصرہ: ص ۵۵)

ڈھاکہ کی اس کانفرنس میں بھی مولانا ظفر احمد صاحب نے اسی قسم کی زوردار تقریر کی کہ لوگوں کے دلوں میں جوش اور ولولہ کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ مولانا احتشام الحق تھانوی کی تقریر نے سونے پر سہاگے کا کام دیا۔ چنانچہ ہر لحاظ سے یہ کانفرنس نہایت کامیاب رہی۔

اس کانفرنس کی کامیابی نے ایوان اقتدار میں ہلچل پیدا کر دی۔ اس زمانے

کے لیڈر تھوڑے سے عوام سے ڈرتے بھی تھے لیکن مارشل لا کے فوجی حکام عوام کو غیر ملکی مخلوق سمجھ کر ہر قسم کا ظلم روا رکھتے ہیں۔ اور غیر فوجی لیڈر بھی عقوبت خانے اور دلائی کیمپ بناتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ابھی کانفرنس کا تیسرا روز تھا کہ وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین نے اکابر علماء کے نام دعوت نامے جاری کیے جن میں ان سے استدعا کی گئی کہ آپ حضرات جلد کراچی تشریف لائیں تاکہ 22 نومبر 1952ء کو جو دستور ساز میں مسودہ پیش کیا جا رہا ہے اس پر غور و خوض کیا جائے۔ چنانچہ وزیر اعظم کی دعوت پر 9 نومبر 1952ء کو حسب ذیل علماء کرام وزیر اعظم سے گفتگو کے سلسلہ میں کراچی پہنچ گئے:

1- حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ
2- حضرت مولانا مفتی محمد حسین امرتسریؒ
3- حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ
4- حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ، کراچی
5- حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ
6- حضرت مولانا اطہر علی، مشرقی پاکستان۔
7- حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ
8- حضرت مولانا شمس الحق فریدی پوریؒ
9- حضرت مولانا مفتی دین محمد، ڈھاکہ
10- حضرت مولانا محمد داؤد غزنویؒ
11- حضرت مولانا عبد الحق صاحب اکوڑہ خٹک

یہ علماء 19 نومبر 1952ء کو وزیر اعظم ہاؤس پہنچے اور خواجہ، ناظم الدین سے ملاقات کی۔ حکومت کی طرف سے خواجہ ناظم، مولوی تمیز الدین اسپیکر قومی اسمبلی اور سردار، عبد الرب نشتر وغیرہ تھے۔ حضرت مولانا احتشام الحق صاحب نے تمام علماء کا تعارف کرایا اور اسلامی نظام کے نافذ کرنے کے بارے میں اپنے موقف کی کھل کر وضاحت کی۔ حکومت کی طرف سے مولوی تمیز الدین خان نے اپنے تحفظات اور اشکالات پیش کیے جن کا مولانا احتشام الحق نے جو علماء کی طرف سے گفتگو کر رہے تھے،

نہایت جامع مانع اور مدلل و مفصل جواب دیا اور بعض کا حل پیش کیا۔ بالآخر خواجہ ناظم الدین نے کہا کہ آپ حضرات بے فکر رہیں۔ انشاء اللہ عوام اور علماء کی خواہش کے مطابق آئین بنایا جائے گا۔ اس پر حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ نے فرمایا: کہ ہماری بھی دعا ہے کہ ''خدا آپ کو ناظم دین بنائے۔'' اختتامی کلمات کے طور پر حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ نے وزراء کو للکارتے ہوئے فرمایا کہ اگر انہوں نے دستور اسلامی سے ایک انچ بھی انحراف کیا تو پاکستان میں ایک ایسا طوفان آئے گا کہ جس میں آپ لوگوں کے اقتدار کی کرسیوں کا خاتمہ یقینی ہے۔

اجلاس کے اختتام کے بعد علماء کرام امیدوں اور تمناؤں کے ملے جلے ردّعمل کے ساتھ لوٹے اور حکومت نے اعلان کر دیا کہ دستور 22 نومبر کے بجائے 22 دسمبر 1952ء کو اسمبلی میں پیش کیا جائے گا۔ پھر 22 دسمبر کو جو دستوری خاکہ اسمبلی میں پیش کیا گیا اس میں قانون سازی پر قرآن حکیم کی پابندی کا ذکر تو تھا لیکن حدیث اور سنت کا تذکرہ کھا گئے۔ یہ سب کارکنانِ حکومت وزراء اور بیوروکریٹس کا کمال تھا۔ حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ نے اس بات کا سخت نوٹس لیا۔ حضرت مولانا احتشام الحق صاحب نے 11 جنوری 1953ء کو اپنی رہائش گاہ پر علماء کی ایک میٹنگ بلائی جس میں دیگر علماء کے علاوہ مندرجہ ذیل حضرات نے بھی شرکت فرمائی:

1- علامہ سید سلیمان ندویؒ
2- مولانا ظفر احمد عثمانیؒ
3- مفتی محمد حسن امرتسریؒ
4- مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ
5- مولانا ابوالحسنات قادری
6- مولانا محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی
7- مولانا مفتی دین محمد خان صاحب ڈھاکہ

اس اجتماع میں علماء کرام نے چند اہم ترمیمات کے بعد نئے دستور کی تائید کی اور سابقہ 22 نکاتی دستور میں مزید دو حضرات حضرت مولانا مفتی دین محمد خان صاحب

ڈھاکہ اور حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی نے دستخط ثبت کیے۔ (ان حضرات کے دستخط رہ گئے تھے) یوں 33 علماء کرام کے دستخطوں سے سابقہ دستور کو آخری شکل دے دی گئی تاہم اس کی منظوری نہیں ہو سکی کیونکہ گورنر جنرل غلام محمد نے 17 اپریل 1953ء کو خواجہ ناظم الدین اور ان کی کابینہ کو برطرف کر دیا جس سے یہ متفقہ دستور دھرے کا دھرا رہ گیا، ورنہ بعض احباب کا خیال ہے کہ خواجہ ناظم الدین وعدہ کر چکے تھے کہ مذکورہ متفقہ دستور پاس کرا لیا جائے گا اور قرآن کے ساتھ سنت کا لفظ بھی بڑھا دیا جائے گا کیونکہ مجلس قانون ساز کی اکثریت خواجہ صاحب کے حق میں تھی مگر انہی دنوں مسئلہ ختم نبوت بھی اٹھ کھڑا ہوا، اور خواجہ ناظم الدین صاحب کی نازیبا روش کی وجہ سے رائے عامہ ان کے خلاف ہو گئی تھی۔ اس بات کو گورنر جنرل غلام محمد نے بھانپ لیا، اور اسلامی دستور کے نفاذ کا وہ خود بھی مخالف تھا کیونکہ پرانا ICS آفیسر ہونے کے ناطے انگریزوں کی ہر برائی اس کے ذہن و فکر میں جاگزین ہو گئی تھی۔ نام تو ان کا غلام محمد تھا لیکن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اسے کوئی نسبت نہ تھی بلکہ انگریزوں کی غلامی کو وہ اپنے لیے باعث فخر سمجھتا تھا۔ اس وجہ سے موقع مناسب دیکھ کر خواجہ ناظم الدین اور ان کی کابینہ کو یک قلم برطرف کر دیا۔ اگر خواجہ صاحب نے مجلس ختم نبوت کا مطالبہ منظور کر کے مرزائیوں کو اقلیت اور چوہدری ظفر اللہ خان قادیانی کو وزارت خارجہ کے منصب سے الگ کر دیا ہوتا جو کہ پوری امت مسلمہ کا مطالبہ تھا تو گورنر جنرل کا دستوری روایات کے خلاف یہ طرز عمل کبھی بھی کامیاب نہ ہوتا۔ آخر 1947ء میں جب ذوالفقار علی بھٹو نے مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا تو دنیا نے ان کا کیا بگاڑ لیا، لیکن ؏

مردی و نامردی قدمے فاصلہ دارد

خواجہ صاحب بزدل تھے وہ مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار نہ دے سکے۔ بھٹو دلیر اور بہادر تھا، جو چاہتا کر گزرتا تھا، اس لیے اس نے نہایت اچھے طریقے مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا۔

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کا خیال تھا اور آپ نے اپنے اس خیال کا اظہار بھی فرمایا' جس وقت خواجہ ناظم الدین نے اپنے کو گورنر جنرل کے عہدہ کو چھوڑ کر وزارت عظمیٰ کے

عہدہ کو قبول کیا تھا اس وقت مولانا ظفر احمدؒ نے اپنے دوستوں سے فرما دیا تھا کہ خواجہ صاحب نے اچھا نہیں کیا۔ ان کے لیے گورنر جنرل کا عہدہ ہی مناسب تھا۔ اس طرح خواجہ ناظم الدین کے دور میں جو آئین تیار ہوا تھا اور جس کے پاس ہونے کی علماء کو بڑی توقعات تھیں، وہ ان کی وزارت عظمیٰ سے برطرفی کی وجہ سے دھرے کا دھرارہ گیا۔

ملک غلام محمد گورنر جنرل نے نہ صرف کابینہ کو توڑا بلکہ ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کرتے ہوئے 24 اکتوبر 1945ء کو مجلس دستور ساز بھی توڑ کر آج تک اسلامی آئین کی ترتیب وتشکیل کے لیے جس قدر کوششیں ہوتی رہی تھیں، ان سب کو سبوتاژ کر دیا۔ اور اس طرح وہ طبقہ جو دستور اسلامی کے نفاذ کا مخالف تھا، اپنی خفیہ ریشہ دوانیوں کے ذریعہ کامیاب وکامران ہوگیا۔

علماء کرام اور پاکستان کے اسلامی ذہن رکھنے والے احباب کی کوششیں بارآور نہ ہوسکیں، لیکن حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ اور مولانا ظفر احمد عثمانی نے ہمت نہ ہاری اور اپنی مسلسل اور ان تھک کوششیں جاری رکھیں، یہاں تک کہ چوہدری محمد علی پاکستان کے وزیراعظم نامزد ہوئے۔ اس عرصہ میں دونوں علمائے کرام نے اپنے خطابات، ملاقاتوں اور خط وکتابت کے ذریعہ پاکستان میں اسلامی نظام کے مسئلہ کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ ارباب اقتدار کو اس بارے میں یاد دہانی کراتے رہے تا کہ وہ اپنے کیے گئے وعدوں کو گلدستہ طاق نسیان نہ بنا دیں ؎

غلط ہو آپ کا وعدہ کوئی خدا نہ کرے
مگر حضور کو عادت ہے بھول جانے کی
یہ کہہ کے برق نے میرے قفس کو پھونک دیا
کہ تو نے شکل بدل دی ہے آشیانے کی

چنانچہ اس سلسلہ میں ستمبر 1955ء میں چوہدری محمد علی، وزیراعظم پاکستان کو حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے ایک مفصل خط لکھا، جس میں تحریر فرمایا:

"مجھے آپ کی وزارت عظمیٰ کی خبر سن کر بڑی مسرت ہوئی تھی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ آپ نے قائداعظم اور قائد ملت مرحوم کے

ساتھ کام کیا ہے اور ان کو آپ پر کلی اعتماد تھا، اس لیے آپ کی وزارت عظمیٰ سے یہ امید قائم ہو گئی تھی کہ آپ ان مقاصد کو جلد از جلد پورا کریں گے جن کے لیے پاکستان حاصل کیا گیا تھا، مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ایک ہی مہینہ کے اندر ایسی باتیں سننے میں آئیں جن سے یہ امید یاس میں تبدیل ہونے لگی اور خطرناک صورتیں سامنے آنے لگیں۔ اس بنا پر جناب سے چند سوال کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ ان کے تسلی بخش جوابات سے مجھے اور ان سب مسلمانوں کو جنہوں نے قائداعظم اور قائد ملت کے وہ بیانات اور مواعید سن کر جو پاکستان بننے سے پہلے دیئے گئے تھے، ایک خاص نظریہ کے تحت سب کچھ حصول پاکستان کے لیے قربان کر دیا ہے، مطمئن فرمائیں گے۔

1- کیا یہ صحیح ہے کہ آپ کی وزارت نے جگتو فرنٹ کا یہ مطالبہ مان لیا ہے کہ پاکستان میں آئندہ انتخابات مخلوط ہوں گے؟ اگر واقعی یہ تسلیم کر لیا گیا ہے تو میں صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ یہ اس دو قومی نظریہ یعنی ٹو نیشنز تھیوری کے بالکل خلاف ہے جس پر پاکستان کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ کانگرس اور مسلم لیگ کی جنگ مخلوط اور جداگانہ انتخابات ہی کی جنگ تھی۔ دو قوموں کے نظریہ کی جنگ تھی۔ اسی بنیاد پر پاکستان قائم ہوا۔

حیرت ہے کہ وزارت نے سب سے پہلے حملہ پاکستان کے بنیادی نظریہ ہی پر کیا ہے۔ غالباً جناب نے اس کے عواقب میں بھی غور نہیں فرمایا کہ دراصل مخلوط انتخابات کا مطالبہ مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کا مطالبہ ہے۔ چونکہ الیکشن میں جگتو فرنٹ کو مسلم لیگ کے مقابلہ میں ہندوؤں کی امداد نے کامیاب کرایا تھا۔ اس لیے لامحالہ ہندوؤں کے بعض مطالبات ان کو اپنے 21 نکاتی پروگرام میں شامل کرنے پڑے۔ مشرقی پاکستان کا ہندو جس کی تعداد سوا کروڑ کے قریب ہے، مخلوط انتخاب اس لیے چاہتا ہے کہ شیڈول کاسٹ ہندو

پاکستان کی اسمبلی میں نہ آسکیں۔صرف اونچی ذات کے ہندو ہی ان کی سیٹوں پر قابض ہو جائیں۔ نیز وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ پاکستان اسمبلی میں مسلم بھی ایسے پہنچیں جو ہندوؤں کی ہاں میں ہاں ملانے والے ہوں۔مخلوط انتخاب کی صورت میں مسلمان ممبروں کو اپنی کامیابی کے لیے ہندوؤں کے ووٹوں کی بھی ضرورت ہوگی، اور اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ اسمبلی میں وہی مسلمان زیادہ آسکیں گے جو ہندوؤں کے غیر اسلامی نظریات کو پاکستان میں فروغ دینا چاہیں گے۔ پھر مخلوط انتخاب میں جب ہندو مسلمان تمیز باقی نہ رہے گی تو پاکستان ایک حقیقی اسلامی ملک ہرگز نہیں بن سکتا۔ اس لیے ایسی غلطی ہرگز نہ کی جائے۔ حسب دستور سابق انتخابات جداگانہ ہی ہونے چاہئیں ورنہ آپ کی وزارت آپ کے پیشرو محمد علی کی وزارت سے بھی زیادہ بدنام ہو جائے گی۔ان کی غلط سیاست نے تو مسلم لیگ کو مشرقی بنگال میں ختم کر دیا تھا، اور اگر آپ نے مخلوط انتخاب مان لیا تو آپ پاکستان کی بنیاد ہی ختم کر دیں گے۔

2- کیا یہ صحیح ہے کہ جگتو فرنٹ کے لیڈروں کو ''مشرقی پاکستان'' کا نام پسند نہیں؟ وہ اس کا نام ''مشرقی بنگال'' رکھنا چاہتے ہیں؟ اگر یہ واقعہ ہے تو جن لوگوں کو پاکستان کا نام بھی پسند نہیں، ان کو اپنا پاکستانی ہونا کیسے پسند ہوگا؟ پھر ان کو پاکستان کی سالمیت سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟

یہ تو ان مسلمان لیڈروں کا حال ہے جو مخلوط انتخاب سے نہیں بلکہ صرف ہندوؤں کی امداد سے کامیاب ہو کر اسمبلی میں آئے ہیں۔ اسی سے اندازہ کر لیا جائے کہ جو مسلمان ہندوؤں کے ووٹ سے کامیاب ہو کر آئیں گے وہ کیا کچھ ہوں گے؟ پھر جس ملک کا مشرق نہ ہو تو اس کے مغرب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔تو مغربی پاکستان کا نام بھی ختم ہوا۔تو کیا ایسے ہی ممبروں سے مل کر آپ اسلامی دستور بنائیں گے؟ جس کا وعدہ آپ نے وزارت عظمیٰ کی کرسی سنبھالتے ہی قوم سے کیا ہے۔''

3- کیا یہ صحیح ہے کہ ہندو ممبران اسمبلی نے یہ بھی مطالبہ کیا ہے کہ پاکستان کے

نصاب تعلیم سے اسلامیات کا مضمون حذف کر دیا جائے؟ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ پاکستان میں وہی نصاب تعلیم چاہتے ہیں جو انگریز کے زمانہ میں تھا۔ مسلمان اس کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتے۔ پاکستان کی ہندو اقلیت کو اچھی طرح معلوم ہے کہ انڈین یونین کا قیام تو ہندو اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی ملی جلی کوششوں سے وجود میں آیا ہے، لیکن پاکستان کا وجود خالص مسلمانوں کی مساعی اور قربانیوں سے عمل میں آیا ہے۔ ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے قائداعظم اور دیگر زعمائے مسلم لیگ کے اعلانات برابر اس قسم کے ہوتے رہے ہیں کہ مسلمان اپنے لیے ایک قطعۂ زمین الگ اس لیے چاہتے ہیں کہ وہاں اسلامی احکام جاری کر کے مسلمان اسلامی زندگی بسر کر سکیں اور ان کا مذہب وتمدن، کلچر وثقافت اور زبان محفوظ رہے۔ پاکستان بننے کے بعد قرارداد مقاصد میں اس حقیقت کو اچھی طرح سے واضح کر دیا گیا ہے اب اگر ایسی سیدھی اور صاف بات کو بھی بھلا دیا جائے تو اس کا کچھ علاج کسی کے پاس نہیں۔

جناب والا! اگر ہندوؤں کے اس مطالبہ کو مان کر قرارداد مقاصد کے خلاف راۂ عمل اختیار کی گئی تو مسلمان یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ موجودہ دستور یہ نمائندہ اسمبلی نہیں ہے کیوں کہ جو اسمبلی محض اس وجہ سے کہ مرکزی وزارت کا قیام جگتو فرنٹ کے اتحاد کا مرہون منت ہے، پاکستان کے بنیادی نظریات کو پامال کرنے لگے، اس کو کوئی مسلمان بھی نمائندہ نہیں مان سکتا۔

امید ہے کہ جناب والا ان سوالات کے تشفی بخش جوابات سے بہت جلد مسلمانوں کو مطمئن فرمائیں گے، ورنہ آپ یقین جانیں کہ پاکستان کی سالمیت کو سخت خطرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کو تمام آفات سے محفوظ رکھے۔

(آمین)

ظفر احمد عثمانی نائب شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی، شیخ الحدیث

دارالعلوم اشرف آباد، ٹنڈو الہ یار، سندھ

یہ تاریخی خط اس گروہ کے ایک ممتاز فرد کا ہے جس کو موجودہ حکومت جاہل اور دقیانوس کے نام سے یاد کرتی ہے اور بعض حضرات کا فرمان ہے کہ ''یہ لوگ عوام سے بہت حد تک لاتعلق رہتے ہیں، انہیں وقت کے تقاضوں اور دنیا کے موجودہ نشیب و فراز سے کوئی آشنائی نہیں۔ وہ زمانہ سے بہت پیچھے رہ جانے والے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کے اس خط کا جواب وزیراعظم سیکرٹریٹ کراچی سے 18 اکتوبر 1955ء کو وزیراعظم کے معتمد سیاسی جناب صدیق علی خان نے دیا جس میں کہا کہ ''پاکستان کے نصاب سے اسلامیات کا مضمون حذف کرنے کی خبر بالکل بے بنیاد ہے۔ اور رقم کردہ سوالات نمبر 1 اور نمبر 2 زیر غور ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ سوالات نمبر 1 اور نمبر 2 کا معاملہ جگتو فرنٹ کی طرف سے حکومت کو پیش کیا گیا لیکن مولانا عثمانی کے اس خط نے حکومت کو متنبہ کر دیا۔ چنانچہ مولانا عثمانی نے وزیراعظم کا یہ خط ملنے کے فوری بعد وزیراعظم کو ایک اور خط لکھا۔ یہ خط 10 اکتوبر 1955ء کو ارسال کیا گیا۔

مکرمی المحترم دام اقبالہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میرے عریضہ کے جواب میں گرامی نامہ مؤرخہ 18 اکتوبر 1955ء پرائیوٹ سیکرٹری کے قلم سے موصول ہو کر موجب عزت ہوا۔ بہت بہت شکریہ۔ میں نے اخبار ''الجماعت'' کراچی، اخبار تسنیم لاہور میں پڑھا تھا کہ صوبائی اسمبلی کے ہندو ممبران مشرقی پاکستان میں یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ پاکستان کے نصاب تعلیم سے دینیات کا مضمون حذف کر دیا جائے۔ اندیشہ ہے کہ جگتو فرنٹ کے ممبروں سے ساز باز کر کے صوبہ میں وہ کامیاب ہو جائیں گے۔

میرے سوال نمبر 1 اور نمبر 2 کے بارے میں تحریر فرمایا گیا ہے کہ وہ زیر غور ہیں۔

مکرما! یہ دونوں مطالبے ہرگز اس قابل نہیں کہ ان پر غور کیا جائے۔

ان کو فوراً رد کر دینا چاہیے۔ آخر میں ایک بات اور عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ قاعدہ مسلم ہے کہ جب کوئی چھوٹی سلطنت کسی بڑی سلطنت کے ساتھ اپنے کو وابستہ کر دیتی ہے، اور اس کے قوانین اپنے یہاں رائج کر دیتی ہے تو بڑی سلطنت کی قوت اور مدد اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ جب تک مسلمانوں کے دن اچھے تھے تو انہوں نے اپنی سلطنت کو سب سے بڑی سلطنت یعنی حکومت الٰہی کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا۔ اس کے قوانین اپنے یہاں رائج کر دیئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ غیبی طاقت ان کے ساتھ تھی اور یہ ہر مرحلہ میں بڑی سے بڑی طاقت کے مقابلہ میں کامیاب تھے۔ یہی اب کیا جائے تو غیبی امداد آپ کے ساتھ ہو گی۔

پاکستان اس وعدے پر اور اس مقصد کے لیے حاصل کیا گیا تھا کہ اس کو ایک مثالی اسلامی مملکت بنایا جائے گا، مگر افسوس! یہ وعدہ اب تک شرمندہ ایفا نہیں ہوا بلکہ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ دیانت و امانت، خدا ترسی اور پرہیز گاری اور اخلاقی معاشرتی پہلو سے اس وقت پاکستانی مسلمان بجائے ترقی کے بہت تنزل کی طرف جا رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس وعدہ اور مقصد کو جلد سے جلد پورا کیا جائے، ورنہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ قدرت کی طرف سے کس طرح بار بار ہم کو متنبہ کیا جا رہا ہے۔ ہر سال سیلاب وغیرہ سے اس قدر نقصان پاکستان کو پہنچتا ہے کہ اس کی ساری ترقی خاک میں مل جاتی ہے۔ قدرت ہم کو خبردار کرتی ہے کہ کافروں کے طریقہ پر ترقی کرو گے تو حق تعالیٰ ساری ترقیوں کو ذرا سی دیر میں ملیامیٹ کر کے رکھ دے گا۔

اسلامی مملکت کی ترقی کا ایک ہی راستہ ہے کہ اپنے کو حکومت الٰہیہ سے وابستہ کر کے خدائی قانون اپنا کر ترقی کرے۔ الذین ان مکنا ھم فی الارض۔ ''اللہ ہی کے ہاتھ میں تمام معاملات کا

انجام ہے" اس سے مسلمانوں کو وابستہ ہونا چاہیے۔
امید ہے کہ ان معروضات پر غور فرمایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی وزارت کو استحکام اور قوت عطا فرمائے اور آپ کے ذریعہ سے پاکستان میں دستور اسلامی اور قانون شرعی جلد سے جلد نافذ ہو جائے تا کہ وہ صحیح معنوں میں ایک مثالی اسلام کی سلطنت بن جائے۔

والسلام مع الاحترام
ظفر احمد عثمانی

قریباً ایک ماہ کے بعد کراچی میں چوہدری محمد علی وزیر اعظم پاکستان نے سیرت کے ایک جلسہ میں ایک اہم تقریر فرمائی۔ اس میں موصوف نے امت مسلمہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دی۔ مولانا ظفر احمد عثمانی پر اس تقریر کا یہ ردّ عمل ہوا کہ انہوں نے اسی وقت وزیر اعظم کو ایک تبلیغی خط لکھا اور انہیں اپنی اس تقریر پر عمل کرنے کی ترغیب دی۔ خط یہ تھا:

محترم المقام
السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میں نے بارہ ربیع الاول کو آپ کی تقریر دل پذیر کا ریکارڈ سنا جو آپ نے جلسہ سیرت کراچی میں کی ہے۔ ماشاء اللہ! بہترین تقریر تھی، مگر دل یہ چاہتا ہے کہ تقریر سے زیادہ آپ کی حکومت کا عملی کارنامہ سامنے آئے۔ اس میں کیا شبہ ہے کہ اگر مسلمان اپنے رسول اللہ صلی اللہ علہ وسلم کی سیرت پر عمل پیرا ہو جائیں تو کوئی طاقت ان کو شکست نہیں دے سکتی، لیکن ضرورت اس کی ہے کہ وزیر اعظم اور ان کی حکومت ایسا رویہ اختیار کرے جس سے قوم خود بخود اسوۂ رسول اصلی اللہ علیہ وسلم پر چلنے لگے۔
مثال کے طور پر تمام خرافات بند کر دی جائیں جن سے مسلمانوں کے اخلاق و اعمال خراب ہوتے ہیں جیسے شراب کی خرید و

فروخت، سینما، جوا بازی، رنڈی خانے، فحش لٹریچر وغیرہ یک لخت بند کر دیئے جائیں۔ دستور اسلامی کا جتنا حصہ ناظم الدین بی پی سی رپورٹ میں طے ہو چکا ہے اس کو بحال رکھا جائے۔ صرف اس کی خامیاں دور کر دی جائیں، جو ترمیمات علماء سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ عدالتوں میں بہت جلد شرعی قانون نافذ کیا جائے جو فتاویٰ عالمگیری کی صورت میں پہلے سے موجود ہے۔ جس کا انگریزی ترجمہ ہو چکا ہے۔ نصاب تعلیم میں دینیات و اخلاق کی تعلیم پر زور دیا جائے۔ مجھے اخبارات میں یہ معلوم کر کے بہت دکھ ہوا کہ اسلامی دستور کا جو مسودہ آپ کی حکومت قوم کے سامنے لانے والی ہے، اس میں سے رہنما اصول کا باب نکال دیا گیا ہے۔ قرار داد مقاصد بھی بدل دی گئی ہے اور وہ دفعات بھی نکال دی گئی ہیں جن میں قرآن وسنت کی پابندی کو تمام قوانین میں لازم کیا گیا ہے۔ صدر جمہوریہ کے لیے اسلام کی شرط نہیں رکھی گئی۔ اگر آپ کی حکومت کا کارنامہ یہی ہو گا تو سیرت پر تقریر کرنا محض بیکار ہے۔

آپ کو سوچنا چاہیے کہ اس وقت پاکستان سخت نازک دور سے گزر رہا ہے۔ مخالف طاقتیں سر اٹھا رہی ہیں۔ اس وقت حکومت کو اللہ کی مدد اور قوم کے تعاون کی سخت ضرورت ہے۔ اگر دستور پاکستان کا نمونہ وہی ہوا جو اخبارات سے معلوم ہوا ہے تو نہ خدا کی مدد آپ کے ساتھ ہو گی اور نہ ہی قوم کا تعاون حاصل ہو گا، بلکہ اندیشہ ہے کہ پہلے سے زیادہ انتشار پیدا ہو جائے گا۔ ہم نے پاکستان اس لیے نہیں حاصل کیا تھا کہ اس میں مخلوط انتخاب رائج کر کے دو قومی نظریہ کو باطل کر دیں جو پاکستان کی بنیاد ہے، اور اس کا دستور بھی سیکولر بنائیں۔ امید ہے کہ ان حقائق کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔

ظفر احمد عثمانی

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی کی یہ مخلصانہ اور حکیمانہ ترغیب بحمد اللہ موثر اور بار آور ثابت ہوئی اور چوہدری محمد علی وزیر اعظم نے اس گرامی قدر مکتوب کا جواب اپنے قلم سے حسب ذیل دیا:

محترمی! السلام علیکم

آپ کے گرامی نامہ کا شکریہ! جو مشورے آپ نے دیئے ہیں ان پر حتی الوسع عمل پیرا ہونے کی کوشش کروں گا۔ والسلام

مخلص: محمد علی

(منقول از تذکرۃ الظفر: ص۴۰۴)

وزیر اعظم کے خطوط سے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کے خدشات کی تصدیق ہو رہی ہے کیونکہ ان خطوط میں جس طرح نصاب تعلیم سے اسلامیات کے مضمون کو حذف کر دینے والی خبر کی تردید کر دی گئی تھی اسی طرح اخبارات کی دوسری اطلاعات کی تردید نہیں کی گئی تھی۔ اس سے دور دراز مسجدوں اور مدرسوں میں رہنے کے باوجود حضرت مولانا کی سیاسی بصیرت اور زمانہ کے نشیب و فراز اور اس کی رفتار سے آشنائی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یہ وہ حضرات تھے کہ درس و تدریس میں مصروف رہنے کے باوجود ان کی فراست و بصیرت مستقبل کے واقعات کو پہلے ہی سے تاڑ لیتی تھی اور ان کی نظر حالات و واقعات کی رفتار پر رہتی تھی۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ 17 اپریل 1953ء کو خواجہ ناظم الدین کی وزارت عظمیٰ کو ختم کر دیا گیا۔ لیکن حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا ظفر احمد تھانوی اور دیگر جید علماء نے ہمت نہ ہاری اور چوہدری محمد علی وزیر اعظم کو مجبور کر دیا کہ وہ پاکستان میں اسلامی دستور نافذ کرے۔ چنانچہ یہ علماء آخر کار ایک دستور جس میں چوہدری محمد علی کی کوششوں کو بھی کافی دخل ہے 26 فروری 1956ء رات بارہ بجے دستور ساز اسمبلی سے منظور کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس دستور کی رو سے صدر پاکستان کی طرف سے ایک ایسے قانون کمیشن کا تقرر لازمی تھا جو اسمبلی کو تدریجی طور پر اسلامی قوانین بنانے کے لیے سفارش کرتا رہے۔ مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ بھی اعزازی طور پر اس کے ممبر منتخب

ہوئے۔ چنانچہ آپ نے اس لاء کمیشن کے مختلف اجلاسوں میں شرکت فرما کر لاء کمیشن کی دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ اس کمیشن کی افادیت کے بارے میں آپ نے ایک مرتبہ فرمایا:

> ''رہا یہ کہ اس کمیشن سے اچھے نتائج برآمد ہونے کی امید ہے یا نہیں؟ تو اس سے زیادہ نہیں کہ موجودہ قوانین کو شریعت کے موافق بنانے کا طریقہ بتلا دیا جائے۔ آگے حکومت ان سفارشات پر عمل کرے گی یا نہیں؟ اس کا دارومدار حکومت پر ہے۔ حکومت اچھی ہوئی تو عمل ہوگا ورنہ قانون کاغذ ہی میں رہے گا۔''

1956ء کا یہ دستور اگرچہ سابقہ متفقہ دستور نہیں تھا، تاہم یہ دستور کافی حد تک اسلامی تھا۔ اس دستور کے تحت لفظ ''اسلام'' پاکستان کا جزو بنا اور اب بولا جانے لگا ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' ورنہ اس سے قبل صرف ''جمہوریہ پاکستان'' ہی بولا جاتا تھا۔ بلاشبہ 1956ء کے دستور کی منظوری علامہ ظفر احمد عثمانی، مولانا احتشام الحق تھانوی اور دیگر علمائے حق کی ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ یہ دستور چوہدری محمد علی کی وزارت میں 26 فروری 1956ء کو پاس ہوا اور 23 مارچ 1956ء کو نافذ ہوا۔ یوں پاکستان کو قریباً 9 سال کے بعد پہلا دستور نصیب ہوا۔ یہ دستور اگرچہ کافی حد تک اسلامی تھا لیکن اس میں ہر شخص کو مذہب کی تبدیلی کا اختیار دے کر ارتداد کا دروازہ کھول دیا گیا اور اسلامی پرسنل لاء میں قرآن وسنت کے بجائے خود رائی اختیار کی گئی۔

یہ تھی مختصر داستان پاکستان بننے کے بعد 1956ء کے آئین تک کی۔ پھر پاکستان میں جو خالص اسلامی نظام کے لیے بنا تھا، اس میں بھٹو صاحب نے سوشلزم کا نعرہ لگایا۔ سوشلزم درحقیقت ایک لادینی نظام ہے جس کا مفہوم طے شدہ ہے۔ اس کو اسلام کے ساتھ پیوندکاری کرنا یا کسی دوسری اصطلاح سے اس کے مفہوم کو ظاہر کرنا محض ایک لفظی فریب ہے۔ اگر اسلامی مساوات سے مراد معاشی مساوات ہے تو اسلام میں سرے سے اس کا کوئی تصور ہی موجود نہیں۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں تمام صحابہ کرامؓ مالی حیثیت سے مساوی اور برابر تھے؟ اگر نہیں تھے اور یقیناً نہیں تھے

تو پھر اسلامی مساوات کا نعرہ لگانا معلوم نہیں کیا معنی رکھتا ہے؟ عملی طور پر مساوات کا لفظ ایک سیاسی نعرہ ہے جو غریبوں کو بیوقوف بنانے اور ان سے ووٹ حاصل کرنے کے لیے لگایا گیا۔ وگرنہ چین اور روس میں بھی مساوات نہیں ہے۔ اس نعرہ سے لوگوں کو مختلف طبقات میں تقسیم کر دیا گیا۔ اسلام نے معاشی اعتبار سے عدل و انصاف کا درس دیا ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں ہر انسان کو عزت و آبرو کے ساتھ زندگی گزارنے اور اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ان چیزوں سے فائدہ اٹھانے کا پورا پورا حق ہے جو انسان کی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ جس نظام میں بلا امتیاز مذہب و ملت اور طبقات کی تفریق کیے بغیر ہر انسان کو اتنی معاش میسر آ جائے کہ وہ عزت کی زندگی بسر کر سکے خواہ ایک فرد دوسرے کے برابر نہ ہو تو اسے عادلانہ اور منصفانہ نظام کہا جا سکتا ہے۔ لہٰذا سوشلزم کا ترجمہ اسلامی مساوات کرنا بھی ایک فریب ہے اور اسلام کے بارے میں فرضی مساوات کا اظہار کرنا دوسرا فریب ہے، اور پھر سوشلزم کو اسلامی مساوات کی اصطلاح میں چھپانے سے سوشلزم کی لادینیت اپنی جگہ پر ہے، اس میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔

اب پاکستان اگرچہ ایک ایٹمی قوت بن چکا ہے، لیکن نائن الیون کے بعد اب پاکستان کی حیثیت ایک غلام ملک سے زیادہ نہیں۔ اقتدار کے بزرجمہروں نے انسداد دہشت گردی کی فرنٹ لائن میں ہونے کی خاطر ہر ذلیل سے ذلیل سوراخ میں گھسا جا رہا ہے۔ طالبان ایک ہی رات میں مجاہدین سے دہشت گرد ہو گئے، گوانتاناموبے کے پنجروں کو ہم نے بسایا اور ان پنجروں کی آبادکاری پر ہم فخر محسوس کر رہے ہیں۔ ملک میں اپنے ہی بھائیوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنا رہے ہیں، اب یہودیوں کی حکومت کو تسلیم کرنے کی خاطر ان سے پیار کی پینگیں چڑھائی جا رہی ہیں۔ اور شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار اس کی تائید کر رہے ہیں۔ اور مسلم لیگ کے صدر محترم نے ایک ایسا ہنسی خیز بیان دیا جس کو پڑھ کر ایسے لوگوں کی قیادت پر رونا آتا ہے۔ پاکستان کو بنانے والی جماعت بھی مسلم لیگ اور اس کو دولخت اور برباد کرنے والی جماعت بھی مسلم لیگ ہے۔ یہ ہمیشہ اقتدار پرست رہی ہے۔ آج کی مسلم لیگ ہو یا گزرے کل کی۔ اس کے چند شرفاء کو چھوڑ کر 58 سالہ تاریخ اس کے کھوٹے سکوں کی کثرت پر گواہ ہے۔ جنرل ایوب نے اقتدار

پر قبضہ تو یہ کنونشن لیگ بن گئی۔ کبھی یہ پیر پگاڑا کی خایہ بوس ہو کر پگاڑا لیگ ہو گئی، نواز شریف اقتدار کی دلہن سے ہم آغوش ہوا تو یہ نواز لیگ ہو گئی۔ اور جنرل پرویز مشرف نے اقتدار پر شب خون مارا تو یہ لیگ اس کے اردگرد جمع ہو کر (ق) لیگ ہو گئی اور اپنے کردار اور عمل سے اس کے بزرجمہر قدم قدم پر اس کے نظریات اور بصیرت کی تائید کرنے لگے۔ اب (ق) لیگ اقتدار کے ایک شخص کی لونڈی بن کر رہ گئی ہے۔ اور اب تو یہودیوں سے پیار کی پینگیں چڑھانا شروع کر دیں وہ یہودی جن کے دلوں سے عہد نبویؐ سے لے کر آج تک نفرت کی آگ نہیں بجھی۔ اللہ کے غضب کا شکار اس قوم نے چودہ سو سال میں بار بار اپنے رویوں، طرز عمل اور مختلف قسم کی سازشوں سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف حسد و کینہ کے تنور میں جل رہی ہے۔ آج یہودی اور اس کے ایما پر صدر بش پاکستان اور دنیا کے دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کے دلوں سے جہاد کا ولولہ ختم کرنے کے لیے مختلف جتن کر رہے ہیں۔ جس کا آلۂ کار پاکستان کے اقتدار کے بزرجمہروں کو بنایا ہوا ہے۔ تہذیب کے یہ دعویدار جہاد کو دہشت گردی ثابت کر رہے ہیں حالانکہ انہی لوگوں نے جہادیوں کو خوش آمدید کہا تھا۔ آج جہاد کے لفظ سے بش اور ٹونی بلیئر کو وحشت ہوتی ہے اور وہ اسے پاکستان کے نصاب سے خارج کرنے کا حکم دے رہے ہیں، لیکن ہمارے حکمران ''یس سر'' کہہ کر ان کے ہر حکم کی تعمیل کر رہے ہیں۔ حالانکہ جہاد دہشت گردی نہیں ہے۔ جس جہاد کو یہ لوگ دہشت گردی کہہ رہے ہیں، وہ دہشت گردی نہیں ہے بلکہ دہشت گردی اور بربریت تو ان کے ہاں ہے۔ دنیا بھر کے صلیبی رچرڈ دی لائن کی کمان میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے مدمقابل تھے۔ اور ان کے بقول ''وحشی جہادی'' صلاح الدین ایوبی نے جب رچرڈ کو پا پیادہ لڑتے دیکھا کہ اس کا گھوڑا جنگ کے شعلوں کی نذر ہو گیا ہے تو اپنا بہترین گھوڑا بھجوایا کہ میرا دشمن میرے مقابلے میں پا پیادہ نہ لڑے۔ یہ عظمت کس امریکی یا انگریز کے مقدر میں ہے؟ جب رچرڈ بیمار ہوا تو یہی مسلمان جہادی (صلاح الدین ایوبی) طبیب لے کر اس کی عیادت کے لیے پہنچا۔ آج جہاد ان کو دہشت گردی نظر آتا ہے۔

پاکستان کے نصاب تعلیم سے جہاد کو خارج کرنا ضروری ہے کیونکہ اس سے

دہشت گردی کو ہوا ملتی ہے۔ آئرلینڈ کے گورے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دہشت گردوں نے تو پاکستانی نصاب نہیں پڑھا۔ انہیں تو کسی دینی مدرسے کے مولوی صاحب نے جہاد کی تعلیم نہیں دی۔ اس کے باوجود برسوں سے دونوں کی دہشت گردی کے سبب بہنے والا خون مہذب برطانوی حکومت نہیں رکوا سکی۔ کیا امریکی دہشت گردوں نے پاکستان کے کسی دینی مدرسہ سے تعلیم حاصل کر کے ریڈ انڈین شہریوں کے خلاف دہشت گردی روا رکھی تھی؟

جن یہودیوں کے لیے پاکستان کے نصاب سے جہاد کو نکلوایا جا رہا ہے، ان یہودیوں نے خود اپنے بارے میں لکھا ہے کہ

> ''غیر یہود بھیڑوں کا گلہ ہیں اور ہم ان کے لیے بھیڑیئے ہیں، اور کیا آپ جانتے ہیں کہ اس وقت کیا ہوتا ہے جب بھیڑیئے بھیڑوں کو گھیر کر حاوی ہو جاتے ہیں۔'' (Protocols 11:4)

یہودی شیروں نے مسلمان کہلوانے والے حکمرانوں کے منہ پر طمانچہ مارتے ہوئے یہ کہا تھا اور اس نے بالکل درست کہا تھا کہ ''آج مسلمانوں میں نہ کوئی عمرؓ ہے اور نہ ہی کوئی صلاح الدین ایوبیؒ، شرابی اور زانی حکمرانوں سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے''۔ ہماری بدقسمتی کہ کسی مسلمان کو اس ہرزہ سرائی پر انگڑائی لینا نہ سوجھا۔ حکمران حال مست اور مال مست بش ڈاکٹرائن کے سامنے سجدہ ریز ہیں کہ اسی سجدہ کو زندگی اور اقتدار کی طوالت کی ضمانت سمجھتے ہیں اور ملت کفر کو اس بات کا یقین ہو رہا ہے کہ آج وہ مسلمان جو اسلام پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے ہمارے لیے خوف و ہراس کا باعث تھے، دنیا سے ختم ہو گئے۔

یہود و نصاریٰ اسلامی عقیدۂ جہاد سے سخت نالاں ہیں اور نزول قرآن کے وقت سے قرآن حکیم کی تعلیمات کو تبدیل کرنے کے لیے کوششیں کر رہے ہیں۔ چنانچہ 25 اگست 1981ء کو صیہونی وزیراعظم بیگن نے اپنے مصر کے دورے پر مصری صدر انور السادات سے کہا تھا کہ ''میں آپ کی اس بات پر کیسے یقین کرلوں کہ آپ ہمارے ساتھ واقعتاً دوستی چاہتے ہیں جب کہ آپ کے طلبہ کو آج بھی اس قرآنی آیت کی تعلیم دی جاتی ہے: ''لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل علی لسان داؤد و عیسیٰ ابن مریم'' (المائدہ) یعنی بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر

سیدنا داؤد اور سیدنا عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی زبان سے لعنت کی گئی۔ صیہونی وزیراعظم کے اس اعتراض پر انوار السادات نے اپنے وزیر تعلیم کو بلا کر حکم دیا کہ ایسی تمام آیات قرآنی کو نصاب سے نکال دیا جائے جن میں یہود دشمنی کا ذکر ہے۔ چنانچہ مصر کے تعلیمی نصاب میں سے آیات جہاد، یہودیوں کی مسلم دشمنی، کفار سے محبت اور دوستی کی ممانعت اور پردہ وحیاء کی آیات نکال دی گئیں۔ امریکی صدر بل کلنٹن نے دسمبر 2001ء کو عرب ممالک کے دورے کے دوران سربراہان حکومت سے کہا تھا کہ عرب ممالک اپنے نصاب تعلیم میں ضرور اضافہ وترمیم کریں تاکہ عالمی سیاسی معاشرے کی تشکیل میں آسانی ہو۔

برطانیہ کے ایک وزیراعظم گلیڈ اسٹون نے بھرے مجمع میں قرآن حکیم کو اٹھا کر بلند آواز میں کہا تھا کہ جب تک یہ کتاب دنیا میں باقی ہے دنیا متمدن اور مہذب نہیں ہو سکتی۔ اسی بات کو نیوز ویک اور ٹائم میگزین کے ایک مضمون نگار نے یہ لکھا کہ دہشت گردی اور شدت پسندی کا پہلا اڈہ مدرسہ اور دوسرا اڈا مسجد ہے۔ (جنگ کراچی ۱۱ اکتوبر ۲۰۰۱ء)

یہ سارے اعتراضات جو ہم پر ہو رہے ہیں اور یہ ساری ذلت جو آج ہمیں دنیا میں اُٹھانی پڑ رہی ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو خاکے نشر کیے جا رہے ہیں، اس کا واحد سبب انگریز دوستی ہے۔ اور اس کی بنیاد اس امریکی دوستی پر ہے جو ہم نے امریکہ کی حفاظت کے لیے اپنے آپ کو دہشت گردی کی فرنٹ لائن میں شامل کر لیا اور آج اس پر بڑا فخر کر رہے ہیں، اور اس حماقت کی وجہ سے پاکستان کو غیر محفوظ بنا دیا ہے۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ سے ایک مرتبہ کسی شخص نے 1857ء کے بعد مسلمانوں کی پستی اور انگریز دوستی کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا:

''ابھی کیا ہے، وہ وقت بھی آنے والا ہے جب مسلمان انگریز دوستی کی بدولت اس سے بھی زیادہ ذلیل اور رسوا ہوں گے، اور اس کے بعد پھر خدا ان کو سمجھ دے گا اور وہ اپنی اس روش سے متنفر ہو کر اپنی اجتماعی عزت کے لیے کوشاں ہوں گے''۔ (یعنی یہ نہیں کہیں گے کہ ''سب سے پہلے پاکستان''۔ ظفر)

19 اکتوبر 2002ء کی شب بی بی سی اردو سروس نے بتایا کہ انڈیا کی ایک مشہور ہندو جماعت ''ویشوا ہندو پریشد'' نے مطالبہ کیا ہے کہ قرآن حکیم سے یا تو جہاد کی آیات

نکال دی جائیں جن سے دہشت گردی کی راہیں کھل رہی ہیں یا پھر قرآن کی طباعت پر پابندی لگا دی جائے۔آج اسی ڈگر پر پاکستان کی حکومت گام زن ہے۔اس لیے حکومت کبھی ماڈل دینی مدارس کا اعلان کر رہی ہے، کبھی درس نظامی کے نصاب میں تبدیلی کے لیے علماء پر دباؤ ڈال رہی ہے، کبھی موجودہ دینی مدارس پر مختلف قسم کی پابندیاں عائد کر رہی ہے اور کبھی علماء کو پیسوں اور نوکریوں کا لالچ دے کر اپنے مطالبات منوانے کی کوشش کر رہی ہے۔کبھی یہ کہہ رہی ہے ہم پر کسی قسم کا دباؤ نہیں بلکہ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ دینی مدارس کے طلبہ بھی موجودہ زمانے کا ساتھ دیں اور جدید علوم سے واقف و آشنا ہوں تاکہ وہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اچھی ملازمت حاصل کرسکیں، لیکن دنیا جانتی ہے کہ یہ سب کچھ امریکی دباؤ کے تحت صرف یہود و نصاریٰ کو خوش کرنے کے لیے کیا جارہا ہے لیکن وہ پھر بھی خوش نہیں ہو رہے۔قرآن نے چودہ سو سال پہلے کہا تھا"ولن ترضیٰ عنک الیھود والنصاریٰ حتی تتبع ملتھم"

یہ بات ہر شخص کے ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔اور یہ اسلام کے نظریہ پر قائم ہوئی۔جب تک اسلام یہاں نافذ نہ ہوگا اللہ نہ کرے اس کا قائم رہنا مشکل ہے۔لیکن نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہوگیا، باوجود اس شدت کے ساتھ مطالبات کرنے اور اتنی جدوجہد کے اس ملک میں اسلام نافذ نہیں ہوا، اور اب تو ملک کا دین دار طبقہ نفاذ اسلام سے مایوس ہو چکا ہے۔اور اسلامی نظام کا مطالبہ کرنے والی جماعتیں بھی اب پوری سیاسی جماعتیں ہو چکی ہیں اور وہ الیکشن میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ہر وہ غیر اسلامی حربہ اختیار کر رہی ہیں جو دوسری غیر اسلامی جماعتیں کرتی ہیں۔اب تو ان کا منتہائے مقصود بھی صرف الیکشن میں کامیابی ہے، اسلام کی بات ان کے ذہنوں سے نکل چکی ہے۔اور ارباب اقتدار گذشتہ اٹھاون برس سے اسلام کو نافذ نہ کرنے کے لیے مختلف بہانے اور حیلے تراش رہے ہیں۔ایک وہ زمانہ تھا کہ لیاقت علی خان نے علماء سے کہا کہ کون سا اسلام نافذ کیا جائے؟ اور کس فرقے کا اسلام نافذ کیا جائے؟ اس پر حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ نے مختلف فرقوں کے علماء کو اکٹھا کر کے ایک دستوری خاکہ تیار کروایا اور حکومت کو نفاذ کے لیے پیش کیا لیکن وہ نافذ نہ ہوسکا۔

ایک اور موقع پر سکندر مرزا نے ''قومی آواز'' کے نمائندہ کو انٹرویو دیا اور اس سوال کے جواب میں کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہوگا یا سیکولر؟ کہا:

> ''گذشتہ تیرہ سو سال کے عرصہ میں آپ ہی بتایئے کہ کسی ملک میں بھی حکومت کی بنیاد قرآن پر رہی ہے؟ اور اگر کسی دور میں اسلامی حکومت اس سے پہلے نہیں ہوئی ہے تو آج کیسے ہوسکتی ہے؟
>
> (صدق جدید: جد۴نمبر،۵۰ص۲)

ارباب اقتدار کی طرف سے اس اعتراض کا جواب مفسر قرآن حضرت مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے یہ دیا کہ

ادوار ذیل میں تو قرآن حکیم برابر آئین سلطنت کا کام دیتا رہا۔

1- محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم 628ء تا 632ء جب رقبہ حکومت 10 لاکھ مربع میل تھا۔

2- سیدنا ابوبکر صدیقؓ 632ء تا 634ء جب رقبۂ حکومت 13 لاکھ مربع میل تھا۔ بشمول عراق وشام جنوبی وغیرہ۔

3- سیدنا عمر فاروقؓ 634ء تا 644ء جب رقبہ حکومت 27 لاکھ مربع میل تھا بشمول ایران، شمالی شام، مصر، طرابلس وغیرہ۔

4- سیدنا عثمان بن عفانؓ 644ء تا 656ء جب رقبۂ حکومت 35 لاکھ مربع میل تھا بشمول شمالی افریقہ ومغربی جزائر، بحیرہ روم وغیرہ۔

5- سیدنا علی مرتضیٰؓ 656ء تا 661ء جب رقبۂ حکومت 35 لاکھ مربع میل تھا۔

6- سیدنا حسن بن علیؓ 661ء تا 663ء جب رقبۂ حکومت 35 لاکھ مربع میل تھا۔

7- سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ 717 تا 720ء جب حدود سلطنت کہیں زیادہ وسیع ہو چکے تھے بشمول افغانستان، کردستان، ترکستان، خراسان اور اندلس وغیرہ۔ یہ تو تاریخ کی کھلی ہوئی شہادت ہے، ورنہ ان کے علاوہ بھی کیا ہندوستان اور کیا عراق اور کیا شام اور کیا سپین، ہر مسلم ملک کے بیسیوں فرمانروا اپنے آئین حکومت کو قرآن سے قریب لانے کی کوشش کم وبیش کامیابی کے ساتھ کرتے

رہے، اور پھر سب سے بڑھ کر روشن مثال تو آج کی مملکت حجاز کی ہے۔ نجد و حجاز کا دستور العمل آج بھی قرآن ہی ہے، اور ابھی دو ہی چار سال کی بات ہے کہ جب امریکہ میں ساری دنیا کے ملکوں کے آئین اکٹھے کیے جا رہے تھے تو اس کی مانگ پر سلطان عبدالعزیز ابن سعود مرحوم نے اپنے ہاں سے قرآن ہی بھجوا دیا تھا، یہ کہہ کر کہ ہمارا آئین و دستور یہی ہے۔

آئیڈیل اور مثالی نصب العین کوئی سا بھی ہو، یہ ضروری نہیں کہ اس کے ماننے والے ایک ایک جزئیہ میں اس پر چلنے میں کامیاب ہو جائیں، بلکہ جو نصب العین جتنا زیادہ بلند ہوگا اسی نسبت سے اس کی پیروی بھی دشوار اور ہمت طلب ہوگی، لیکن اس سے اس کے مطلوب و مقصود ہونے پر ہرگز کوئی اثر نہیں پڑتا۔

(صدق جدید: جلد۴ نمبر۵۰، ص۲)

گویا اسلامی آئین کی تیاری اور نفاذ کے خلاف ارباب اقتدار نے جس قدر بھی ہوائی قلعے تیار کیے، ہر زمانہ کے گوشہ نشین علمائے اسلام نے دلائل و شواہد کی توپوں سے سب گرا دیے، لیکن ان اٹھاون برسوں میں پھر بھی صحیح معنوں میں اسلامی نظام کا نفاذ نہ ہوا اور نہ آئندہ ہونے کا کوئی ظاہری امکان نظر آ رہا ہے۔

یہی اسکندر مرزا جو اسلامی آئین کا قائل ہی نہ تھا، 1955ء میں حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب قاسمیؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند پاکستان تشریف لائے اور کراچی میں ایک عشائیے کی تقریب میں حسن اتفاق سے ان کی اسکندر مرزا سے ملاقات ہوگئی۔ اسکندر مرزا نے اسلامی آئین کے بارے میں چند اشکالات حضرت قاری صاحبؒ کے سامنے پیش کیے تو انہوں نے اس کے اشکالات کا حکمت قاسمی سے ایسا مدلل جواب دیا کہ اسکندر مرزا بے تابانہ کہہ اٹھا کہ اگر واقعی اسلام کے بنیادی اصول یہی ہیں تو ہم اسے ہر قیمت پر منظور اور نافذ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ قاری صاحب نے فرمایا کہ قرآن کی رو سے اسلامی دستور صرف 17-18 دفعات پر مشتمل ہے باقی سب بائیلاز یا رولز ہیں جن کو لوگ غلط فہمی سے اسلامی آئین سمجھ رہے ہیں۔ اس پر اسکندر مرزا نے خواہش ظاہر کی کہ وہ ہندوستان واپس جانے کا ارادہ منسوخ کر کے یہاں رہیں اور اسلامی آئین مرتب

کرنے میں ہماری مدد کریں لیکن دارالعلوم کی ذمہ داریوں کے باعث اسکندر مرزا کے اصرار کے باوجود یہاں ٹھہرے پر آمادہ نہ ہوئے اور فرمایا کہ یہاں اس سلسلہ میں دوسرے حضرات موجود ہیں۔ مختصر یہ کہ حضرت قاری صاحب کی ایک ہی ملاقات نے اسکندر مرزا کی اس بارے میں ساری غلط فہمیاں دور کر دیں اور بالآخر اس نے 2 مارچ 1956ء کو ایک شاندار اور پروقار تقریب میں آئینی بل پر اپنے دستخط اور مہر ثبت کر کے اسے قانونی شکل دے دی اور سکندر مرزا جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کا پہلا صدر بلا مقابلہ منتخب کیا گیا۔ (تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی ص ۲۳۱)

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ پاکستان بناتے وقت پوری مسلمان قوم کو مسلم لیگی وڈیروں نے دھوکہ دیا کہ پاکستان اسلامی نظام کے قیام کے لیے بنایا جا رہا ہے۔ اور اس بارے میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری قدس سرہ کی وہ بات بالکل صحیح اور درست ثابت ہوئی جو انہوں نے 26 اپریل 1946ء کو دہلی کے ایک بہت بڑے جلسہ میں کہی تھی، جس کو ہم پہلے بھی نقل کر چکے ہیں، لیکن اسی مرد قلندر کی بات پر اس کتاب کو ختم کرتے ہیں۔

> ''اس وقت آئینی اور غیر آئینی دنیا میں یہ بحث چل رہی ہے کہ آیا ہندوستان میں ہندو اکثریت کو مسلم اقلیت سے جدا کر کے برعظیم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ مجھے پاکستان بن جانے کا اتنا ہی یقین ہے جتنا اس بات پر کہ صبح کو سورج مشرق سے طلوع ہوگا، لیکن وہ پاکستان نہیں بنے گا جو دس کروڑ مسلمانان ہند کے ذہنوں میں موجود ہے اور جس کے لیے آپ بڑے خلوص سے کوشاں ہیں۔ ان مخلص نوجوانوں کو کیا معلوم کہ کل ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔
>
> ''بات جھگڑے کی نہیں سمجھنے اور سمجھانے کی ہے، لیکن تحریک (مسلم لیگ) کی قیادت کرنے والوں کے قول و فعل میں بلا کا تضاد اور بنیادی فرق ہے۔ اگر مجھے آج کوئی اس بات کا یقین دلا

دے کہ کل کو ہندوستان کے کسی قصبہ کی گلی میں یا کسی شہر کے کسی کوچہ میں حکومت الٰہیہ کا قیام اور شریعت اسلامیہ کا نفاذ ہونے والا ہے تو رب کعبہ کی قسم! میں آج ہی اپنا سب کچھ چھوڑ کر آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں، لیکن یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ جو لوگ اپنی اڑھائی من کی لاش اور چھ فٹ کے وجود پر اسلامی قوانین نافذ نہیں کر سکتے، جن کا اٹھنا بیٹھنا، جن کا سونا، جن کا جاگنا، جن کی وضع قطع، جن کا رہن سہن، بول چال، زبان و تہذیب، کھانا پینا اور لباس وغیرہ غرض یہ کہ کوئی چیز بھی اسلام کے مطابق نہ ہو، وہ دس کروڑ کی انسانی آبادی کے ایک قطعۂ زمین پر اسلامی قوانین کس قدر نافذ کر سکتے ہیں؟

''ہندو اپنی مکاری اور عیاری سے پاکستان کو ہمیشہ تنگ کرتا رہے گا۔ اسے کمزور بنانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ اس تقسیم کی بدولت آپ کے دریاؤں کا پانی روک لے گا۔ آپ کی معیشت تباہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ آپ کی یہ حالت ہوگی کہ بوقت ضرورت مشرقی پاکستان مغربی پاکستان کی اور مغربی پاکستان مشرقی پاکستان کی کوئی سی مدد کرنے سے قاصر ہوگا۔

''اندرونی طور پر پاکستان میں چند خاندانوں کی حکومت ہوگی اور یہ خاندان زمینداروں، صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کے خاندان ہوں گے۔ امیر دن بدن امیر تر ہوتا چلا جائے گا اور غریب غریب تر۔'' (روزنامہ الجمعیۃ، دہلی مؤرخہ ۲۸ اپریل ۱۹۴۶ء)

دیکھ لیں حضرت شاہ صاحب کے الہامی فقرات حرف بحرف درست ہورہے ہیں، اور آج پاکستان کی وہی حالت ہے بلکہ اس سے بدتر ہے جو شاہ جی نے بیان کی ہے۔ اللہ کرے اس پاکستان میں صحیح معنوں میں اسلامی نظام نافذ ہوتا کہ جس مقصد کے لیے پاکستان بنایا گیا تھا وہ مقصد پورا ہو۔ پاکستان پاک نظام سے بنتا ہے اگر پاکستان

میں انگلستان کا نظام ہو تو پاکستان اور انگلستان میں کیا فرق ہوگا؟ اکبر مرحوم نے سچ کہا ؎

ایک ناقوس اٹھا لاؤ ابھی دکھلا دوں
دیر کیا لگتی ہے کعبے کو کلیسا ہوتے

دینی لحاظ سے تو ابھی پاکستان پاکستان نہیں بنا، دنیوی لحاظ سے بھی اس کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا گیا۔ اس کا غازہ نوچا گیا اور ہر شخص نے اس کو تباہ و برباد کرنے کی پوری پوری کوشش کی یہاں تک کہ یہ دولخت ہو گیا ہے۔ اب چاروں صوبوں میں ایک افراتفری کا عالم ہے جس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا ؎

حالت گلستاں پہ کیا روئیں، ہر طرف سے صدائیں آتی ہیں
پہلے گل ٹوٹتے تھے شاخوں سے، اب تو کلیاں ہی سوکھ جاتی ہیں
توڑ کے لے گیا کوئی غنچے، کوئی کلیوں پر آن ٹوٹا ہے
کیا بتاؤں دوست اس گلستاں کو، باغبانوں نے مل کے لوٹا ہے

